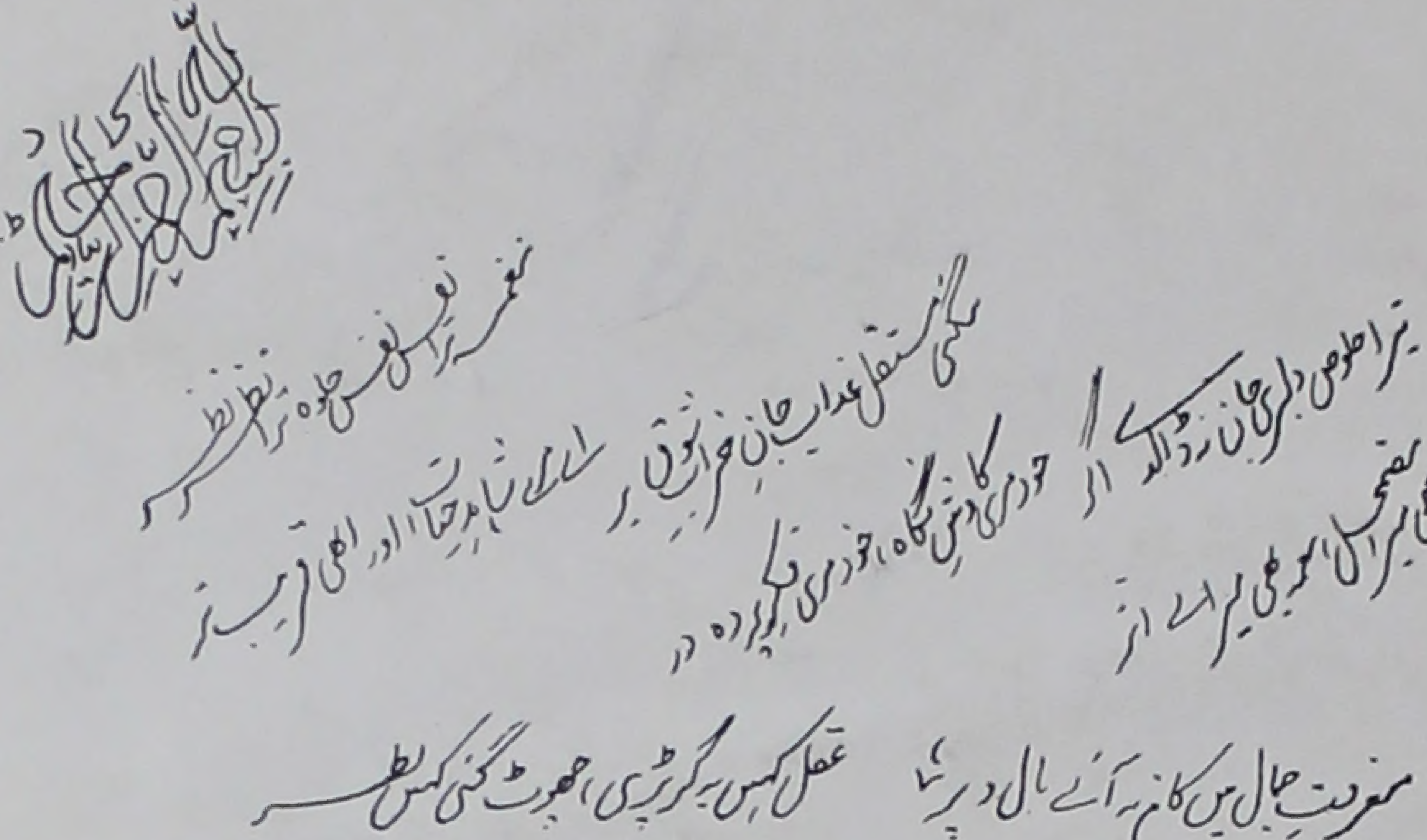
جگر مرادآبادی

حیات اور شاعری

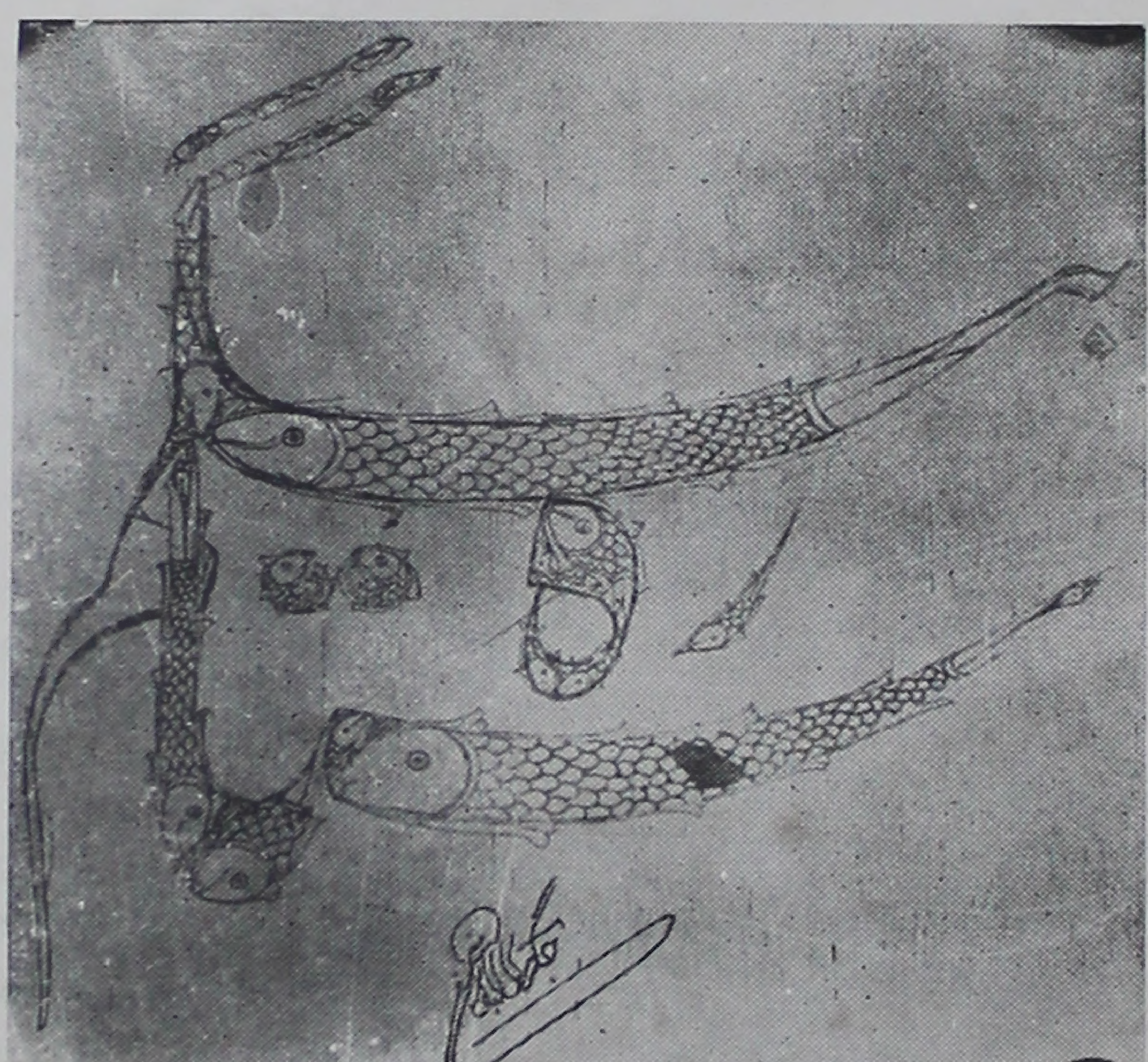


ڈاکٹر محمد اسلام

جگر کی تحریر



جگر کا آرٹ



پیشِ لفظ

جگر مرادآبادی دنیائے اردو ادب میں ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے مشہور و مقبول ہوئے ان کی دنیا حسن و عشق کی دنیا تھی۔ اسی لئے ان کی شاعری تمام حُسن و عشق ہی کی شاعری تک محدود رہی، ان کو خود اس کا اعتراف تھا کہ ان کی شاعری "غزل" ہی تک محدود ہے اس کے باہر انھوں نے (بعض مستثنیات کو چھوڑ کر) کبھی دوسرے میدان میں قدم نہیں رکھا اور کبھی اس بات کا دعویٰ نہیں کیا کہ وہ کوئی فلسفی، قومی یا ناظم قسم کے شاعر ہیں۔ اس لئے ان کے یہاں فلسفہ و تصوف یا اخلاقیات کی تلاش کرنا ان کے ساتھ ناانصافی کرنا ہے یہ بات دوسری ہے کہ بعض بعض جگہ انھوں نے فلسفہ و اخلاق سے متعلق بھی (اپنے آخری دور میں) بعض اشعار کہے ہیں لیکن اگر انصاف مقصود ہو تو جگر کا صحیح مرتبہ قائم کرنے کے لئے ان کو ایک غزل گو کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے نہ کہ فلسفی یا ناظم کی حیثیت سے۔ اور غزل گو ہی کی حیثیت سے ان کے مرتبہ کا تعین کرنا چاہیے۔

جگر صاحب کو اپنے عہد میں جس قدر مقبولیت و شہرت حاصل ہوئی وہ ان کی اپنی رنگا رنگ شخصیت، رنگِ تغزل، اور نغمہ و ترنم وغیرہ کی بدولت ہوئی، انھوں نے اپنے عہد کے تمام غزل گو شعراء میں سب سے زیادہ مقبولیت حاصل کی لیکن اپنے انکسار اور حسنِ اخلاق کی وجہ سے انھوں نے کبھی خود کو اپنے عہد کے کسی دوسرے شاعر (مثلاً حسرت، فانی، اصغر وغیرہ) سے نہ تو بڑا شاعر کہا اور نہ کسی بڑے شاعر کی عیب جوئی یا برائی کر کے اپنی عظمت تسلیم کرانے کی کوشش کی۔ انھیں خیالات کے پیشِ نظر اس مقالہ میں جگر مرادآبادی کی حیات اور شاعری پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور اس کو حسبِ ذیل سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

باب اوّل میں "جگر کے عہد اور ادبی پس منظر" کے تحت، جگر کی پیدائش سے کچھ پہلے کے حالات (عام طور سے ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات) سے لیکر ۱۹۶۰ء تک کے تمام سیاسی، تہذیبی و تمدنی، مذہبی، تعلیمی اور ادبی حالات کا تاریخی اعتبار سے جائزہ لیا گیا ہے اور اس زمانے (۱۸۵۷ء کے بعد سے ۱۹۶۰ء تک) میں جو بھی خاص خاص سیاسی، مذہبی، تعلیمی تبدیلیاں ہوئیں ان کا مختصر

مگر جامع طور پر تاریخی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ پتا چلانے کی بھی کہ جگر پر اس عہد کے ان مختلف تمدنی اور ادبی ماحول کا کیا اثر پڑا یا ان حالات سے جگر نے کس حد تک اثر قبول کیا۔

باب دوم میں جگر کی حیات کے سلسلے میں ان کے اسلاف، سلسلۂ نسب، مقام و سال پیدائش، تعلیم و تربیت، مذہبی عقائد، جگر پہ ماحول کا اثر اور شعر گوئی کی ابتدا، ان کی پریشانیاں اور اسباب ترکِ وطن (مرادآباد) اور زندگی کے تمام واقعات درج کئے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں راقم نے تحقیقی و مستند حالات و واقعات معلوم کرنے کے لئے ہندوستان و پاکستان کے مختلف شہروں کا دورہ کیا۔ ان کی حیات کے سلسلے میں ایک ایک بات کی تحقیق کی اور صرف انھیں حضرات کے اقوال و بیانات کا حوالہ دیا جو مستند اور معقول معلوم ہوئے، ان حالات و واقعات کے متعلق جن حضرات کے اقوال و بیانات ناقص یا غلط معلوم ہوئے ان کی تردید بھی کر دی۔ جگر کی حیات کے سلسلے میں بعض ان کے بہت ہی قریبی احباب و مخلصین مثلاً محمود علی خاں جامعی مرحوم (مصنف "تذکرۂ جگر")، قیس الفاروقی (مصنف حیاتِ جگر (غیر مطبوعہ) اور "یادگارِ جگر" (غیر مطبوعہ) خود جگر مرحوم سے دریافت کر کے لکھی ہیں) اور مظہر حبلیل شوقی مرادآبادی (مصنف "یادگارِ جگر" غیر مطبوعہ) کی نہ صرف ان کتابوں میں بلکہ ان کے دوسرے احباب و مخلصین کے مضامین میں بھی بعض بعض جگہ کچھ نقص ملے ہیں، راقم نے جہاں کوئی نقص پایا اس کی تردید کر دی ہے اور جو واقعات و حالات تحقیق کے بعد صحیح معلوم ہوئے ان کی تصدیق بھی کر دی ہے اور ہر بات کو جس میں کسی قسم کی غلطی یا غلط فہمی معلوم ہوئی اسے وضاحت و صراحت اور تفصیل کے ساتھ اسناد پیش کر کے لکھ دیا ہے تاکہ کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔

باب سوم میں جگر کی سیرت کے چند نفسیاتی پہلو، طرزِ معاشرت، استغنا و خودداری، فیاضی، حب الوطنی، لطفِ صحبت، لطائف جگر وغیرہ کے سلسلے میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جگر کی سیرت اور شخصیت کے بننے میں ان کے خاندان اور ماحول وغیرہ کا کس حد تک اثر پڑا اور وہ اپنے عہد کے خارجی حالات و واقعات سے کس قدر متاثر ہوئے۔ طرزِ معاشرت کے تحت ان کی شکل و شمائل، لباس، طعام اور تواضع وغیرہ کے متعلق ان کے مخلصین و مقربین کے بیانات نقل کیے گئے ہیں۔ استغنا و خودداری، فیاضی اور حب الوطنی وغیرہ کے سلسلے میں مختلف مگر لائق اعتماد تحقیقی واقعات و حالات لکھ دیئے گئے ہیں۔ جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جگر مستغنی، فیاض، مخیر خوددار اور ایک سچے محبِ وطن تھے جس سے جگر پر بعض حضرات کے لگائے گئے اس الزام کی کہ جگر صاحب ایک پیشہ ور شاعر تھے تردید ہو جاتی ہے۔ اس باب میں جگر کے بہت سے لطائف بھی قلمبند کر دیے گئے ہیں اسلئے یہ باب بھی ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو پیش کرتا ہے۔ جو عام طور سے ابھی تک نظروں

سے اوجھل تھا۔

باب چہارم میں جگر کے پہلے مجموعے "داغِ جگر" کے سنہ اشاعت کی تحقیق کے ساتھ ساتھ ان کے اس عہد کے کلام میں رسمی شاعری کا پتا لگانے کے لئے ان کی سنہ ۱۹۱۰ء و ۱۹۱۴ء کی بعض ایسی غزلوں (جو اُن کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہیں لیکن راقم نے انھیں "یادگارِ جگر" میں یکجا کر دیا ہے)، سے بھی کچھ اشعار بطور سند کے پیش کر دیئے ہیں۔ جگر کے یہاں حسن کے خارجی لوازم کے بیانات بھی ملتے ہیں جبکہ بعض حضرات کا خیال ہے کہ جگر کے یہاں حسن کے خارجی لوازم کا بیان نہیں ہے اسلئے ثبوت میں جگر ہی کے اشعار پیش کر دیئے گئے ہیں۔ اور چونکہ وہ عاشق شاعر تھے اس لئے ان کے یہاں ابتدائی زمانے ہی سے عشقیہ جذبات و احساسات کی عکاسی پائی جاتی ہے۔

• "داغِ جگر" کے بعد جگر کا دوسرا مجموعہ "شعلۂ طور" شائع ہوا ہے اس لئے اس مجموعہ کے سنہ اشاعت کی تحقیق کرنے کے بعد اس بات کا بھی مکمل جائزہ لیا گیا ہے کہ اس دور میں جگر کی شخصیت اور شاعری نے حضرت اصغر گونڈوی سے کس حد تک اثرات قبول کئے۔ جگر کے یہاں نیم صوفیانہ شاعری ملتی ہے، جو ان کے خاندان، اصغر اور شاہ عبدالغنی منگلوری کی دین ہے ان کے بعض اشعار میں عشق کے گہرے ذاتی تجربات بھی ملتے ہیں۔

جگر کا تیسرا مجموعہ "آتشِ گل" ہے اس کے سنہ اشاعت کی بھی تحقیق کر لی گئی ہے اس مجموعہ میں جگر کے یہاں محبوب کا ایک خاص تصور ملتا ہے ان کے محبوب نے ان کی والہانہ محبت کا جواب والہانہ محبت ہی سے دیا ہے۔ بلکہ بعض اشعار میں جگر صاحب خود محبوب اور ان کا محبوب ان کا عاشق بن گیا ہے۔ انھوں نے حسن و عشق کے ایسے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا تصورِ حسن و عشق کس قدر اعلیٰ و ارفع تھا۔ ان کے اس عہد کے کلام میں گہری داخلیت کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔

انھوں نے داغ، مومن، غالب اور اقبال کا اثر قبول کیا ہے اس لئے ان کے کلام سے ایسے اشعار کا انتخاب کر کے جن کا مفہوم ایک ہی سا ہے تقابل کے لئے بطور سند کے پیش کر دیئے گئے ہیں۔ جگر کے یہاں بنیادی تصورات (تصوف، اخلاق اور انسانیت وغیرہ کا) ان کے خاندان، اصغر گونڈوی اور شاہ عبدالغنی منگلوری کے اثر سے پیدا ہوئے اس سلسلے میں ان کی زندگی کے حالات و واقعات اور ان حالات و واقعات سے متعلق اشعار پیش کئے گئے ہیں۔ جگر صاحب نے مشاعروں کے لئے بہت سی غزلیں کہی تھیں جن کی نشاندہی انھوں نے خود ہی اپنے مجموعوں میں کر دی ہے اس لئے ان کا یہ بیان کہ انھوں نے کبھی مشاعروں کے لئے یا فرمائش پر غزلیں نہیں کہی ہیں حقیقت سے بعید ہے کیونکہ انھوں نے مشاعروں کے لئے اور فرمائش پر غزلیں کہی ہیں۔ ایسی غزلوں کے مقامات اور سنہ

بطور سند کے لکھ دیئے گئے ہیں۔ وہ مشاعروں سے معاوضہ بھی بہت سختی کے ساتھ وصول کرتے تھے جس کا سبب یہ تھا کہ ان کے ذمہ کئی خاندانوں کی پرورش تھی اور اس طرح وہ بہت سے مستحقین کا حق ادا کرتے تھے اور اس آمدنی کا بیشتر حصہ خیرات اور غریبوں کی امداد میں دے دیتے تھے۔

جگر کا فارسی کلام بہت مختصر سا ہے جس میں بیشتر فارسی شعراء کی تقلید کی گئی ہے البتہ بعض بعض جگہ سادگی و دلکشی پائی جاتی ہے اس طرح اس باب میں جگر کی شاعری کے ہر عہد کے ارتقاء کا مکمل جائزہ لیا گیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جگر کے یہاں خالص رسمی شاعری اور حسن کے خارجی لوازم کا بیان وغیرہ پایا جاتا ہے جبکہ جگر کے بعض مخلصین و معتقدین نے جگر کو ان لوازم سے مستثنیٰ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے یہ باب ______ جگر کی شاعری کے متعلق بعض غلط فہمیاں دور کرنے میں مفید ثابت ہوگا۔

باب پنجم میں جگر کی شاعری کے بعض اہم موضوعات مثلاً خمریات، تصورِ حسن و عشق، انسانی عظمت کا تصور، اخلاقیات اور اُن کی نظم گوئی کو انھیں کے کلام کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے خمریات میں جگر کے ایسے اشعار جو شراب سے متعلق ان کے ذاتی تجربات اور جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں پیش کئے گئے ہیں۔ تصورِ حسن و عشق میں انھوں نے قدیم اور اپنے عہد کے شعراء کی عام روش سے ہٹ کر حسن و عشق کا ایک اعلیٰ و ارفع تصور پیش کیا ہے اور دونوں کی عزت و احترام کو قابل لحاظ حد تک قائم کر دیا ہے۔ تصوف میں ایسے اشعار ملتے ہیں جو ان کے احساسات و تجربات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے تصوف کی بنیاد ان کے خاندان اور مرادآباد کے قدیم ساتھیوں کی صحبت ہی سے پڑی تھی لیکن اصغرؔ اور شاہ عبدالغنی منگلوری کی ملاقات نے اسے پروان چڑھایا۔

جگر صاحب کوئی معلم اخلاق نہ تھے اور نہ کبھی انھوں نے اس کا دعویٰ کیا لیکن اپنے عہد کے حالات و واقعات اور حادثات (مثلاً جنگ عظیم، انگریزوں کے ظلم و ستم اور ملک کے فسادات وغیرہ) سے انھوں نے چشم پوشی بھی نہیں کی چنانچہ انھوں نے ان حالات و واقعات سے متاثر ہو کر اپنے ملک و قوم کو اپنے اشعار کے ذریعہ بعض بعض جگہ درس اخلاق دیا ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ جگر صاحب نے صرف غزلیں کہی ہیں۔ نظم سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہے اس سلسلے میں ان کی مطبوعہ نظموں کے ساتھ ساتھ ان کی غیر مطبوعہ نظموں کو ان کی بیاضوں اور بعض پرانے رسائل وغیرہ سے تلاش کر کے پیش کر دیا گیا ہے۔ تاکہ جگر کی نظم گوئی کے متعلق کوئی رائے قائم کی جا سکے۔ اس لحاظ سے یہ عنوان جگر کی شاعری کے سلسلے میں ایک نیا عنوان ہے جو بعض جگر کے جاننے والوں کے لئے بھی نیا ثابت ہوگا۔

جگر صاحب نے قومی تحریک کا اثر قبول کیا تھا۔ انھوں نے اس تحریک سے متاثر ہو کر

بعض نظمیں کہیں جن میں مطبوعہ وغیر مطبوعہ دونوں قسم کی نظمیں شامل ہیں۔ اور جن کو واقعی قومی اور وطنی نظم کہا جاسکتا ہے۔ ان کے یہاں تقسیم ہند کے بعد کے اثرات کا رمزی اور علامتی بیان ملتا ہے۔ انھوں نے سیاست میں محبت کا پیغام دیا ہے۔ اور ارباب حکومت کو ایسی سیاست بروئے کار لانے کا مشورہ دیا ہے جس میں عام طور پر محبت کارفرما ہو۔ اور انسانی زندگی سکون و اطمینان سے گزر سکے۔ اس کے تحت ان کے کلام سے ایسے ہی اشعار منتخب کرکے پیش کئے گئے ہیں۔ جو مندرجہ بالا خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

باب ششم میں جگر کے شعری نظریات کو ان کے اقوال و اشعار کی مدد سے بیان کرنے کے بعد ان کے ایسے اشعار جن میں سادگی اور پرکاری پائی جاتی ہے پیش کیے گئے ہیں۔ جگر کے یہاں سہل ممتنع، زبان و بیان کی لطافت، قدیم و جدید دونوں قسم کے محاورے، تشبیہات و استعارات، خاص جدت و ندرت کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ رمز و کنایہ اس انداز سے برتے ہیں کہ ان کے اشعار کی اثر آفرینی میں دلچسپ ابہام پیدا ہو گیا ہے ان کے کلام میں ندرت بیان بھی ہے اور نشتریت بھی۔ انھوں نے مترنم بحروں میں —— الفاظ اور ان کے تواتر و تکرار سے ترنم پیدا کیا ہے اور فارسی ترکیبیں اپنے پورے شاعرانہ کمال کے ساتھ استعمال کی ہیں۔

اسی باب میں "جگر کے نقاد" کے عنوان کے تحت نقاد کے فرائض تنقید کا اصل مقصد وغیرہ بیان کرنے میں اردو ادب کے مشاہیر نقادوں کی بیش قیمت رایوں سے مدد لی گئی ہے اور اس حقیقت کا انکشاف کیا گیا ہے کہ ایک طرف تو ان کے مخلصین و معتقدین نے ان کی تعریف کرنے میں حقیقت سے تجاوز کیا ہے تو دوسری طرف ان کے بعض معترضین نے ان پر تنقید کرنے میں ایمان و انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے اس لئے جگر کے مخالفین و موافقین دونوں کی معقول رایوں کو مع حوالہ کے پیش کر دیا گیا ہے اور جہاں جہاں ان کے بیانات یا تنقید میں کوئی لغزش یا نقص ملا ہے اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ آخر میں جگر کے نقادوں کی تنقید کا خلاصہ بیان کر دینے کے بعد تمام نقادان جگر کے یہاں صداقت و حقیقت کی تلاش کی گئی ہے۔

جگر کیا دنیا کے کسی شاعر کا کلام خامیوں اور نقائص سے پاک نہیں ہے۔ چنانچہ جگر کے کلام میں بھی بعض خامیاں اور نقائص پائے جاتے ہیں جن کو مجملاً بیان کر دیا گیا ہے۔

باب ہفتم میں اردو غزل کا تاریخی جائزہ لیا گیا ہے۔ اور غزل میں تاریخی اعتبار سے ہر دور میں (از ابتدا تا حال) جو بھی خاص تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کا الگ الگ جائزہ لیا گیا ہے۔ یعنی یہ بتلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس کس عہد میں غزل میں زبان و بیان یا تکنیک وغیرہ میں کیا کیا خصوصی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ پھر جگر کے عہد کی غزل کا جائزہ لیکر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس عہد میں

غزل کن کن منازل سے گزری اور اب وہ کس مقام پر ہے
جگر کے ہم عصر غزل گو شعراء نے غزل میں کیا خصوصیات پیدا کیں اس کا بھی تذکرہ کر دیا گیا ہے
جگر اپنے عہد کے سب سے زیادہ مقبول و مشہور شاعر ہوئے جس کی وجہ ان کا حسنِ اخلاق خلوص و محبت، استغناء، وضعداری اور ان کے فنی کمالات خصوصاً تغزل کی شیرینی و نغمگی، سرمستی و سرشاری، دلآویزی اور ترنم وغیرہ ہے۔ یہی خصوصیات تھیں جنھوں نے جگر کو خواص و عوام دونوں میں یکساں مقبول مشہور کیا۔

جگر کی مقبولیت و شہرت کے مستقبل کو اگر زیادہ روشن نہیں تو تاریک بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ حسن و عشق سے خصوصی لگاؤ انسانی فطرت میں داخل ہے اس لئے جب تک انسان دنیا میں ہے حسن و عشق کے افسانے بھلائے نہیں جا سکتے۔ یہ حسن و عشق کے افسانے جب تک اردو زبان زندہ کبھی مٹ نہیں سکتے اور جب تک اردو زبان زندہ ہے غزل زندہ رہے گی اور جب تک اردو غزل زندہ ہے جگر بھی زندہ رہیں گے کیونکہ انھوں نے اپنی تمام عمر لیلائے غزل ہی کے گیسو سنوارنے میں صرف کی ہے۔

جگر پر تحقیقی کام کرنے کے سلسلے میں راقم الحروف نے اپنے حتی الامکان اس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ غیر جانبدار رہے اور جگر کی حیات یا شاعری کے سلسلے میں جو بات حقیقت و صداقت پر مبنی ہو اسی کی تصدیق کرے اور غلط یا ناقص باتوں کی تردید کر دے

مواد کی فراہمی کے لئے راقم نے جگر کی حیات پر تحقیق کرنے کے لئے لکھنؤ کے علاوہ ان کے اصل ماخذ کی تلاش میں گونڈہ (جس کو انھوں نے اپنے آخری ایام میں تقریباً بیس سال تک مستقر بنائے رکھا) مرادآباد، آگرہ، علی گڈھ، میرٹھ، حمیرپور، کانپور، دہلی، لاہور، اوکاڑہ (پاکستان)، اور کراچی وغیرہ شہروں کا سفر کیا۔ اور لاہور میں بشیر ضیائی صاحب کے کتب خانے سے اور دہلی میں "گوشۂ جگر" لائبریری جامعہ ملیہ دہلی سے خصوصی استفادہ کیا۔ اس سفر کے دوران جگر کے مختلف احباب سے ملاقات کر کے جگر کی حیات اور شاعری کے متعلق معلومات فراہم کیں اور جہاں جہاں پہونچنا راقم کے امکان سے باہر تھا۔ ذریعہ خط و کتابت جگر کے احباب سے رابطہ قائم کر کے اصل حالات و واقعات کی تحقیق کی جن کی فہرست آخر میں دیدی گئی ہے۔

میں عالی جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (نائب صدر جمہوریہ ہند) کا شکر گزار ہوں جنھوں نے بذریعہ مراسلہ جناب سید صدیق حسن صاحب مرحوم سے میرا تعارف کرایا اور انھیں کے مساعی سے میں اپنے تحقیقی مقالہ کی تکمیل کر سکا۔

آخر میں جناب سید صدیق حسن صاحب مرحوم، جناب نواب مرزا جعفر علیخاں صاحب اثر لکھنوی جب

حضرتِ جوشؔ ملیح آبادی، جنابِ فضل احمد کریم فضلی، جناب مرزا احسان احمد صاحب، جناب پروفیسر رشید احمد صدیقی، جناب تمکین قریشی، زائرِ حرم حضرت حمید صاحب صدیقی (مرحوم)، جناب حبیب احمد صدیقی، جناب مجروحؔ سلطان پوری، جناب بندیشوری پرشاد تقدیرؔ (گونڈوی)، جناب مکینؔ اکبرآبادی، جناب سراجؔ لکھنوی، جناب مولوی خورشید حسن مرادآبادی، جناب رازؔ مرادآبادی، جناب نواب سید شمس الحسن شمسؔ، جناب مولانا ماہرؔ القادری، جناب مظہر جلیل شوقؔ مرادآبادی، جناب قمرؔ مرادآبادی، جناب غلام محی الدین، جناب قیصرؔ مرادآبادی، جناب عزیز حسن صاحب مرادآبادی، جناب علی مظفر صاحب مرادآبادی (جگرؔ صاحب کے حقیقی چھوٹے بھائی)، جناب شمس الہدیٰ قیصی الفاروقی، جناب اختر علی تلہری، جناب تبسمؔ نظامی (مرحوم)، جناب عارفؔ عباسی، جناب شاہ محمد حسین عثمانی، جناب جلیل قدوائی، جناب کرشن چند حیرتؔ (گونڈوی)، جناب فناؔ نظامی کانپوری، جنابہ شاہجہاں بانو یاد صاحبہ دہلوی، جناب رشید نعمانی، جناب محمد رفیق صاحب مرادآبادی، جناب حکیم سید ابرار احمد (آگرہ)، جناب عبد اللطیف اعظمی، جناب احمد حسین خاں اخگر رفاعی، جناب محسن علی صدیقی (گونڈوی)، جناب نیازؔ گونڈوی وغیرہ وغیرہ کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھوں نے "مقالہ" کی تیاری کے سلسلے میں میری کسی نہ کسی طرح سے امداد و حوصلہ افزائی فرمائی۔

ان کے علاوہ میں جناب ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی صاحب کا شکر گزار ہوں جنھوں نے "جگرؔ مرادآبادی، حیات اور شاعری" پر تحقیقی کام کے لئے اس عنوان کو لکھنؤ یونی ورسٹی سے منظور کرایا اور اپنی نگرانی میں اس کی تکمیل کرائی۔

پروفیسر سید احتشام حسین صاحب، ڈاکٹر شجاعت علی صاحب سندیلوی اور ڈاکٹر سید رغیب حسین صاحب کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے وقتاً بہ وقتاً مقالہ کے سلسلے میں مواد فراہم کرنے میں میری امداد کی۔ جناب بشیر ضیائی صاحب (لاہور)، اور لائبریرین جامعہ ملیہ دہلی خاص طور پر شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے اپنی لائبریری سے مجھے مکمل استفادہ کرنے کا موقع دیا۔

تصاویر کے لئے جنابہ ستارہ بیگم صاحبہ (ہمشیرہ رازؔ صاحب مرادآبادی جن کا نام جگرؔ صاحب نے "پچھلیوں" میں لکھا تھا) کا اور "ادارۂ فروغِ اردو" لکھنؤ کا شکر گزار ہوں جنھوں نے اس "مقالہ" کے لئے تصاویر عنایت فرمائیں۔

احباب میں جناب مجتبےٰ اقبال احمد خاں صاحب (لاہور)، جناب معجز حسین صدیقی، بھابھی نور جہاں بیگم صاحبہ، شمشاد احمد خاں، مطرب سلطان نظامی، شکیل احمد خاں،

اور احمد حسن صاحب کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے اس "مقالہ" کی تیاری کے سلسلے میں مختلف اوقات میں کسی نے "مقالہ" کے نقل کی تو کسی نے زبانی ہمدردی وغیرہ کا اظہار کیا۔ جس سے "مقالہ" کی تکمیل میں مجھے کافی مدد ملی۔

یہ تحقیقی مقالہ اکتوبر ۱۹۶۵ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کیلئے پیش کیا گیا اور فروری ۱۹۶۶ء میں لکھنؤ یونیورسٹی نے اس مقالہ پر راقم الحروف کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کی۔

محمد اسلام

۱۵ر جولائی ۱۹۶۶ء (جمعہ)

لکھنؤ

بابِ اوّل

جگر کا عہد اور ادبی پس منظر صفحہ ۱۹ تا ۶۴

سیاسی و سماجی، تہذیبی و تمدنی، مذہبی، علمی و ادبی

ترتیب

جگر کا عہد اور ادبی پس منظر

ادیب اور شاعر اسی آب و گل کی دنیا کے رہنے والے اور سماج کے ایک رکن ہوتے ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش ہی سے اپنی تخلیقات کے لئے مواد فراہم کرتے ہیں اور ان کے گرد و پیش کے حالات و روایات ماضی سے اثر قبول کر کے مستقبل پر اپنا اثر ڈالتے ہیں اس لئے کسی شاعر یا ادیب کو سمجھنے کے لئے اس کے ماضی اور حال کے سیاسی، سماجی، تہذیبی، مذہبی اور ادبی حالات وغیرہ کا جاننا ضروری ہے۔

جگر کا زمانہ (۱۸۹۰ء تا ۱۹۶۰ء) ہندوستان کا اہم اور نازک زمانہ تھا اسی زمانے میں زندگی کے تمام شعبوں سیاست، سماج، مذہب، تہذیب اور ادب وغیرہ میں ایک عظیم انقلاب رونما ہوا مشترکہ تہذیب کے مٹنے کے آثار نظر آنے لگے اور مشرقیت پر مغرب کے اثرات روز بروز بڑھتے گئے۔

سیاسی و سماجی

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے رفتہ رفتہ سارے ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کر لی اور اس نے ہندوستان (جسے سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا) کو لوٹنا شروع کیا۔ نئے نئے ٹیکس، ہر سال بجٹ میں خسارہ دکھا کر لگائے جانے لگے، یہاں کا کچا مال انگلستان جانے لگا اور اسی سے تیار کیا ہوا پکا مال ہندوستان آ کر کئی گنا قیمت پر فروخت ہونے لگا۔ یہاں کی صنعت کو انگریزوں نے تقریباً ختم کر دیا اور کسانوں پر اس قدر ٹیکس لگایا کہ وہ بے چارے سارے دن سخت محنت کرنے کے بعد بھی جو کچھ پیدا کرتے وہ ان کا نہ ہوتا بلکہ وہ ساری محنت مہاجن یا ٹیکس کی شکل میں نذرِ سرکار ہو جاتی وہ بیچارے فاقوں سے موت کے گھاٹ اترنے لگے۔ ہندوستان میں (جو زراعتی ملک ہے اور جس میں قحط کا کبھی نام بھی نہ سنا گیا تھا) اب آئے دن قحط اور بھکمری کے واقعات پیش آنے لگے۔

۱۸۳۷ء میں جو ملکہ کی تاجپوشی کا سال تھا۔ شمالی ہند میں قحط پڑا۔ ۱۸۵۷ء میں غدر کے ساتھ بہار اور اڑیسہ میں قحط نمودار ہوا۔ ۱۸۷۷ء میں مدراس میں ایک بھیانک قحط پڑا۔ اسی سال ملکہ معظمہ نے قیصرۂ ہند کا لقب اختیار کیا اور ۱۸۹۷ء میں ملکہ کی ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر ایک ہندوستان گیر قحط رونما ہوا۔ جس میں لاکھوں انسان موت کے بھینٹ چڑھے۔

ان حالات و واقعات سے ہندوستانی اور انگریز دونوں متاثر ہوئے بعض انگریزوں نے حکومت کی اس پالیسی پر جس سے ہندوستان میں قحط پیدا کر دیا گیا تھا۔ اور اسے مفلس بنایا جا رہا تھا خود انگلستان میں سخت تنقید کر کے اس پالیسی کو بدلنے کی کوشش کی۔

رفتہ رفتہ ہندوستانی انگریزوں کی روباہی خصلت اور پُر فریب چالوں سے واقف ہو گئے اور وہ (انگریز) جو تعلیم و تہذیب اور تجارت کی آڑ میں ہندوستانیوں کو جاہل، وحشی اور مفلوک الحال بنا رہے تھے۔ ہندوستانی ان کی اس چال کو بھی سمجھ گئے ان ہی احساسات نے ۱۸۸۵ء میں کانگریس کو جنم دیا جس کا مقصد ہندوستان کے تمام رہنے والوں کو ایک قوم بنا کر اسے ترقی دینا اور نا منصفانہ قوانین و احکام میں ترمیم کرنا تھا۔ اس کا پہلا اجلاس ۱۸۸۵ء میں ایک بنگالی (عیسائی) بنرجی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس کے بعد باقاعدہ سالانہ اجلاس ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں ہونے لگے۔

۱۸۸۸ء میں علی گڑھ میں "یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن" یعنی جماعت محبانِ وطن قائم ہوئی جس میں ہندو مسلمان دونوں قومیں شامل تھیں۔ اس زمانے میں ہندوستانی دو طبقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک طبقہ برٹش سرکار کے ظلم و تشدد کے باوجود ہر وقت بغاوت پر آمادہ تھا۔ اور دوسرا سمجھ بوجھ کر سلجھے ہوئے طریقہ سے اپنی دقتوں کو گورنمنٹ کے سامنے پیش کر کے اس سے سمجھوتہ کرنا چاہتا تھا، کانگریس کے علمبردار اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے ۱۸۹۲ء میں کونسلوں میں پبلک کے منتخب کئے ہوئے ممبر شریک ہونے لگے انھیں دنوں میں راناڈے نے اقتصادی انجمن (ECONOMIC SOCIETY) اور گوکھلے نے انجمن خادمانِ ہند (SERVANT OF INDIA SOCIETY) کی بنیاد ڈالی، ان دونوں انجمنوں نے بہت سے محبِ وطن پیدا کئے

۱۹۰۵ء میں روس کے انقلابی مزدوروں کے ساتھ ساتھ سارا ایشیا جاگ اٹھا۔ ایران، ترکی اور مصر نے جمہوری نظام حکومت بنانے اور سامراجی اثرات کو مٹانے کی آواز بلند کی، جس کا اثر ہندوستانیوں نے بھی قبول کیا۔ اسی سال انگریزوں نے بنگال کو تقسیم کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی آزادی پسند جماعت میں تفرقہ ڈالنے کی کوشش کی جس سے ہندو بنگالی بہت برہم ہوئے اور انھوں نے ولایتی سامان کے بائیکات کا کام شروع کر دیا۔

۱۹۰۶ء میں کانگریس نے "سوراج" کو اپنا مطمح نظر بنایا۔ جگر نے اس تحریک سے متاثر ہو کر "سوراج" کے عنوان سے ایک نظم کہی تھی لیکن وہ ان کی سُستی کی نذر ہو گئی۔ اسی سال ڈھاکہ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے بعد کہ جس میں "مسلم لیگ" اور لاہور میں "آل انڈیا ہندو مہاسبھا" کا اجلاس منعقد کیا گیا۔ اور صوبہ متحدہ میں سر انیتھونی میکڈانل نے اردو، ہندی کا قضیہ اٹھایا۔

۱۹۱۱ء میں بنگال کی تقسیم کی تنسیخ ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں کانگریس اور مسلم لیگ میں سمجھوتا ہو گیا جس سے

متحدہ جدوجہد کے دروازے کھل گئے۔

۱۹۱۶ء میں بال گنگادھر تلک نے "ہوم رول" کی تحریک شروع کی جس میں مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے متحد ہو کر ہندوستان کی آزادی کے لئے آوازیں بلند کیں اور دوسری نوآبادیات ممالک کی طرح اپنے ملک میں خود انتظام کرنے کا حق مانگا اس حق طلبی نے ملک میں ایسا جوش و خروش پیدا کر دیا کہ "ہوم رول" لوگوں کا دین و ایمان بن گیا چکبست کہتے ہیں ؎

ہو ہوم رول حاصل ارمان ہے تو یہ ہے
اب دین ہے تو یہ ہے ایمان ہے تو یہ ہے

پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے ختم ہونے کے بعد تمام دنیا میں سیاسی، اقتصادی اور ذہنی انقلابات رونما ہوئے۔ روس کی طرح ہندوستان میں بھی نئی زندگی اور تازہ بیداری پیدا ہوئی۔

۱۹۱۷ء و ۱۹۱۸ء ہی میں ہندوستان میں ہندو مسلم فساد بھی ہوئے جو انگریزوں کی پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کے تحت ہوئے۔

۱۹۱۸ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ کے ذریعہ ہندوستانیوں کو نظامِ سلطنت میں کافی حقوق دیئے گئے جسے کانگریس نے قبول کر لیا۔

۱۹۱۹ء میں آئینی اصلاحات کی چوتھی قسط "گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء" شائع ہوئی، جو مانٹیگو چیمسفورڈ سے زیادہ مایوس کن تھی اس لئے اس قانون کے خلاف سارے ہندوستان میں صدائے احتجاج بلند ہوئی، بڑے بڑے جلسے شروع ہوئے جن کو حکومت نے تشدد سے روکنے کی کوشش کی۔ مارچ ۱۹۱۹ء میں پولیس نے دہلی میں ایک بہت بڑے جلوس کو گولیاں مار کر منتشر کیا اور ۱۳ر اپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں ایک محصور مقام پر جہاں کچھ لوگ ستیا گرہ کا دن منانے کے لئے جمع ہوئے تھے جنرل ڈائر نے اپنے فوجی دستے سے اسے باقاعدہ گھیر کر نہتی رعایا پر گولیاں برسوانے لگا اور جب تک گولیاں ختم نہ ہو گئیں وہ برابر گولیاں برسواتا رہا۔ یہ واقعہ "جلیان والا باغ" کے نام سے مشہور ہے۔ جگر صاحب نے اس واقعہ سے متاثر ہو کر کچھ شعر کہے تھے جن کا تذکرہ آگے آئے گا۔

۱۹۲۰ء میں سیاسی اور خلافت کی تحریک، دونوں نے "سوراج" کو اپنا نصب العین بنا کر ساتھ ساتھ ایک ہی راستہ پر چلنا شروع کیا اور حکومت سے ترک موالات کی لڑائی شروع کر دی۔ لیکن جب گاندھی جی نے ملک کو عدم تعاون کے پروگرام کے لئے تیار کرنے کی غرض سے ملک کے طول و عرض کا سفر کیا تو جناح صاحب نے اس مشن کو پسند نہیں کیا اور وہ اس سے سیاسی وجوہ کی بنا پر قطعی طور پر الگ ہو گئے

۱۹۲۱ء سے آزادی کا احساس زیادہ مستحکم ہو گیا۔ تحریک خلافت کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی اور جب حکومت سے ترکِ موالات کی تحریک نے زیادہ زور پکڑا تو حکومت نے اسے طاقت کے زور سے دبانا چاہا جس کی وجہ سے ملک میں بلوے شروع ہو گئے۔ سب سے بڑا بلوہ ۵ر فروری ۱۹۲۲ء کو چورا چوری (ضلع گورکھپور)

میں ہوا۔ یہاں کے دیہاتیوں نے پولیس کے مظالم سے تنگ آکر تھانے کو آگ لگادی اور چھ سات سپاہیوں کو زندہ جلا دیا۔

اب انگریزوں نے "شدھی اور تبلیغ" کے ذریعہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کی ایک نئی چال چلی جس کے متعلق سید طفیل احمد نے صحیح لکھا ہے کہ:۔

"چورا چوری کے واقعات کے بعد ۱۹۲۲ء میں وائسرائے نے ترک موالات کے ایک بڑے ہندو لیڈر سوامی شردھانند کو جو اس وقت جیل میں تھے بلاکر گفتگو کی اور اس گفتگو کے بعد جو صیغہ راز میں رہی ان کو رہا کر دیا۔ اس کے بعد ہی شردھانند نے مسلمانوں کو شدھی کرنے کا کام شروع کر دیا۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر مونجے نے سنگھٹن قائم کی جو خالص ہندوؤں کی جماعت تھی شدھی اور سنگھٹن چونکہ بعض کانگریسی لیڈروں کے ہاتھوں شروع ہوئیں اس لئے ملک میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں اور بدگمانیاں پیدا ہونے لگیں، اسی زمانہ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس علی گڑھ میں سر فضل حسین وزیر تعلیم پنجاب نے اپنے خطبۂ صدارت میں مسلمانوں کو ترغیب دی کہ وہ اچھوتوں میں اسلام کی تبلیغ کریں...... بالآخر ہندوؤں اور مسلمانوں کی طرف سے ملک میں شدھی اور تبلیغ کا دور دورہ شروع ہو گیا اور پھر جو ہندو مسلم بلوے شروع ہوئے تو انھیں کوئی قوت روکنے والی نہ تھی، شدھی اور تبلیغ ایک دوسرے کے مقابلہ میں تقریباً دو سال تک زور و شور سے چلتی رہیں اور اسی کے ساتھ بلوے ہوتے رہے"[۱]

مارچ ۱۹۲۷ء میں مسلمانوں کی طرف سے مسٹر جناح کے چودہ[۱۴] امور کے محضر کے پیش کئے جانے اور اسے کانگریس کے اکثر اکابرین کے تسلیم کر لینے پر کانگریس اور مسلم لیگ کے قریب آنے کی امید ہو چلی تھی لیکن بعض کانگریسیوں ہی کی وجہ سے جنھوں نے اس محضر کو تسلیم نہیں کیا مسلم لیگ اور کانگریس الگ الگ ہی دو سیاسی جماعتیں باقی رہ گئیں۔

۱۹۲۸ء میں مزدوروں، کاشتکاروں، اوسط طبقے کے نوجوانوں اور بہت سے تعلیم یافتہ لوگوں میں نئی امنگ اور جوش پیدا ہو چکا تھا۔ اس لئے ۳ فروری ۱۹۲۸ء کو جب "سائمن کمیشن" (جس کے کل ممبر انگریز تھے) بمبئی پہونچا۔ اور اس کے بعد ملک میں جہاں کہیں بھی گیا "سائمن کمیشن گو بیک" کے نعروں سے اس کا خیر مقدم کیا گیا اس میں ہندوستانیوں کو حیرت انگیز کامیابی ہوئی۔

۱۲ فروری ۱۹۲۸ء کو آل پارٹیز کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی لیکن اس منزل پر پہونچکر مسلمان فرقہ پرستوں نے اپنے مطالبات میں اضافہ کرنا شروع کیا اور ہندو مہا سبھا نے اس کی مخالفت کی۔ اسی سال

---

[۱] "مسلمانوں کا روشن مستقبل" مطبوعہ ۱۹۴۳ء صفحہ ۳۷۹

آخر دسمبر ۲۸ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوئے اس وقت مسٹر جناح نے پنجاب و بنگال کی اسمبلیوں اور کونسلوں میں مسلم اکثریت ہونے کی مخالفت کی اور انھیں پاکستان بنائے جانے سے روکا لیکن کانگریس والوں نے مسلمانوں کے چھ مطالبات میں سے چار خارج کر دیئے اور مسٹر جناح اور مولانا محمد علی کے ساتھ بے رخی برتی جس کی وجہ سے مسلم لیگ و خلافت کمیٹی اور کانگریس کے درمیان کشیدگی بڑھ گئی۔

۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو تمام ہندوستان میں یوم آزادی منایا گیا۔ اور بدیسی مال، کپڑا اور شراب وغیرہ کے خلاف مظاہرے شروع ہوئے۔

۳۰ء کے بعد کانگریس میں قدامت پسند اور ترقی پسند دو جماعتیں قائم ہو گئیں۔

۱۹۳۴ء میں سول نافرمانی ختم ہوئی تو ۱۹۳۵ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے "گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ" پاس کر کے صوبوں کی خود اختیاری حکومت اور مرکز میں ایک وفاق قائم کیا لیکن اس قانون نے گورنر اور وائسرائے کو سب سے زیادہ اختیارات دیکر سیاسی و معاشی اختیارات اب بھی برطانوی حکومت کے ہاتھ میں رکھے۔ اس لئے ہندوستان کے ہر گروہ اور ہر خیال کے لوگوں نے اس قانون کی مخالفت کی۔

۱۹۳۶ء میں ہندوستانی طلباء نے مسٹر جناح کی صدارت میں ایک انجمن "اسٹوڈینٹس فیڈریشن" قائم کی۔ جس نے سوشلزم اور اشتراکیت کا اثر قبول کیا۔

۱۹۳۷ء میں جب ہندوستان میں گیارہ صوبوں میں سے سندھ، بنگال اور پنجاب کے علاوہ آٹھ ریاستوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہوئیں تو کانگریس نے مسلم لیگ کے جداگانہ وجود ہی سے انکار کر دیا اور گاندھی جی نے بھی "ہندو جاتی" کے استحکام پر زیادہ زور دینا شروع کیا اور صوبوں کا انتظام کانگریسی وزیروں کے ہاتھوں میں آ جانے کے بعد اکثر متعصب حکام کی وجہ سے عناد و فساد کے شعلے بھڑک اٹھے تو عام مسلمانوں کو یہ احساس دلایا گیا کہ کانگریسی صوبوں میں ہندو راج ہے اور ہندو تہذیب کو فروغ دینے کی کوشش کیجا رہی ہے اس احساس نے مسلمانوں کو چونکا دیا اور دسمبر ۳۸ء کے اجلاس میں مسٹر جناح نے کانگریس کو ہندو جماعت قرار دیکر کہا کہ وہ مسلمانوں کو اپنا غلام بنانا چاہتی ہے۔ ۱۹۴۰ء میں مسٹر جناح نے ہندو مسلم دو جداگانہ قومیں تسلیم کرتے ہوئے ملک کو دو جداگانہ حصوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی اور ہندوستان میں وفاقی اور مرکزی حکومت کی مخالفت کی۔

۱۹۳۹ء میں برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا جو عالمگیر جنگ بن گئی تمام اقوامِ عالم مثلاً جرمنی، پولینڈ، اٹلی، جاپان، برطانیہ، فرانس اور امریکہ وغیرہ اس کی لپیٹ میں آگئے۔ رفتہ رفتہ ہندوستان بھی اس آتشیں حملوں کی زد میں آگیا۔

۱۹۴۰ء میں جمعیت العلماء، احرار جماعت، مومن (یعنی جولاہوں کی جماعت)، شیعہ جماعت وغیرہ نے ملکر مسلم لیگ کے خلاف ایک متحدہ اور متفقہ آزاد مسلم کانفرنس کی بنیاد ڈالی "ہندو مہاسبھا" بھی مسلم لیگ

کی مخالفت بلکہ اس کے جواب میں قائم ہو چکی تھی جو آئے دن مسلم لیگ کی مخالفت کرتی رہتی تھی۔

۱۹۴۲ء میں ہندوستان میں سیاسی کشمکش بہت بڑھ گئی تھی کیونکہ عالمگیر جنگ کے حالات نازک ہو گئے تھے اور اس کی وجہ سے ہندوستان کے سماجی نظام کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا اس عالمگیر جنگ کے اثر سے حکومت کا رویہ بدلا اس نے اسی سال "کرپس مشن" کے ذریعہ ہندوستان کی آزادی کے لئے کچھ تجویزیں پیش کیں لیکن اسے کانگریس والوں نے قبول نہیں کیا بلکہ گاندھی جی نے انگریزی حکومت سے کہا کہ ان کی بہتری اور ہندوستان کی نجات اسی میں ہے کہ وہ ہندوستان سے نکل جائیں چاہے ہندوستان میں نراج ہی کیوں نہ قائم ہو جائے اس اعلان سے "ہندوستان چھوڑو" کی تحریک حرکت میں آگئی۔ اس تحریک کو دبانے کے لئے حکومت نے اکابر کانگریسی لیڈروں کو گرفتار کر کے کانگریس کی مرکزی و صوبائی انجمنوں کو ممنوع قرار دیدیا اور اس کے جائداد پر پولیس کا قبضہ ہو گیا۔ حکومت کی اس بہیمانہ ظلم و تعدی کے خلاف پورا ملک اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزی حکومت کے خلاف غیظ و غضب کی لہریں دوڑنے لگیں اور یہاں کے لوگ "انقلاب زندہ باد" اور "ہندوستان چھوڑ دو" کے نعرے بے خوف اور بے تحاشا لگانے لگے۔

۱۹۴۵ء میں حکومت نے ہندوستان کے سیاسی مسائل حل کرنے کے لئے شملہ میں ایک کانفرنس بلائی جس میں کانگریس و مسلم لیگ کے صدر اور شیڈول کاسٹ (نیچی ذات) اور سکھوں کے نمائندے شریک ہوئے اور مولانا آزاد نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کو آمادہ کر لیا کہ وہ لارڈ ویول کا پیش کش کو منظور کرے لیکن ایگزیکیٹو کونسل میں فرقہ واری نمائندگی کے مسئلے کی وجہ سے کانفرنس ناکام ہو گئی کیونکہ قائد اعظم محمد علی جناح انگریز اور ہندو دونوں کو اپنا دوست نہیں سمجھتے تھے اور ان دونوں سے وہ براہ راست ٹکر لینے پر آمادہ تھے اپریل ۱۹۴۶ء میں انھوں نے طے کیا کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی علاحدہ مملکت (پاکستان) قبول کرائے بغیر کسی آئینی فیصلے کو قبول نہیں کریں گے۔ لیکن اسی مہینے کے آخر میں انھوں نے اور کانگریس نے کیبنٹ مشن پلان (جس کا مقصد ملک کی تمام بڑی پارٹیوں کے درمیان باہمی رضامندی سے معاہدہ کرنے کے لئے گفتگو کرنا تھا) کو منظور کر لیا۔ لیکن وہ اس مصالحت سے مطمئن نہیں ہوئے۔

کرپس مشن کی ناکامی کے بعد شری راجگوپال اچاری نے کانگریس سے مسلم لیگ کے مطالبات منوانے کی کوشش کی، وہ ملک کی تقسیم کو بھی اصولی طور پر مانتے تھے۔ اسی لئے ان کو کانگریس ورکنگ کمیٹی سے علاحدہ ہونا پڑا۔

مسٹر جناح کے اس خیال کو کہ ہندو ان کے دوست نہیں ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے ایک بیان سے اور زیادہ تقویت پہونچی جس میں پنڈت نہرو نے کہا تھا کہ کانگریس دستور ساز اسمبلی میں اپنی اکثریت کے بل پر اسکیم میں تبدیلی کر سکے گی جس سے جناح صاحب نے سمجھا کہ اقلیتیں اکثریت کے رحم و کرم پر ہوں گی۔ اس دلیل کے پیش نظر انھوں نے وائسرائے کو مشورہ دیا کہ چونکہ کانگریس نے مشن پلان کو مسترد کر دیا ہے

اس لئے اب وہ مسلم لیگ کو جس نے مشن پلان کو قبول کر لیا ہے وزارت بنانے کی دعوت دیں انھوں نے کہا کہ جواہر لال کا بیان ہی کانگریس کی صحیح ترجمانی کرتا ہے ان کا خیال تھا کہ جب ابھی انگریز ہندوستان میں موجود ہیں اور کانگریسیوں کے ہاتھوں میں مکمل اختیار نہیں آیا ہے اور ابھی سے ان کے ایسے خیالات ہیں تو اقلیتیں کیسے یقین کر لیں کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد کانگریس پھر بدل نہیں جائے گی۔

۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو حالات نے شدید طور پر پلٹا کھایا اور کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان مسائل کے پُر امن طریقے پر حل ہونے کی اُمید جاتی رہی کلکتہ میں فسادات شروع ہو گئے اس کے بعد نواکھالی، بہار اور بمبئی میں فسادات کے بازار گرم ہوئے۔ جگرؔ نے ان تمام واقعات کو اپنے کلام میں نظم کیا ہے۔

ادھر مسلم لیگ کی عدم مفاہمت کی وجہ سے ایگزیکیوٹیو کونسل سے سردار پٹیل تنگ آکر ہندوستان کی تقسیم کے حامی ہو گئے تھے اور رفتہ رفتہ انھوں نے جواہر لال اور گاندھی کو بھی اپنی رائے سے متفق کر لیا اس طرح لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ملک کی تقسیم کے لئے یہ ایک سُنہرا موقع مل گیا۔

تقسیم کے وقت مولانا آزاد کے الفاظ میں :۔

"مختلف حصوں میں خون کی ندیاں بہیں، بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچّوں کا قتل عام ہوا، ہندوستانی فوج تقسیم کر دی گئی تھی اور بے گناہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے قتل کو روکنے کی کوئی کارآمد تدبیر نہیں کی جا سکی۔"[۱]

اس قتل و غارت میں اعلیٰ حکام اور بعض متعصب رہنماؤں تک نے اپنے فرائض منصبی سے چشم پوشی کی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان دونوں بظاہر آزاد لیکن درحقیقت دونوں برباد ہوئے دونوں جگہ کی اقلیتوں پر جو مظالم ہوئے دُنیا کی تاریخ میں ایسی مثال نہیں ملتی۔

ملک کے ان حالات و واقعات سے جگرؔ صاحب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان حالات و واقعات کو انھوں نے اپنے اشعار میں بھی نظم کیا ہے۔

ہندوستان کی قومی تحریک سے متاثر ہو کر انھوں نے "سوراج" گاندھی جی، "تلک" اور مولانا محمد علی مرحوم وغیرہ پر نظمیں کہی تھیں لیکن اس دور مستی کی زیادہ تر نظمیں ضائع ہو گئیں، ان کے علاوہ انھوں نے ۱۹۴۳ء میں بنگال کے قحط سے متاثر ہو کر "قحطِ بنگال" والی نظم کہی۔ ۱۹۴۵ء میں بمبئی کے جہازیوں کی بغاوت کو کچلنے کے لئے برٹش سامراج نے جو ظلم کیا اس کو جگرؔ صاحب نے یوں بیان کیا ہے

---

[۱] "ہماری آزادی" ص ۳۸۳

حکومت کے مظالم جب سے ان آنکھوں نے دیکھے ہیں
جگرؔ ہم ممبئی کو کوچۂ قاتل سمجھتے ہیں!

اور آزادی کے بعد انھوں نے "آج کل"، "گاندھی جی کی یاد میں"، "آوازیں"، "گنڈہ رجا"، "نوائے وقت" "زمانے کا آقا، غلام زمانہ"، "دل حسیں ہے تو محبت بھی حسیں پیدا کر"، "اعلانِ جمہوریت" ۲۶ جنوری سنہ ۱۹۵۰ء کے یوم جمہوریت کے موقع پر، "ساقی سے خطاب" اور گیت "بھاگ مسافر بھاگ" جیسی نظمیں کہیں اور اپنے تاثرات کا اظہار اشعار میں کیا (ان سب کی تفصیل آگے چل کر جگرؔ کی سیاسی شاعری میں آئے گی)۔

جگرؔ صاحب نے بھی تقسیم کے بعد کے ہندو مسلم فسادات (خصوصاً گونڈہ، یو۔پی کے حالات) کا تذکرہ اپنے احباب مثلاً تسکین قریشی، حبیب احمد صدیقی، حمید صدیقی، مکیش اکبرآبادی اور ایک خط[1] وزیر اعلیٰ (یو۔پی) کے نام لکھا ہے جن میں انھوں نے زیادہ تر گونڈہ کے حاکم اعلیٰ اور مسلمانوں کے درد و الم کا تذکرہ کیا ہے ایک شعر ان کے ان تاثرات کا ترجمان ہے ملاحظہ فرمایئے ؎

بھری بہار میں تاراجیٔ چمن مت پوچھ!
خدا کرے! نہ پھر آنکھوں سے وہ سماں گزرے

غرضیکہ جگرؔ جیسا خالص غزل گو شاعر جو غزل کے دائرے سے باہر قدم نکالنا کفر سمجھتا تھا۔ ایک وقت ایسا آگیا جب کہ وہ خود پکار اٹھا ؎

فکرِ جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

اور غزل سرائی چھوڑ کر ملک کے سیاسی حالات سے متاثر ہو کر نظم یا نظم نما غزلیں کہنے لگا اور اس طرح کے اشعار کہے ؎

ان کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہونچے

بہر حال جگرؔ صاحب سیاست سے متنفر ہونے کے باوجود اور اس کو مکر و فریب مانتے ہوئے بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور کچھ نہ کچھ سیاست کے متعلق بھی کہہ دیا۔ اس طرح انھوں نے اپنے کلام میں اپنے دور کے سیاسی حالات کی بھی عکاسی کی۔

---

[1] یہ سارے خطوط راقم نے "جگرؔ کے خطوط" میں یکجا کر دیے ہیں۔ طوالت سے بچنے کے خیال سے یہاں ان خطوط کے اقتباسات قصداً پیش نہیں کیے گئے ہیں۔ م ا

ڈاکٹر جعفر حسن نے سماج کو تمدن کی شاخ بتلاتے ہوئے یہ صحیح لکھا ہے :۔

> تمدنی علوم کی ایک شاخ عمرانیات یا سماجیات ہے جس کی عام قسمیں، بیانی، نظری، اطلاقی دیہی، شہری، تعلیمی، مذہبی ہیں[۱]۔

ہندوستان میں سماجی زندگی کی سب سے نمایاں خصوصیت مشترکہ خاندانی زندگی اور ذات پات کا طریقہ ہے۔

یہاں کے خاندان سے مراد میاں، بیوی اور بچوں کی چھوٹی سی اکائی نہیں ہے جیسا کہ یورپ میں ہے بلکہ کنبہ کے وہ تمام افراد ہیں جو کسی نہ کسی بزرگ کی وجہ سے یا محض عادت یا کسی مجبوری کے تحت مل جل کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہاں کے بعض خاندانوں میں تو تین تین چار چار پیڑھیاں، بہویں، پوتے، پوتیاں، پرپوتیاں، نواسے، نواسیاں اور ان کے بچے وغیرہ سب ایک ساتھ رہتے ہیں۔

یہاں کے رہنے والوں میں دو بڑی قومیں ہیں۔ جن میں ایک ہندو اور دوسری مسلمان ہے۔ مسلمان کسی درجے یا طبقے کے ہوں ایک ساتھ کھانے پینے میں پرہیز نہیں کرتے لیکن ہندو کھانے پینے کے معاملہ میں اس کے بالکل برعکس ہیں۔ ان میں کوئی بھی فرد ایک دوسرے کے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتا لیکن شادی بیاہ کے معاملے میں دونوں قوموں کے طور طریقے ایک سے ہیں۔ روشن خیال مسلمانوں کے اوپری طبقہ کو چھوڑ کر دونوں قوموں میں ذات برادری کی عصبیت ایک سی پائی جاتی ہے۔ عورتوں کو خاندانی املاک میں ان کا حق نہیں دیا جاتا ہے حالانکہ دونوں مذہبوں میں خاندانی املاک میں عورت کو اس کا مناسب حق دیا گیا ہے۔ ان کو ان کا حق دینے کے بجائے شوہر کی تابعداری اور خدمت گذاری کا سبق سکھایا جاتا ہے۔ مسلمان عورتیں تعلیم یافتہ کم اور پردے کی سخت پابند ہیں۔ وہ اپنے مذہب کے دیئے ہوئے حقوق سے بہت کم فائدہ اٹھا پاتی ہیں۔ دونوں قوموں میں عورتیں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کو چھوڑ کر، اپنی مستقل شخصیت کی مالک ہونے کے بجائے مرد کا ضمیمہ بن کر رہ جاتی ہیں اور ہر حال میں وہ مرد کے تابع ہوتی ہیں۔ دونوں قوموں کے خاندانوں کی آمدنی اور خرچ کا بجٹ عام طور پر مجموعی ہوتا ہے خاندان کے لوگ ایک دوسرے کے رنج و راحت اور خانگی اور عمومی زندگی میں دخل دینے کا حق رکھتے ہیں۔ بزرگوں خصوصاً ماں، باپ، کی عزت اور اطاعت کرنا ہر شخص کے فرائض میں شمار ہوتا ہے۔ ہر شخص خاندان کے دوسرے افراد کی عزت و آبرو کو اپنی عزت و آبرو سمجھتا ہے اور جب بھی خاندان کے مفاد یا آبرو کا معاملہ آجاتا ہے تو عام طور پر سب ایک ہو جاتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ ہندوستان دنیا کی مرکزی عبادت گاہ ہے کیونکہ یہاں تقریباً ہر مذہب کے ماننے والے پائے جاتے ہیں۔ اور مذہبی، نیم مذہبی، ظاہراً مذہبی اور نام نہاد مذہبی رسوم و طریقے یکساں قدر و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

---

[۱] ہندوستانی سماجیات ص ۱۳

یہاں کی سماجی زندگی کے تمام شعبوں میں قدامت کا رنگ اور پرانے پن کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ پرکھا پوجا، رجعت زدگی، اور دقیانوسیت یہاں کی زندگی کی نمایاں اور ناقابلِ انکار حقیقتیں ہیں۔

اسی قدامت پسندی، رجعت زدگی اور دقیانوسیت کو دور کرنے کے لئے سرسید نے ۱۸۶۶ء میں مسلمانوں میں سماجی اصلاح کے لئے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق جس میں مسلمانوں کو انگریزوں سے سماجی تعصب کے بجائے انگریزی تعلیم کی طرف رجوع کرنے کی کوشش کی گئی تھی، جاری کیا اور گوکھلے نے ۱۸۹۲ء میں انجمن خادمانِ ہند کے ذریعہ تمام فرقوں میں باہمی خوش دلی، باہمی امداد، تمام تعلیمی اداروں یا تحریکوں کی امداد اور نیچ ذات لوگوں کی اصلاح کی کوشش کی۔ ۱۹۱۴ء میں کنزرو نے الٰہ آباد میں سیوا سمتی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کا مقصد اتفاقی حادثوں، قدرتی آفتوں اور بڑے بڑے اجتماعوں خاص طور پر میلوں میں عوام کی سماج سیوا کرنا تھا۔

۱۹۰۷ء میں سودیشی تحریک کی وجہ سے ملک میں ہندوستانیت کی فضا پھیلی، صنعت و حرفت کے علاوہ دیسی لباس، سماجی میل ملاپ، بات چیت کی دیسی زبان وغیرہ کا رواج بڑھنے اور مقبول ہونے لگا۔ سماجی اصلاح کی کوششیں اور ذات پات کی بندشیں ڈھیلی ہونے لگیں اور پرانی رسمیں جو ترقی کی راہ میں حائل تھیں موقوف ہونے لگیں۔

۱۹۱۱ء میں سوشل سروس لیگ نے عوام خاص کر مزدوروں کے لئے کام کاج کا معقول انتظام کیا اور ان کو بہتر حقوق دلوائے۔

۱۹۱۶ء میں "ہوم رول" کی وجہ سے زبان، کتاب، علم اور فن کی عام قدر بڑھی

۱۹۲۰ء میں کانگریس نے ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے، ہندو سماج سے چھوت چھات کو دور کرنے چرخا کاتنے، کھدر پہننے اور پنچایتیں قائم کرنے کی کوشش کی۔

۱۹۳۲ء میں "ہریجن سیوک سنگھ" نے ہزاروں گاؤں، کھیڑوں میں اچھوتوں کی بھلائی، ان کے حقوق کی حفاظت اور ان کی تہذیبی، تعلیمی، سماجی اور معاشرتی ترقی کی راہ میں جو رکاوٹیں تھیں ان کو دور کرنے کی کوشش کی۔

گاندھی جی نے ستیہ گرہی تحریک میں ہر طبقے، ہر حصے، ہر علاقے اور ہر عمر کے مرد اور عورتوں کو شریک کیا اور اس کو عوامی تحریک بنایا اسی تحریک سے ذات پات کے بندھن ٹوٹے، پردے کا رواج کم ہوا، عورتوں میں خودداری پیدا ہوئی، نچلے طبقوں اور نیچ ذات کے لوگوں میں مساوات کی لہر دوڑی، حریت کے جذبے مشتعل ہوئے اور لوگ آزادی کے طلبگار ہوئے۔

ہندوستان کی نوے فیصدی آبادی دیہات میں رہتی ہے اور یہ دیہات یعنی گاؤں کھیڑوں کا ملک ہے اس لئے گاندھی جی اصل سدھار گاؤں اور کھیڑوں کا سدھار سمجھتے تھے اور اسی میں جنتا کی

بھلائی جانتے تھے، انھوں نے ۱۹۳۶ء میں "ہندستانی تعلیمی سنگھ" کے ذریعہ تعلیم کو مفید بنانے اس کو عام کرنے کاروباری نقطۂ نظر سے خود مکتفی بنانے اور سستا کرنے کی کوشش کی اور ۳۷ء سے ۴۰ء تک جن صوبوں میں کانگریسی راج رہا ان صوبوں میں اس سنگھ کی تجویز کردہ اصولوں پر عملی تجربہ بھی ہوا۔

گاندھی جی کچھ دنوں ساہتیہ سمیلن سے بھی وابستہ رہے لیکن اس کی رجعت پسندی، وعدہ فراموشی اور اصول شکنی سے بیزار ہو کر ۱۹۴۲ء میں انھوں نے "ہندستانی پرچار سبھا" قائم کی تاکہ اس کے صحیح اصولوں پر ایک قومی زبان بنے اور وہ ترقی کرے وہ ایک مشترکہ زبان بنانا چاہتے تھے جس میں ہر زبان کے الفاظ رائج رہیں اور اس کے لکھنے کا طریقہ ناگری اور اردو دونوں میں ہو لیکن دو طرح سے لکھنے کے طریقے کے علاوہ ہندستانی کے سچے، مخلص اور قابل کام کرنے والوں کی قحط نما کمی کی وجہ سے اس کی کارگزاری ہمیشہ محدود رہی اور بٹوارے کے بعد اس کی رہی سہی اہمیت بھی ختم ہو گئی

گاندھی جی کے پیش نظر تعمیری کاموں اور تخلیقی مسکلوں میں ہندو مسلم اتحاد، گھریلو صنعتوں کا فروغ، چھوت چھات کی بیخ کنی، نشہ بندی اور مرد و عورت میں مساوات قائم کرنا تھا۔

رفتہ رفتہ ہندستان میں سماج کاری کا سلسلہ شروع ہوا جس کا اصل مقصد تہذیبی ناانصافی کو دور کرنا، تضاداتی سماجی ایذاؤں کا مقابلہ کرنا، مصیبتوں کو کم کرنے میں مدد دینا اور قابل روک تھام آفتوں پر قابو پانا تھا۔

ہندستانی کانفرنس اور اس کی صوبے کی شاخوں نے جاہلوں کی تعلیم، جیل سدھار، صحت، سیوا، نشہ بندی اور دوسرے عیوب کی روک تھام، مزدوروں کا رفاہ، شادی اور خاندانی زندگی سے متعلق تعلیم و تربیت، زچگی اور بچوں کی بھلائی کے لئے تعلیم، نوجوان مجرموں کی جرم پسندی سے روک تھام، نوجوانوں کی تحریک وغیرہ کا انتظام کیا۔

موجودہ دور میں عورتوں کی آزادی کی تحریک اور مغرب زدگی نے نہ صرف ان کو بے پردہ کر دیا ہے بلکہ ان میں یورپی سماج کی سی بیباکی بھی پیدا ہو گئی ہے، وہ ٹینس، پنگ پانگ، ڈرامے، تیراکی سگریٹ نوشی، شراب نوشی، ناچ رنگ اور نامعلوم کن کن مشغلوں میں خوش وقتی اور وقت گزاری کرنے لگی ہیں لیکن اسی دور میں عورتوں کی ایک جماعت ایسی بھی ہے جو اب بھی پچھلی صدی کی طرح پردے کے رواج کو سختی کے ساتھ قائم کئے ہوئے ہے اور وہ اس زمانہ میں بھی شرم و حیا، معصومیت، پاکبازی اور شرافت کی دیوی ہے۔

جگر صاحب بھی ہندوستانی سماج کے ایک فرد تھے اس لئے ناممکن تھا کہ وہ یہاں کے سماجی حالات سے متاثر نہ ہوتے والدین کی فرمانبرداری اور عزت و احترام وغیرہ انھوں نے یہیں کے سماج سے سیکھا تھا۔ بزرگوں (مثلاً مولانا اصغر گونڈوی اور شاہ عبدالغنی منگلوری اور دوسرے علمائے دین وغیرہ) کی عزت کرنے میں

وہ اپنی مثال آپ تھے یہاں کے سماجی حالات ہی سے متاثر ہوکر انھوں نے شراب نوشی وغیرہ شروع کی اور وہ یہیں کے سماجی حالات کا شکار ہوکر رہ گئے۔ اس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔

تہذیب و تمدن

تہذیب کی تعریف کرتے ہوئے رالف لنٹن نے صحیح لکھا ہے کہ:۔

"تہذیب عقائد، جذبات، عادات، اداروں اور علامات کا ایک مجموعہ ہے جو ایک گروپ سے افراد کے کردار اور ان کے رد عمل کو متعین کرتا ہے اس پر جغرافیائی اور تاریخی حالات کا نیز معیارِ زندگی، تعلیم، زبان اور ادب سب کا اثر پڑتا ہے۔"[۱]

اور ڈاکٹر سید عابد حسین کا یہ بیان بھی قابل اعتنا ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ:۔

"دراصل تہذیب کی روح ہے اقدار کا شعور اور وہ ترتیب جو اُن میں اہمیت کے لحاظ سے قائم کی جائے یہ روح اپنے آپ کو تین طرح سے ظاہر کرتی ہے۔

(۱) اجتماعی ادارات مثلاً مذہب، ریاست، قانون وغیرہ کی صورت میں۔

(۲) لوگوں کے عام مزاج، طرزِ عمل، طرزِ معاشرت کی صورت میں۔

(۳) اُن مادی اشیا کی صورت میں جو کسی معاشی جمالی یا ذہنی قدر کے حاصل کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ مثلاً غذا، لباس، مکان وغیرہ"[۲]

غرضیکہ تہذیب ایک قسم کا آئینہ ہے کسی ملک، قوم، گروہ یا جماعت کو دیکھنے کا، کیونکہ ہر ملک قوم، گروہ با باعث اپنے یہاں کے داخلی و خارجی حالات و واقعات کا اثر قبول کرکے اپنا ایک مخصوص رنگ دُنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔

ہندوستان میں زمانۂ قدیم ہی سے مختلف قسم کی رنگ برنگی تہذیب پائی جاتی ہے کیونکہ یہاں اکثر مختلف زبان، رنگ و روپ، طرزِ معاشرت، اخلاق و عادات، عقائد و نظریات کے لوگ مختلف اوقات میں آتے رہے ہیں جو اپنے ساتھ اپنے ملک و قوم کی تہذیب بھی لائے ہیں اور یہاں کے تہذیبی ذخیرے میں اپنے باہر سے لائے ہوئے تہذیبی سرمائے کو خلط ملط کرکے ایک مخلوط قسم کی رنگ برنگی تہذیب بنایا ہے۔

اگرچہ ہم کو صرف جگر کے عہد (۱۸۹۰ - ۱۹۶۰) کے تہذیبی حالات کا جائزہ لینا ہے۔ لیکن ہمیں ان کے عہد کے تہذیبی حالات معلوم کرنے کے لئے ان کے ماضی کے تہذیبی حالات کا بھی جائزہ لینا ہوگا، کیونکہ تہذیب ماضی ہی کے تجربات و روایات اور حال کے انقلابات و تغیرات سے ہم آہنگ ہوکر

---

[۱] "ہندوستانی تہذیب اور اردو" ص ۱۱

[۲] "ہندوستانی قومیت اور قومی تہذیب" (حصہ سوم) ص ۸۲۵ و ۸۲۶

پروان چڑھتی ہے اور اُن کے ماضی کے تہذیبی حالات معلوم کرنے کے لئے سرسیّد تحریک کا جائزہ لینا کافی ہوگا۔

سرسیّد کے عہد کے تہذیبی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے چودھری عبدالغفور نے اپنی انتہائی معقول اور گرانقدر رائے دی ہے اور لکھا ہے کہ:-

"ہماری ملکی زندگی کی حقیقت سرسیّد کے زمانے میں کانگریس نہیں تھی اس کی تلخ حقیقتیں اردو اور ہندی کا مسئلہ تھا، گئو کشی کے انسداد کی جدوجہد تھی، آبادی کے ایک حصہ کے سیاسی، اقتصادی انحطاط اور دوسروں کا انگریز منفعت اندوزی کا ذریعہ بنانے کی حقیقت تھی۔ سیاسی انتخاب کے میدان میں، ملازمتوں کے مقابلے کے امتحان میں باہمی کش مکش کی حقیقت تھی، ان کے علاوہ خالص مذہبی حیثیت سے آریہ سماج، دھارم منڈل اور پرچارنی سبھاؤں کی حقیقت تھی.....

مذہبیت اور مذہبی قومیت کے دھارے، سماج اور زبان کے گرداب، کانگریس کی تحریک اوپر کے طبقے کے چند پڑھے لکھے لوگوں کی تحریک تھی دوسری تحریکیں پورے عوام کے دلوں کی ایک آہنی گرفت ایک گلو فشار پکڑے رہی تھیں، سرسیّد کا احتجاج کانگریس کے خلاف نہیں، اس بڑھتی ہوئی ذہنیت کے خلاف تھا۔ یہ ذہنیت سیاسی ہم آہنگی کے خلاف ہی نہیں، کلچرل اور معاشی تعاون کے خلاف بھی کام کر رہی تھی اس کی جڑیں بہت گہری، بہت پائیدار اور پھیلی ہوئی تھیں، اس رجحان کے تلخ نتائج ہم آج بھی دیکھ رہے ہیں"[1]۔

سرسیّد کی حیات ہی میں کانگریس کے رہنما مسٹر تلک نے پونا میں گنپتی کے جلوس میں انگریزوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے خلاف بھی نعرے لگانا شروع کر دیے تھے، صوبہ بہار میں ہندی زبان کو عدالتی زبان کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ ۱۸۸۳ء میں سرسیّد نے پنجاب جیسے علاقہ میں (جو خالص اردو کا علاقہ تھا) ہندی کے لئے میموریل اور معروضات پیش ہوتے دیکھا، اسی زمانہ میں گئوکشی کے انسداد کی تحریک بھی سارے ملک میں چل رہی تھی یہ سب حالات دیکھکر انھیں ہندوستانی قومیت پر شبہ ہونے لگا تھا اسی لئے انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم و تہذیب کی حفاظت کے لئے اپنی تحریک چلائی جس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔

لارڈ رپن کے زمانے میں ہندوستانیوں کو مغربی جمہوری حکومت سیکھنے کا موقع ملا۔ لیکن انگریزی حکومت نے نسلی غرور اور معاشی خود غرضی کی وجہ سے اسے ۱۹۰۵ء میں ختم کر دیا۔

اس وقت تک ہندوستانی، انگریزی تہذیب کے ذریعہ جدید سیاسی و معاشی رجحانات سے آشنا ہو چکے تھے اور انھوں نے انگریزوں کی تقلید کرنا شروع کر دیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے قدیم مذہب

---

[1] علی گڑھ تحریک (مطبوعہ ۱۹۶۰ء) ص ۲۱۸ و ۲۱۹

اخلاق آرٹ و ادب اور قومی و ملکی احساس سے بیگانہ ہو گئے۔ انھوں نے انگریزی وضع کا لباس پہننا، انگریزی میں بات چیت کرنا، بنگلوں میں رہنا، چھری کانٹے سے انگریزی کھانا کھانا، بلیرڈ، ٹینس، تاش کھیلنا، یورپی شراب پینا، اور یورپی رقص کرنا، انگلش ایٹیکٹ کی پیروی کرنا تو سیکھ لیا اور آداب معاشرت لیتے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، ملنے جلنے میں بھی انگریزوں کی حرکات و سکنات کی ہو بہو نقل کرنے کی کوشش کی لیکن انھوں نے انگریزوں کی سی طبیعت اور مزاج نہ پانے کی وجہ سے ان کی تقلید میں اپنا اخلاق اور سیرت بگاڑ لی اور ان میں انگریزوں کے سے احساس تناسب نہ ہونے کی وجہ سے ان کی اس تقلید نے تحکم اور خود نمائی کا رنگ پیدا کر دیا۔

انھیں ہندوستانیوں میں مسلمانوں کی ایک مخصوص جماعت نے (جس نے قدیم طرز کی مذہبی تعلیم پائی تھی) مغربی تہذیب و معاشرت کو اپنے مذہب کے لیے ایک خطرہ سمجھ کر اس کی شدید مخالفت کی لیکن کچھ عرصہ کے بعد اس نے انگریزی تعلیم کو جائز قرار دے دیا۔

اردو زبان نے ملک کو انگریزی تہذیب کی کورانہ تقلید سے بچانے کی کوشش کی اور اس نے انگریزی تہذیب سے اپنی طبیعت اور مذاق کے ساتھ کھپ جانے والی چیزوں کو قبول کیا، جدید اردو ادب نے قوم کو بے راہ روی سے روکنے کی کوشش کی، کبھی نصیحت کر کے، کبھی پست ذہنیت و خود فریبی کا مضحکہ اڑا کر۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ انیسویں صدی کے آخر میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ نے انگریزی تہذیب سے صرف ٹکسالی تہذیب کے بہترین عناصر کو اپنے اندر جذب کیا اور مغرب کے طرز خیال، آزادانہ نقطۂ نظر اور معاشی اور حیاتی قدروں کو اپنی ذہنی زندگی کا ایک اہم جز بنا لیا۔ اسی وقت سے ہندوستانی تہذیب میں مناسب و کارآمد تبدیلی پیدا ہوئی۔

بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں نئی اور پرانی تہذیبوں میں تصادم شروع ہوا، بعض لوگوں نے نئے رجحانات کی پیروی شروع کی تو بعض نے اسے حد درجہ خطرناک سمجھا اور بعضوں نے درمیانی راستہ اختیار کیا یعنی انھوں نے بقدر ضرورت انگریزی تہذیب کو اپنا لیا۔

آزادی کے بعد ہندی کو دیوناگری رسم الخط میں قومی زبان مان لیا گیا جس کی وجہ سے اردو اور دوسری علاقائی زبانوں میں سخت بےچینی پھیل گئی اس کی وجہ سے ہندوستان کی تہذیبی وحدت میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔

یہاں کی تہذیبی وحدت میں رکاوٹ کی وجہ سے زبانوں کے اختلافات، اقلیت کی زبان اور تہذیب کی تحفظ و ترقی کے لئے کما حقہ سہولتیں بہم نہ پہنچانا اور سرکاری ملازمتوں وغیرہ کے معاملہ میں اکثریت اور اقلیت کے لوگوں میں تفریق برتنا، حکومت کا ایک آزاد جمہوریت پسند قوم کی طرح جس کو انگریزوں سے جدید جمہوریت کی نظری تعلیم اور عملی تربیت ملی تھی اس پر عامل نہ ہونا ہے حالانکہ ہندوستانی

تہذیبی وحدت کا قائم ہونا کوئی مشکل بات نہیں ہے کیونکہ یہاں کی سب سے بڑی دو قومیں (ہندو اور مسلمان ہیں)، جن میں مذہبی نقطۂ نظر سے وحدت وجود اور الوہیت کے تصور مساوی حیثیت سے قابلِ قدر سمجھے جاتے ہیں دونوں قوموں کے نزدیک اصل مذہب، وحدت وجود اور الوہیت کے تصورات سے جذبۂ عقیدت و محبت کو ابھارنا ہے، دونوں کی باضابطہ عبادات اور مذہبی رسموں کا نظام ایک دوسرے سے مختلف ہے لیکن نغمۂ وحدت کی ایک ہی لے پر دونوں وجد کرتے ہیں اسی وجہ سے ہندو مسلمان ایک دوسرے کے عوامی مذہبی محفلوں، قوالی اور بھجن منڈلیوں میں بے تکلف شریک رہتے ہیں۔ دونوں قومیں خدا کی عبادت اور محبت کے بعد سب سے بڑی قدر خلقِ خدا کی محبت میں ایثار، خیرات، صلہ رحم، مہمان نوازی اور خدمت وغیرہ کو سمجھتی ہیں۔

تہذیب و تمدن کو بعض اوقات ہم معنی سمجھا جاتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ تمدن تہذیب کے ارتقاء کی ایک خاص منزل ہے اور انسان اپنے احتیاجات عزائم اور مقاصد کی تکمیل کے لئے زندگی کے گوناگوں تقاضوں کے پیشِ نظر شعوری اور ارادی جدوجہد کرتا ہے

تمدنی نقطۂ نظر سے ہندوستان میں صورت، شکل، وضع قطع، ذہنی عادتوں اور خصلتوں اور زبان میں بہت زیادہ اختلافات پائے جاتے ہیں۔ شمال مغرب کے پٹھان اور جنوب کے تامل میں کوئی بھی چیز صورت شکل، قد و قامت، غذا، لباس اور زبان مشترک نہیں ہے لیکن دوسری جگہوں کے لوگ اپنی امتیازی خصوصیات رکھنے کے باوجود ان دو فریقوں کے بین بین ہیں پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ میں:

"بنگالی، مرہٹے، گجراتی، تامل، اندھرے، اڑیا، آسامی، کنٹری، ملیالی، سندھی، پنجابی پٹھان، کشمیری اور وسیع مرکزی علاقے کے لوگ جہاں ہندوستانی بولی جاتی ہے سیکڑوں ہزاروں سال سے اپنی جداگانہ خصوصیات رکھتے ہیں۔ اور ان میں کم و بیش وہی خوبیاں موجود ہیں جو روایات اور تاریخ کے مطابق ان کے بزرگوں میں تھیں مگر اسی کے ساتھ ساتھ ان سب نے اس سلسلے عرصہ میں ہندوستانیت کی امتیازی شان کو قائم رکھا ہے اور ان سب میں ہندوستان کی قومی میراث اور اس کی اخلاقی اور ذہنی صفات مشترک ہیں[۱]"

رفتہ رفتہ انگریزی تمدن نے ہندوستانیوں کے سماجی، مذہبی، اخلاقی اور روحانی زندگی کو متاثر کیا اور غلامانہ ذہنیت نے ان کو بہت پست کر دیا وہ دنیا کی ہر ترقی کو انگریزی حکومت کی برکت سمجھنے لگے، ہندوستانیوں کی یہ ذہنیت دیکھکر اکبر نے کہا ہے

مُرید دیر ہوئے وضع مغربی کر لی — نئے جنم کی تمنا میں خودکشی کر لی

---

[۱] "تلاشِ ہند" (حصہ اول) ص ۱۰۸

ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں میں تمدنی اعتبار پر بنیادی مذہبی، اخلاقی اور اجمالی شعور، خاندانی زندگی، عام رہن سہن اور سماجی تنظیم میں بہت کچھ مشابہت پائی جاتی ہے ان دونوں قوموں کا پہناوا، طریقہ رہن سہن اور کھانا پینا تقریباً یکساں ہے، ان کے یہاں کے شادی بیاہ، پیدائش اور موت، اور زندگی کے دوسرے آداب و رسوم بھی تقریباً ایک جیسے ہیں اور ایک ہی صوبے کے رہنے والوں کے لباس اور زبان سے ہندو مسلمان کی تفریق کرنا بہت مشکل ہے۔

اس بیسویں صدی میں بھی ایک طرف تو سیکڑوں برس کے پرانے طرز کا لباس پہن کر کام کرنے والے حکیم، وید، پانڈے اور مولوی پائے جاتے ہیں تو دوسری طرف نئے قسم کے پیشہ ورانہ لباس پہن کر کام کرنے والے بیرسٹر، ڈاکٹر، ہواباز، اور فورمین وغیرہ ملتے ہیں، شادی بیاہ کا طریقہ بھی بعض لوگوں کے یہاں تو سیکڑوں سال پرانے رسموں کے ساتھ ہوتا ہے اور بعض انگریزی طرز سے ٹی پارٹی اور ایٹ ہوم دیگر مغربی وضع کی شادی کرتے ہیں۔ خلوت میں بھی شرم و حیا اور غیرت و شرافت کا لحاظ رکھنے والے جوڑے بھی ہیں اور نفس پرست قسم کے عاشق و معشوق بھی۔

دھیرے دھیرے مغرب کے اثر سے ہندوستانیوں کے رہن سہن کے ظاہرہ طریقے، مشغلے کاروبار اور کھانے پینے کے طریقے بدل گئے، مغرب زدہ گھرانوں میں خانگی اور سماجی زندگی میں بھی انقلابی تبدیلیاں ہو چکی ہیں، شریف گھرانوں کی بہو بیٹیوں نے سینا پرونا اور بچوں کی پرورش کرنے کے بجائے جنسی آزادی میں کافی بیباکی حاصل کر لی ہے۔ نیم عریاں لباس، سگریٹ، شراب اور کلب میں ناچنا پسند کرنے لگی ہیں۔ اور اپنی سہیلیوں سے زیادہ اپنے شوہر کے رقیبوں سے بے تکلف رہتی ہیں۔

جگر صاحب مشرقی تمدن کے ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، جو آخر وقت تک مشرقی رہا جگر صاحب خود بھی مشرقی تہذیب و تمدن کا ایک اعلیٰ نمونہ تھے، اس سلسلے میں وہ کھانے پینے رہنے سہنے کے طور و طریقے، لباس، اخلاق، خلوص و محبت وغیرہ میں بھی خالص مشرقی تھے۔

لباس میں وہ کوٹ پتلون کے بجائے شیروانی پائجامہ پہنتے تھے اور کھانے میں کیک و بسکٹ کے بجائے انڈے پراٹھے اور دوسرے مشرقی کھانے پسند کرتے تھے، مغربی تہذیب کو بھی وہ زیادہ پسند نہ کرتے تھے اور یہ نہیں چاہتے تھے کہ مشرقی عورتیں مغربی عورتوں کی طرح محفل کی رونق بنیں، یہاں تک کہ ادب میں بھی وہ مغربیت کو پسند نہ کرتے تھے ان کا ایک شعر اسی خیال کی غمازی کرتا ہے ؎

صرف نقالی ہے مغرب کی جگر
شعر میں جب مشرقیت ہی نہیں

اخلاق و عادات میں بھی وہ اپنے اسلاف ہی کے پیرو تھے اور خلوص و محبت تو ان کی فطرت میں داخل ہو گیا تھا۔ شراب ترک کرنے کے بعد اپنے مذہبی عقیدے کے مطابق نماز پڑھتے اور

روزے بھی رکھتے، حالانکہ اس پر سختی سے پابندی نہ کر پاتے تھے لیکن مزاج مذہبی رکھتے تھے جو مشرقی تہذیب کی خصوصیت ہے۔

مذہبی

یہ سچ ہے کہ ہندوستان دنیا کے تمام مذاہب کی آماجگاہ ہے کیونکہ یہاں دنیا کی تقریباً ہر قوم مسلمان عیسائی، ہندو، سکھ، بدھ، جین، پارسی وغیرہ آباد ہیں۔

جگر صاحب کا تعلق انھیں قوموں میں سے ایک قوم "مسلمان" سے تھا ان کی پیدائش سے کچھ عرصہ قبل شاہ ولی اللہ تحریک شروع ہو چکی تھی۔ جس نے مسلمانوں کے جامد و محدود مذہبی تصور، مشرکانہ اوہام، پیر پرستی، قبر پرستی، عرس، محرم، نذر و نیاز وغیرہ پر تنقید شروع کر دی تھی۔

انگریزی دور حکومت میں ہندوستان کے عام لوگوں کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ اب سب لوگ عیسائی بنالئے جائیں گے اس لئے ہر مذہب کے کچھ لوگوں نے مذہب کے تحفظ کے خیال سے اپنے مذہبی عقائد کی تبلیغ شروع کی ساتھ ہی ساتھ تلقین و اشاعت کا کام بھی شروع کر دیا جو عرصہ تک قائم رہا۔

مذہب کے تحفظ ہی کے لئے مولانا محمد قاسم نے ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی جس نے مغربی علوم کو نصاب سے خارج کر کے صرف اسلامی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔

اسی زمانے میں راجہ رام موہن رائے نے ہندوؤں میں "برہمو سماج" کی اصلاح کا سلسلہ شروع کیا ان کے بعد اس کام کو بابو کیشب چندر سین نے آگے بڑھایا اور یہ سلسلہ رفتہ رفتہ بنگال سے نکلکر سارے ہندوستان میں پھیل گیا۔

۱۸۷۵ء میں دیانند سرسوتی نے آریہ سماج کی بنیاد ڈالی جس کا اصل مقصد دوراز کار روایات پیچیدہ معاشرتی ادارات اور ویدانت کے دقیق اور نازک خیالات کو خارج کرنا اور ویدک عہد کے سیدھے سادے عقائد اور رسوم کو باقی رکھنا اور اسی کی بنیاد پر ایک نئی تہذیب تعمیر کرنا تھا۔

اس تحریک نے نہ صرف ہندو تہذیب کے غیر ویدک اثرات کی مخالفت کی بلکہ اسلامی اور عیسائی اثرات کو ختم کر کے مسلمانوں اور عیسائیوں کو مذہبی تبلیغ کے ذریعہ ہندو بنانا اور ہندوؤں کو قومی تعلیم کے ذریعہ منظم کر کے انگریزوں کی سیاسی اور ذہنی حکومت سے آزاد رہنا سکھایا۔

مسز اینی بیسنٹ نے "تھیوسوفیکل" تحریک کو ہندوستان بھر میں مقبول بنانے کے لئے بنارس میں ہندوؤں کی طرف سے مذہبی نشر و اشاعت کے لئے ایک کالج قائم کیا۔

عیسائی مذہب کی تبلیغ اور نشر و اشاعت بھی ان دنوں عروج پر تھی جس سے نوجوان طبقہ متاثر ہو رہا تھا لیکن اسی نوجوان طبقہ میں کچھ نوجوان ایسے بھی تھے جو مذہبی رسوم و قیود کو آزادیٔ خیال کے لئے ایک رکاوٹ سمجھتے تھے اس لئے وہ مذہب کی جکڑبندیوں سے آزاد رہنا چاہتے تھے۔

مسلمانوں میں مذہبی تحریک تو شاہ ولی اللہ اور دارالعلوم دیوبند کے ذریعہ شروع ہو چکی تھی اور

ہر طرف سے مولوی اور مجتہد مذہب کی حفاظت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے ایک طرف پرانے مسلمان مذہبیوں کا گروہ تھا تو دوسری طرف سرسیّد اپنے رفیقوں کے ساتھ مذہب اسلام کو انسانی فطرت کے مطابق ثابت کرنے، جذباتی عنصر اور کورانہ تقلید کو مذہب سے کم کرنے اور مذہبی مسائل کو زیادہ تر عقل و منطق سے حل کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور جب انھوں نے مغربی سائنس کی سند اور خالص عقلیت کی روشنی میں ملائکہ، اجنّہ، شیاطین، جنت، دوزخ، معجزات، دعا، اور عیسائیوں کے ساتھ کھانا پینا، گمردن مروڑی مرغی کا کھانا، نیچتا پہن کر نماز پڑھنا، کھڑے ہوکر پیشاب کرنا اور داڑھی منڈانے کو آیات و احادیث سے جائز ثابت کرنے کی کوشش کی تو سنّی، شیعہ، وہابی، بدعتی سبھی فرقوں نے مخالفت کا ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا اور سرسیّد کو کفر کا فتویٰ تک دے دیا اس سلسلے میں مخالف جماعت اور سرسید کے درمیان خوب بحث و مباحثے اور رسالے بازی و اشتہار بازی ہوئی۔

سرسیّد نے اپنے عہد میں اسلامی مسائل کو علوم جدیدہ کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی اور بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی:۔

"بذات خود سرسیّد کا اعتقاد مذہب پر ایقانی و وجدانی تھا لیکن ان کے سامنے مذہب کا مسئلہ اپنی ذاتِ واحد کو نہیں بلکہ اپنی قوم کے ہر چھوٹے بڑے کو سمجھانے کا تھا۔"[۱]

سرسیّد کے عہد میں عیسائیوں اور بعض غیر مسلموں نے اسلام کے خلاف مستقل محاذ قائم کر لئے تھے اس محاذ کو بعض علمائے کرام اور بندگانِ عظام نے اسلام کے لئے ایک خطرہ محسوس کیا تو انھوں نے (جن میں سرسید بھی شامل تھے) اسلام کی جانب سے حفظ و دفاع کا فرض نہایت اعلیٰ پیمانے پر انجام دیا جس کی اس وقت اسلام کو ضرورت تھی۔

سرسیّد نے اسلام کے معترضین کے اعتراضات کے نہ صرف جواب دیئے بلکہ ان کی بدیہی حکمتیں اور مصلحتیں بھی بیان کیں اور ان کے مزید اطمینان کے لئے خود ان کی مذہبی کتابوں سے ویسی ہی مثالیں بھی پیش کر دیا۔

سرسیّد کے مخالفین میں علامہ شبلی اور اکبر الٰہ آبادی جیسی مقتدر ہستیاں تھیں۔ شبلی نے ندوۃ العلماء لکھنؤ، علی گڑھ کالج کے مقابلے میں قائم کیا اور اس کے ذریعہ انھوں نے مسلمانوں کو سرسیّد کے علم الکلام اور ان کی سیاست کے اثرات سے بچانے کی کوشش کی اور اکبر نے نوجوان طبقے کو انگریزی تعلیم سے متاثر ہو کر بے دین ہوتے دیکھکر کہا ؎

گر جیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں — بازو میں سکت نہیں تو عزت بھی نہیں
گر علم نہیں تو زور زر ہے بیکار — مذہب جو نہیں تو آدمیت بھی نہیں

۱؎ "علی گڑھ تحریک" مطبوعہ ۱۹۶۰ء ص۷

علامہ اقبال نے بھی مسلمانوں میں اسلام کی شرعی پابندی میں ڈھیل دیکھکر قوم کو خطاب کرتے ہوئے غیرت دلائی اور کہا ؎

واعظ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی — برق طبعی نہ رہی شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی — فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے

سنہ ۱۹۲۱ء میں تحریک خلافت سے متاثر ہو کر بہت سے مغرب زدہ مسلمانوں نے داڑھیاں رکھنا اور احکام شرعی کی پابندی کرنا شروع کر دی۔

گاندھی جی بھی ایک خاص مذہبی تصور حیات رکھتے تھے وہ مذہبی اور روحانی پہلو پر برابر زور دیتے رہتے تھے۔

سنہ ۱۹۲۳ء میں انگریزوں نے ترک موالات کے ایک بڑے ہندو لیڈر سوامی شردھانند کو جیل سے رہا کر کے ان سے مسلمانوں کی شدھی کرانے کا کام لیا، اسی زمانے میں ڈاکٹر مونجے نے ہندوؤں کی ایک سنگھٹن قائم کی اور سر فضل حسین نے مسلمانوں کو اچھوتوں میں اسلام کی تبلیغ کرنے کو کہا اس طرح شدھی اور تبلیغ کے نتیجہ میں سارے ملک میں دو سال تک مسلسل ہندو مسلم فسادات ہوتے رہے۔

رفتہ رفتہ ہندوستان میں صرف مسلمانوں کی اصلاح کے لئے اصلاحی و تبلیغی جماعتیں قائم ہوئیں جو ابھی تک اپنا کام کر رہی ہیں۔ جگر صاحب کے ایک خط سے ان اصلاحی اور تبلیغی جماعتوں کی اہمیت اور خود ان کے تاثرات کا پتا چلتا ہے جس میں انھوں نے جون یا جولائی سنہ ۱۹۲۹ء میں ابرار الرحمٰن قدوائی کو لکھا ہے کہ:۔

"میں نے اصلاحی و تبلیغی جماعت (جس کا مرکز اول دہلی اور مرکز ثانی لکھنؤ ہے) بہت قریب اور بہت غور سے دیکھا ہے (دیہ ؟) میں بہ آسانی کسی کا معترف نہیں ہوا کرتا خود اپنے ایک مطلع میں اپنی اسی افتاد طبیعت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہ نہیں دل کسی عنوان نہ جانے پائے — گر اتنا ہے کہ آسان نہ جانے پائے

بہر حال میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ مولانا" مودودی کے لٹریچر کا تفصیلاً مطالعہ کرتے رہیے وہ حقیقتاً بڑے مفکر ہیں لیکن ان کی تصانیف کا اثر صرف دماغ تک محدود رہتا ہے۔ میں اس تحریک کو غیر حکیمانہ بھی سمجھتا ہوں (اگر ؟) اگرچہ تحریک کے ایک ایک جزو سے مجھے اتفاق ہے۔ مختصراً (یہ) کہ ان کی تصانیف قلب و روح کے لئے بیکار سی ہیں تاہم ذہنی اعتبار سے بیحد مفید۔ آپ نوجوان ہیں۔ لکھنؤ قریب، کبھی کبھی جاتے بھی رہتے ہوں گے اس تحریک کا قریب سے

صرف مطالعہ دیکھیے ؟ ماہ کیجیے اگر روح دقلب خود آگے بڑھیں تو پھر رکئے نہیں" ندوۃ العلماءؒ" کی مسجد میں" جمعرات" کی شب مغرب سے صبح تک رہیں بسر کیجیے انشاءاللہ آپ فائدے میں رہیں گے۔[۱]

اگرچہ جگرؔ کا تعلق مذہب کی کسی جماعت سے نہیں رہا لیکن وہ نماز اور روزے کے چھوٹنے اور ان پر عمل نہ کرنے والوں کو گنہگار و خطاکار سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ جو لوگ مذہبی احکام سے روگردانی کرتے ہیں ان کو اس کی سزا بھگتنی پڑے گی، اس لئے جب انھوں نے متاہل زندگی شروع کی تو جہاں تک ہو سکا مذہبی احکام کی بھی پابندی کی۔ خیر و خیرات اور دوسرے کام محض مذہب میں عقیدہ رکھنے کی وجہ سے کرتے رہے، وہ مولانا مودودی کی تحریک سے بھی متاثر تھے جیسا کہ ان کے مندرجہ بالا خط سے ظاہر ہوتا ہے۔

یہ تھے جگرؔ کے عہد اور اس سے کچھ عرصے قبل کے مذہبی حالات و واقعات جن سے جگرؔ کی زندگی بالواسطہ یا بلاواسطہ رفتہ رفتہ اثر قبول کرتی رہی۔

علمی و ادبی

۱۸۳۴ء میں مکالے نے یورپ کے علوم کی اشاعت کو ہندوستان میں عام کرنا چاہا لیکن ان کو اس میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی، اس کے تین سال کے بعد ۱۸۳۷ء میں جب حکومت نے دیہاتوں میں مکتب قائم کرنے کی کوشش کی تو عام طور پر لوگ ان مکتبوں کی تعلیم سے بچوں کے عیسائی ہو جانے کے ڈر سے گریز کرتے رہے رفتہ رفتہ جب شاہ عبدالعزیز (جو تمام ہندوستان میں مشہور مولوی تھے) نے انگریزی تعلیم کو جائز قرار دے دیا تب مسلمانوں نے اپنے بچوں کو کالج بھیجنا شروع کیا۔ لیکن ذریعۂ تعلیم انگریزی زبان ہونے کی وجہ سے بچوں کے اسکولی نصاب کا معیار بہت گر گیا اور ۱۸۵۲ء تک ہندوستان میں انگریزی پڑھنے والوں کی تعداد چالیس ہزار ہی تک پہنچ سکی ۱۸۵۷ء میں کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں تین جامعات قائم ہوئیں لیکن اس سال کے سنگین ہنگامے کی وجہ سے تعلیمی ترقی میں رکاوٹ پڑ گئی، کچھ عرصے کے بعد حکومت نے سرکاری دفاتر چلانے، انگریزی زبان میں کارروائیوں کے اندراج کرنے، عدالتوں میں حکام کو معاملات سمجھانے کے لئے ایسے لوگوں کی ضرورت محسوس کی جو مندرجۂ بالا کام انجام دے سکیں اسی خیال سے اس نے اسکول اور کالج کھولنے شروع کئے ساتھ ہی ساتھ کچھ قومی درس گاہیں (عربی مدارس اور سنسکرت پاٹھ شالے) بھی قائم ہوئے اس زمانے کی تعلیم میں کوئی گہرائی، تنوع اور علمی تحقیق کی روح نہیں پائی جاتی ہے۔

۱۸۶۶ء میں مظاہر العلوم سہارنپور اور ۱۸۶۷ء میں دارالعلوم دیوبند قائم ہو چکے تھے

---

[۱] "جامعہ" اکتوبر ۱۹۶۲ء ص ۲۰۰

اور شمالی ہند میں لکھنؤ، جون پور، علی گڑھ، کانپور کے علاوہ دہلی، لاہور، بمبئی، سندھ، مدراس اور بنگال وغیرہ میں کچھ پرانے مدرسے زندہ کئے گئے اور کچھ نئے مدرسے قائم کر کے ملک میں عربی تعلیم رائج کی گئی ۱۸۷۵ء میں سر سید نے جدید تعلیم کو عام کرنے کے لئے علی گڑھ محمڈن کالج قائم کیا جس کو وہ خود مختار یونیورسٹی بنانا چاہتے تھے لیکن انگریزوں کی وجہ سے ان کو اس مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی پھر بھی انھوں نے عام مسلمانوں میں یہ جذبہ پیدا کر دیا کہ وہ اپنے اسکول اور اس کا انتظام باہمی چندے کر کے خود اپنے ہاتھ میں رکھیں تاکہ طلباء مغربی علوم و فنون اور سائنس کی تعلیم کو اپنی ضرورت کے مطابق حاصل کر سکیں اور علوم دینی و دنیوی دونوں قسم کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم کو فروغ ہو، وہ عورتوں کی تعلیم اور ان کو دستکاری سکھانے کا بھی عمدہ بندوبست کرنا چاہتے تھے وہ خود بقول ڈاکٹر سید عابد حسین اپنے مدرسے میں چار قسم کے تعلیمیافتہ پیدا کرنا چاہتے تھے:۔

"(ا) وہ جو انگریزی کے ذریعہ تعلیم حاصل کر کے سرکاری عہدے اور عزتیں پائیں۔

(ب) وہ جو انگریزی کے ذریعہ تعلیم حاصل کر کے مغربی علوم کو اردو میں منتقل کریں۔

(ج) وہ جو اردو میں تعلیم پا کر "لیاقت کامل" حاصل کریں جس کا معیار انگلستان کے کالجوں کے برابر ہو تاکہ ان کو ہر وقت اور ہر محل پر اپنے اپنے علم کی ترقی کا موقع ہو۔"

(د) وہ جو عربی فارسی میں کمال حاصل کریں تاکہ مسلمانوں کے قدیم مذہبی اور تہذیبی سرمائے کو موجودہ نسلوں تک پہونچا سکیں[۵]۔

اس کالج کے قیام سے مسلمانوں کے لئے انگریزی تعلیم کا راستہ کھل گیا اور دوسرے صوبوں مثلاً بنگال و بہار کے سرکاری کالجوں میں مسلمان طلباء کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہونے لگا اور بعض دوسرے ثانوی مدارس اور کالج خود مسلمانوں کے روپے اور انتظام سے کھلتے گئے۔ لیکن اس وقت تک انگریزوں کی تفرقہ اندازی کی چال کی وجہ سے جدید تعلیم کے حاصل کرنے میں ہندو مسلمانوں سے کافی آگے نکل چکے تھے اور ہر سرکاری محکمے میں ان کے قدم جم چکے تھے۔ مسلمانوں کا کس بل نکل چکا تھا۔ تب انگریزوں نے بھی ۱۸۷۲ء پھر ۱۸۷۳ء میں مسلمانوں کی تعلیم کی طرف خاص طور پر توجہ کی، مسلمانوں کے مدارس کو سرکاری امداد، طلباء کو وظائف اور جامعات میں عربی و فارسی کے شعبے قائم کئے اور ابتدائی تعلیم سے لیکر اعلیٰ مدارج تک خاص مراعات برتیں۔

۱۸۸۲ء میں ڈاکٹر ہنٹر کی صدارت میں ایک تعلیمی کمیشن مقرر ہوا جس کے ذریعہ صوبوں کی حکومتوں نے مرکز سے سفارش کی کہ مسلمان تعلیم میں پیچھے ہیں ان کی امداد کی جائے اس پر گورنمنٹ ہند کا ایک ریزولیوشن ۱۸۸۵ء میں جاری ہوا جس کی رو سے سرکاری ملازمتوں میں ان کے ساتھ خاص رعایت کی گئی اور مقابلہ کے امتحان

---

۵ "علی گڑھ تحریک" مطبوعہ سنہ ۱۹۶۰ء ص ۱۲

میں ان کو مستثنیٰ کر دیا گیا۔ ان کی تعلیمی حالت معلوم کرنے کے لئے سالانہ رپورٹ میں ایک جداگانہ باب قائم کیا گیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے ان کے وظائف کا انتظام کیا گیا جن مقامات پر مسلمان تعلیم میں پیچھے تھے وہاں مسلمانوں کے خاص انسپکٹر مقرر کئے گئے۔ اپریل ۱۸۹۴ء میں مولانا شاہ محمد علی کی سرپرستی میں ایک مجلس مختلف الخیال علماء کی قائم ہوئی جو ندوۃ العلماء کے نام سے مشہور ہے اس مجلس کا مقصد آپس کے نزاع کو رفع کرنا اور نصاب تعلیم میں اصلاح کرنا، ادب اور عربیت کا معیار قائم کرنا، قرآن پاک کو نصاب میں شامل کرنا اور طلباء میں تحریر و تقریر کی قابلیت پیدا کرنا تھا۔

۱۸۹۹ء میں کلکتہ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں ۱۸۷۱ء کے مسلمانوں کی تعلیم کے لئے جو مراعات دیئے گئے تھے ان ہی تجاویز کو پاس کیا گیا اور اس پر عمل درآمد شروع ہو گیا لیکن ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن نے ایک تعلیمی کمیشن کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم کے اخراجات بڑھادیے اور پرائیویٹ کالجوں کی تعداد کم کرنے کے لئے بعض بندشیں لگادیں جس کی وجہ سے ملک میں ایک شور برپا ہو گیا۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ ہر ہر صوبہ میں یونیورسٹیاں قائم ہونے لگیں اور صوبہ متحدہ میں پانچ یونیورسٹیاں قائم ہو گئیں لیکن چونکہ اس تعلیم سے طلباء عیش پرست اور ہر پیشے سے متنفر ہوتے جا رہے تھے اس لئے ملک کے سمجھدار لوگوں نے یونیورسٹی کے طریقہ تعلیم میں اصلاح کے لئے رزولیوشن منظور کئے اور اس طریقہ تعلیم کی مذمت شروع کی

۱۹۱۴ء میں صوبہ متحدہ کی حکومت نے مسٹن اسکیم کے ذریعہ ایک رزولیوشن جاری کیا جس کی رو سے گورنمنٹ نے اسلامیہ مدارس و مکاتب اور لوکل بورڈوں کو ایک خاص رقم دینا منظور کیا اسی کے اثر سے رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری نے ۱۹۱۷ء میں دیسی زبان میں علوم جدیدہ کی تعلیم دینے کی تحریک چلائی جس کی تشکیل سر سید راس مسعود کے ہاتھوں ۱۹۱۸ء میں ہوئی اور جامعہ عثمانیہ کا وجود ہوا۔ اس ادارہ میں تمام مغربی علوم دیسی زبان (اردو) میں پڑھائے جانے لگے جو انگریزی زبان کے مقابلہ میں زیادہ آسان اور زود فہم ہے، انگریزی زبان کی تعلیم بھی لازمی رہی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام درسی کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہوا جسے پڑھ کر طلباء نے یورپ کی یونیورسٹیوں میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن سے زیادہ سودمند نتائج برآمد ہوئے تو حیدرآباد کے باہر بھی دوسرے صوبوں میں تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا، صوبہ متحدہ نے مادری زبان ہی میں تعلیم دینے کا سلسلہ شروع کیا۔

۱۹۲۰ء میں دہلی میں ایک درسگاہ "جامعہ ملیہ" کے نام سے کھولی گئی جس میں تعلیم و تربیت کے متعلق جدید مگر کامیاب تجربے کئے گئے۔ جگر صاحب نے اس درسگاہ کی ہر ممکن امداد کی جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

علی گڑھ میں لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ۱۹۰۷ء ہی میں ایک مدرسہ کھول دیا گیا تھا جس میں ۱۹۱۸ء میں ہائی اسکول، ۱۹۲۹ء میں انٹرمیڈیٹ، ۱۹۳۷ء میں بی۔ اے اور ۱۹۳۸ء میں بی۔ ٹی کے

کلاسز شروع ہوئے اس کا الحاق ۱۹۲۹ء میں مسلم یونی ورسٹی سے ہو چکا تھا۔

اُردو اور ہندی کا جھگڑا ۱۸۶۷ء ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ لوگ اردو کی جگہ ہندی کو دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ ۱۸۸۷ء میں انگریزوں نے ہندی کی سرپرستی کی اور ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف اکسایا ۱۹۳۱ء تک پہونچتے پہونچتے اردو ہندی کے جھگڑے نے شدت اختیار کرلی جس کی وجہ سے مسلمان بچوں کی تعلیم میں رکاوٹیں حائل ہونے لگیں اُردو کو برادرانِ وطن نے مسلمانوں کی زبان قرار دیکر مسلمانوں میں خواندوں کی تعداد کم کردی اور جب ۱۹۳۷ء میں کانگریس کو صوبوں میں، حکومت کے اختیارات حاصل ہوئے تو مدراس اور صوبہ متحدہ میں کانگریس حکومت نے ہندی زبان کی تحریک کو امداد پہنچائی، اس طرح ہندی اردو کا ایک مستقل جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کانگریسی حکومت نے ثانوی تعلیم اور یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے کمیٹیاں اور کمیشن مقرر کردیں اور اس نے بنیادی تعلیم کے نام سے عام تعلیم کا ایک نیا طریقہ ہندوستان میں رائج کیا جو نہ صرف تعلیم کے نئے اصولوں پر مبنی تھا بلکہ ہندوستان کے حالات کے لئے خاص طور پر موزوں اور مناسب تھا۔

پنڈت جواہر لال نہرو کو تعلیم کے پہلوؤں سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ قدیم ادب کے شیدائی تھے لیکن وہ طلبار میں سائنٹیفک نقطۂ نظر پیدا کرنے کے لئے طبعیات، کیمیا اور حیاتیات کی ابتدائی تعلیم اور اس کے تھوڑے بہت عملی تجربے بہت ضروری سمجھتے تھے اسی وجہ سے ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان آزاد ہوا اور اس کی حکومت کی باگ ڈور اُن کے ہاتھ میں آئی تو انھوں نے اپنی تمامتر توجہ سائنس کی تعلیم کی طرف صرف کردی اسی لئے ملک میں سائنسدانوں، ڈاکٹروں، انجنیروں وغیرہ کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ اس طرح انھوں نے ہندوستانیوں میں سائنٹیفک نقطۂ نظر پیدا کیا۔

موجودہ دور میں نصابِ تعلیم بچوں کی نفسیاتی نشو ونما کا خیال رکھتے ہوئے تیار کیا گیا ہے تاکہ ان کے ذہن کی بالیدگی میں تعلیم ان کا معاون و مددگار بن سکے لیکن ابھی تک قومی وحدت پیدا کرنے کے لئے دوسرے جمہوری ممالک کی طرح ہمارے ملک نے کوئی قدم نہیں اٹھایا ہے اور آئے دن لسانی اور فرقہ وارانہ جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔

۱۹۵۱ء کے ہندوستان کے آئین نے اقلیتوں کے تہذیبی اور تعلیمی حقوق کے لئے کسی جماعت کی بھاشا، لکھاوٹ، کلچر کے بچائے رکھنے کی ضمانت لی ہے اقلیت کو چاہے وہ کسی مذہب یا زبان سے تعلق رکھتی ہوں اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کو چلانے کا حق دیا ہے لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری جمہوری حکومت اقلیت کی زبان (مثال میں ہم اردو کو لیتے ہیں) بچائے رکھنے میں ناکام ثابت ہوئی اردو جیسی زبان کو جس نے اسی ملک میں جنم لیا، ہندوؤں اور مسلمانوں کی گود میں پلی اور بڑھی آج اس کو ختم کرنے کے لئے اکثریتی فرقہ مختلف طریقے اختیار کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کی تعلیم روز بروز کم ہوتی

بار ہا ہے اور اس کا کوئی روشن مستقبل نظر نہیں آتا جب تک کہ اس کے ساتھ سوتیلی ماں کا برتاؤ ترک نہ کر دیا جائے۔ ان ہی حالات سے متاثر ہو کر جگر نے کہا تھا ؎

ہونے کو یوں تو روز نئی ہیں عنایتیں
اردو زباں پہ خاص کرم اب ہے آجکل

یہی وہ تعلیمی حالات تھے جن میں جگر نے آنکھ کھولی، پلے، بڑھے اور اسی کی گود میں پرورش پا کر جوان ہوئے ان ہی تعلیمی حالات کا وہ شکار رہے اور ان کے مزاج کے مطابق معقول طریقۂ تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ان کی طبیعت اس طرف راغب نہیں ہوئی، اسی وجہ سے انگریزی میں نویں درجہ تک تعلیم حاصل کر کے یہ سلسلہ ختم کر دیا اور اپنی معمولی فارسی اور اردو تعلیم ہی پر تمام عمر کے لئے اکتفا کر لیا۔

جس وقت جگر کی آنکھ کھلی انھوں نے سرسید کی ادبی تحریک کا آفتاب دنیائے ادب پر اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ چمکتا ہوا دیکھا لیکن اس سرمستِ ازل پر اس آب و تاب کا کوئی خاص اثر نہ ہوا اس کی آنکھیں اس روشنی سے خیرہ نہ ہوئیں بلکہ اس نے زمانہ پیری کو چھوڑ کر اپنی تمام عمر اپنے مخصوص ڈھن میں غزل کے گیسو سنوارنے میں صرف کر دی اور تا حیات اسی دھن پر قائم رہا۔

غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے ہمارے ادب میں سرمایہ دارانہ نظام کام کر رہا تھا، بادشاہ، نواب اور راجے مہاراجے داد و دہش دیتے رہتے تھے، یہی ادبا و شعراء کی پرورش کیا کرتے تھے اسی لئے اس دور کے ادب میں عیش پرستی کا جذبہ کار فرما نظر آتا ہے لیکن غدر کے بعد یہ سارا نظام درہم برہم ہو گیا ادب نے پلٹا کھایا، سرسید کی ادبی تحریک شروع ہوئی تو نظم اور نثر دونوں کا ڈھانچہ بدلنے لگا اب ان میں ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے زندگی کا مقصد کام کر رہا تھا۔ نظم اور نثر دونوں سے زندگی کے جملہ امور میں کام لیا جانے لگا جس کی وجہ سے ان میں وسعت اور بلندی پیدا ہو گئی۔

سرسید اور ان کے رفقائے کار حالی، شبلی، ذکاء اللہ اور وقار الملک وغیرہ جیسے شعراء و ادبا نے اردو ادب کو ایک نئی اور جدید دنیا میں لا کر کھڑا کر دیا۔ انھوں نے نہ صرف ہمارے ادب میں نظم نگاری ادبی تنقید، نثر نگاری، افسانہ، مکاتیب، تراجم، انشائیہ، خطبات، مقالات، سفرنامے، سوانح، سائنس، فلسفہ، مذہب، سیاست، تاریخ، اور علم کلام جیسے بیش بہا سرمائے کا اضافہ کیا بلکہ ملک کے کونے کونے میں ادیب و شاعر بھی پیدا کر دئیے۔ اور شاعری کو ناپاک خیالات، جھوٹ، مبالغہ اور لفاظی وغیرہ سے پاک کیا۔

سرسید کے تہذیب الاخلاق نے الفاظ قوم، قومی ہمدردی، قومی خیر خواہی ہمارے روز مرہ میں داخل کئے، مسلمانوں کو آپ اپنی عزت کرنا سکھایا، اردو ادب سے لفاظی، جھوٹ، مبالغہ، خوشامد اور ابتذال کو دور کیا، ایشیائی شاعری کے ناپاک خیالات کی جگہ نیچرل شاعری کو رائج کیا، علوم کی قدر

اور لوگوں کو آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کو ظاہر کرنے کی جرأت دلائی اور دلوں میں تحقیق کا شوق پیدا کیا۔

سرسید کی تحریک چونکہ اصلاحی اور افادی تھی اس لئے اس نے اردو ادب کو زندگی سے قریب کر دیا۔ اس کے پرانے نقطۂ نظر، کہنگی، فرسودگی، تعطل اور جمود کو دور کیا۔ اور اس میں نیاپن، ہمہ گیری، مقصد اور سنجیدگی پیدا کی، اسی کے ذریعہ دل اور دلی خیالات کی عکاسی کی شاعری کو تہذیب اور شائستگی کا وسیلہ قرار دیا۔

انھوں نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی کے لئے مضمون کی ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ الفاظ کی درستی اور بول چال میں صفائی لانے کی کوشش کی۔ رنگینی عبارت، تشبیہات اور دل پر نہ اثر کرنے والے پرشوکت الفاظ اور تک بندی وغیرہ سے پرہیز کیا اور مضمون کی ادا میں سادگی عبارت سے اس طرح کام لیا کہ جو کچھ ان کے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔

سرسید اور سوامی دیانند دونوں کی تحریکوں کا مقصد انگریزی تعلیم اور معاشرے کے صحت مند اثرات قبول کر کے معاشرے کے نئے طور طریقے اور فکر و گفتار کے نئے اسالیب اختیار کرنا تھا۔ ان ہی تحریکوں کے اثرات لوگوں نے قبول کر کے اس کا اثر ادب میں ظاہر کیا۔

حالی (جو اپنے زمانے کے مجدّد کہلاتے ہیں) نے ملک کے بگڑے ہوئے مذاق کو سدھارنے اور ادب کو پستی سے نکال کر بلندی کی راہ دکھانے کی کوشش کی انھوں نے اردو ادب میں خاص توجہ غزل کی اصلاح پر دی وہ خود بھی غزل کا اچھا مذاق رکھتے تھے انھوں نے غزل کے مزاج کو بخوبی سمجھنے کے بعد اس کی باطنی کمی اور اسے اپنی عظمت و برتری کا احساس دلا کر اپنے پیروں پر کھڑا کیا اُس نے اپنے لئے نئی نئی راہیں نکالیں، نئی نئی جدتیں پیدا کیں۔ اس کے مضامین اور خیالات میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کو اصلیت، حقیقت اور واقعیت سے روشناس کرایا۔ اور اس میں سادگی اور بے تکلفی پیدا کی۔ انھوں نے زندگی کے ہر پہلو اور ہر مسئلے مثلاً سیاست، تہذیب، تمدن، معاشرت، اخلاق وغیرہ کو غزل کا موضوع بنانا جائز قرار دیا۔ غزل میں محبت کے اعلیٰ اور بلند تصورات پیدا کئے اور لکھا:۔

"بندہ کو خدا کے ساتھ، اولاد کو ماں باپ کے ساتھ، ماں باپ کو اولاد کے ساتھ، بھائی بہن کو بھائی بہن کے ساتھ، خاوند کو بی بی کے ساتھ، بی بی کو خاوند کے ساتھ، نوکر کو آقا کے ساتھ، رعیت کو بادشاہ کے ساتھ، دوستوں کو دوستوں کے ساتھ، آدمی کو جانور کے ساتھ، مکین کو مکان کے ساتھ، وطن کے ساتھ، ملک کے ساتھ، قوم کے ساتھ ——— غرض کہ ہر چیز کے ساتھ لگاؤ اور دل بستگی ہو سکتی ہے..... غزل میں جو عشقیہ مضامین باندھے جائیں وہ

ایسے جامع الفاظ میں ادا کئے جائیں جو دوستی و محبت کے تمام انواع و اقسام اور تمام جسمانی و روحانی تعلقات پر حاوی ہوں"[۱]

شبلی نے بھی نظم (جس میں بیشتر قومی اور سیاسی نظمیں ہیں) اور نثر دونوں میں اپنی قادر الکلامی سے پیغام بیداری کو اپنے فنی آب و تاب کے ساتھ پیش کیا۔ انھوں نے طنز بھی کیا ہے اور تنقید بھی۔ نشتر بھی چلائے ہیں اور مرہم بھی رکھا ہے۔ ان کی تنقید میں مجددانہ اور مجتہدانہ رنگ جھلکتا ہے۔

مولوی نذیر احمد نے اردو ناول نگاری کی ابتدا کی اور اپنی ناولوں کے ذریعہ ہندوستان کی خاندانی زندگی کی شیرازہ بندی کرتے، گھریلو فضا کو خوش گوار بنانے اور خانگی انتشار کو دور کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اپنی البصیرت سے خاندان میں بگاڑ کے اسباب کو پہچانا اور ان کی برائیوں کو روکنے کے لئے مختلف طریقے بتائے۔

ان کے علاوہ اس دور کے محسن الملک، چراغ علی، وقار الملک، ذکاء اللہ، سید علی بلگرامی، شرر، اور عبد الرزاق کانپوری نے بھی اردو ادب میں حقیقت پسندی اور تنومند اسلوب بیان اختیار کیا۔ ادب اور زندگی کے رشتے کو قریب تر کر کے جاندار بنایا۔

سرسید کے انھیں ساتھیوں نے اردو ادب کو ایک نئی کلاسکی عظمت عطا کی۔

مولانا محمد حسین آزاد نے ۱۸۷۴ء میں کرنل ہالرائڈ کے مشورے سے پنجاب میں ایک انجمن قائم کر دی تھی جس میں غزلوں کے بجائے نظموں کے پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوا اسی زمانے میں اردو زبان میں مغربی خیالات کے اثرات واضح ہونے لگے تھے۔ بہت سی کتابیں اور مضامین انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہو چکے تھے اور ہو رہے تھے، انیسویں صدی کے نصف آخر کا سیاسی اور سماجی نظام بدل رہا تھا جس سے انسانی زندگی متاثر ہو رہی تھی۔ اور بقول ڈاکٹر عبدالواحد خاں خلیل:-

"بدلتے ہوئے مادی حالات، جاگیردارانہ نظام کا زوال، مشینی دور کی ابتدا، مذہبی اور اخلاقی اقدار میں رد و بدل، حب الوطنی کے جذبات اور نئے مسائل حیات نے مل جل کر ہمارے ادب کو نیا رنگ و آہنگ دیا۔ اور بالخصوص اس زمانے کی مقبول ترین صنف سخن یعنی غزل کو پوری طرح متاثر کیا، تمدن نے اپنے محدود دائرے سے نکل کر اردگرد کی دنیا پر نظر ڈالنا سیکھا نئے تجربات کی ہمت افزائی ہوئی اور ہماری غزل کے فن میں توخیر لیکن فکر میں نئے ابواب کا اضافہ ہوا اب غزل محض سرد سننے اور دل خوش کرنے کی چیز نہ رہی، بلکہ ضروری باتیں کہنے اور لوگوں کو کچھ کام کی طرف متوجہ کرنے کی چیز بن گئی۔ "افادیت" نے "استفادیت" کی جگہ لی اور محل حسین خاں کے عیش کے تذکروں کے بجائے ہماری غزل انسانی مسائل کو قدر و قیمت

---

[۱] غزل اور مطالعۂ غزل، ص ۵۰ (ماخوذ از مقدمہ شعر و شاعری)

کا اندازہ کرنے، بھولی ہوئی قومی عظمت کو یاد دلانے اور اخلاقی بلند نظری کا احساس پیدا کرنے کا ذریعہ بن گئی"[1]

۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ" نے "ادبِ لطیف" کا سلسلہ شروع کیا جس میں روایت کی پابندی، بندھی ٹکی فن پرستی اور تکلفات کے ساتھ ساتھ عیش و عشرت کے بت اور جمود و تعطل کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

اس کے بعد اخبار "عام" "لاہور"، "مسلم گزٹ" "لکھنؤ"، "اردوئے معلی"، رسالہ "مخزن"، "معارف"، ہفت روزہ "مسلم گزٹ"، اخبار "زمیندار"، "الہلال"، "کامریڈ" اور "ہمدرد" وغیرہ نے نئی تعلیم یافتہ نسل کو ادبی بلوغیت عطا کی۔

اسی زمانے میں رومانوی ادب اور انشائے لطیف کی تحریک بھی چلی جس نے اردو ادب میں بعض ذہین اور طباع نوجوان پیدا کئے

جنگِ عظیم اوّل کے بعد سیاسی خلفشار کی وجہ سے ادب میں وطن پرستی، مقامی رنگ، جذباتیت سادگی، عنائیت اور ماحول کی مصوری کی جانے لگی۔ ان ہی دنوں میں غزل کی مخالفت نے شدت اختیار کرلی اور گیتوں کا رواج ہونے لگا، نئی نسل کے لکھنے والوں کی ادبِ لطیف سے زیادہ دلچسپی بڑھی۔

۱۹۳۰ء کے بعد ملک میں امن، شانتی اور پریم کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کا علم بلند ہوا جس کا اثر اردو ادب پر بھی پڑا، جوش نے انقلابی نظمیں لکھ کر اردو ادب میں بغاوت کا علم بلند کیا۔

۱۹۳۵ء کے بعد اردو ادب میں تنقید، افسانہ نگاری، تاریخ نویسی، صحافت اور تراجم کا سلسلہ شروع ہوا۔

۱۹۳۶ء میں "ترقی پسند مصنفین" کی ایک انجمن قائم ہوئی جس میں نوجوان ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ساتھ کہنہ مشق افسانہ نگار، ادیب اور شاعر بھی شریک ہوئے اور اب قومی و وطنی ترانوں کے ساتھ ساتھ افلاس، بیکاری، اور مزدوروں کو بھی شاعری کا موضوع بنایا جانے لگا۔ اور سرمایہ داری کی کھلم کھلا مخالفت شروع ہوگئی۔ ان ہی مصنفین نے ادب کے ذریعہ سماج میں اصلاح و تبلیغ اور تلقین اپنے مخصوص مادی اور اشتراکی نقطۂ نظر سے شروع کی۔ ترقی پسندی کے اصولوں کو عام کیا۔ ادب میں مقصدیت اور سنجیدگی پیدا کی۔ انھوں نے زبان کی ترقی، مقبولیت اور اصلاح کی کوشش بھی اپنے مخصوص انداز سے کرنا چاہی۔

اس دور میں تنقید کے نئے شاعر یا ادیب کے تجربے کو اہم قرار دیا گیا۔ لوگوں میں مطالعہ کا شوق پیدا ہوا

---

[1] "اردو غزل کے پچاس سال" ص ۱۶۲ و ۱۶۳

غزل کا معیار بلند ہوا، ادب میں جمہوریت پیدا ہوئی اور اس میں سائنس اور دوسرے علوم داخل ہوئے۔ ترقی پسندی ہی کی وجہ سے افسانوں میں بھی گہرائی، وسعت اور بلندی پیدا ہوئی گو اس بلندی کا سرچشمہ روسی اشتمالیت پسندوں سے مستعار لیا گیا تھا۔

۱۹۴۲ء کی تحریک آزادی کے زمانے میں ہمارے شعراء نے بہت سی تعمیری نظمیں لکھیں، اس زمانے کے غزل گو شعراء نے حسن و عشق کے نئے تصورات کو نئے انداز میں پیش کیا۔ اب چونکہ لوگوں کا زاویہ نظر بدل چکا تھا اس لئے اس بدلے ہوئے زاویۂ نظر نے جدید غزل پر بھی اپنے اثرات چھوڑے۔

۱۹۴۷ء سے کچھ قبل اور اس کے بعد ملک میں جو ہولناک فسادات ہوئے، انسان جس وحشت اور درندگی پر آمادہ ہو گیا اس کے تلخ اور لرزہ خیز مشاہدوں نے ہمارے شاعروں اور ادیبوں کی بشریت کو جگا دیا۔ ان حالات و واقعات سے متاثر ہو کر انھوں نے انسانیت کے چاک گریبان کو اپنے فن سے سینے کی کوشش کی، انسانیت کی مظلومیت پر سب ہم آواز ہو کر ماتم کناں ہوئے، آدم کی اولاد کو ان کی خداداد شرافت کی یاد دلائی۔ جگر نے بھی ان ہی حالات و واقعات سے متاثر ہو کر کچھ جذباتی و تاثراتی نظمیں کہی ہیں جن میں ان اثرات کی عکاسی پائی جاتی ہے۔ ان کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔

باب دوم

حیات جگر

صفحہ ۴۸ تا

جگر کے اسلاف، سلسلۂ نسب، ولادت، تعلیم و تربیت، مذہبی عقائد، جگر کا ادبی ماحول اور شعر گوئی کی ابتداء، جگر کی پریشانیاں اور اسباب ترک وطن (مراد آباد)، زندگی کے چند اہم واقعات، وفات، علالت، جگر کے استاد، جگر کے شاگرد۔

ترتیب

حیاتِ جگر

جگر کے اسلاف

جگر مرادآبادی نے اپنے بزرگوں کا حال خود "حیاتِ جگر" میں شمس الہدیٰ قلیبی الفاروقی کو لکھایا ہے کہ:-

"میرا خاندان مولویوں کا خاندان تھا، ماحول علمی اور ادبی تھا۔ اصل خاندان دہلی کا تھا۔ عورتوں کی زبان ہمارے یہاں خالص تھی اور محفوظ، وہ اکثر ایسے محاورات استعمال کرتی تھیں کہ طبیعت خوش ہو جاتی تھی۔ میرے مورثِ اعلیٰ مولوی محمد سمیع صاحب شہنشاہ شاہجہاں[1] کے اتالیق تھے۔ دہلی کے اس خاندان کے دو حصے ہو گئے ایک حصہ

---

[1] راقم الحروف نے جگر کے تایازاد بھائی مولوی حکیم محمد احمد صاحب (جن کا تذکرہ آگے چل کر جگر نے خود بھی کیا ہے) سے ۲۴ دسمبر ۱۹۶۳ء کو ملاقات کر کے جگر کے اس بیان کی تصدیق کرنا چاہی تو محمد احمد صاحب نے اپنے یہاں کی دستاویزیں مجھے دکھائیں جن میں فرخ سیر بادشاہ کا شاہی فرمان بنام مولوی محمد سمیع صاحب موجود تھا۔ اس فرمان پر شاہی مہر لگی ہوئی تھی۔ اور اس میں کسی معقول خزانچی کے انتظام کرنے کے لئے لکھا گیا تھا۔ اس فرمان کے دیکھنے کے بعد جگر کے اس بیان کی تردید ہو جاتی ہے کہ ان کے مورثِ اعلیٰ مولوی محمد سمیع صاحب شہنشاہ شاہجہاں کے اتالیق تھے۔

جگر صاحب کا یہ بیان اس لئے بھی قابلِ اعتماد نہیں کیونکہ انھوں نے خود بارہا اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان کو لوگوں کے نام، منصب، مقام اور تاریخ وغیرہ یاد نہیں رہتے بہت ممکن ہے کہ اسی طرح اندازاً انھوں نے مولوی محمد سمیع صاحب کو بجائے فرخ سیر بادشاہ کے اتالیق کے شہنشاہ شاہجہاں کا اتالیق لکھا دیا ہو۔

جگر صاحب کے مقابلہ میں مولوی حکیم محمد احمد صاحب زیادہ قابلِ اعتماد ہیں اور ان کی بات زیادہ مستند ہے کیونکہ وہ ایک باہوش، نمازی و پرہیزگار اور ثقہ قسم کے گوشہ نشین انسان ہیں وہ بڑا تا یاد ہیں اب بھی اپنی ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں، اور اس قدر باہوش ہیں کہ اس عمر میں بھی جبکہ وہ جگر سے سات یا آٹھ سال بڑے ہیں۔ یعنی تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں ایک برتن کے تاجر کے یہاں انگریزی میں مراسلت کا کام وہی انجام دیتے ہیں۔ جگر مرحوم کے حقیقی چھوٹے بھائی علی مظفر صاحب نے بھی راقم الحروف سے ۲ مئی ۱۹۶۳ء کو کانپور کی ایک ملاقات میں بتایا تھا کہ

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

اعظم پور باشندہ (بہار) اور دوسرا مراد آباد میں سکونت پذیر ہوا۔ میرے پر دادا مرحوم حافظ نور محمد اور دادا حافظ مولوی امجد علی مرحوم دونوں شاعر تھے۔ والد مرحوم سے سُنا ہے کہ جدامجد شاعر تھے۔ اور دادا مرحوم کا ایک شعر یاد ہے جو مجھے بیحد پسند ہے ؎

لطفِ جاناں رفتہ رفتہ آفتِ جاں ہوگیا
ابرِ رحمت اس طرح برسا کہ طوفاں ہوگیا

میرے والد ماجد مولوی علی نظر نظرؔ بھی شاعر تھے ان کا بھی ایک شعر یاد ہے ؎

وہ یہاں آئے ہم وہاں پہونچے
ان کو شکوہ ہمیں گلا نہ رہا

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)
ان کا شجرۂ خاندان اور اسلاف وغیرہ کے بارے میں محمد احمد صاحب جو کچھ بتائیں گے وہ زیادہ مستند ہوگا۔ کیونکہ جب وہ سب لوگ اپنا مکان چھوڑ کر مراد آباد سے جانے لگے تھے تو تمام ضروری کاغذات و دستاویزیں مولوی حکیم محمد احمد صاحب کے حوالے کر آئے تھے اور وہ سب اب تک حکیم محمد احمد صاحب کے پاس محفوظ ہیں۔ علی مظفر صاحب نے بتایا کہ جگر صاحب ایک رند لاابالی قسم کے انسان تھے اور انھیں کوئی بات یاد بھی نہیں رہتی تھی اس لئے ان کے بیان کئے ہوئے واقعات پر بغیر تحقیق کے اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔

مولوی حکیم محمد احمد صاحب نے جگر کے اسلاف کے سلسلے میں بتایا کہ ان کے دادا مولوی محمد سمیع فرخ سیر بادشاہ کو حدیث کی تعلیم دیتے تھے۔ اور جب وہ مراد آباد چلے آئے تو یہاں بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا ان کے بعد مولوی محمد قاسم تک درس و تدریس کا سلسلہ قائم رہا اور یہ حضرات شاہی معافیات (شاہی گاؤں جو ان کو ملے تھے) سے گزر اوقات کرتے رہے کیونکہ اس زمانے میں درس و تدریس کا کام بغیر کسی معاوضے کے ہوتا تھا۔

محمد قاسم صاحب نے ابتداء میں درس و تدریس کا کام کیا پھر جب وہ علی گڑھ کے منصف مقرر ہوئے تو یہ کام ختم کر دیا۔ منصفی سے ترقی کر کے وہ الٰہ آباد کے سب جج (Sub Judge) ہوئے اور خان بہادری کا خطاب بھی حاصل کیا۔ ۱۸۸۵ء کے بعد پنشن لیکر مراد آباد چلے آئے۔

لہ ۷ نومبر ۱۹۶۳ء کی ملاقات میں مولوی خورشید الحسن صاحب جو جگر کے ایک دیرینہ مخلص دوست اور عقیدتمند ہیں۔ جو اب بھی مراد آباد میں ہیں۔ اور جگر کی حیات پر ایک مستند کتاب لکھ رہے ہیں) نے راقم سے بتایا کہ اعظم پور باشندہ بہار میں نہیں ہے بلکہ دہلی اور مراد آباد کے درمیان کہیں واقع ہے۔ اس سے بھی جگر کے اس بیان کی تردید ہوتی ہے کہ اُن کے خاندان کا ایک حصہ بہار میں سکونت پذیر ہے۔

میرے چچا علی ظفر بھی شاعر تھے۔ ان کا ایک مقطع یاد ہے ؎

ہو ہی جاتا ہے تخلص پہ ظفر کا دھوکہ
اے ظفر بندشِ اشعار کہ دوں یا نہ کردوں

میرے تایا مولوی علی اکبر صاحب بھی شاعر تھے اور اکبر تخلص کرتے تھے مولوی حکیم محمد احمد صاحب ان کے صاحبزادے مرادآباد میں اب بھی موجود ہیں۔ میرے ایک پھوپھی زاد بھائی محمد حسین صاحب ابن اشفاق حسین صاحب فاروقی بھی شاعر تھے۔ مرثیہ بہت اچھا پڑھتے تھے ایک امام باڑہ قائم ہوا۔ شیخ تفضّل حسین کے والد شیعہ تھے اور ان کے بھائی مشتاق حسین صاحب مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے۔ والد صاحب تفضیلی تھے[۱] اور وہی عقائد میرے بھی تھے[۲]۔"

جگر کا سلسلۂ نسب

جگر کا نام شیخ محمد علی سکندر اور تخلص جگر تھا۔ ان کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے :-

"شیخ محمد علی سکندر بن شیخ محمد علی نظر بن شیخ حافظ محمد امجد بن شیخ نور محمد بن شیخ مولوی محمد امین، بن شیخ محمد سمیع بن شیخ مولوی محمد مخدوم بن شیخ عبد الواحد بن شیخ عبد السمیع بن شیخ فرید بن شیخ منصور بن شیخ عبد الستار بن شیخ حسین بن شیخ علی اکبر بن شیخ قاضی مبارک بن شیخ قاضی بدرالدین بن شیخ قاضی بڈھن بن شیخ قاضی میٹرن بن شیخ قاضی عبداللطیف بن شیخ قاضی محمد بن شیخ قاضی زاہد بن شیخ ابراہیم بن شیخ علی احمد بن شیخ سلطان محمد بن شیخ عبدالصمد بن شیخ نظام الدین بن شیخ محمد سید بن شیخ رضی الدین بن شیخ محمد قاسم بن شیخ عبداللہ بن پیران پیر شیخ المشائخ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی بن شیخ کریم اللہ بن شیخ ابو محمد بن شیخ عثمان بن شیخ سلطان عبدالرحمٰن بن محمد بن امیر المومنین حضرت شیخ ابابکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ[۳]۔"

۱۔ مولوی حکیم محمد احمد صاحب نے جگر کے اس بیان کی بھی تردید کی کہ ان کے والد مولوی علی نظر تفضیلی تھے محمد احمد صاحب نے بتایا کہ مولوی علی نظر صاحب قادریہ خاندان سے بیعت تھے اور کٹر قسم کے حنفی المذہب اور صوم وصلوٰۃ کے پابند انسان تھے اس لئے ان کی حیات تک جگر کا تفضیلی عقائد رکھنا یا شیعہ ہونا ناممکن ہے کیونکہ ان کے والد سنی عقائد رکھتے تھے اور ان کی حیات تک انھوں نے اپنے عقائد میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی' ان کے عقائد میں اگر کوئی تبدیلی ہوئی ہوگی تو وہ ان کے والد کے انتقال کے بعد ہوئی ہوگی اس سے پہلے عقائد کا بدل دینا ممکن نہیں ہے۔

۲۔ "حیاتِ جگر کا ایک باب حضرت جگر کی زبانی از قیسی الفاروقی' قومی آواز ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء ص ۴

۳۔ از خط خورشید الحسن صاحب مرادآبادی مورخہ ۷ اپریل ۱۹۶۳ء بنام راقم الحروف (خورشید الحسن صاحب ہم وطن ہونے کے علاوہ جگر صاحب کے بہت قریبی اور دیرینہ دوست ہیں یہ شجرہ انھوں نے حکیم محمد احمد صاحب سے حاصل کیا ہے جو جگر صاحب کے حقیقی تایا زاد بھائی ہیں)۔

جگر کی ولادت

شمس الہدیٰ قیسی الفاروقی نے "حیاتِ جگر" میں لکھا ہے:-
"حضرت جگر مرادآبادی سنہ ۱۸۹۰ء میں بنارس میں پیدا ہوئے"[۱]

---

[۱] جگر مرحوم کی عمر کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔ ان میں سے بعض مستند اور ذمہ دار حضرات کے بیانات ملاحظہ فرمائیے۔

سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن "شبلی کالج میگزین" سنہ ۱۹۶۰-۶۱ء میں صفحہ ۲۴ پر لکھتے ہیں کہ جگر کا سنہ پیدائش سنہ ۱۸۹۰ء بتایا جاتا ہے لیکن ان کے بعض ملنے والوں کا خیال ہے کہ ان کا سنہ پیدائش سنہ ۱۸۹۰ء سے پہلے رہا ہوگا کیونکہ جب وہ سنہ ۱۹۲۰ء میں اعظم گڑھ آئے ہوئے تھے تو اپنے کو ۳۶ سال کا بتاتے تھے" اس لحاظ سے ان کی سنہ پیدائش سنہ ۱۸۸۴ء ہوگی۔

اور عابد رضا بیدار رسالہ "جامعہ" اکتوبر سنہ ۶۱ء میں صفحہ ۲۵۲ پر لکھتے ہیں:-
"علی سکندر نام اور جگر تخلص ہے سنہ ۱۸۹۰ء میں اپنے وطن مرادآباد میں پیدا ہوئے۔"
اسی صفحہ پر عبداللطیف اعظمی کا ایک نوٹ دیا ہوا ہے کہ "جگر مرحوم کی عمر کے بارے میں مختلف روایات ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی کو ان کا صحیح سنہ پیدائش معلوم نہیں ہے یہاں تک کہ خود جگر صاحب کو بھی معلوم نہیں تھا، اس لئے اس کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا جا رہا ہے محض ظن و قیاس پر مبنی ہے اصطفیٰ خاں صاحب کے ارشاد کے مطابق (جو جگر کے خاص دوستوں میں ہیں) سنہ ۱۸۹۳ء ہے (تذکرہ جگر از محمود علی خاں جامعی ص ۱۹) مگر عام طور پر خیال ہے کہ انتقال کے وقت ان کی عمر ۷۰ سال تھی۔ اس لحاظ سے سنہ پیدائش سنہ ۱۸۹۰ء کی ہونا چاہئیے اور داغ کی شاگردی کے وقت جگر مرحوم کی عمر کا جو اندازہ کیا گیا ہے اس لحاظ سے سنہ پیدائش سنہ ۱۸۹۱ء یا ۱۸۹۲ء ہونا چاہئیے۔ محمود علی خاں نے اسی اشاعت کے مضمون میں سنہ ۱۸۹۳ء لکھا ہے۔"

محمود علی خاں صاحب جامعی نے رسالہ "جامعہ" اکتوبر ۶۱ء میں صفحہ ۶۳۱ پر لکھا ہے "جگر صاحب کی پیدائش سنہ ۱۸۹۳ء کی ہے سنہ ۱۸۹۰ء کی نہیں۔"

یہی جامعی صاحب اپنی کتاب "تذکرہ جگر" میں صفحہ ۱۹ پر لکھتے ہیں "جگر کی سنہ پیدائش کا صحیح علم نہیں ہے ..... ان کی عمر کے متعلق اندازہ یہ ہے کہ انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً ۷۰ سال ہوگی۔ لیکن اصطفیٰ خاں صاحب کے زبانی کے بموجب ان کی پیدائش سنہ ۱۸۹۳ء ہے اس لئے عمر ۶۸ سال ہوئی۔ جائے پیدائش بنارس، رہنے والے مرادآباد کے، مرادآبادی کہلاتے ہیں۔"

احمد حسین خاں احمر رفاعی رسالہ "اردو" جولائی سنہ ۵۹ء میں صفحہ ۱۴۱ پر لکھتے ہیں۔
"جگر کا سال پیدائش سنہ ۱۸۹۰ء ہے۔"

یہ وہی رفاعی صاحب ہیں جنھوں نے جگر کی حیات میں اپنے ایم۔اے کے امتحان کے لئے جگر پر ایک

اس کے بعد جگر نے قیسی الفاروقی کو لکھایا ہے کہ :۔

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ)

"مقالہ" لکھا تھا۔

پروفیسر آل احمد سرور "سب رس" ستمبر سنہ ۶۰ء میں صفحہ ۳۲ پر لکھتے ہیں :۔

"جگر صاحب سنہ ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے" اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "مجھے ان کے ابتدائی حالات کا بہت کم علم ہے "

سرور صاحب ایک دوسرے مضمون میں "جو نظام جدید ۱۶ و ۲۳ ستمبر سنہ ۶۲ء میں صفحہ ۲۵ پر شائع ہوا) لکھتے ہیں

"علی سکندر جگر سنہ ۱۸۹۰ء میں مراد آباد میں پیدا ہوئے "

سرور صاحب کے ان دونوں بیانات میں اختلاف ہے لیکن انھوں نے پہلے ہی اپنی معذوری کا اظہار کر دیا ہے
تبسم نظامی نے اپنی کتاب "جگر مراد آبادی" مطبوعہ جنوری سنہ ۴۶ء (جو جگر مراد آبادی کی حیات کے سلسلے میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔) میں صفحہ ۷ پر لکھتے ہیں۔

"جگر صاحب کا نام علی سکندر ہے اور جگر تخلص کرتے ہیں۔ مراد آباد کے باشندے ہیں سنہ ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے "

اور کریم الاحسنی "صبح اُمید" جولائی سنہ ۵۱ء میں صفحہ ۲۶ پر لکھتے ہیں :۔

"آپ کا نام علی سکندر اور تخلص جگر ہے ' وطن مراد آباد اسی نسبت سے مراد آبادی مشہور ہیں۔ آپ شہر مراد آباد میں سنہ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے "

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ اندازہ ہو گیا کہ جگر مرحوم کی تاریخ پیدائش میں کس قدر اختلاف ہے لیکن زیادہ تر لوگوں کو اس رائے سے اتفاق ہے کہ جگر کی پیدائش سنہ ۱۸۹۰ء ہے اور جگر صاحب نے خود بھی اپنی تاریخ پیدائش سنہ ۱۸۹۰ء ہی بتائی ہے اس لئے ہمیں جگر کی تاریخ پیدائش سنہ ۱۸۹۰ء ہی مان لینا چاہیے۔

جگر صاحب نے اپنی یوم پیدائش کو خود بھی معمہ بنا دیا ہے انھوں نے قیسی الفاروقی کو اپنی تاریخ پیدائش سنہ ۱۸۹۰ء لکھائی ہے اور خود انھوں نے اپنی ایک بیاض میں (جو جامعہ ملیہ کا سلسلہ وار نمبر ہے) میں ابتدائی صفحہ پر سب سے اوپر اپنے ہاتھ سے لکھا ہے "پیدائش ۱۵ جون سنہ ۱۸۹۲ء" اس کے نیچے جگر نے تاریخ ۱۱ دسمبر سنہ ۱۹۵۲ء لکھی ہے یہ بیاض جگر کی ہے اور اس میں انھیں کی غزلیں ہیں۔ اس بیاض پر ظاہر ہے انھوں نے اپنی ہی تاریخ پیدائش لکھی ہو گی۔ جگر کی یہ تحریر مجھے جگر پر تحقیقی کام کے سلسلے میں پاکستان سے واپسی پر دہلی میں "جامعہ ملیہ" میں دیکھنے کو ملی جس نے میرے لئے الجھنوں میں ایک اور اضافہ کر دیا۔ لیکن ان کی اس تحریر پر غور کرنے کے بعد راقم الحروف بھی اسی نتیجہ پر پہونچا کہ جگر صاحب کو دن تاریخ تو یاد نہیں رہتے تھے خدا معلوم کس خیال میں رہے ہوں جب بیاض پر پیدائش کی یہ تاریخ لکھی ہو

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

"میری جائے پیدائش بنارس[1] ہے۔ بنارس میں والیٔ ٹونک (غالباً موجودہ نواب کے پردادا)

پچھلے صفحہ کا حاشیہ:

میری رائے میں ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۹۰ء ہی صحیح ہے کیونکہ تسکین قریشی نے بھی ایک خط مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۶۵ء (بنام راقم الحروف) میں اس کی تصدیق کی ہے اور لکھا ہے کہ

"میں نے جگر صاحب کا سال ولادت اور مقام پیدائش تحقیقی طور پر معلوم کر لیا ہے، وہ مرادآباد میں پیدا ہوئے تھے اور تاریخ ماہ و سال پیدائش ۱۲ شعبان ۱۳۰۷ھ ہے عیسوی تاریخ ماہ اپریل ۱۸۹۰ء بھی صحیح طور پر تحقیق ہو چکی ہے یہ معلومات محبی خورشید الحسن صاحب کے ذریعہ جگر صاحب کے تایازاد بھائی محمد احمد صاحب مرادآبادی سے حاصل ہوئی ہیں اب ان میں کوئی شک کی گنجائش نہیں۔ عیسوی سنہ میں نے اس طرح برآمد کیا کہ صفیر بلگرامی کی مصدقہ تاریخ وفات ۱۲ رمضان ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۱ مئی ۱۸۹۰ء گویا مئی میں رمضان کا مہینہ تھا تو اپریل میں شعبان ہوا، اس لئے مہینہ تحقیق ہو گیا۔ تاریخ میں چونکہ ۳۰۔ ۲۹ کی رویت ہلال کا سوال پیدا ہوتا ہے اس لئے اگر ۳۰ کا چاند مانا جائے تو ۱۲ اپریل ہوتی ہے اور ۲۹ کا تصور کر لیا جائے تو ۳ سمجھئے۔ بہرحال اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں صرف اپریل ۱۸۹۰ء کافی ہے۔"

[1] جگر صاحب کے اس بیان سے کہ ان کی جائے پیدائش بنارس ہے۔ بعض حضرات کو اختلاف ہے جن کی رائے ایک استاد کا درجہ رکھتی ہیں۔

سب سے پہلے شخص تو مولوی حکیم محمد احمد صاحب ہیں جن کا تذکرہ پچھلے صفحات میں آچکا ہے۔ انھوں نے راقم الحروف سے ۲۴ دسمبر ۱۹۶۳ء کی ایک ملاقات میں بتایا کہ جگر ۱۸۹۰ء میں مرادآباد میں پیدا ہوئے تھے ان کا کہنا ہے کہ جگر جس کوٹھری میں پیدا ہوئے تھے وہ کوٹھری ابھی تک موجود ہے اور ان کی دادی صاحبہ ان سے اکثر کہا کرتی تھیں کہ "جگر اس کوٹھری میں پیدا ہوا تھا"۔ راقم نے ان سے دریافت کیا کہ ان کی (جگر کی) ماں نے بھی کبھی ان سے اس واقعہ کے متعلق کچھ بتایا یا انھوں نے خود کبھی اس سلسلے میں ان سے تصدیق کی تو انھوں نے بتایا کہ چونکہ جگر کی ماں غیر قوم کی تھیں اور وہ بنارس کی رہنے والی تھیں۔ اس وجہ سے وہ ان لوگوں سے بہت کم بات کرتی تھیں۔ کیونکہ غیر قوم ہونے کی وجہ سے وہ ان لوگوں کے سامنے آتے شرماتی تھیں انھوں نے بتایا کہ چونکہ جگر کی ماں بنارس کی تھیں اس لئے ان کو سہو ہو گیا کہ وہ بنارس ہی میں پیدا ہوئے۔ ان کو سہو ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے والد بنارس اپنی خالہ کے یہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے کبھی کبھی کئی کئی مہینے وہاں قیام بھی کرتے تھے۔ کیونکہ علی نظر کے خالو بنارس میں سررشتہ دار (پیشکار) کی حیثیت سے کام کرتے تھے، اور وہیں ان کی ملازمت تھی لیکن جگر کے والد علی نظر نے والیٔ ٹونک کے یہاں کبھی کسی قسم کی نہ تو کوئی ملازمت اختیار کی نہ مصاحبت۔ البتہ سوز خوانی کے لئے کبھی کبھی جایا کرتے تھے۔ لیکن ایک دفعہ ایک حادثہ پیش آیا اور انھوں نے سوز خوانی کے لئے بھی وہاں کا آنا جانا ترک کر دیا۔ اس لئے جگر کا اپنی جائے پیدائش بنارس بتانا صحیح نہیں ہے۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کے ساتھ والدِ ماجد علی نظر صاحب مرحوم رہتے تھے۔ میں وہیں پیدا ہوا۔ والد ماجد پھر مراد آباد تشریف لائے اس وقت میری عمر چھ ماہ ہوگی۔ مراد آباد اجداد کا وطن تھا وہیں بارہ چودہ سال کی عمر تک رہا۔ اِس وقت میری عمر ۷۰ سال کی ہوگی، مجھے دن، تاریخ، سنہ پتے اور مناصب یاد نہیں رہتے، ان باتوں سے مجھے کوئی مناسبت نہیں۔[1]"

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ)

مراد آباد ہی کے جگر صاحب کے ایک قدیم مخلص دوست مولوی خورشید الحسن صاحب (جو جگر کی حیات کے سلسلے میں تحقیق کر کے ایک مستند کتاب لکھ رہے ہیں) نے ۲۰ ردسمبر ۱۹۶۲ء کی ملاقات میں راقم سے بتایا کہ ان کو تحقیق کرنے پر پتا چلا کہ جگر بنارس میں نہیں مراد آباد ہی میں پیدا ہوئے تھے جگر کی پیدائش کے ایک مہینے کے بعد ان کے والد علی نظر کے پاس ان کی خالہ کا بنارس سے تار آیا کہ وہ سخت بیمار ہیں اس لئے جگر کے والد اپنی اہلیہ اور جگر کو لیکر بنارس چلے گئے اور وہاں ان کو پانچ یا چھ مہینے تک قیام کرنا پڑا۔ اس کے بعد وہ پھر جگر اور ان کی والدہ کو لیکر مراد آباد چلے آئے، اور یہیں رہنے لگے۔

بہت ممکن ہے کہ اسی مناسبت سے جگر نے اپنی جائے پیدائش بنارس لکھا دی ہو کیونکہ شاید انھوں نے بچپن میں اپنے والد یا والدہ سے سنا ہو کہ ان کے بچپن کے پانچ چھ مہینے بنارس میں گزرے ہیں۔ اسی لئے وہ یہ سمجھے ہوں کہ ان کی جائے پیدائش بنارس ہے۔

جگر کی جائے ولادت مراد آباد ہے، اس سے علی منظر صاحب (جگر کے حقیقی بھائی)، اہلیہ جگر (نسیم جگر)، محسن علی صدیقی (جگر کے برادرِ نسبتی کے داماد) اور نیاز احمد (جگر مرحوم کے برادرِ نسبتی کے صاحبزادے) کو بھی اتفاق ہے۔

اس سلسلے میں ان کی (جگر کی) رائے اس لئے بھی قابلِ اعتماد نہیں کیونکہ انھوں نے خود ہی مندرجہ بالا بیان میں اقرار کر لیا ہے کہ ان کو دن، تاریخ، سنہ اور مناصب یاد نہیں رہتے ہیں اس لئے میرے خیال میں مولوی حکیم محمد احمد صاحب کی رائے سند کا درجہ رکھتی ہے اور جگر کی جائے پیدائش مراد آباد ہی کو مان لینا چاہیے۔

[1] "حیاتِ جگر کا ایک باب۔ حضرت جگر کی زبانی از قیسی الفاروقی"، قومی آواز ۱۹ ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۴۔

تعلیم و تربیت احمد حسین خاں احمر دفاعی جگرؔ کی ابتدائی تعلیم کے متعلق لکھتے ہیں۔ کہ انھوں نے۔

"ابتدائی تعلیم مولوی محمد صدیق صاحب سے حاصل کی، مولوی محمد صدیق صاحب، مولانا محمد رشید احمد گنگوہی کے خلیفہ بھی تھے۔ جن سے جگرؔ کے والد بیعت تھے اور اپنے زمانۂ طفولیت میں ان کے ہمراہ اکثر و بیشتر باہر ہی رہا کرتے تھے اور ان سے ابتدائی درسی کتابوں کے چند اسباق بھی لئے تھے"[1]

رازؔ مرادآبادی لکھتے ہیں:۔

"میرے والد اور جگرؔ صاحب بچپن کے ساتھی ہیں۔ دونوں کی ساتھ بسم اللہ ہوئی اور ایک بزرگ حافظ قاری عبدالرشید صاحبؒ کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ حضرت قاری صاحب ہماری خاندانی مسجد میں درس دیا کرتے تھے اور جگرؔ صاحب کے والد محترم نے قاری صاحب کی شہرت اور لیاقت کے باعث جگرؔ صاحب کو ان کے حضور پیش کیا تھا"[2]

اور مولوی حکیم محمد احمد صاحب (جن کا تذکرہ پچھلے صفحات میں آچکا ہے) نے ۲ دسمبر ۶۳ء کی ملاقات میں راقم الحروف سے بتایا کہ جگرؔ نے ۶۔۷ سال کی عمر تک اپنے والد سے تعلیم پائی اور ۸۔۹ سال کی عمر تک مولوی معین الدین صاحب سے تعلیم حاصل کی، مولوی معین الدین صاحب مولوی حکیم محمد احمد صاحب کو پڑھانے آتے تھے انھیں کے ساتھ جگرؔ بھی ان سے پڑھتے تھے۔

مولوی حکیم محمد احمد صاحب نے بتایا کہ یہ زمانہ جگرؔ کے والد کے عسرت کا تھا۔ اور وہ فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اس لئے جگرؔ اکثر اپنے چچا علی ظفر کے ساتھ رہا کرتے تھے اور انھیں کے ساتھ رہ کر انھوں نے کُردی (ضلع باندہ) اور لکھنؤ میں نویں درجہ تک انگریزی تعلیم حاصل کی۔/

محمود علی خاں جامعی نے لکھا ہے کہ:

---

[1] "رسالہ سہ ماہی اردو" جولائی ۵۹ء ص ۱۴۱،

[2] مولوی خورشید الحسن صاحب نے اپنے ۳۱ مارچ ۶۳ء کے خط میں شوق مرادآبادی کو (جو جگرؔ مرادآبادی کے بچپن کے دوست اور ہم مکتب ہیں) لکھا ہے "محمد احمد صاحب کا یہ بیان ہے کہ انھوں نے حضرت مولانا حکیم حافظ قاری عبدالرحمٰن صاحب کے مکتب میں الف، ب، ت شروع کی اور جناب مولوی اسمٰعیل بیگ صاحب مرحوم کے مکتب میں پڑھا اور اپنے والد صاحب مرحوم کے مکتب میں لیے فارسی جناب مولوی نعیم الدین صاحب مرحوم کے والد مرحوم سے سکندر نامہ تک پڑھی تھی"۔ [3] "فروغ اردو" فروری، مارچ ۶۱ء ص ۳۳۔۳۴

"فارسی اور اردو کی تعلیم انھوں نے اپنے والد سے پائی۔"[1]

اور قیسی الفاروقی نے "حیاتِ جگر" (غیر مطبوعہ) میں لکھا ہے کہ

"قرآن پاک، فارسی اور اُردو کی تعلیم اس زمانہ کے دستور کے مطابق گھر پر مولوی کے ذریعہ ہوئی یہ اور ان کے بھائی مولوی محمد احمد صاحب جو اب بھی مراد آباد میں حکیم ہیں یہ دونوں ہی مولوی معین الدین صاحب سے تحصیل علم کرتے تھے، مراد آباد کے بعد پھر گروی میں یہ سلسلہ جاری رہا۔ جب ان کے چچا علی ظفر صاحب (جو گروی ضلع باندہ میں پولیس انسپکٹر تھے) کا تبادلہ گروی سے لکھنؤ ہوا تو وہ ان کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے جہاں انھوں نے مشن اسکول (مینیٹیل اسکول) میں نویں درجہ تک تعلیم حاصل کی لیکن ابھی وہ نویں جماعت میں تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا جس کے بعد وہ اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے[2]۔ کیونکہ انگریزی تعلیم سے انھیں کوئی مناسبت پیدا نہیں ہوئی۔"[3]

جگر صاحب کی تعلیم منقطع ہونے کا سبب جگر کے حقیقی بھائی علی مظہر صاحب نے راقم الحروف سے ۲۶ جنوری ۱۹۶۳ء کی ایک ملاقات میں بتایا کہ

"بھائی صاحب (جگر صاحب)، محمد احمد صاحب مراد آبادی اور ایک صاحب اور (جن کا نام انھیں یاد نہیں تھا) نویں درجہ میں پڑھتے تھے یہ تینوں حضرات نویں درجہ میں دو بار مسلسل فیل ہوئے جس کی وجہ سے ان تینوں حضرات کا دل پڑھائی سے گھبرا گیا۔ اس لئے سبھوں نے سلسلۂ تعلیم منقطع کر دیا۔ اس کو بھائی صاحب (جگر صاحب) کے بچپن پر محمول کیا جاسکتا ہے اس سے زیادہ اس کی اہمیت نہیں ہے۔"

بعض حضرات کا یہ خیال کہ چونکہ جگر کے والد کا انتقال ہو گیا تھا اس لئے ان کا سلسلۂ تعلیم منقطع ہو گیا تھا، درست نہیں ہے جگر کے سلسلۂ تعلیم کے منقطع ہونے کا اصل سبب ان کی طبیعت میں انگریزی تعلیم سے مناسبت کا نہ پیدا ہونا تھا۔ جس کی وجہ سے انھوں نے یہ تعلیم ترک کر دی، ورنہ ان کی تعلیم کی ذمہ داری تو

۱؎ "تذکرۂ جگر"، صفحہ ۲۰۔

۲؎ جگر کی انگریزی تعلیم کے سلسلے میں شوق مراد آبادی سے ایک بڑی عجیب و غریب بات معلوم ہوئی۔ انھوں نے راقم سے ایک ملاقات میں کراچی میں دسمبر ۱۹۶۳ء میں بتایا کہ جگر نے کہیں بھی انگریزی تعلیم حاصل نہیں کی وہ صرف مدرسۂ امدادیہ میں پڑھتے تھے۔ شوق صاحب جگر کے ہم جماعت رہ چکے ہیں۔ لیکن ان کا یہ خیال حقیقت سے بہت دور ہے اور بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ جگر نے خود اپنی نویں درجہ تک تعلیم تسلیم کی ہے۔

۳؎ "شبلی کالج میگزین" ۱۹۶۰-۶۱ء صفحہ ۲۴ ۴؎ "حیاتِ جگر" (غیر مطبوعہ) از قیسی الفاروقی

ان کے چچا علی ظفر صاحب پر تھی۔ ان کے والد اُس زمانے میں جگر کی تعلیم کے اخراجات تو یوں بھی نہیں برداشت کرتے تھے۔

محمود علی خاں جامعی نے تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں ان کے نظریے کی وضاحت صحیح کی ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"دراصل وہ انسان کی تعلیم کے لئے "بہ خواہش نگاہے کُن" کے قائل ہیں کیونکہ ان کے نزدیک انسان خود سب سے بڑی کتاب ہے"۔[1]

یہی اصل وجہ تھی کہ وہ کتابی یا درسی اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔

جگر صاحب عام طور پر کتابوں کے مطالعے سے گھبراتے تھے، وہ فطری طور پر محسوس کرتے تھے کہ کتاب کے مقابلہ میں شخصیت اہم چیز ہوتی ہے جس کی تعمیر کسی شخصیت کے زیرِ اثر ہی ممکن ہے، وہ کتابوں کو انسان کے جہل کا ایک شاہکار اور انھیں انسان اور اس کے خالق کے درمیان ایک پردہ سمجھتے تھے۔ اس لئے وہ اپنی شخصیت کی تعمیر کسی شخصیت کے زیرِ اثر ہی کرنا چاہتے تھے۔ ان کے اس خیال کو اس وقت اور زیادہ تقویت ملی جب ان کی ملاقات اصغر گونڈوی سے ہوئی۔ اصغر گونڈوی کی صحبت، محبت اور تربیت سے ان کی زندگی میں ایک انقلاب آیا جس کا انھوں نے خود ہی بارہا اعتراف کیا ہے انھوں نے ایک ادبی ملاقات میں جو ۵ر جولائی ۱۹۵۹ء کو گونڈہ میں ریکارڈ ہوئی اور ۸ر جولائی ۵۹ء کو شب میں آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر ہوئی۔ قیسی الفاروقی سے بتایا کہ:

"روحانی اور معنوی بلندیوں کا جہاں تک تعلق ہے ان کے لئے تمام تر زندگی کے ساتھ اصغر گونڈوی کی تربیت کا صحیح معنوں میں شکر گزار ہوں"۔

جب اُن کی اصغر گونڈوی سے ملاقات ہوئی تو اصغر نے انھیں تسکین قلب کی خاطر قاضی شاہ عبدالغنی منگلوری سے بیعت کرا دیا جس کی وجہ سے اُن سے روحانی تعلق پیدا ہو گیا اور اس روحانی تعلق سے جگر کی طبیعت میں ایک عظیم انقلاب رونما ہوا۔ اس عظیم انقلاب میں جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اصغر مرحوم کا بھی بڑا دخل تھا۔ اس طرح جگر کے متصوفانہ خیالات میں دلکشی اور گہرائی و گیرائی پیدا ہوئی اور جگر کے دل سے افسردگی و پژمردگی ختم ہو کر اس میں ایک نئی زندگی اور نئی جولانی پیدا ہو گئی جو اس سے پہلے برائے نام تھی۔

جگر کے مذہبی عقائد

جگر صاحب نے اپنے مذہبی عقائد کے سلسلے میں قیسی صاحب کو لکھا یا ہے کہ:-

---

[1] تذکرۂ جگر" صفحہ ۲۰

"والد صاحب تفضیلی تھے اور وہی عقائد میرے بھی تھے"[۵]

لیکن ان کے تایا زاد بھائی مولوی حکیم محمد احمد صاحب (جن کا تذکرہ پچھلے صفحات میں آچکا ہے اور ان کے بیانات جگر صاحب کے مقابلہ میں زیادہ مستند ہیں) راقم الحروف سے ۲۴ دسمبر ۱۹۶۳ء کی ایک ملاقات میں بتایا کہ جگر کے والد علی نظر صاحب حکیم مولوی محمد صدیق صاحب (خاندان قادریہ) سے بیعت تھے اور حنفی المذہب اور پابند صوم و صلوٰۃ تھے اس لئے جگر کا یہ بیان کہ ان کے والد تفضیلی تھے غلط ہے۔ اسی کے ساتھ ان کا یہ بیان بھی غلط ہے کہ ان کے عقائد بھی تفضیلی تھے اپنے والد کی حیات تک تو ان کے عقائد کے بدلنے کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا کیونکہ ان کو اس وقت تک اتنی آزادی بھی نہیں ملی تھی کہ وہ جو مذہبی عقیدہ چاہتے اختیار کرتے۔ والد کے انتقال کے بعد البتہ ان کے عقائد میں تبدیلی ہوئی بہت ممکن ہے کہ والد کے انتقال کے بعد ان کے پھوپھی زاد بھائی محمد حسین صاحب اور شیخ تفضل حسین صاحب کے ساتھ شعر و شاعری کی صحبت اور ہم عمری کا ان پر اثر ہوا اور اس وقت ان کے عقائد تفضیلی یا شیعی ہو گئے ہوں کیونکہ یہ حضرات شیعہ تھے۔ لیکن ۱۹۱۹ء میں ان کی ملاقات اصغر گونڈوی سے ان کے ایک فیض آبادی دوست کی تحریک پر ہوئی جس کے متعلق انھوں نے ناطق جے پوری سے ایک دفعہ فرمایا کہ :-

"شاید تمھیں معلوم نہ ہو کہ میں مختلف مذہبی عقائد سے گزرتا رہا ہوں۔ ایک زمانہ میں دہریت بھی مجھ پر حاوی رہی ہے میں شیعیت کی جانب بھی رجحان رکھتا تھا، ان دنوں میں لاہور میں چشمہ کی ایک فرم میں ملازم تھا جس کے ڈائرکٹروں میں شیخ عبدالقادر بھی تھے یہ زمانہ میرا دکھ اور روحانی اذیتوں کا تھا۔ آخر ایک روز میں حضرت اصغر گونڈوی کے پاس ان سے ملنے کیلئے گیا جو ایک صاحب سے بحث کر رہے تھے۔ میری دلچسپی نے دور ہی سے مجھے اس بحث کو سننے کے لئے روک لیا۔ میں قریب کھڑا ہوا اس طرح کہ وہ مجھے نہ دیکھ سکیں تمام بحث سنتا رہا عجیب بات یہ تھی کہ حضرت اصغر سمجھا رہے تھے اُسے اور کیسے دلیں کانوں کے ذریعہ ہر ایک بات اترتی جا رہی تھی ایسا بھی وقت آیا کہ جو شبہات میرے دل میں تھے میں نے سوچے، اور تھوڑی دیر کے بعد ہی وہاں سے جواب ملا۔ وہ وقت مجھے یاد ہے جب میں تھوڑی دیر میں راسخ العقیدہ حنفی ہو گیا۔ حضرت اصغر کے پاس سے وہ صاحب چلے گئے تو میں حاضر ہوا اور ماجرا بیان کر کے رونے لگا جب کچھ میری بھڑاس نکل تو میں نے چاہا کہ ان سے بیعت ہونے کی خواہش کروں۔ میرے دل میں یہ خیال آنا تھا کہ انھوں نے باتوں باتوں میں مجھے اپنے پیر طریقت کی طرف متوجہ کیا اور فرمایا تم جو چاہتے ہو وہاں سے دستیاب ہو گا۔

---

[۵] "قومی آواز" ۱۹ ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۴

مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرے سینے میں آگ بھڑکنے لگی ہے اور میری بیتابی حصولِ مقصد کے لئے ہر آن بڑھتی جارہی ہے اسی روز میں روانہ ہوگیا اور وہاں پہونچنے کے بعد پھر میری رنگینیوں نے بہکایا، سامان کہیں رکھا اور پینے پلانے میں مصروف ہوگیا، خدا جانے دو روز اس طرح گذرے یا تین روز، ایک دن مجھے اپنے مقصدِ سفر کا خیال آیا اور اس درجہ اس کا تصوّر مجھ پر حاوی ہوگیا کہ نشہ کافور تھا، میں نہا کر نکلا ہی تھا کہ ایک بزرگ جن کی پیشانی پر نور جھلک رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ چند بزرگ اصحاب کے ساتھ اس طرح میری جانب چلے آرہے ہیں گویا میں نے انھیں بلایا ہے۔ یا وہ خود اسی ارادے سے تشریف لائے ہیں، میں نے نہایت احترام اور انتہائی عجز و انکسار سے سلام و مصافحہ کے بعد عرضِ حال کیا۔ گویا مجھے معلوم ہے کہ آپ ہی وہ ذاتِ بابرکات ہیں جن کی قدمبوسی کے لئے حاضر ہوا ہوں فرمانے لگے "بھائی ہم تو ننگِ بے نمک ہیں ہمارے پاس لذتیں کہاں رنگینیوں میں جاؤ کہتیں اس میں ہی لطف آسکتا ہے" میں یہ الفاظ سنکر رو دیا اور میں نے قدم پکڑ لئے تو آپ نے مجھے اٹھایا اور فرمایا "اچھا ہمارے گھر چلو" کئی ہفتے گذر گئے، ہر لحظہ میری بےچینی بڑھتی گئی ایک روز فرمانے لگے "بھئی اب رمضان کا مہینہ آگیا جمعۃ الوداع پر آنا اس وقت تمھارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیں گے۔

یہ کیا قیامت تھی جو مجھ پر ٹوٹ پڑی لیکن دم تابی کی مجال کسے تھی مجھے وہ زمانہ یاد ہے اور شاید زندگی میں اس سے کٹھن گھڑیاں کبھی نہیں آئیں گی، جب میں نے ایک گھنٹہ ایک ایک مہینے کی طرح کاٹا۔ وقت آیا اور میں نہایت بے تابی سے پھر روانہ ہوا۔ غالباً جب میں پہونچا ہوں تو چہارشنبہ تھا وہ دن میں نے کیسے گذارے، خدا بہتر جانتا ہے لیکن روحانی اذیتوں سے میرا جسم ہلکا ہوتا جارہا تھا اور ایک بار سا جو ہر وقت میرے دل پر رہتا تھا وہ تقریباً ہٹ چکا تھا۔ جمعۃ الوداع کی نماز پڑھ لی، کس طرح عرض کروں کہ آپ نے آج کے لئے فرمایا تھا۔ نماز کے بعد حضور نے مجھے حکم دیا کہ جاؤ بھائی آرام کرو۔ چند منٹ کے بعد مجھے نیند کے جھونکے آنے لگے اور میں سوگیا۔ مجھے یہ معلوم ہوا کہ میں مرگیا ہوں۔ لیکن میرے دل میں ایک روشنی چمکی جو پھیلتی گئی اور میری رگ رگ میں پھیل گئی۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ باواز بلند پڑھتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ میں نے دیکھا کہ حضور سامنے سے تشریف لارہے ہیں آپ نے فرمایا: "جاؤ بھائی وضو کر آؤ اب وقت آگیا ہے" آخر مجھ میں وہ کیفیت پیدا ہوگئی جس نے ما فیہا سے مجھے مستغنی کر دیا۔"[1]

---

[1] ہمایوں" مارچ ۱۹۵۱ء صفحہ ۲۵۹ - ۲۶۰

خلاصہ یہ کہ جگر صاحب ابتداء سے حنفی المذہب مسلمان تھے دورِ رندی میں ان کا رجحان دہریت اور شیعیت کی طرف ہو گیا تھا لیکن اصغر صاحب (جو جگر کی پہلی ملاقات کے وقت کسی شبعہ سے مذہبی مسائل پر گفتگو کر رہے تھے) اور شاہ عبدالغنی منگوری سے اس تفصیلی ملاقات کے بعد پھر حنفی العقائد مسلمان ہو گئے جگر صاحب اصغر صاحب سے ملنے کے بعد ان کے خیالات سے اور اصغر صاحب جگر کی داستان غم سے متاثر ہوئے اور ان کو (جگر کو) اپنے یہاں قیام کرنے کی دعوت دی جسے جگر نے منظور کر لیا.

جگر صاحب کا بیان ہے کہ:

"اصغر صاحب کی صحبت نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا، میرے عقائد بھی بدل گئے اور میری زندگی کو ایک نیا رخ بھی مل گیا اصغر صاحب نہیں رہے مگر مجھ پر اب تک ان کا اثر ہے اور ان کا فیض جاری ہے، میرا رنگ اللہ کی وجہ سے بالکل بدل گیا، اس میں بزرگوں کی نظر کا فیض بھی ہے ...... اصغر صاحب اور موجودہ بیوی کے وقت سے روحانی انقلاب شروع ہوا...... میں اصغر صاحب کی کرامت کا قائل ہوں"[۵]

جگر صاحب نواب علی حسین خاں صاحب کی صحبت کے بعد سے مسلمانوں کی اصلاحی تحریک کے علماء کے طبقہ سے زیادہ متاثر ہوئے اور بدعتوں کے مخالف ہو گئے۔

دراصل وہ خلوص ہی کو مذہب کا نچوڑ سمجھتے تھے انھوں نے اپنے مذہبی خیالات کا اظہار اپنے مختلف خطوط میں مختلف احباب سے کیا ہے جن کے اقتباسات سے ان کے مذہبی خیالات کی وضاحت ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں:

"مذہبیت اور مذہب" کے جہاں اور بہت سے احسانات ہیں ایک بڑا احسان اس دورِ ابتلاء میں یہ بھی ہے کہ باایں شدتِ احساس زندہ ہوں اور زندگی کی تمنا رکھتا ہوں کہ شاید کچھ تلافی مافات کر سکوں"[۶]

"قسمت اور خدا کا میں بھی معترف ہوں اور محض رسماً تقلیداً نہیں، لیکن اپنی خامیوں اور کوتاہیوں پر کسی حیثیت سے بھی پردہ ڈالنا پسند نہیں کرتا کیونکر تقدیر یا خدا پر الزام رکھ سکتا ہوں...... میرے لئے صرف مسلم بن جانے کی دعا فرمائیے: ایمان و ایقان کے مقام بلند کا طالب ہوں. اور دوسری بات خاتمہ بخیر ہونے کی، خدا کی رحمتوں سے مایوس نہیں لیکن زندگی اور صحت ساتھ دیتے نظر نہیں آتے"[۷]

---

[۵] "حیاتِ جگر" کا ایک باب۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۴
[۶] مکاتیب جگر" صفحہ ۵۷ و ۱۱۲

"مزاجاً رند واقع ہوا ہوں، عملاً ایک عمر بے عملی و بدعملی میں صرف ہو چکی، دین سے ذہنی طور پر ہمیشہ وابستہ رہا۔ حضرت پیر و مرشد سے بیعت ہونے کے بعد پوری زندگی شدت سے متاثر ہوتی رہی[1]۔"

"میں کیا اور میری دُعا کیا، لیکن جانتا ہوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی محبت اپنی مخلوق سے بے اندازہ ہے بُری اولاد بُری ہی لیکن ماں کی ممتا زیادہ تر اسی جانب رہتی ہے[2]۔"

"میں موت کو حیات پر ترجیح دیتا ہوں بشرطیکہ انجام بخیر (ہو؟) اور ان میں سے کوئی خیر ہمارے اختیار میں نہیں یہ بھی اللہ کا فضل و احسان ہے کہ اس کی یاد آئے جاتی ہے[3]۔"

جگر صاحب اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم کو اس کے قہر و غضب سے زیادہ سمجھتے تھے اور ان کا ایمان تھا کہ اللہ تعالیٰ رحیم و غفار ہے وہ لکھتے ہیں:

"گنہگار ہوں لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ کی رحمتوں پر یقینِ کامل رکھتا ہوں توقع ہے کہ اس بدعمل و بے عمل زندگی میں موت مجھ سے دور رہے گی لیکن فیصلہ تو کیا نہیں جا سکتا ایک عجب کہ خاتمہ بخیر ہی ہو[4]۔"

پھر لکھتے ہیں:-

"میں اور موت تو ایک ایسی صداقت ہے جس سے گریز ممکن نہیں اور اگر ممکن بھی ہو تو ایک نعمت سے گریز کے معنی کفرانِ نعمت نہیں تو اور کیا ہو سکتے ہیں[5]۔"

"مذہبی آدمی" پہلے ہی سے تھا۔ اب کہ عالم ہوش ہے۔ خود میری بھی خواہش ہے کہ بطور تلافیٔ مافات اپنے حدود میں رہ کر بڑی سے بڑی حد تک مذہبی اور اخلاقی خدمات انجام دیتا رہوں[6]۔"

"میرا جسم کافر ہی، روح بھی اس کفر بے پناہ سے متاثر، لیکن کوئی شخص اپنے آپ کو اس حد تک دھوکا نہیں دے سکتا کہ وہ اپنے آپ کو نہ سمجھ سکے۔ خوب جانتا ہوں کہ روح کی گہرائیوں میں ایک بے پایاں مذہبیت ایک بے انتہا درد کی لہریں ہمہ وقت موڈ را

---

[1] "مکاتیب جگر" صفحہ ۱۴۱ [2] مکاتیب جگر صفحہ ۱۲۸

[3] جگر صاحب کا ایک خط نواب شمس الحسن صاحب کے نام جس پر تاریخ درج نہیں ہے۔

[4] جگر صاحب کا ایک خط حاجی اصطفیٰ خاں صاحب کے نام جس پر تاریخ درج نہیں ہے۔

[5] جگر صاحب کا خط مسز شہناز ہاشمی کے نام مورخہ ۳ جنوری ۱۹۵۳ء یہ اور اس قسم کے تمام خطوط راقم نے "جگر کے خطوط" میں شائع کر دیئے ہیں۔

[6] جگر صاحب کا خط نواب سید علی حسن خاں صاحب کے نام جس پر تاریخ درج نہیں ہے۔

رہتی ہیں، ان سب باتوں کے باوجود حساس جس حد تک واقع ہوا ہوں اس کا علم آپ حضرات کو بھی اور مجھے بھی رہے ہے[1]"

"موت کا تخیل، بڑا ہی عجیب اور بہت ہی ہولناک اور عبرتناک ہے، انسان ذرا سی زندگی پر کسقدر مغرور، کسقدر غافل ہے آہ۔ معلوم ہے کہ اُسے کہیں جانا پڑے گا لیکن وہ ہے کہ یوم الحساب سے بے خبر دنیا بھر کو اپنا سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو باقی۔

اگر چشم بصیرت وا ہو تو فطرت کا ہر سکون اور ہر اضطراب، ہمارے لئے درس بصیرت ہے، دفتر نصائح کھولنے کے لئے نہیں بیٹھا ہوں، میں خود بھی انتہائی سیاہ کار انسان ہوں لیکن پھر بھی خدائے قدوس کا بہت بڑا افضل یہ ہے کہ اس سے غافل نہیں ہونے پاتا' اور آنے والے دائمی عالم سے لرزتا رہتا ہوں یہاں تک کہ بعض اوقات نیم جنونی حالات وارد ہوتے رہتے ہیں[2]"

جگر صاحب ایسی جنت کو جہاں کوئی جد وجہد نہ کرنی پڑے اور صرف بیٹھے بیٹھے آرام کی زندگی گذارنی پڑے خدمت کے لئے حور وغلمان ہوں' اپنیچیوں کی زندگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اسے پسند نہیں کرتے، ان کا خیال تھا کہ جب خدا کی ذات لامحدود ہے تو انسان اس جنم میں اچھے کام کرکے خدائی حدود کو کیسے چھو سکتا ہے۔ ان کو دنیا ہی کی ہر چیز نعمت معلوم ہوتی تھی وہ دنیاوی غم کو خدا کی دی ہوئی نعمت سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ بات دوسری ہے کہ انسان میں اس نعمت سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت ہی نہ ہو وہ تو خدا کے قہر کو بھی نعمت سمجھتے تھے وہ اسے بظاہر قہر لیکن دراصل اس ماں کی شفقت سے تعبیر کرتے تھے جو کبھی کبھی ناراض ہو کر اپنے بچے کو ڈراتی ہے اور بعد کو وہ اُسے پیار بھی کرتی ہے۔

جگر صاحب کبھی کبھی نوجوانوں کو مذہبی ادب کے پڑھنے اور اسے سمجھنے کی بھی تلقین کرتے تھے اس سلسلے میں انھوں نے اپنے ایک خط (جو جون یا جولائی ۱۹۴۹ء کا ہے) میں ابرار الرحمٰن قدوائی کو مولانا مودودی کے اصلاحی وتبلیغی لڑیچر کا تفصیلی مطالعہ کرتے رہنے کا مشورہ دیا ہے جس کا ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے۔

محمود علی خاں جامعی نے ان کے دگرگرے، مذہبی عقائد اور اُس پر عمل کے متعلق لکھا ہے:۔

"مذہب کے عقائد کے معاملہ میں وہ سخت ہیں لیکن اعمال مثلاً نماز، روزہ کے معاملہ میں بے عمل ہیں۔ نماز کبھی کبھی پڑھتے ہیں۔ بڑی احتیاط اور انتہائی پاکیزگی کا خیال رکھ کر۔

---

[1] جگر صاحب کا خط نواب سید شمس الحسن صاحب کے نام جس پر تاریخ درج نہیں ہے

[2] جگر کا ایک خط محمد رفیق مرادآبادی کے نام مورخہ ۸ ستمبر ۳۷ء

اکثر کئی کئی دن تک متواتر پڑھتے رہتے ہیں اور بظاہر ان میں پورا خضوع و خشوع ہوتا ہے، پھر ترک ہو جاتی ہے، روزہ میں بہت کمزور ہیں۔ افطار سے کوئی آدھ گھنٹہ پہلے سگریٹ جلا کر ٹہلنے کھڑے ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ افطار تک چار پانچ سگریٹ یونہی جل کر بجھ جاتے ہیں۔"[1]

ماہر القادری لکھتے ہیں:۔

"سفر میں مسلسل جگر مرحوم کے ساتھ رہتا تھا جب بھی اللہ تعالیٰ توفیق دیتا، نماز پڑھتے تو بڑی توجہ اور یکسوئی کے ساتھ پڑھتے، رکوع و سجود اور قعود و قیام میں خشیت جھلکتی ہوئی۔"[2]

فنا نظامی نے ۲۷ مئی ۱۹۶۳ء کی ملاقات میں راقم الحروف سے جگر کی نماز میں ان کے تقدس کے متعلق بتایا کہ ایک دفعہ جگر صاحب نماز پڑھ رہے تھے، دورانِ نماز انھوں نے ہاتھ سے گھڑی کھولی اور اسے الگ رکھ دی اور پھر نماز میں مصروف ہو گئے جب جگر صاحب نے نماز ختم کر لی تو فنا نے ان سے اس گھڑی کے اُتار کر رکھنے کا سبب دریافت کیا۔ جگر صاحب نے فرمایا کہ وہ گھڑی ایک فلم پروڈیوسر نے پیش کی تھی نماز پڑھتے وقت طبیعت کراہت کرنے لگی اس لئے دورانِ نماز ہی گھڑی اتار کر رکھ دی تب نماز میں دل لگا۔

جگر صاحب کا دل آخری ایام میں محبت رسولؐ سے سرشار تھا۔ اور کلام الٰہی بھی سننے کا بے حد اشتیاق ہو گیا تھا۔ اس کے متعلق قیسی الفاروقی ۲۶ مارچ ۱۹۵۹ء کی ڈائری میں لکھتے ہیں:۔

"میرے یہاں حافظ عبدالرشید صاحب ہمیرپور سے تشریف لائے تھے وہ تراویح میں اور نفلوں میں کلام پاک سُنا رہے تھے حضرت جگر نے بھی فرمایا کہ وہ تراویح پڑھنا چاہتے ہیں، کل اور آج تشریف لائے اور بیٹھ کر تراویح پڑھی بعد میں فرمانے لگے کہ تکان محسوس ہو رہی ہے مگر بغیر محنت کے صلہ بھی نہیں ملتا۔ آج میں نے ان کے چہرے پر شگفتگی دیکھی۔"[3]

لیکن بقول شمس تبریز خاں جگر صاحب کی "اکثر نمازیں تحت حلاوت اور تقریباً بے خبری کی حالت میں چھوٹ جاتی تھیں۔"[4]

غرضیکہ جگر صاحب مذہبی عقائد کے معاملہ میں تو پختہ تھے لیکن ان پر عمل کرنے سے قاصر رہتے تھے بس ان کا مذہب یہیں تک محدود تھا

---

۱ متذکرہ جگر، صفحہ ۵۹ و ۶۰

۲ "فاران" نومبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۴۴

۳ "نادرِ وطن" ۲۰ دسمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۸

۴ "فروغ اردو" فروری و مارچ ۱۹۶۱ء صفحہ ۳۴۴

جگر کا ادبی ماحول اور شعر گوئی کی ابتداء

جگر کا تعلق مُراد آباد کے مولویوں کے اُس خاندان سے تھا جو اپنی امارت، وجاہت اور علم و ادب کی بنا، پر مُراد آباد جیسے شہر میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا شعر گوئی و شعر فہمی میں بھی ان کا خاندان ممتاز تھا۔ اُن کے والد، تایا، چچا، پھوپھا، بڑے بھائی وغیرہ سب کے سب شاعر تھے (جگر کے والد علی نظر صاحب نے ایک ضخیم تضمین "باغِ نظر" کے عنوان سے لکھی تھی) ان کے چچا کو وزیر کے خاندان سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ جگر نے ایسی فضا میں آنکھ کھولی اور سنِ بلوغ تک پہونچے جس میں زندگی کی قدیم قدروں کا عزت و احترام تھا۔ جگر کا بچپن اور عنفوانِ شباب، فارغ البالی میں بسر نہیں ہوا اور نہ وہ اعلیٰ تعلیم اور جدید علوم و فنون ہی سے استفادہ کر سکے لیکن ان کو خانگی، سماجی، علمی اعتبار سے ایک خوشگوار فضا ملی جس سے جگر نے خود داری سیکھی اور محنت و تحمل کا درس لیا۔ اِن کے دل میں انسانی درد و محبت کے شریفانہ جذبات پیدا ہوئے۔ ان میں شاعری اور تصوّف کا ذوق بھی اسی فضا سے پیدا ہوا۔ وہ شاعرانہ ماحول میں پیدا ہوئے تھے اور ان کو تمام اہلیتیں وراثت میں ملی تھیں۔ اسی زمانہ میں داغ، حالی، شاد، اقبال، حسرت، ریاض، جلیل، فانی اور اصغر جیسے مشاہیر شعراء اپنے اپنے کمالات کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ یکے بعد دیگرے مندرجہ بالا شعرائے کرام دُنیائے فانی سے رحلت فرماتے گئے اور جگر تنہا ایک عرصہ تک اپنے اخلاقی اقدار کا مظاہرہ کرتے رہے۔ آخر ایک دن ان کو بھی اس دُنیا سے کوچ کرنا پڑا۔ وہ خود اس بنیادی اصول کے قائل رہے تھے کہ اخلاقی اصولوں کو برتنے میں فی الواقع صداقت ہو اس ضمن میں انھوں نے اپنے نظریے کا اظہار اس طرح کیا ہے

"فرد، خاندان اور قوم کی تباہی کا سبب دراصل کردار کی خرابی ہی میں مضمر ہے"[۱]

جگر کی شعر گوئی کی ابتدا بھی اسی ماحول سے ہوئی کوکب مُراد آبادی کا کہنا ہے کہ:۔

"علی سکندر میرا ہم جماعت رہا ہے جب اس کی عمر آٹھ سال کی تھی تو وہ شعر موزوں کرنے لگا تھا، اس کی کاپیوں پر تک بندیوں کے علاوہ سبق کا حصّہ کم ہی ہوتا تھا...... جگر اس وقت بھی بڑا اچھا خطاط تھا اس نے "خطِ طغریٰ" سے لیکر "خطِ شکست" تک کئی خطوط کی مشق کی تھی"[۲]

مولوی خورشید الحسن صاحب (جن کا تذکرہ پچھلے صفحات میں آچکا ہے) لکھتے ہیں:۔

"ان کی شعر گوئی کے متعلق روایتی طور پر اتنا پتا چلا ہے کہ نو، دس سال کی عمر میں شعر کہا تھا"[۳]

پروفیسر آلِ احمد سرور نے لکھا ہے کہ جگر

"۱۳ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے"[۴]

---

[۱] "سہ ماہی اردو" جولائی ۱۹۵۹ء صفحہ ۱۴ [۲] "مادرِ وطن" ۸ جنوری ۱۹۶۱ء صفحہ ۵

[۳] مولوی خورشید الحسن صاحب کا خط مورخہ ۸ اکتوبر ۱۹۶۲ء بنام راقم الحروف [۴] "نظام جدید" ۱۶ و ۲۳ ستمبر ۱۹۶۲ء صفحہ ۲۷

مرزا احسان احمد صاحب نے بھی "داغ جگر" کے مقدمہ میں جگر کی شعر گوئی کی ابتدا تیرہ، چودہ سال کی عمر سے بتائی ہے۔

جگر صاحب نے خود بھی اپنی غزل گوئی کی ابتدا اور اپنی پہلی غزل کے سلسلے میں قیسی الفاروقی کو لکھا ہے کہ

"میں لکھنؤ اپنے تایا کے ساتھ آیا تھا وہیں میں نے پہلی غزل کہی تھی، میرے والد بہت خوش مذاق تھے اور غالب کے معتقد تھے، میرے تایا قتیل کے مداح تھے، میں قتیل پر غالب کو ترجیح دیتا تھا۔ بھائی محمد احمد صاحب مجھ سے عمر میں بہت بڑے تھے اور قتیل کے پرستاروں میں سے تھے۔ ہم دونوں میں تفاوتِ عمر اور کم علمی کے باوجود بحث ہوتی رہتی تھی وہی باتیں جو سنتے رہتے تھے، میں نے جھنجھلاہٹ میں ایک غزل ڈائری میں کہی تخلص بھی قتیل رکھا ایک دن موقع پا کر میں نے بحث چھیڑ دی، میں نے کہا آپ قتیل کی بہت تعریف کرتے ہیں، دیکھئے میں ایک غزل لایا ہوں کتنی پست غزل لکھی ہے، میرا سن ۱۴، ۱۵ سال کا تھا، میں جس قدر مقطع کے قریب آتا جاتا تھا پیچھے ہٹتا جاتا تھا مگر میں دور ہوتا جاتا تھا، مقصد یہ تھا کہ غزل پڑھتے ہی بھاگ جاؤں۔ مقطع کے بعد میں نے جھک کر سلام کیا اور کہا یہ میں نے کہی ہے یہ کہہ کر میں بھاگا اور بھائی صاحب نے مجھے دوڑایا۔ بات بزرگوں تک پہنچی میری طلبی ہوئی، والد صاحب نے غزل مانگی، میں نے انکار کیا۔ والد نے کہا کہ "جھوٹ نہیں بولتے لاؤ غزل" میری غزل دیکھی اور فرمایا "تم شعر ضرور کہو گے مگر ابھی نہ کہو" یہ ماحول کا اثر تھا جو میں نے غزل کہہ لی تھی، مقطع یاد ہے۔ غلط یا صحیح کا بھی ٹھیک سے اندازہ نہ تھا۔"

کرد مارا بیک نظارہ قتیل
ختم بر تو ست اے چہ رعنائی[1]

جگر کی شعر گوئی کی ابتدا کے سلسلے میں تبسم نظامی نے اپنی کتاب "جگر مرادآبادی" (مطبوعہ ۱۹۶۳ء) (جو اس حیثیت سے جگر پر پہلی کتاب ہے) میں لکھا ہے:۔

"جگر صاحب کو زمانۂ تعلیم میں بھی شاعری سے کافی ذوق تھا لیکن وہ اس وقت تعلیمی سلسلے کی وجہ سے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو منظرِ عام پر نہیں لانا چاہتے تھے جگر صاحب کے خاندان نے جس قدر عروج و کمال حاصل کیا، اتنا ہی اسے زوال دیکھنا پڑا یکایک پورے خاندان میں تباہی کے آثار پیدا ہو گئے، سارا گھر حوادث سے دوچار

---

[1] "قومی آواز" ۱۹ ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۴

ہوگیا۔ ان مسلسل غم و آلام نے جگر صاحب کے دل و دماغ کو مجروح اور احساسات کو بیدار کر دیا۔ شاعری کا جو ذوق جگر صاحب کو اپنے اسلاف سے ودیعت ہوا تھا دفعتاً اُبھر آیا اور وہ ہر مادی شے سے مستغنی و بے نیاز ہو کر شعر کہنے لگے اور سلسلۂ نادُنوش بھی جاری کر دیا۔[۱]

تبسم صاحب کے اس بیان میں کہ جگر سارے گھر کے حوادث سے دوچار ہوئے اور مسلسل غم و آلام سے ان کے دل و دماغ مجروح اور احساسات بیدار ہو گئے تھے وغیرہ وغیرہ میں صداقت کا فقدان ہے کیونکہ جگر سارے گھر کے حوادث سے دوچار ہونے کے بجائے خود اپنی زندگی کے مسلسل غم و آلام سے دوچار ہوئے جس کی وجہ سے ان کا دل و دماغ مجروح ہو گیا تھا۔ ایک تو والدین کے انتقال کا غم دوسرے ذریعہ معاش کی فکر تیسرے اپنے معاشقہ میں ایک دلدوز حادثہ کی وجہ سے ان کے دل و دماغ مجروح ہو گئے اور ان کے دل میں سوز و گداز پیدا ہو گیا ان کے احساسات پہلے ہی سے بیدار تھے شاعری کا ذوق بھی رفتہ رفتہ بڑھتا گیا اور جوں جوں ان کے دل و دماغ مجروح ہوتے رہے ان کے کلام میں سوز و گداز پیدا ہوتا گیا انھوں نے سلسلۂ نادُنوش بعض حضرات کے خیال کے مطابق زمانہ طالب علمی ہی سے شروع کر دیا تھا اور بعض کے خیال کے مطابق اپنی پہلی بیوی کے غم میں شروع کیا تھا۔

جگر کے ماحول اور شعر گوئی کی ابتدا کے سلسلے میں شوق مرادآبادی (جگر کے ایک مکتبی ہم جماعت) نے لکھا ہے:۔

"میں اور وہ عمر بھر کے ساتھی یہ چند احباب: علی سکندر ابن مولوی علی نظر صاحب..... دوسرے قاضی جمیل الدین (مرزا غالب کے ہم جلیس قاضی نجم الدین برق کے پوتے اصل وطن گڈھ مکتیشر مقیم مرادآباد) تیسرے حضور احمد ساکن مرادآباد چوتھے حافظ حامد علی خاں (راز مرادآبادی کے والد از خانزادگان مرادآباد گھیر سید خاں) پانچویں قاضی اتقان حسین ابن قاضی مولوی امداد حسین صاحب قاضی شہر مرادآباد۔ چھٹا راقم الحروف زندہ درگور۔ عمر کے کچھ کچھ تفاوت سے، اس دور کے مکتب داریوں کے طفیل میرے گھر پر مستقل قیام اور مدرسۂ امدادیہ کی طالب علمی کے ذریعہ ایک دوسرے سے وابستہ اور مربوط ہوئے۔

جمیل اُٹھتے بیٹھتے شعر کہتے اور سناتے، جگر اور میں داد دیتا حضور منہ اُٹھا اُٹھا کر دیکھا کرتے۔ شعریت جگر کی فطرت میں ودیعت ہوئی تھی۔ جمیل پر اپنے اجداد کی شاعرانہ زندگی منعکس تھی۔ حضور کو شاعر بننا اچھا معلوم ہوتا تھا۔ مجھے شعر سننے اور سمجھنے

---

[۱] جگر مرادآبادی از تبسم نظامی صفحہ ۵

میں لطف آتا تھا۔ اتفاقی کبھی کبھی اپنی پسند کا ایک بے معنی آہ، واہ سے اظہار کیا کرتے اور حامد خاں بھائی سنجیدگی اور خاموشی سے سنا کرتے۔ جگر نے دو ایک نامکمل غزلیں کہیں میں نے بھی کچھ شعر کبھی کبھی موزوں کئے جمیل بھی کہتے رہے۔ حضور نے بھرپور کوشش کرکے کئی غزلیں بہت مرمت طلب گڑھ ڈالیں، منشی حیات بخش رسا رامپوری مغفور جو اصل میں ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے، ہز ہائی نس نواب حامد علی خاں والی رامپور کے درباری شاعر اور ریاست میں وکیل سرکار تھے، ان کی غزل کہیں چھپی تھی، ہم سب نے پڑھی بہت لطف اندوز ہوئے اس کا ایک مطلع اور ایک شعر اس وقت یاد ہے۔

"میری حسرت اور نکالی جائے گی وعدۂ فردا پہ ٹالی جائے گی
تم چڑھاؤ گے مری تربت پہ پھول خاک بھی تم سے نہ ڈالی جائے گی"

جگر پر ہم سب سے زیادہ اثر ہوا۔ اور انھیں کی تحریک سے یہ طے پایا کہ ایک دن ہم سب رسا صاحب سے چلکر ملیں اور ان سے اپنے شعروں پر اصلاح لیناطے کریں بہ الفاظ دیگر انھیں استاد بناکر ہم سب شاعر بن جائیں۔ جگر خاموش رہے مگر رسا صاحب کے ملنے کی تڑپ اور عجلت انھیں ہم سب کے زیادہ تھی انھیں شروع سے اچھا شعر اور اچھا کہنے والا بہت اچھا معلوم ہوتا تھا آخر ایک دن رامپور کا سفر ہوا اور رنگین کے جذبۂ تفریح نے رسا صاحب تک ہمیں پہنچا ہی دیا۔ موصوف بزرگانہ شفقت سے پیش آئے سب کے شعر سُنے، سب کو اصلاح اور اصلاح کے وجوہ بتائے۔ غزلیں بھیجتے رہنے کی اجازت دی کچھ دنوں اسی طرح ہم سب خط وکتابت کے ذریعہ اصلاح لیتے رہے، وائے بر حال میرے، ۱۹۳۸ء تک ہندوستان میں میری بہت سی چیزیں بربادیوں کی نذر ہوگئیں حافظہ بالکل تباہ ہوچکا ہے ورنہ دل چاہتا تھا کہ وہ اصلاحیں پیش کی جاتیں جو ہم چاروں کے شعروں پر رسا صاحب نے وقتاً فوقتاً رقم فرمائی تھیں اور بیشتر میرے پاس محفوظ تھیں لیکن یہ اصلاحیں ایک وقتی جذبہ کا تقاضہ تھیں ہم سب کی شاگردی کا سلسلہ کچھ زیادہ دن نہ چلا اور ہم لوگ تلامیذ الرحمٰن کے زمرے میں آگئے۔ البتہ جگر صاحب پر حضرت رسا کی عقیدت کا اثر کچھ زیادہ رہا اور وہ کبھی کبھی ان کی خدمت میں حاضر بھی ہوتے رہے اب ہم چاروں اصلاح کی اس منزل میں تھے کہ ہم نے آپس میں اصلاح و مشورے کی رسم قائم کرلی تھی چنانچہ اب ۱۹۴۲ء میں جگر نے میرے ایک شعر کا پہلا مصرع خارج کرکے خود مصرع دیا تھا مجھے اپنا مصرع یاد بھی نہیں رہا۔

ہمدم یہ کیا مقامِ محبت ہے دیکھنا گھبرا رہے ہیں جبر سے وہ اور وفا سے ہم

اسی طرح غزلیں، مشاعروں میں شرکتیں، احباب کی نشستوں میں شاعری ہونے لگی، جگر کے شعر سب سے اچھے ہوتے رفتہ رفتہ ترنم بھی بڑھتا گیا اور شہرتِ شخصیت بھی زیادہ ہوتا گیا وہی زمانہ حضرت داغ دہلوی کی زیادہ شہرت و مقبولیت کا تھا۔ جگر چشمے کا کام کرنے لگے تھے جس کی وجہ سے اکثر سفر کرتے اور انھیں سفروں میں داغ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے، ایک دن آکر کہا "لو بھئی ہم تو داغ کے شاگرد ہو گئے اور بس شعر اپنے ہی فطری شعور کے ماتحت کہتے رہے[۱]۔"

شوق صاحب کے اس بیان کی کہ جگر پہلے رسا کے شاگرد ہوئے بعد کو داغ کے، کوئی حقیقت نہیں معلوم ہوتی اور نہ ان کا یہ بیان بھی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ جگر صاحب چشمہ کے کاروبار کے سلسلے میں دہلی پہونچے اور وہاں داغ کے شاگرد بن گئے۔ جگر نے داغ سے اصلاح ضرور لی جیسا کہ انھوں نے خود بھی اعتراف کیا ہے لیکن دہلی جاکر وہ ان کے شاگرد نہیں بنے کیونکہ داغ کا انتقال ۱۹۰۵ء میں ہو گیا تھا۔ اس وقت جگر کی عمر تقریباً پندرہ سال کی تھی، اور وہ زمانہ جگر کی طالب علمی کا زمانہ تھا، اس عمر میں جگر نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور وہ داغ کو صرف ایک غزل بذریعہ ڈاک بھیج سکے تھے، جو اصلاح کے بعد واپس آگئی تھی، اس کے بعد داغ کا انتقال ہو گیا۔ اس لئے شوق صاحب کے بیان میں صداقت نہیں معلوم ہوتی، اس کے علاوہ جگر نے داغ کے انتقال کے بعد رسا سے رجوع کیا تھا داغ سے پہلے نہیں اسلئے شوق صاحب کا یہ بیان بھی صحیح نہیں ہے کہ جگر نے پہلے رسا سے اور بعد کو داغ سے اصلاح لی۔

جگر کی پریشانیاں اور اسبابِ ترکِ وطن (مرادآباد)

تبسم نظامی نے اپنی کتاب "جگر مرادآبادی" مطبوعہ ۱۹۴۶ء میں لکھا ہے:-

"جگر صاحب نے خاندان کی تباہی اور حالات کی ناسازگاری سے دل برداشتہ ہو کر وطن کو خیرباد کہہ دیا اور جادۂ پیمائی اختیار کر لی اور وہ سیاحت و سفر کی منزلیں طے کرتے ہوئے آگرہ پہونچے اور وہاں پہونچ کر عینکوں کے کاروبار کو ذریعہ معاش بنا لیا[۲]۔"

تبسم نظامی کا یہ بیان ایک حد تک صحیح ہے۔ جگر کے آگرہ پہونچنے کا واقعہ جگر کے حقیقی چھوٹے بھائی نے راقم الحروف سے ۲۶ جولائی ۶۳ء کو بتایا کہ:

"بھائی صاحب (جگر صاحب) کے ترکِ تعلیم کے بعد چچا علی ظفر صاحب نے ان کو کسی دفتر میں ملازم رکھا دیا تھا[۳]

[۱] "جگر مرادآبادی" از شوق مرادآبادی (غیر مطبوعہ) [۲] "جگر مرادآبادی از تبسم نظامی صفحہ ۹

[۳] مولوی خورشید الحسن صاحب کے ایک خط سے بھی جگر کی ملازمت کی تصدیق ہوتی ہے انھوں نے ۳۱ مارچ ۶۳ء کے خط میں شوق مرادآبادی کو لکھا ہے:- "جگر نے نوکری کی تھی نجیب آباد میونسپلٹی میں محافظِ دفتر ہو گئے تھے یہ واقعہ ۱۹۱۰ء کا ہے۔"

نہیں پر چچا کے ایک دوست تحصیلدار صاحب بھی رہتے تھے جنھوں نے ایک طوائف سے شادی کرلی تھی۔ بھائی صاحب (جگر صاحب) کا ان کے یہاں آنا جانا تھا۔ رفتہ رفتہ بھائی صاحب کو بھی ان سے (تحصیلدار صاحب کی بیوی سے) محبت ہوگئی اور ایک دن بھائی صاحب کو خدا معلوم کیا سوجھی کہ انھوں نے ایک خط میں اپنی محبت کا اظہار کرکے اسے تحصیلدار صاحب کی بیوی کو دیدیا۔ تحصیلدار صاحب کی بیوی نے وہ خط تحصیلدار صاحب کے حوالے کردیا اور تحصیلدار صاحب نے اسے چچا علی ظفر صاحب کے پاس بھیج دیا۔ جب چچا کو یہ خبر ملی تو انھوں نے بھائی صاحب (جگر صاحب) کو لکھا کہ وہ ان کے پاس جلد پہونچ رہے ہیں۔ بھائی صاحب اس خبر سے بہت گھبرائے اور پریشان ہوکر انھوں نے بھنگ کھالی۔ جب لوگوں کو اس کا علم ہوا تو لوگوں نے دوڑ دھوپ کی اور بھائی صاحب کو ہوش میں لائے۔ ہوش میں آنے کے بعد بھائی صاحب (جگر صاحب) ان سے بھاگ کر آگرہ چلے گئے اور شرم کے مارے تمام عمر چچا علی ظفر کے سامنے نہ گئے اس طرح انھوں نے مرادآباد کی سکونت ترک کرکے آگرہ کی سکونت اختیار کرلی۔"

یہ سچ ہے کہ جگر کی ۱۵-۱۶ سال کی عمر میں ان کے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ اس کے بعد انھیں مختلف قسم کی خانگی پریشانیوں نے گھیر لیا کیونکہ والد کے انتقال کے بعد ان کے سرپرستوں میں ان کے چچا باقی رہ گئے تھے جن سے مندرجہ بالا وجوہ سے وہ ملاقات نہیں کرسکتے تھے۔ آخرکار کچھ دنوں کے بعد ان کے چچا کا بھی انتقال ہوگیا۔ ہوتے ہوتے ان کے بیشتر قریبی اعزا نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور اب وہ صحیح معنوں میں دنیا میں بے یار و مددگار ہوکر رہ گئے۔ بہر حال وہ کسی بھی طرح سے آگرہ پہونچے۔ اور وہاں بی۔ این جیل کے یہاں ایک ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرنا شروع کردیا۔

جگر کی پہلی بیوی آگرہ ہی کی تھیں، جن کا نام وحیدن بیگم تھا۔ وحیدن بیگم سے نکاح کرنے کے بعد آگرہ میں وہ بہت مختصر وقت کے لئے (اندازہ یہ ہوتا ہے کہ غالباً ایک یا دو سال) رہے ہوں گے کہ اسی زمانے میں علی ظفر صاحب (جگر صاحب کے حقیقی چھوٹے بھائی) کو جگر کے آگرہ کے قیام کا علم ہوا تو وہ مع والدہ کے آگرہ چلے گئے اور وہیں جگر کے ساتھ رہنے لگے لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد جگر صاحب اپنی بیوی (وحیدن بیگم)، اور والدہ وغیرہ کو لیکر مرادآباد چلے آئے اور جب ان کی عمر پچیس یا چھبیس سال کی تھی (جیسا کہ خود ان کا بیان ہے) ان کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوگیا۔ یہ حادثہ ۱۹۱۵-۱۶ء میں

لہ اس واقعہ کی تصدیق ان کے ایک شعر مطبوعہ ۱۹۱۶ء (جسے راقم نے "یادگار جگر" میں شائع کرادیا ہے) سے بھی ہوتی ہے۔ شعر ملاحظہ ہو

"وہ کہتے ہیں کہ اس نے جان دیدی سنکھیا کھا کر ۔۔۔ خدا جانے جگر کمبخت کے کیا آگیا دل میں"

ہو سکتا ہے کیونکہ ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۹۰ء ہے۔ جگر غالباً ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۵ء کے درمیان آگرہ میں رہے ہوں گے کیونکہ والدہ کے انتقال سے کچھ دنوں قبل وہ مراد آباد چلے آئے تھے
جگر صاحب نے وحیدن بیگم سے معاشقہ کے متعلق بیان کیا ہے کہ :-

"میری آگرہ کی شادی کی ایک طویل داستان ہے۔ کتنے عرصہ تک ساتھ رہا یاد نہیں۔ وہ میرے ساتھ مراد آباد میں بھی رہیں اس زمانہ میں میری شہرت نمولی تھی ان کا نام وحیدن تھا وہ بہت خوبیوں کی آدمی تھیں نظم "ہلال عید"[1] آغازِ محبت کے زمانے میں لکھی تھی وہ فراق کا نتیجہ تھی۔ میں آگرہ میں تھا وہ پنجابی کہلاتی تھیں پہلے وہ مجھ سے ملتفت نہ تھیں جب عید آئی تو مجھے کوئی مسرت نہ ہوئی یہ نظم اسی کیفیت کی آئینہ دار ہے یہی وہ وقت تھا جب یہ کیفیت تھی کہ ؎

دیکھا جو اُن کے ہاتھ میں دشمن کا ہاتھ ہے
کچھ سوجھتا نہیں مجھے دن ہے کہ رات ہے[2]:

پھر راہ و رسم ہوگئی اور ؎

اُف وہ رُوئے تابناک وچشم تر میرے لئے
ہائے وہ زلفِ پریشاں تا کمر میرے لئے

یہ غزل ہوئی ان سے شادی ہوگئی"[3]

اور وہ جگر صاحب کے ساتھ مراد آباد چلی آئیں۔
مراد آباد آنے کے بعد جگر کو اپنی لاپرائیوں اور لااُبالی پن کی وجہ سے وحیدن بیگم سے ہاتھ دھونا پڑا

---

[1] علی منظر صاحب جگر کے حقیقی چھوٹے بھائی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ بھابھی (وحیدن بیگم) گھر سے خفا ہو کر چلی گئی تھیں انھیں کی جدائی سے متاثر ہو کر بھائی صاحب نے نظم "ہلال عید" میں اپنے دلی کیفیات کا اظہار کیا تھا بھائی صاحب کی اس نظم کے ختم ہونے کے بعد دوسرے ہی دن بھابھی صاحبہ خود بخود گھر آگئی تھیں۔ راقم الحروف کے خیال میں علی منظر صاحب ہی کی بات زیادہ صحیح ہے کیونکہ جگر نے بہت سے واقعات خلط ملط کر کے بیان کئے ہیں۔

[2] جگر صاحب نے اس شعر کے پس منظر کے بیان کرنے میں بھی واقعات کو خلط مبحث کر دیا ہے۔ یہ شعر دراصل اس موقع پر کہا گیا تھا جب انھوں نے عاقل اور اپنی بیوی (وحیدن بیگم) کو اپنی غیر موجودگی میں اپنے گھر پر دیکھا اور جس کی وجہ سے انھوں نے مراد آباد کی سکونت ترک کر دی تھی، اس واقعہ کی تفصیل آگے آئے گی۔

[3] "حیاتِ جگر" کا ایک باب۔ حضرت جگر کی زبانی از فلکی الفاروقی، قومی آواز ۱۹ دسمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۴۔

اس واقعہ کی صحت کا پتہ مندرجۂ ذیل بیانات سے چلتا ہے۔ قمر مراد آبادی لکھتے ہیں:-

"میری اور جگر کی ملاقات کا آغاز ۱۹۳۰ء سے ہوتا ہے جب کہ میری شاعری کا بالکل ابتدائی دور تھا، اور ان کی شاعری شباب پر تھی وہ اس وقت دس بارہ برس کے بعد مراد آباد آئے تھے۔ وہ اپنے معاشقہ میں ایک ناگہانی حادثہ پیش آنے کی بنا پر وطن چھوڑنے پر آمادہ ہوئے تھے اگر ان خیالات میں وہ وطن کو خیر باد نہ کہہ گئے تو شاید ان کی خودداری اور غیر تمندی کو ایک ایسی ٹھیس پہنچتی جسے وہ برداشت نہ کر پاتے انھوں نے اپنی آرزوؤں کی دنیا تیاگ دی اپنی امیدوں پر پانی پھیر دیا لیکن اپنی انسانی عظمت اور خودداری فطرت کو مجروح نہ ہونے دیا یہی وہ حادثہ تھا جس نے جگر کو جگر بنا دیا۔"[1]

اس حادثہ کا سراغ جگر کے ایک خط بنام مسکین اکبر آبادی سے بھی ملتا ہے (اس خط کے سنہ کا اندازہ مسکین صاحب نے راقم الحروف سے ۳۵ء سے پہلے کا بتایا) اس حادثہ سے متاثر ہو کر مراد آباد سے چلے جانے اور ایک عرصے کے بعد وہاں واپس آنے کے متعلق جگر صاحب لکھتے ہیں:-

"غالباً بارہ چودہ برس کے بعد وطن کا رخ کیا تھا۔ خیر۔"

یہ جملہ کتنا ہی مختصر سہی پھر بھی جگر کے اس زمانہ کے واقعات کا آئینہ دار ہے اس ایک جملہ میں معنی کی دُنیا پوشیدہ ہے۔ اس جملہ کا اندازِ تحریر بتاتا ہے کہ جگر مراد آباد سے کسی دلسوز حالات کی وجہ سے چلے گئے ہوں گے اس سے ان کی مُراد آباد سے ناراضگی کا بھی پتا چلتا ہے ان کا "خیر" بہت پُرمعنی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اور بھی کچھ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن کہتے کہتے رہ گئے اور "خیر" لکھ کر اس واقعہ کو وہیں ختم کر دیا۔

صفیر احسنی جلال آبادی کے مضمون سے بھی جو "صبح اُمید" جولائی ۱۵ء میں صفحہ ۵۹ پر شائع ہوا ہے اس واقعہ کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس کے بعد جگر ایک خاص وجہ کے تحت باہر نکلے اور چشمے کی ایجنسی فروغ کی۔"

جگر صاحب کے ایک بیان سے بھی اس واقعہ کی صداقت کا پتا چلتا ہے جس کا صدمہ ان کیلئے ناقابلِ برداشت تھا۔ ان کا بیان ہے کہ،

"بچپن ہی سے حُسن سے مجھے ایک خاص ربط و نسبت رہی' رفتہ رفتہ یہ نشہ تیز تر ہوتا گیا اس کی تکمیل آگرہ کے قیام میں ہوئی' زاں بعد حالات اس درجہ اندوہناک ہوتے چلے گئے کہ غالباً حضرت اصغر کے توسط سے مجھے آستانہ منگوڑ سے شرف غلامی حاصل نہ ہو جاتا تو یقیناً یا تو خودکشی کر چکا ہوتا' ورنہ بقول خود میرے ایک دوست کے زینت صحرا ہوتا۔"[2]

---

[1] "نظام جدید" ۱۶ و ۲۳ ستمبر ۶۲ء صفحہ ۱۳

[2] "جامعہ" اکتوبر ۶۱ء صفحہ ۲۵۱

انھوں نے (جگر نے) ایک جگہ اور بیان کیا ہے کہ:-

"اس حادثہ کا مجھ پر اس قدر شدید اثر ہوا کہ میں جس چیز کو دیکھتا تھا مجھے سرخ نظر آتی تھی۔"[1]

اس حادثہ کی تفصیل مختلف لوگوں نے راقم الحروف سے مختلف طریقوں سے بیان کی جن میں مولوی خورشید الحسن مراد آبادی، محمد رفیق مراد آبادی (جگر کے قدیمی احباب) اور علی مظفر (جگر کے حقیقی چھوٹے بھائی) وغیرہ کے بیانات مستند ہیں ان حضرات کے بیانات میں سے میں صرف علی مظفر صاحب کا بیان یہاں نقل کروں گا جو سب سے زیادہ مستند ہے علی مظفر صاحب نے راقم الحروف سے ۲۶ مئی ۶۳ء کو ایک ملاقات میں بتایا کہ:

"ہم لوگ کچھ دنوں آگرہ میں رہے اس کے بعد بھائی صاحب اور بھابھی صاحبہ کے مراد آباد چلے آئے یہاں تھوڑے ہی دن گذرے تھے کہ محمد عاقل صاحب جو بھابھی صاحبہ (وحیدن بیگم) کے عزیزوں میں تھے اور رشتہ میں بھائی لگتے تھے انھیں کے یہاں بھائی صاحب (جگر صاحب) ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتے تھے ان کا بھی گھر میں آنا جانا ہوگیا رفتہ رفتہ ان سے کچھ بے تکلفی بڑھ گئی جو ایک حد تک مشکوک تھی ایک دن میں نے ان کو بھابھی سے ناشائستہ مذاق کرنے پر ڈانٹ بھی دیا تھا کیونکہ ان کا مذاق بھدے قسم کا تھا اسی لئے میں نے ان سے کہہ دیا کہ اگر آپ کو گھر میں آنا ہو تو قاعدے سے آیا کیجئے ورنہ بھائی صاحب کی غیر موجودگی میں آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بھائی صاحب کو بھی اس بات کی خبر ہوگئی اور وہ بھابھی (وحیدن بیگم) سے ناراض ہو کر گھر سے چلے گئے بھابھی صاحبہ نے ان کا تقریباً چھ ماہ تک انتظار کیا اور جب بھائی صاحب واپس نہ آئے اور ان کا کوئی پتا بھی نہ چلا تو انھوں نے محمد عاقل سے اس شرط پر نکاح کر لیا کہ وہ نکاح کے بعد اجمیر چلی[2] جائیں گی چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ نکاح ہو جانے کے بعد وہ اجمیر چلی گئیں اور تاحیات اجمیر کی چہار دیواری سے باہر قدم نہ نکالا، اور نہ محمد عاقل ہی سے ملیں، آخر کار ان کا وہیں انتقال ہو گیا۔ اس حادثہ کے بعد ہی بھائی صاحب نے مراد آباد چھوڑ دیا اور شہر شہر مثلاً اناؤ، کانپور، اعظم گڈھ، گونڈہ اور مین پوری وغیرہ گھومتے اور وہیں قیام کرتے رہے اور کئی سال کے بعد مراد آباد واپس آئے۔"

مولوی خورشید الحسن صاحب اور محمد رفیق صاحب کا بیان ہے کہ جب جگر کو اپنی بیوی (وحیدن بیگم) کے محمد عاقل سے تعلقات کا علم ہوا تو انھوں نے ایک دن عاقل سے کاروبار کے سلسلے میں دور دراز سفر پر جانے کا بہانا کیا اور عاقل کے ساتھ اسٹیشن تک جا کر ———

---

[1] "سہ ماہی اردو" جولائی سنہ ۵۹ء صفحہ ۵۰۔

[2] راقم الحروف کو علی مظفر صاحب کی اس بات سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ جب ان کا اجمیر ہی جانے کا خیال تھا تو محمد عاقل سے نکاح کی کیا ضرورت تھی۔

ٹرین میں بیٹھ گئے اور دوسرے اسٹیشن پر جا کر اُتر پڑے اور گھر آگئے یہاں آئے تو دیکھا کہ عاقل صاحب ان کے گھر میں موجود ہیں یہ دیکھ کر وہ اُلٹے پاؤں واپس ہو گئے عاقل اور وحیدن بیگم نے بہت کچھ روکنے اور سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانے اور مراد آباد سے چلے گئے، خورشید الحسن صاحب نے بتایا کہ بعد کو عاقل نے بیان دیا کہ وہ صرف ان کی خیریت لینے گئے تھے لیکن یہ وحیدن بیگم کی بد قسمتی تھی کہ اسی وقت جگر بھی آ گئے اور ان کے شبہ کی تصدیق ہو گئی آخر میں عاقل نے مجبوراً وحیدن بیگم سے نکاح کر لیا۔

اسی واقعہ کو محمد عابد شمسی مراد آبادی نے "مادرِ وطن" ۱۶ جون سنہ ۱۹۶۱ء میں "روشن فاطمہ اور جگر" کے عنوان سے ایک مضمون میں خلط ملط کر کے بیان کیا ہے اصل واقعہ روشن فاطمہ اور عاقل کا تھا لیکن شمسی نے عاقل سے خاندانی مناقشات کی بنا پر ان کو بدنام کرنے کے لئے جگر کو بھی شامل کر لیا۔ راقم الحروف اس واقعہ کے تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں سمجھتا۔

جگر صاحب ابتدا سے ایک لااُبالی انسان تھے اور راقم السطور کا خیال ہے کہ وحیدن کے ان سے چھن جانے کا ایک سبب ان کا لااُبالی پن بھی رہا ہوگا کیونکہ وہ وحیدن بیگم سے شادی کے بعد بھی عرصہ تک گھر سے غائب رہا کرتے تھے اور اپنی بیوی کے اخراجات کی بھی کوئی فکر نہیں کرتے تھے، وہ ان کی غیر موجودگی میں اپنے زیورات بیچ بیچ کر آگرہ میں گھر کا خرچ چلایا کرتی تھیں۔ اور جب جگر صاحب گھر واپس آتے تھے تو وہ ان سے اپنے زیورات طلب کرتی تھیں۔ جگر صاحب فوراً ان کو نئے زیورات بنوا بھی دیتے تھے۔ اکثر جب ان کی اطلاع عرصہ تک نہ ملتی تو جگر کی والدہ ماجدہ بہت بے چین ہوتیں اور کسی کو مامور کر کے ان کا پتا لگواتی تھیں۔

بہت ممکن ہے کہ جگر کی اس زندگی سے عاجز آ کر انھوں نے عاقل سے رابطہ بڑھا لیا ہو۔

غرضیکہ یہ ایک ایسا حادثہ تھا جس کی وجہ سے جگر کو اپنا وطن مُراد آباد چھوڑنا پڑا۔

اس حادثہ کے بعد وہ گھومتے پھرتے گونڈہ پہونچے وہاں ان کی اصغر سے ملاقات ہوئی اُنھوں نے ان کے دُکھے ہوئے دل کو پہچانا اور اس پر مرہم رکھا، اصغر نے ان کے سکونِ قلب کی خاطر اپنی سالی نسیم بیگم سے غالباً سنہ ۱۹۲۰ء میں ان کا عقد کرا دیا۔

نسیم بیگم سے نکاح ہو جانے کے بعد بھی جگر کی مے نوشی کم نہ ہوئی اور قیس الفاروقی کی تحریر کے مطابق "ان کی فطری لاپروائی، مدہوشی اور سرمستی بدستور رہی اور حالات نے پھر ایک بار کروٹ بدلی، حضرت اصغر گونڈوی کی اہلیہ اور محترمہ نسیم اور خود حضرت اصغر گونڈوی مولانا شاہ عبدالغنی کے مرید تھے دونوں بہنیں صوم و صلوٰۃ کی پابند تھیں اور اب حضرت جگر بھی اسی خاندان کے ایک فرد تھے مہینوں لاپتہ رہتے تھے نہ خیریت لکھتے تھے نہ عافیت پوچھتے تھے آمدنی پیمانے میں گھل جاتی تھی۔ تن بدن کا ہوش نہیں گھر سے ملتے سے بے نیاز شہر شہر گھومتے

رہتے تھے، اگر گونڈہ آنا بھی ہوتا تھا تو بہت جلد واپس چلے جاتے تھے۔

حضرت اصغر گونڈوی کی پہلی شادی کہیں اور ہوئی تھی ان سے ایک بچّی بھی ہوئی تھی، اس لڑکی کی بھی شادی ہوئی اور اس سے بھی ایک بچّہ پیدا ہوا مگر وہ لڑکی اور اس کا بچّہ دونوں ہی جلتے رہے گونڈہ میں اصغر صاحب نے دوسری شادی محترمہ نسیم جگر کی بڑی بہن سے کی۔ اس وقت ان کی پہلی بیوی حیات تھیں۔ اس دوسری بیوی سے حضرت اصغر گونڈوی کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

بڑی بہن نے حضرت جگر کی بے فکری کی زندگی سے عاجز آ کر حضرت اصغر گونڈوی کو مشورہ دیا کہ وہ انھیں طلاق دے دیں اور جگر نسیم کو طلاق دے دیں اور وہ (اصغر) نسیم سے شادی کر لیں۔ خیال یہ تھا کہ بڑی بہن کے کوئی اولاد اصغر صاحب سے نہیں ہوتی تو شاید محترمہ نسیم سے ہو جائے اس طرح یہ بھی نوبت آئی کہ محترمہ نسیم سے جگر صاحب کی کنارہ کشی ہو گئی اور کچھ عرصہ بعد حضرت اصغر گونڈوی نے نسیم سے شادی کر لی حضرت جگر سے ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔

حضرتِ جگر کی شراب نوشی کا اب بدترین دور شروع ہوا، ان کے بھائی علی مظفر صاحب کا کہنا ہے کہ اس دور میں بھائی صاحب نے جتنی شراب پی، اس سے قبل کبھی نہیں پی۔ اس زمانے میں حضرت جگر کا قیام زیادہ تر کانپور، علی گڑھ اور مین پوری میں رہا۔ کسی نہ کسی دوست کے ساتھ رہتے تھے اور وہ ان کی دلجوئی میں مصروف رہتا تھا نہ انھیں مشاعرے کی آمدنی کی فکر تھی نہ اس کا ہوش تھا[1]

نسیم بیگم سے طلاق ہونے کے بعد بھی ان کی لاپروائیوں میں کوئی کمی نہ ہوئی اس کے بعد ان کی مالی پریشانیوں میں مزید اضافہ ہوا جس کا اندازہ ان کے ایک خط سے لگایا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے نواب سید شمس الحسن صاحب خلف نواب سید علی حسن صاحب (مالک بھوپال ہاؤس لکھنؤ) کو بغیر تاریخ کے لکھا ہے:۔

"فی الوقت دو روپیوں کی ضرورت ہے آپ کو معلوم ہے میرے پاس کچھ نہیں پھر اس پر طرہ یہ دکھ، اس زمانے میں علیل بھی ہوں ہزار طرح کی ضرورت واقع ہوتی رہتی ہے، مثلاً سگریٹ دوا، دھلائی۔ اکثر اوقات دودھ، برف وغیرہ۔"

اس اقتباس سے جگر کی عسرت کی زندگی اور ان کی پریشانیوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ زمانہ جگر کی کس قدر عسرت کا زمانہ رہا ہوگا۔

اسی زمانہ میں جگر کچھ عرصہ اناؤ میں بھی رہے جہاں ان کو رمزآں جیسے قدرداں مل گئے۔ جگت موہن لال رواں صاحب نہ صرف یہ کہ ان کے لئے اچھی سے اچھی شراب کا انتظام کرتے تھے

---

[1] "حیاتِ جگر" (غیر مطبوعہ) از قیسی الفاروقی۔

بلکہ وہ ان کی ہر طرح کی آرام و آسائش کا خیال رکھتے تھے اور طرح طرح سے اُن کی خاطر و مدارات کرتے رہتے تھے

جگر نے اپنے اس زمانہ کی بادہ کشی کے متعلق خود بھی فرمایا ہے ؎

جگر کی بادہ کشی ان دنوں معاذ اللہ
جب آپ دیکھیں گے غرقِ شراب دیکھیں گے

اور یہ حقیقت ہے کہ ان دنوں ـــــ ان کی بادہ کشی بہت عام اور بے انتہا بدنام تھی جس کی خبر جلیل قدوائی کی والدہ جیسی پردہ نشین خاتون کو بھی ہو گئی تھی۔ اور انھوں نے جگر کا غائبانہ تعارف جلیل سے بطور ایک تنبیہ کے اس طرح کرایا تھا:۔

"سُنا ہے کہ آج کل تمھارے رواںؔ کے ہاں کوئی عجیب موذی آیا ہوا ہے جو شاعر ہے اور ہر وقت نشے میں دھت رہتا ہے ایسے ہی بنے ہوئے مولویوں نے مذہب کو بدنام کر رکھا ہے تمھارے بھائی جان (والد صاحب) کہتے تھے کہ جلیل سے کہنا کہ رواںؔ کے ہاں جائے تو اس موذی سے احتیاط برتے"[1]

رواںؔ جگر کے بڑے قدردانوں میں سے تھے اسی زمانے میں انھوں نے بقول جلیل قدوائی کے جگر کا

"چشموں کا بکس کہیں ٹھکانے لگا دیا تھا اور اس کے بعد وہ کبھی ان کے ساتھ نہیں دیکھا گیا"[2]

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جگر نے چشمے کا کاروبار دورانِ قیامِ اناؤ چھوڑا جو قابلِ یقین بھی ہے کیونکہ رواںؔ صاحب جگر کی ہر طرح خاطر و مدارات کے ساتھ ساتھ ان کو خرچ کے لئے کافی روپے بھی دیتے رہتے تھے جسے جگر صاحب معلوم نہیں کہاں خرچ کر ڈالتے تھے۔ اور جلیل قدوائی کی تحریر کے مطابق:

"اس خیال سے کہ جگر صاحب کو یہ احساس نہ ہو کہ وہ کسی پر بار ہیں اناؤ ڈسٹرکٹ گزٹ کی ایڈیٹری ان کے سپرد کر دی گئی تھی مگر دفتر جانے کی پابندی نہ تھی۔ ڈسٹرکٹ بورڈ سے اس کام کے انھیں تنخواہ بھی یا ہوار ملتے تھے"[3]

اس زمانہ کی جگر صاحب کے ساتھ ایک صحبتِ شب کی یادگار میں رواںؔ نے حسبِ ذیل رباعی کہی تھی ؎

فطرت کی نگاہیں نہ بھولے گی ہمیں
نکھری ہوئی چاندنی نہ بھولے گی ہمیں
جب ہم تھے جگر تھے اور بزمِ بادہ
وہ رات رواںؔ کبھی نہ بھولے گی ہمیں

---

[1] "العلم" جولائی تا ستمبر ۶۲ء صفحہ ۹
[2] " " " صفحہ ۱۱
[3] " " " صفحہ ۱۰

غرضیکہ جگر کا یہ زمانہ ذہنی طور پر انتہائی پریشان کن زمانہ تھا۔ جگر نے اپنی زندگی کی پریشانیوں کو خود مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"میری زندگی گوناگوں انقلابات و تغیرات کا مجموعہ ہے جسے بہم مصائب و آلام کی آمیزش نے خدا جانے کیا سے کیا بنادیا ہے۔ لیکن میں منہ بنا بنا کر رونے دھونے کو بالطبع سخت ناپسند کرتا ہوں۔ خود میں نے کہا ہے ؎

جاں ہمہ سم ساختہ، رقصم بہ عشق

دل ہمہ خوں کردہ، خنداں می روم[۱]

جگر صاحب کا یہ بیان خواہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو لیکن اس میں ان کی پوری زندگی کا عکس موجود ہے۔

انھوں نے ایک دوسری جگہ اپنی پریشانیوں اور اس کی وجہ سے کلام کے سرمایہ کے ضائع ہو جانے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"یہ میں فخر سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ انتہائی درد کے ساتھ، کہ میری زندگی کا ہر شعبہ سخت پریشان اور کج دلرتع ہوا ہے۔ خدا جانے کس قدر سرمایہ کلام ضائع ہو گیا اور کس قدر اغیار نے فائدہ حاصل کیا"[۲]

جگر کی اپنی انتہائی پریشانی کے زمانہ میں بھی اصغر گونڈوی سے عقیدت باقی رہی وہ اپنے اس دور سرشاری میں جہاں جہاں جاتے اصغر کا کلام ساتھ لے جاتے تھے اور اسے بڑی عقیدت کے ساتھ نجی محفلوں اور مقامی مشاعروں میں بڑی خوش الحانی کے ساتھ پڑھتے رہتے تھے۔ ان دنوں جگر مقبول عام اور اصغر کے کلام کے حافظ ہو گئے تھے۔

جگر صاحب نے اصغر کے احسانات اور نسیم بیگم سے مطلقہ زمانے کی روداد قلبی الفاظ و قمی سے یوں بیان کی ہے:۔

"اصغر صاحب کے مجھ پر بہت احسانات ہیں ان کے گھر کا ماحول مذہبی تھا میں نے یہیں شادی کرلی۔ اصغر صاحب کی بیگم اور میری بیگم سگی بہنیں ہیں۔ حضرت کے سب مرید تھے وہ زمانہ میری شہرت کا زمانہ تھا عسرت میں بسر ہوتی تھی۔ میں لاپرواہ تھا اور بہت کم گونڈہ میں رہتا تھا نسیم بہت خوددار ہیں۔ شاید اصغر صاحب کی تربیت کا اثر ہو، میں باوجود تمام

۱۔ "شعلۂ طور" ایڈیشن ۱۹۳۲ء صفحہ ۱۹۰

۲۔ "تحریک" اکتوبر ۱۹۶۲ء صفحہ ۳۱

باتوں کے ان کی دلجوئی کرتا ہوں ان پر ایک وہ بھی دور گزرا ہے کہ ان پر فاقے گزرے ہیں مگر انھوں نے اپنی ماں، بہنوں، بھائی پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ لحاف میں روئی نہیں رہ گئی اور سردی کھاتی رہیں مگر صبح اٹھکر لحاف چھپا دیتی تھیں کہ کسی کی نظر نہ پڑے۔ نہ حرفِ شکایت زبان پر لائیں نہ دستِ سوال بڑھایا پھر ان سے کنارہ کشی ہو گئی۔ اس دور میں میری عجیب حالت ہو گئی، میں اصغر صاحب کی کرامت کا قائل ہوں ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا، میاں تم چاہے جہاں چلے جاؤ آنا تمھیں اسی دروازے پر پڑے گا'

مین پوری میں اصغر حسین صاحب مختار میرے خاص الخاص دوست تھے تسنیم سے جدائی کی اصل وجہ شراب تھی اور ہر اعتبار پر مزاج کا اختلاف بھی تھا۔ مجھے مضمحل دیکھکر اصغر حسین صاحب مجھے ایک جگہ لے گئے وہ ایک طوائف تھیں اصغر حسین صاحب نے کہا کہ میں کچہری چلا جاتا ہوں تم یہیں رہا کرو، میں نے محسوس کیا کہ میں خطرے میں ہوں، مشغلہ کا کوئی تصور نہیں تھا۔ میں نے جانا ترک کر دیا۔ اسی زمانے میں میرے مرنے کی خبر کسی نے اڑا دی۔ کسی تقریب میں وہ مختار صاحب کے یہاں تشریف لائی تھیں میری موت کی خبر سے ان پر بہت اثر ہوا تھا چلتے وقت انھوں نے کہا "آپ آیا کریں" میں نے پھر جانا شروع کر دیا۔ بغیر کسی وجہ کے یکا یک انقباض ہوا اور میں یہ کہہ کر چلا آیا کہ "میں چلا" انھوں نے شادی کا پیغام دیا مگر میں نے انکار کر دیا۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ میں مین پوری میں علیل تھا۔ اصغر حسین صاحب ان کا ہاتھ پکڑے ہوئے میرے پاس آئے انھوں نے کہا "سنا ہے آپ علیل ہیں"۔ میں — "جی نہیں۔ اب میں پہلے سے بہت بہتر ہوں" انھوں نے کہا "آپ شاعر نہیں معلوم ہوتے کیا کوئی محبت کرنے والا یہ پسند کرتا ہے کہ اس کا محبوب اپنی شکست کا اعلان کرے"

یہ ایک ایسی بات تھی کہ میں پھر آنے جانے پر مجبور ہو گیا۔ "شعلۂ طور" کے یہ اشعار

دست در دست نگارِ شوخ و سیر کوہِ طور — بود حاصل ہر تمنائے کہ پنہاں داشتم

در فضائے آسمانِ حسن چوں سیارگاں — اصغر و ہم شاد و ہم اختر غزلخواں داشتم

گہ بہ زیرِ طور ہیم دعوتِ ذوقِ نظر — گہ بہ سقفش دولتِ حسن خراماں داشتم

یہ اسی زمانہ کی غزل ہے، بات یہ تھی کہ آپس میں گفتگو کرنے کے لئے اس جگہ کا نام طور رکھ لیا تھا۔ وہ ابھی زندہ ہیں۔ حج بھی کیا ہے، وہ اس وقت پاکستان میں ہیں۔ "کلائیاں تو بہ" انھیں کے لئے کہا تھا۔

اس زمانے میں میری آمدنی بھی بڑھ گئی تھی۔ اور شہرت بھی کافی تھی، دور دور سے

رشتے آرہے تھے، بھوپال سے بھی رشتہ آیا تھا۔ مجھ سے طلاق کے بعد نسیم سے اصغر صاحب نے شادی کرلی تھی اور ان کی بڑی بہن کو طلاق دے دی تھی۔ میرے اور اصغر کے درمیان اس معاملہ میں کوئی کشیدگی نہیں ہوئی، اصغر صاحب نے نسیم کو وصیت کی تھی کہ اگر جگر شراب ترک کردے تو اس سے شادی کرلینا۔

جب بھوپال سے پیغامات آئے تو دل نے کہا' سوچ سمجھ لو۔ گونڈہ کا معاملہ تمھارا جانا پہچانا ہے میں نے نسیم ہی کو ترجیح دی، جب میں پوری سے چلا تھا تو یہ کہکر چلا تھا کہ نسیم سے شادی کی کوشش کروں گا، یہاں آنے پر پیغام دیا تو گھر میں ان کی بڑی بہن نے کہا 'تم بھی حضرت ہی کے مرید ہو وہیں عرض کرو، مجھے مایوسی ہوئی' میں نے حکیم عبدالباری صاحب سے خط و کتابت کی اس لئے کہ وہ میرے پیر بھائی تھے انھوں نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ میں علی گڑھ چلا گیا۔ رشید احمد صدیقی صاحب نے میرے تاثرات کو دیکھتے ہوئے منگلور اور گونڈہ خطوط لکھے، گونڈہ سے بھی خط وہاں گیا۔ حضرت کے صاحبزادے نے فرمایا کہ 'حضرت ہوتے تو جگر یوں ٹھوکریں نہیں کھاتا پھرتا' بہر حال یوں تجدید ملاقات ہوئی ہے[1]

یہ "تجدید ملاقات" غالباً ۱۹۴۶ء میں ہوئی تھی۔

جگر نسیم بیگم سے بہت محبت کرتے تھے، انھیں کی یاد سے متاثر ہوکر انھوں نے یہ شعر کہا تھا[2]

بھوپال گرچہ خلد بداماں ہے اے جگر
دل کیا شگفتہ ہو کہ نسیم جگر نہیں

نسیم بیگم سے دوبارہ شادی کے وقت ان کی عمر تقریباً پچاس سال کی تھی۔ اس وقت سے انھوں نے گونڈہ ہی میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ اور جب کبھی کسی مشاعرے میں شریک ہونے کی غرض سے کہیں باہر گئے اور دو چار مہینے یا سال بھر کے بعد جب بھی واپس ہوئے تو گونڈہ ہی آئے جب وہ اپنے فارغ البالی کے زمانے میں سفر سے واپس آتے تو اپنے ہر ملنے والے کے لئے تحفے تحائف لاتے تھے، کپڑوں پر ہزار، پانچسو روپے خرچ کردینا ان کے لئے کوئی بڑی بات نہیں تھی، وہ نسیم بیگم کے لئے اپنے مختلف اوقات میں اس قدر کپڑے اور زیورات لاتے تھے کہ ان کے بہت سے کپڑے جگر کے آخری وقت تک بالکل نئے رکھے رہ گئے۔ ایک دفعہ قیسی صاحب نے ان کو اس قدر قیمتی اور زیادہ مقدار میں کپڑوں کے خریدنے سے منع کرنا چاہا تو جگر صاحب نے

---

[1] "حیات جگر" کا ایک باب حضرت جگر کی زبانی از قیسی الفاروقی قومی آواز ۱۹ ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۴

اُن سے کہا:-

> "جی آپ نہیں سمجھ سکتے۔ میں نے زمانۂ رندی میں جو اذیتیں پہنچائی ہیں اور انھوں نے میرے لئے جو تکالیف برداشت کی ہیں اس کا آپ کو اندازہ نہیں ہو سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ میں اس کا کچھ بار کم کردوں"[1]

غرضیکہ جگر صاحب مراد آباد کی سکونت ترک کرنے کے بعد یوں تو اُناؤ، کانپور، لکھنؤ، مین پوری، اعظم گڑھ وغیرہ مختلف مقامات پر رہے لیکن مراد آباد کا ترک سکونت کے فوراً بعد ابتداء میں کچھ عرصہ تک گونڈہ میں رہے اور اپنی عمر کے آخری بیس سال میں بھی انھوں نے گونڈہ ہی کو اپنا مستقر بنائے رکھا۔

زندگی کے چند اہم واقعات ہر شخص کی زندگی میں کچھ نہ کچھ واقعات پیش آتے ہیں۔ جگر کی زندگی بھی سیکڑوں قابل یادگار واقعات سے بھری پڑی ہے وہ حسن کے پجاری تھے۔ عشق کیا تو اسے عروجِ کمال تک پہونچایا اور اس میں ناکامی ہوئی تو شغل مے نوشی اختیار کیا۔ شراب جو شروع کی تو بس جگر اور شراب، شراب اور جگر، دونوں لازم و ملزوم بن کر رہ گئے۔ اسے چھوڑی تو رمی کا کھیل اختیار کیا اور اس کھیل کو بھی انتہا تک پہونچا دیا۔ تین تین چار چار دن تک مسلسل رمی کھیلتے رہنا ان کے لئے کوئی بڑی بات نہ تھی پان اور چائے نوشی کی بھی حد کردی۔ ایک دفعہ ان کو ایک فلم "آسمانی مشاعرہ" میں بھی کام کرنے کا اتفاق ہوا لیکن اس کے بعد نہ تو انھوں نے کسی فلم میں کام کیا اور نہ کبھی کسی فلم کو کوئی غزل ہی دی۔

جگر کی زندگی کے مندرجہ بالا واقعات کی تفصیل درج ذیل ہے۔

معاشقے جگر کی زندگی میں حسن سے متاثر ہونے کا جذبہ ایک اہم عنصر تھا جو ان کی فطرت میں بچپن ہی سے روح بس گیا تھا۔ انھوں نے اپنے عشق کی ابتداء کے متعلق خود ہی بیان کیا ہے کہ:

> "عشق کی ابتداء حیرت ناک طور پر ہوئی۔ مراد آباد میں میرے تایا کے ایک کرایہ دار تھے میری عمر سات آٹھ سال کی تھی، مجھے کوئی احساس بھی نہیں تھا۔ مگر کچھ دنوں میں یہ — ہو گیا کہ میں ان کے گھر جاتا اور ان کی بیوی کو پہروں دیکھا کرتا۔ پھر میں گروی چلا گیا چار سال بعد آیا تو انھوں نے محلہ چھوڑ دیا تھا۔ ایک دن حضور احمد صاحب مراد آبادی کے مکان سے اٹھکر

---

[1] "حیاتِ جگر" حالاتِ زندگی (غیر مطبوعہ) از قیسی الفاروقی

سامنے کے ایک مکان میں بے اختیارانہ چلا گیا۔ وہ لکھنؤ والی کہلاتی تھیں، میں نے اُنھیں دہی پا یا وہ بہت مسرور ہوئیں، ہمیں بار بار جانا پڑا، تیسری مرتبہ جب گونڈے سے آیا تو اس بار مسلسل ایک خلش نامعلوم تھی، حضور احمد صاحب سے دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ میاں اس کا تو انتقال ہو گیا[1]

یہ واقعہ ۱۸۹۷ء سے ۱۹۰۲ء کے درمیان کا ہو سکتا ہے۔

جگر صاحب نے نواب سید شمس الحسن صاحب سے بھی اپنے ایک محبت کے واقعہ کو بیان کیا تھا جسے نواب صاحب نے راقم الحروف کو یکم اکتوبر ۱۹۶۲ء کے خط میں یوں تحریر فرمایا ہے۔

"ایک اور واقعہ جو انھوں نے اپنی ابتدائی عمر کا بتایا تھا وہ یہ کہ جب وہ سنِ بلوغ کو بھی نہیں پہونچے تھے انھیں اپنی کسی عزیزہ[2] سے شدید محبت ہو گئی تھی حالانکہ وہ عمر میں اُن سے کہیں بڑی تھیں۔"

ایک اور واقعہ جگر صاحب نے بیان کیا ہے کہ:۔

"میری عمر کوئی بارہ تیرہ سال کی ہو گی میں ایک دن باہر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک لڑکی جس کی عمر کوئی دس گیارہ سال کی ہو گی سر پر ایک گھڑا اور ہاتھ میں ایک بالٹی لئے سامنے سے گزری میری آنکھیں اس سے چار ہو گئیں[3]۔ خدا جانے ان آنکھوں میں کس بلا کا جادو تھا کہ میں ملتے دیکھتے ہی ایک ایسی دُنیا میں پہونچ گیا اور مجھ پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی جس کا اظہار میں الفاظ میں نہیں کر سکتا اس کی نشیلی اور سرمئی آنکھیں، اس کا گورا رنگ، دبلا پتلا قد اور اس کی خراماں روی اور الھڑپن کا تصور اب بھی جب کرتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں اس مادی دُنیا سے ایک دوسری دنیا میں پہونچ گیا ہوں .... میرا ایک شعر جو آپ نے بھی سُنا ہو گا اسی جذبے کے تحت کہا گیا ہے خدا جانتا ہے کہ میں ایک شعر کہنے پر قادر نہ ہوتا جب تک کہ اس عالم میں نہ پہنچ جاتا۔

وہ کب کے آئے چلے گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آرہے ہیں وہ جا رہے ہیں

...... میری شراب نوشی جسے میں اپنا دورِ سیاہ کاری کہوں گا اس کے بعد کا دور ہے ——— میں شراب خود نہیں پیتا تھا بلکہ جب شراب

---

[1] حیاتِ جگر کا ایک باب۔ حضرت جگر کی زبانی از قیسی الفاروقی۔ قومی آواز ۱۹ ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۲
[2] اس واقعہ کے متعلق راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہ وہی واقعہ ہو سکتا ہے جسے جگر صاحب نے قیسی الفاروقی سے بیان کیا ہے۔
[3] جگر صاحب کے اس عشقیہ واقعہ کی تصدیق جگر کے کسی قدیم ترین احباب سے میری کوششوں کے باوجود نہ ہو سکی، یہ واقعہ فرقت کاکوروی نے لکھا ہے اور راقم سے جون ۱۹۶۲ء کی ایک ملاقات میں جو سید احتشام حسین صاحب کے یہاں لکھنؤ میں ہوئی تھی فرقت صاحب نے بتایا کہ بھی کوئی مانے یا نہ مانے لیکن یہ واقعہ جگر صاحب نے مجھ سے بیان کیا تھا۔

پی لیتا تھا تو اتنی دیر اسے بھول جاتا تھا اسے بھلانے اور سکون حاصل کرنے کی خاطر میں نے شراب شروع کی اور جب خمار آتے ہی وہ پھر سامنے آجاتی اور مجھے دیسا تڑپن محسوس ہوتی میں جام پر جام چڑھاتا چلا جاتا، یہی میری شاعری کی محرک ہے[1]؟

یہ واقعہ ۱۹۰۲ء یا ۱۹۰۳ء کا ہو سکتا ہے۔

علی منظفر صاحب (جگر صاحب کے حقیقی چھوٹے بھائی) نے راقم سے جگر کے بچپن کا ایک واقعہ ۲۷ مئی ۱۹۶۳ء کی ایک ملاقات میں بیان کیا کہ بھائی صاحب (جگر صاحب) کے ترکِ تعلیم کے بعد (یہ زمانہ راقم کے خیال میں ۱۹۰۵ء یا اس کے بعد کا ہو سکتا ہے) چچا علی ظفر صاحب مرحوم نے ان کو کسی محکمہ میں ملازم رکھا دیا تھا وہاں انھوں نے ایک دن ایک محبت نامہ لکھکر چچا کے ایک تحصیلدار دوست کی بیوی کو دیدیا، جس سے ان کو بڑی شرمندگی اُٹھانی پڑی (اس واقعہ کی تفصیل پچھلے صفحات میں بیان کی جا چکی ہے) بہرحال وہ کسی طرح آگرہ پہونچے جہاں پر وحیدن بیگم سے بھائی صاحب کی ملاقات ہوگئی اور کچھ دنوں کے بعد ان سے شادی بھی ہوگئی (یہ زمانہ راقم کے خیال میں ۱۹۰۵ء یا اس کے بعد کا ہو سکتا ہے) ان کو لیکر وہ مرادآباد چلے آئے، یہاں محمد عاقل والا حادثہ پیش آیا۔ (اس واقعہ کو پچھلے صفحات میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے) اس کے بعد وہ غالباً ۱۹۱۹ء میں گونڈہ پہونچے وہاں ان کی شادی اصغر گونڈوی کی سالی نسیم بیگم سے غالباً ۱۹۲۰ء میں ہوگئی لیکن ان کی شراب نوشی اور مزاج میں اختلاف کے باعث طلاق ہوگئی۔ اس حادثہ سے بھائی صاحب (جگر صاحب) کو بے حد صدمہ پہونچا اور وہ دن رات شراب میں مست رہنے لگے وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ "کبھی میں ہوش میں نہیں رہنا چاہتا" اس حادثہ کے بعد جگر صاحب محمد عظیم فیروزآبادی کی تحریر کے مطابق ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۰ء[2] کے درمیان میں مین پوری پہونچے جہاں ان کی شیرازن بیگم (مین پوری کی ایک ڈیرے دار طوائف) سے ملاقات ہوگئی لیکن ان سے کوئی قریبی تعلقات نہیں پیدا ہوئے اس کی تصدیق قیسی الفاروقی مصنف حیاتِ جگر (غیر مطبوعہ) نے راقم سے جونپور میں جولائی ۱۹۶۲ء میں ایک ملاقات میں کی تھی۔

یہ وہی شیرازن بیگم ہیں جن کو ایک خط میں جگر صاحب نے (جو بقول نواب سید شمس الحسن صاحب کے ۱۹۳۲ء کا خط ہے) لکھا ہے۔

"مجھے اس زمانہ میں تسکین کی سخت ضرورت ہے ورنہ کہیں نکل جاؤں گا"

---

[1] "فروغ اردو" لکھنؤ فروری ۱۹۶۲ء صفحہ ۲۰ تا ۲۲

[2] راقم کے خیال میں جگر صاحب مین پوری ۱۹۲۰ء یا اس کے بعد پہونچے ہوں گے کیونکہ ۱۹۱۹ء میں تو وہ گونڈہ ہی پہونچے تھے۔ اس کے بعد نسیم بیگم سے شادی اور طلاق ہوئی ہے۔

جگر صاحب کے اس ایک جملہ میں ان کی اس زمانہ کی پریشان کُن زندگی کی جھلک دکھائی پڑتی ہے

تبسم نظامی مرحوم (جن کا ابھی حال ہی میں فروری ۶۴ء میں جگر مرحوم پر تحقیقی کام کے دوران حیدرآباد میں انتقال ہو گیا) نے راقم سے ۱۵ اگست ۶۳ء کی ملاقات میں بتایا کہ ۱۹۲۶ء میں جب جگر صاحب رائے بریلی کی ایک سرائے میں مقیم تھے وہیں کی ایک بڑی حسین و جمیل بھٹیارن سے بھی ان کا معاشقہ چلا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ایک دفعہ سیدہ اختر سے بھی جگر کی کچھ لڑائی ہوئی تھی اور سیدہ اختر کی طرف سے جگر پر ہتک عزت کا دعویٰ اور جگر صاحب کی طرف سے جوابی دعوٰی ہوا تھا۔

جلیل قدوائی نے جگر کے اناؤ کے ایک عشقیہ واقعہ کے متعلق (جو راقم کے خیال میں ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء کے درمیان کا واقعہ ہو گا) لکھا ہے۔

"اپنی فردوس گمشدہ" کو دوبارہ حاصل کرنے سے پہلے جگر صاحب کو جہاں تک مجھے معلوم ہے 'نظرے خوش گذرے' کے طور پر دو مقامات پر چند عورتوں سے تعلق خاطر رہا۔ اناؤ میں دو بہنیں تھیں، سُندر، مُندر۔ نرم و نازک، نقشے، چھریرے بدن، نور کی شکلیں جیسے کھانڈ کے کھلونے ہوں، سفید لباس میں بالکل آسمانی مخلوق معلوم ہوتی تھیں۔ شہر سے باہر دونوں ایک کوٹھی میں رہتی تھیں۔ کسی ہندو ریاست سے متعلق تھیں۔ مگر تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد وطن واپس آجاتی تھیں جگر صاحب کبھی کبھی ان کے ہاں جاتے تھے، پہلے لے جائے گئے پھر خود جانے لگے۔ نشہ کی حالت میں بے اطلاع پہونچ جاتے تھے چونکہ بے اعتدالی سے پیتے تھے وہ بہنیں پریشان ہو جاتی تھیں اور ان کا آنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ مگر انھوں نے جگر صاحب کو کبھی ذلیل نہیں کیا اور سنبھل کر ملتی رہیں۔ میں نے ان بہنوں کو بعض تقریبات میں دیکھا تھا۔ اور وہ شہر میں اپنے حُسن کے لئے مشہور تھیں مگر ان کے ساتھ جگر صاحب کے واقعات جب میں علی گڑھ سے چھٹیوں میں اناؤ جاتا تھا تو وہاں اور ان کے رشتے کے ایک بھائی ... مجھ سے بیان کرتے تھے، جگر صاحب کی موجودگی میں یہ تذکرے ہوتے تو وہ باغ باغ ہو جاتے تھے اور نشہ کی حالت میں ہوتے تو اپنی کوئی رنگین غزل جھوم جھوم کر مسکرا مسکرا کر پڑھنے لگتے۔"[1]

اس زمانے کی جگر صاحب کی بے اعتدالیوں کے متعلق خواجہ مسعود علی ذوقی نے اپنے ۲۸ء کے ایک مضمون میں لکھا ہے:

"جگر صاحب ایک مرتبہ علی گڑھ آئے ہوئے تھے اس زمانہ میں ان کی بے اعتدالیاں بہت

---

[1] "العلم" جولائی تا ستمبر ۶۳ء صفحہ ۲۲

بڑھ گئی تھیں اور ان پر ہر وقت ایک محویت ایک کیف کا عالم طاری رہتا تھا۔ میں نے ان سے کہا، جگر صاحب خدا کے لئے اپنی زندگی کے طریقے کو بدلیے اب تو آپ کی یہ حالت کسی طرح دیکھی نہیں جاتی۔ اور نہیں تو کم از کم اپنی اس شاعرانہ عظمت کا خیال تو کیجئے جس نے آپ کو ایک خاص حیثیت کا مالک کر دیا ہے'

میری اس بات پر جگر صاحب مسکرائے اور جواب میں صرف یہ شعر پڑھ کر خاموش ہو گئے:۔

رہ گئیں پردۂ ظاہر میں الجھ کر نظریں
حسن دیکھا نہ کسی نے مری رسوائی کا[1]

جگر صاحب کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب اصغر گونڈوی کے انتقال اور نسیم بیگم سے عقد ثانی (غالباً ۱۹۳۰ء) کے بعد پیدا ہوا۔ انھوں نے شراب ترک کر دی اور صوم و صلوٰۃ کی پابندی کرنے لگے لیکن معتبر حضرات (کسی کا نام لکھنے والا نہیں ہے کیونکہ سارے حضرات حیات ہیں۔ اور اپنا نام لکھنے سے راقم کو منع فرمایا ہے اس لئے کسی کا نام لکھنا نہ تو مناسب ہے اور نہ اس کی ضرورت ہی ہے — بہر حال میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ان حضرات کی بات قابلِ اعتماد ہے) کا کہنا ہے کہ نسیم بیگم سے عقد ثانی کے بعد جگر صاحب کے قدم پھر ڈگمگائے تھے اور وہ ایک بیوہ سے نکاح کرنا چاہتے تھے لیکن اصغر صاحب کے احسانات کے خیال سے اور احباب کے سمجھانے بجھانے سے وہ سنبھل گئے۔ ایک صاحب کا خیال ہے کہ جگر مرحوم کو انھیں بیوہ کی دو لڑکیوں سے بھی کچھ تعلق خاطر رہا۔ اس کے بعد انھوں نے گونڈہ ہی کو اپنا سب کچھ سمجھ لیا۔ اور اسی کو مستقر بنا کر وہیں رہنے لگے۔

مسرت قادری غالبی لکھتے ہیں۔

مے نوشی:- "واقف کار حضرات کا کہنا ہے کہ حضرت جگر نے شراب نوشی کا آغاز شوقیہ نہیں کیا بلکہ ان کے دل و دماغ پر آلامِ دنیا نے ایسی ضربیں لگا دی تھیں۔ کہ ان کو چھپانے یا دبانے کے لئے شراب سے بہتر کوئی مرہم نظر نہ آیا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

تو جگر کے مستوں پر طعن کر نہ اے واعظ
تو غریب کیا جانے مسلکِ شراب اس کا[2]"

وہ جوش کی طرح نشاط کے لئے شراب نہیں پیتے تھے بلکہ انھیں یک گونہ بیخودی کی ضرورت تھی ان کی زندگی میں جو غم تھا وہ اس غم کو دور کرنے کے لئے شراب پیتے تھے۔

---

[1] "ترنگ" جون سنہ ۲۸ء صفحہ ۳۱، ۳۲

[2] "صبحِ امید" جولائی سنہ ۵۱ء صفحہ ۵۴

شراب کے معاملہ میں وہ کسی ضابطہ کے پابند نہ تھے۔ وہ شراب کے پینے میں اچھی بری شراب سے مطلب نہیں رکھتے تھے ان کے لئے تو بس شراب ہونی چاہیے۔ خواہ کیسی ہی ہو۔ وہ پینا شروع کرتے تو بس پیتے ہی چلے جاتے تھے اس میں سوڈا، برف یا پانی ملانا بھی کفر سمجھتے تھے وہ خالص قسم کی شراب براہِ راست بوتل سے منہ لگاکر پیتے تھے۔ اور پیتے پیتے بالکل مدہوش ہوجایا کرتے تھے اور جب ہوش میں آتے تو پھر پینا شروع کردیتے غرضیکہ جتنی بھی شراب ان کے سامنے آجاتی یا انھیں مل جاتی وہ ساری کی ساری پیٹ میں ڈال لینے کی کوشش کرتے تھے یہ سلسلہ کئی کئی روز تک چلتا رہتا تھا۔ کبھی کبھار ان کا یہ سلسلہ ختم ہوجاتا تھا لیکن چند ہی روز بعد پھر وہی شراب ہوتی اور وہی جگر۔ ان کے احباب کا خیال ہے کہ شراب جیسے ان کے لئے آسمان سے ٹپکتی ہو وہ خود بھی اکثر کہا کرتے تھے کہ

" مجھے میرا خدا شراب پلاتا ہے پھر تم لوگوں کی کیا مجال کہ اسے روک سکو۔"[۵]

اس سلسلے میں نواب سید شمس الحسن صاحب نے ایک عجیب و غریب واقعہ راقم سے ۳ دسمبر ۱۹۶۲ء کی ملاقات میں بتایا۔ انھوں نے بتایا کہ جب جگر صاحب ان کے یہاں لکھنؤ میں بھوپال ہاؤس میں رہتے تو اکثر ان کے ہر طرح کے آرام کا خیال رکھا جاتا اور لوگوں سے جگر صاحب کو پیسے دینے کے لئے منع کردیا جاتا پھر بھی کسی نہ کسی وقت دیکھا جاتا کہ جگر صاحب جھومتے جھامتے چلے آرہے ہیں۔ لوگوں کو حیرت ہوتی جب اس کی تفتیش ہوئی تو پتا چلا کہ جگر صاحب کے ایک عقیدتمند نے قریب کے مالکِ شراب خانہ سے کہہ رکھا ہے کہ جب جگر صاحب اس کے یہاں جائیں تو وہ انھیں شراب دے دیا کرے۔ جب یہ واقعہ معلوم ہوا تو جگر صاحب پر بھوپال ہاؤس سے باہر جانے پر پابندی لگادی گئی پھر بھی دیکھا جاتا کہ جگر صاحب کبھی نہ کبھی پی لیتے اور پی کر جھومنے لگتے۔ جب اس واقعہ کے متعلق کھوج کی گئی تو معلوم ہوا کہ جگر صاحب کے ایک کرم فرما ایسے بھی ہیں کہ جب ان کو گھر سے باہر نہیں نکلنے دیا جاتا ہے تو وہ پہارہ دیواری کے اوپر سے ایک طرف موقع پاکر جگر کے لئے شراب کی بوتل پھینک جایا کرتے تھے اس طرح جگر صاحب کو گھر بیٹھے شراب مل جاتی تھی۔

جگر صاحب کی ابتدائے مے نوشی کے سلسلے میں صحیح تاریخ و سنہ کا پتہ نہیں چلتا اس لئے کچھ لوگوں کی تحریروں کی مدد سے ان کی ابتدائی مے نوشی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اگر غلام احمد فرقت کاکوروی کے مضمون "جگر مرادآبادی کی شاعری کا پس منظر" (جو فروغ اردو لکھنؤ فروری ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا ہے) کو صحیح مان لیا جائے تو جگر نے تیرہ چودہ سال کی عمر کے بعد اپنی

---

[۵] " تذکرۂ جگر" صفحہ ۳۵

دس گیارہ سال کی عمر کی محبوبہ کو بھلانے اور سکون حاصل کرنے کی خاطر شراب پینا شروع کیا۔

اور نواب سید شمس الحسن صاحب (جگر صاحب کے ایک دیرینہ مخلص) نے یکم اکتوبر ۱۹۶۲ء کے خط میں راقم الحروف کو تحریر فرمایا ہے کہ جگر صاحب نے ان سے تذکرہ کیا تھا کہ "طالب علمی کے زمانہ سے انھوں نے مے نوشی شروع کر دی تھی۔" اس کے اسباب نواب صاحب نے نہیں لکھے۔

لیکن جگر صاحب کے حقیقی چھوٹے بھائی علی منظر صاحب نے ۲۶ مئی ۱۹۶۳ء کی ملاقات میں راقم سے بتایا کہ جگر صاحب نے ترک تعلیم کے بعد ایک دفعہ ایک حادثہ کی بناء پر بھنگ کھائی تھی اور خورشید الحسن صاحب مرادآبادی نے ۲۲ دسمبر ۱۹۶۳ء کی ملاقات میں بتایا کہ مرادآباد کے ایک حکیم صاحب (جن کا نام ان کو اس وقت یاد نہیں تھا) کا کہنا تھا کہ بالکل ابتدائی زمانہ میں جگر کا ان کے یہاں آنا جانا تھا۔ اور نشیلی چیزوں کی لت جگر کو انھیں نے لگائی تھی۔

مندرجۂ بالا بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ جگر صاحب نے تیرہ چودہ سال کی عمر کے بعد اور سولہ سال کی عمر سے پہلے مے نوشی شروع کر دی تھی کیونکہ فرقت کاکوروی نے تیرہ چودہ سال کی عمر کے بعد جگر کی مے نوشی کی ابتدا لکھی ہے اور شمس صاحب نے زمانۂ طالب علمی سے ان کی مے نوشی کی ابتدا بتائی ہے اور جگر صاحب کا زمانۂ طالب علمی تقریباً پندرہ سال کی عمر تک رہا ہے، مرادآباد کے حکیم صاحب کے قول کے مطابق انھوں نے جگر کو یہ لت ابتدائی زمانہ یعنی ۱۴ و ۱۵ سال کی عمر میں لگائی ان سب بیانات سے قیاس یہ گزرتا ہے کہ جگر نے کبھی کبھار مے نوشی کا سلسلہ اپنی نوعمری ہی میں کیا ہوگا لیکن جگر صاحب کے چھوٹے بھائی علی منظر صاحب کے قول کے مطابق جگر صاحب کو نشیلی چیزیں کھانے کی ابتدا ان کی ترک تعلیم کے بعد ایک حادثہ کی بناء پر ہوئی۔

معتبر ذرائع سے جگر کی ابتدائے مے نوشی کے سلسلے میں اگر کچھ معلوم ہو سکا تو صرف اتنا، لیکن اس کے متعلق نہ تو جگر صاحب نے خود کہیں بتایا یا لکھا اور نہ ان کے دیرینہ دوست ہی اس کی نشاندہی کر سکے اس لئے ہمارے پاس سوائے قیاس آرائی کے کوئی چارہ نہیں۔

جگر صاحب کے ایک قدیم ترین دوست محمود علی خاں جامعی (کہ جن کو جگر مرحوم کے بہت سے ابتدائی زمانے کے حالات معلوم تھے) اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"جگر صاحب نے کب سے شراب شروع کی اس کا صحیح علم نہیں لیکن قیاس غالب یہ ہے کہ انھوں نے پہلی بیوی کی محبت میں یہ شغل شروع اور آخری بیوی کے اشارے پر اسے ترک کیا۔"[1]

---

[1] "تذکرۂ جگر" صفحہ ۳۷

غرضیکہ کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے جگرؔ کی ابتدائے مے نوشی کی صحیح تاریخ بتائی جا سکے اس لئے اب اس بحث کو چھوڑ کر ان کی مے نوشی سے متعلق کچھ باتیں بیان کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔

جگرؔ صاحب کا خود کا قول تھا کہ جب وہ شراب پیتے تھے تو خالص (یعنی بغیر کسی آمیزش کے) پیتے تھے۔ پینے کے بعد اکثر رو رو دیتی تین گھنٹے روتے بھی تھے۔ شراب اپنے متعلقین کے ساتھ پیتے تھے، جس کی اُنھیں ندامت تھی۔

ہجوم ہے اور پھر جناب جگرؔ
پی پلا کر بڑا ایساں توبہ

ان کو ہمراز کا یہ قول پسند تھا کہ "میں آپ کے اتنا قریب نہ ہوتا تو ضرور شراب پیتا"۔ جگرؔ صاحب نے کبھی کسی شخص کو اس وقت تک شراب نہیں پیش کی جب تک انھیں اس کے پینے کے متعلق صحیح علم نہ ہو۔ ایک دفعہ لکھنؤ میں گنگا دھر فرحت کانپوری نے اپنے طالب علمی کے زمانہ میں جگرؔ کو شراب پلانے کی کوشش کی لیکن انھوں نے ان سے شراب پینے سے اس لئے انکار کردیا کہ وہ طالب علم تھے فرحت صاحب کو جگرؔ کی یہ بات تازیست یاد رہی اور وہ جگرؔ سے بہت محبت کرنے لگے۔ جگرؔ صاحب شراب کے لئے اپنے خاص احباب ہی کو زحمت دیتے تھے اور ان کی زیرباری کے خیال سے ہلکی سستے قسم کی شراب پیتے تھے۔ اصغرؔ صاحب مرحوم نے انھیں شراب پینے سے منع نہیں فرمایا تھا صرف چند قیود لگادی تھیں جو بہت حکیمانہ تھیں۔ انھوں نے جگرؔ صاحب سے کہا تھا:۔

۱۔ اچھی قسم کی شراب پیو

۲۔ اچھی سوسائٹی میں پیو

۳۔ اپنے دام خرچ کر کے پیو

جگرؔ صاحب کے دل میں بڑا گداز تھا اور وہ بڑے حساس قسم کے انسان تھے، ایک دفعہ ۱۹۳۵ء میں ایک دن جب عارف عباسی ان کو شراب دے رہے تھے تو وہ رونے لگے اور ان سے کہا۔

"تم بنو عباس میں ہو میں تم سے بلاتاویل کے کہتا ہوں کہ میں بیعت کر رہا ہوں"[۱]

ایک دفعہ ۱۹۴۳ء میں بنگلور کے ایک مشاعرے میں جب اخترؔ شیرانی نے آبدیدہ ہو کر کہا کہ "جگرؔ خود تو نکل گئے اور مجھے اس لعنت میں پھنسا گئے"۔

اور یہ آواز جگرؔ کے کانوں تک پہونچی تو وہ بولے کہ

"وہ خود شراب کا رسیا ہے میں اسے اس راہ پر کیوں ڈالتا"[۲]

---

[۱] و [۲] "حیاتِ جگرؔ" حالاتِ زندگی (غیر مطبوعہ) از قیسی الفاروقی

غرضیکہ جگر نے کبھی کسی دوسرے شخص کو شراب کا چسکا نہیں لگایا کیونکہ وہ خود شراب پینا بُری عادت سمجھتے تھے اور ہمیشہ اس پر ندامت محسوس کرتے تھے۔

اس سلسلے میں مسرت قادری خامی نے لکھا ہے کہ :۔

"جگر کو اپنی مے نوشی اور حرمت کا احساس تھا، ان کا خود قول ہے کہ میں کثرت سے پیتا تھا مگر دل میں ایک نسبت ازلی کے تحت ایک کھٹکا لگا رہتا تھا۔ اور اسی کھٹکے کی جب کھٹک بڑھی تو جگر خود پکار اُٹھے۔ شعر

للہ جگر اب تو ذرا ہوش میں آجا
تنگ آگئے احباب تری بے خبری سے"[۵]

جگر پر تنگدستی کا بھی کافی زمانہ گزرا ہے جس وقت ان کے پاس پیسے نہیں ہوتے تو انھیں شراب پینے کو نہیں ملتی تھی، ایک زمانے میں انھیں تین مہینے تک شراب نہیں ملی اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

چاندنی ہے ہوا ہے کیا کہئے
مفلسی کیا بلا ہے کیا کہئے

جگر صاحب کے دورِ سرشاری کا ایک دلچسپ واقعہ مین پوری کا ہے۔

جب وہ مین پوری میں رہتے تھے۔ اس زمانے میں ان کے لئے دو ایک بجے رات تک شراب آجاتی تھی۔ ایک دن ان کو بڑی شدت سے ضرورت محسوس ہوئی ان سے لوگ بہت محبت کرتے تھے اور کوئی نہ کوئی راہ نکال کر ان کے لئے شراب لے آتے تھے۔ اس دن بہت سے لوگ گئے اور واپس چلے آئے تو جگر صاحب خود گئے، انھوں نے باتوں میں والنٹیر کو مرغوب کرنا چاہا مگر ایک آدمی نے ایسا مسکت جواب دیا کہ بات نہ بنی اس نے کہا کہ ہم تو کانگریس کے حکم سے یہاں آئے ہیں ہم یہ سب باتیں کیا جانیں، یہ سنکر جگر صاحب کانگریس کے سکریٹری کے پاس پہونچے اور اس سے خوب باتیں کیں وہ ان کی باتوں سے متاثر ہوا اور اس نے اپنے کارکنوں سے کہا "بھئی انھیں نہ روکا کرو ورنہ یہ دوسرے لوگوں کو بھی اپنے ہی جیسا بنادیں گے اور ہماری مشکلات بڑھ جائیں گی"[۶] پھر اس نے ان کو وہیں منگوادی۔

جگر صاحب اپنے اس دورِ سرشاری میں جسے وہ دورِ سیہ کاری سے تعبیر کرتے ہیں مشاعروں میں بال بکھرائے، تیوری چڑھائے پاؤں لڑکھڑاتے پہونچتے تھے اور ان کو دیکھتے ہی مشاعروں میں دھوم مچ جاتی اُنگلیاں اُٹھا کر اشارے کر کے لوگ اپنی مسرت کا اظہار کرتے، بعض حضرات تو جوشِ مسرت سے

---

[۵] "صبحِ اُمید" جولائی ۱۹۵۱ء صفحہ ۵۶
[۶] " مادرِ وطن" ۱۶ دسمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۷

چیخ پڑتے تھے اس زمانے میں جگرؔ صاحب مشاعرے میں بیٹھکر اچھے شعر کی داد دیتے اور برے شعر پر سرِ محفل ٹوک بھی دیتے تھے. جب کبھی نشہ زیادہ ہوتا تو دو تین آدمی ان کو سہارا دیکر اسٹیج تک لیجاتے اور وہ جھوم جھوم کر اپنے شعر پڑھتے اور سارے مشاعرے پر وجد کا عالم طاری کر دیتے.

قیسی الفاروقی لکھتے ہیں کہ :-

"کبھی کبھی یہ عالم بھی دیکھا گیا کہ انھوں نے 'اے محتسب نہ پھینک' ترنم سے پڑھا اور تھوڑی دیر کے لئے غافل ہوگئے، مصرعہ کا باقی حصہ مشاعرے والوں نے دُہرایا 'میرے محتسب نہ پھینک'

اس کے بعد ذرا چونکے اور مصرعِ ثانی

'ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے' والہانہ انداز میں پڑھا اور مشاعرے میں شراب سی برسا دی، کئی منٹ تک یہی شعر مشاعرے میں گونجتا رہا، بڑے بڑے خشک مولویوں کی زبان سے 'ارے ظالم شراب ہے' کی تکرار سُنی گئی"[1]

جلیل قدوائی نے جگرؔ صاحب کے علی گڑھ کے مشاعرے میں شرکت کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ :-

"جگرؔ صاحب علی گڑھ کے مشاعروں میں برابر تشریف لاتے تھے ان کی ایک بار کی آمد مجھے کبھی نہیں بھولے گی کیا دھوم دھام تھی. اور کیسے ٹھاٹ باٹ تھے. مشاعرے میں تو ان سے کوئی پیش پا ہی نہیں سکتا تھا. دیر سے پہنچائے جاتے تھے جب سامعین فرطِ اشتیاق سے 'آہٹ پہ کان در پہ نظر' کی مجسم تصویر بنے زبانِ حال سے حسرتؔ کا یہ شعر پڑھتے ہوتے تھے ؎

وہ اب آئیں محفل میں، سب اہلِ محفل
خبردار ہیں دل سنبھالے ہوئے ہیں

اُن کی آمد کیا ہوتی تھی جیسے کسی بادشاہ کا جلوس آتا ہو، وہ سماں مجھے اچھی طرح یاد ہے سرشاری کے عالم میں جھومتے جھامتے طلباء کے جمِ غفیر کے ساتھ ہٹو، بچو کے نعروں میں کشاں کشاں لائے جارہے ہیں. اپنے فارسی مطلع ؎

مست و سرشار و غزل خواں می روم!
از سرِ جان سوئے جاناں می روم!

کی تصویر بنے اور بقول غالبؔ ؎

چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

---

[1] "حیاتِ جگرؔ' حالاتِ زندگی" (غیر مطبوعہ) از قیسی الفاروقی

شدتِ تنفس سے نتھنے پھول رہے ہیں۔ ساتھ ہی ہر طرف اپنی مسکراہٹ کی بجلیاں گرا رہے ہیں جیسے چہرے پر ان کا باطن کھلا جا رہا ہو۔

ابھی کچھ شعراء از قسم اساتذہ پڑھنے کو باقی تھے مگر جگر صاحب کو دیکھ کر کوئی اپنے بس میں کب رہتا تھا۔ اور کسی اور کا کلام سننے میں جی کس کا لگتا تھا بہر حال کسی نہ کسی طرح گھاس کٹوائی گئی اور اب دیکھا تو ہر طرف جگر ہی جگر تھے۔ یونین ہال کسمسانے لگا۔ سارا مجمع ہمہ تن گوش ہو گیا، جگر صاحب نے کرسی سنبھالی اور اپنے سے، اپنے احول سے اور ساری دُنیا سے بے خبر و بے نیاز ہو کر پورے جوش کے ساتھ اپنی مخصوص مگر مانوس بلکہ دلفریب اور پاٹ دار مگر ترنم ریز آواز میں غزل چھیڑی۔ حکیم مومن خاں کی غزل اس طرح میں نام پیدا کر چکی ہے۔

عمر تو ساری کٹی عشقِ بُتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

مگر مجھے یقین ہے وہ موجود ہوتے تو اپنی غزل پڑھے بغیر مشاعرے سے چلے آتے سنئے :-

جو جہنم میں بھی فردوس بداماں ہونگے
دیکھ لینا وہ یہیں سوختہ ساماں ہونگے (پوری غزل)

ہر ہر شعر پر ایک کہرام بچ جاتا تھا جیسا کہ معلوم ہے جگر صاحب موسیقی کے عام اصولوں کے خلاف جیسی استرہ اٹھایا جاتا ہے پہلے مصرعے کو اپنے ترنم کی خاص طرز کے مطابق دھیمے لہجے میں ادا کرتے تھے اور دوسرے مصرعہ کو کھینچکر اور بلند آواز سے پڑھتے تھے بلکہ دوسرے مصرعہ کی ابتدا میں آواز بلند ہونا شروع ہوتی تھی۔ اور خاتمہ تک منتہائے کمال کو پہونچ جاتی تھی۔ اس آخری حد تک پہونچنے سے پہلے تک مجمع پورا شعر کامل سکوت کی حالت میں اور مبہوت و ششدر رہ کر سنتا تھا مگر آواز منتہائے کمال کو پہونچی نہیں کہ پورا ہال تحسین و آفرین کے نعروں سے گونج اُٹھتا تھا۔ بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ ہال کی چھت پھٹ جائے گی۔ شائد چھتیں اُڑنا یا دھوئیں پار ہونا ایسی ہی داد کو کہتے ہیں۔

اس کے بعد جگر صاحب سے اور کئی غزلیں سُنی گئیں لوگ اُٹھنے کا نام بھی نہ لیتے تھے اور جگر صاحب نے بھی سماں باندھ دیا، دل لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے تھے۔ داغ مادنت تھے، ایک جادو گر نے نہ صرف سامعین پر سحر کر رکھا تھا بلکہ وقت کی رفتار کو روک دیا تھی کائنات گردش کرنا بھول گئی ہے۔ اور حاضرین میں سے کسی کو جگر صاحب کا کلام سننے کے سوا دُنیا میں کوئی کام نہیں رہ گیا ہے[۵]"

---

[۵] الملم- اکتوبر تا دسمبر ۶۳ء صفحہ ۲۹ - ۳۰

جگر صاحب بعض اوقات اپنے احباب کے ہاتھ سے ضد کرکے شراب پیتے تھے اس موقع پر میکش اکبر آبادی کا لکھا ہوا ایک واقعہ نقل کیا جارہا ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں ہے میکش صاحب ایک محفل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"جگر صاحب نے شیروانی کی جیب سے ادھا نکالا اور بہت اخلاص و اصرار سے دلگیر شاہ سے کہا آج میں آپ کے ہاتھ سے پیوں گا، دلگیر شاہ نے موقع کی نزاکت محسوس کرکے انکار کردیا، اب جگر صاحب نے نمبروار ایک ایک سے یہی اصرار کرنا شروع کیا سب ہی انکار کرتے چلے گئے یہاں تک کہ نوبت ان وارثی فقیر صاحب تک پہونچی، انھوں نے سب کی تقلید کی ان کے بعد میرا نمبر تھا اتنی دیر میں سوچتا رہا کہ اس محفل میں میرے بعض مخالفین بھی ہیں یہ مجھے بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے اور اس پر اضافہ بھی کریں گے لیکن میں نے یہ بھی اندازہ کیا کہ اس وقت جگر صاحب کے انکار کرنے میں مجھے خدا سے زیادہ ان حضرات کا خوف ہے اور یہ خوف ریاکاری کے سوا کچھ نہیں۔ اس لئے جگر صاحب نے جب مجھ سے کہا تو میں نے فوراً ان کے ارشاد کی تعمیل کردی اور پھر جگر صاحب نے ان حضرات کی ایسی توضیح کی کہ انھوں نے بھی میری طرح اس واقعہ کو ہمیشہ یاد رکھا ہوگا"[1]

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے جگر کے دور سرشادی کے متعلق لکھا ہے :۔

"مجھے وہ زمانہ خوب یاد ہے جب جگر صاحب پر شراب کا بدترین دور تھا۔ اکثر و بیشتر وہ آپے میں نہ ہوتے، عزیز اور عقیدت مند ان کو قدم قدم پر سنبھالتے ہوتے، اس حال میں بھی ان کی زبان سے کبھی ایسا فقرہ نہ نکلتا یا کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہوتا جس سے خود ان کو یا ان کے دوستوں کو شرمندگی اٹھانا پڑتی۔ شراب اور شاعری سے بے نقاب کرنے والی کم کوئی چیز ہوگی، جگر صاحب کو ان دونوں نے جی کھول کر بے نقاب کیا۔ برہنگی کہیں نظر نہ آئی۔ رکھ رکھاؤ ہر جگہ موجود"[2]

جگر صاحب شراب پینا گناہ سمجھتے تھے انھوں نے نہ تو کبھی اپنی اس لت کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کی اور نہ دوسروں کو اپنے رنگ میں رنگنے کی۔ جگر کو شراب نے خوب بے نقاب کیا۔ جگر کی اصل حقیقت کو سمجھتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی نے ۱۹۳۳ء میں "شعلۂ طور" کے مقدمہ میں پیشین گوئی کی تھی کہ :۔

۱؎ "تحریک" اکتوبر ۶۲ء صفحہ ۱۸

۲؎ "آتش گل" ،، صفحہ ۲۴

"جگر مست ازل ہے اس کا دل سرشار الست ہے وہ محبت کا متوالا ہے اور عشق حقیقی کا جویا، وہ مجاز کی راہ سے حقیقت کی منزل تک اور بت خانہ کی گلی سے کعبہ کی شاہراہ کو دو دیر خم خانہ کے بادہ کیف سے خود فراموش ہو کر بزم ساقی کوثر تک پہونچنا چاہتا ہے۔ جگر بظاہر سرشار مگر درحقیقت بیدار ہے اس کی آنکھیں پُر خمار مگر اس کا دل ہشیار ہے اور کیا عجب کہ خود جگر کو بھی اپنے دل کی خبر نہ ہو اگر ایسا نہ ہو تو اس کے کلام میں اثر نہ ہو"

جگر کے دور سرشاری کے واقعات بتاتے ہوئے سراج لکھنوی نے راقم الحروف سے ایک ملاقات میں بتایا کہ جب جگر صاحب نشہ کی حالت میں ہوتے تو وہ ان سے اکثر درد کا کلام پڑھنے کو کہتے جگر کو درد کے کلام میں ان کا صوفیانہ رنگ زیادہ پسند تھا۔ اس میں ان کو تصوف کی جھلک دکھائی پڑتی تھی۔ اور چونکہ خود صوفیانہ فطرت رکھتے تھے اس لئے جب وہ نشہ کی حالت میں ہوتے تو ان کی صوفیانہ فطرت کھل کر ظاہر ہو جاتی یہ ان کے دل کی پکار تھی۔

(جگر صاحب بظاہر سرشار مگر درحقیقت بیدار تھے) اس قول کی صداقت حمید صدیقی کی زبان سے ملاحظہ فرمائیے، انھوں نے ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جگر صاحب کے متعلق "ایک مرتبہ مجھے علم ہوا کہ کہیں باہر سے لکھنؤ تشریف لائے ہیں۔ میں اشتیاق دید میں بھوپال ہاؤس گیا۔ قاری احمد خاں میرے ہمراہ تھے جناب شمس الحسن صاحب سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ جگر صاحب فلاں کمرے میں ہیں لاعلمی و بے خیالی میں قیام گاہ پر پہونچ گیا۔ دیکھا تو جگر صاحب اپنے اسی خاص کیف سرشاری کے عالم میں لیٹے ہوئے ہیں۔ اور ایک طرح کا کرب طاری ہے مجھے دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر برہمی کے انداز میں فرمایا کہ 'میں نے تم کو منع کیا تھا کہ اس عالم میں میرے سامنے نہ آنا، کیوں آئے'، اور بہ چشم تر فرمایا کہ اب اگر اس وقت ان سے (قاری صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) قرآن پاک سننے کو دل چاہے تو ایسی حالت میں کیسے سنوں اور تم سے نعت کیسے سنوں'، میں سہم گیا اور دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا، اسی عالم میں قاری صاحب نے قرآن کریم کی چند آیتیں قرأت سے پڑھیں اور وہ بصد ادب و احترام دو زانو بیٹھ کر سنتے رہے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے"[۱]

شراب کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ انسان کے خیال کو بے باکی بہت وسیع کر دیتی ہے اور شراب پینے کے بعد انسان نشہ کی حالت میں اپنے ہر جذبہ کا اظہار بہت بڑھا چڑھا کر کرتا ہے اس کا خاموش اور چھپا ہوا جذبہ جاگ اٹھتا ہے اور اس کا اظہار وہ برملا کرنے لگتا ہے اس کی ایک مثال اور ملاحظہ ہو جسے ابوالحسنی گنوری نے یوں بیان کیا ہے:

---

[۱] آجکل: جنوری ۱۹۶۱ء صفحہ ۴۹

"جگر چونکے پر استاد مرحوم کے برابر بیٹھے ان کی طرف دیکھا۔ انھوں نے شفقت سے جگر کی پشت پر ہاتھ رکھ کر فرمایا پڑھو۔ اب جگر نے ایک چیخ مار کر مولانا احسن کے پاؤں پکڑ لئے اور سر جھکا دیا۔ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے 'میں بڑا گنہگار ہوں' 'میں بڑا نالائق ہوں' 'آپ جیسی مقدس ہستی کے سامنے ایسی گندی حالت میں بیٹھا ہوا ہوں' 'مجھ پر رحم کیجئے مجھے معاف کر دیجئے' 'میرے حق میں دعا کیجئے' 'میں بڑا مجبور ہوں' 'میں قابلِ رحم ہوں' 'یہ برا کام حصولِ عیش کے لئے نہیں کرتا' 'میرے دل میں ناسور ہیں۔ میں نے شراب کو ان ناسوروں کا مرہم بنایا ہے۔ ادھر مولانا جگر کو چپٹا کر ان کے شراب آلودہ منہ اور پیشانی کو چوم رہے تھے حوصلہ بڑھا رہے تھے، ہمت بندھا رہے تھے۔ اور مجمع پر ایک رقت کا عالم طاری تھا۔ کافی دیر میں جگر کا دل ٹھہرا، اس کے بعد ——— انھوں نے دو تین مکمل غزلیں پڑھیں اور پھر اسی کمرے میں لے جائے گئے ——— یہ صورت کیا تھی؟ عقیدت اور صرف عقیدت جس کو شراب نے پھیلا کر مجمع میں ایک تماشائی کی صورت پیدا کر دی۔"[1] یہ تھی جگر کی بیخودی میں ہوشیاری جس کی پیشین گوئی علامہ سید سلیمان ندوی نے ۱۹۳۳ء میں کی تھی۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ جگر صاحب جب شراب پیتے تھے اس زمانہ میں وہ بغیر شراب پئے ہوئے شعر نہیں کہہ پاتے تھے۔ اس خیال کی تردید جگر صاحب نے خود ان الفاظ میں کر دی ہے۔

"میں شراب پی کر شعر نہیں کہتا تھا یہ خیال کہ جب میں شراب پیتا تھا تو بہت اچھے شعر کہتا تھا غلط ہے۔ بہ یک وقت دو محبوب نہیں ہو سکتے جسے شراب سے محبت ہو اور جو اس میں سارے زمانے کو ڈبو دینا چاہتا ہو وہ بھلا شعر کہنے کے لئے شراب پی سکتا ہے جو شخص شراب میں کبھی پانی ملانے کا روادار نہ ہوا ہو وہ بھلا اپنے اوپر شعر مسلط کر سکتا ہے؟ ایک بات یہ بھی ہے کہ میں شعر اسی وقت کہتا تھا جب شراب چھوڑ دیتا تھا۔ دو دو، دو تین تین مہینے ایک بوند بھی نہیں پیتا تھا۔ اور اسی زمانے میں غزلیں کہتا تھا۔ اور چھوڑتا بھی اسی لئے تھا کہ ؎

چاندنی ہے ہوا ہے کیا کہئے
مفلسی کیا بلا ہے کیا کہئے

شراب پی کر صرف دو تین غزلیں کہی ہیں:

۱۔ میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا۔

---

[1] "صبح امید" جولائی ۱۹۵۰ء صفحہ ۴۹

۲۔ خیالِ خاطرِ اہلِ نیاز رہنے دے۔

۳۔ ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے [1]

اسبابِ ترکِ مے نوشی

جگر کے ترکِ مے نوشی کے کئی اسباب ہیں جن میں سب سے پہلے تو ان کی حساس طبیعت، خاندانی شرافت اور فطری طور سے مذہب سے رغبت تھی، دوسرے ان کے پیر و مرشد اور احباب و مخلصین کی دعائیں، اور تیسرے ان کی محبوباؤں اور ان کے حقیقی بھائی وغیرہ کا جگر سے ترکِ مے نوشی کا اصرار تھا۔

جگر کی ترکِ مے نوشی میں ان کے دل کی پکار کو سب سے بڑا دخل تھا۔ ان کے اس دل کی پکار کو سید سلیمان ندوی جیسے نباض نے بہت پہلے سمجھ لیا تھا، اسی لئے انھوں نے ۳۳ء ہی میں لکھا تھا کہ جگر مجاز کی راہ سے حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ ان کے دل کی پکار کی تصدیق اس شعر سے بھی ہوتی ہے ؎

واعظ نے اور نہ زاہدِ شب زندہ دار نے
مجھ کو جگا دیا مرے دل کی پکار نے

تو یہ دراصل ان کے دل کی پکار تھی جس نے ان سے غرقِ جامِ شراب رہنے کے بعد بھی اسے ان سے چھڑا دیا۔

نواب سید شمس الحسن صاحب جگر کی ترکِ مے نوشی کے سلسلے میں اپنی غیر مطبوعہ کتاب میں لکھتے ہیں کہ جگر صاحب نے:۔

• اپنی رندی کو کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا بارہا وہ نشے میں زار زار روتے اور چلّا اُٹھتے کہ "میرا خدا کیوں میری شراب چھڑا نہیں دیتا؟" ان کی رندانہ زندگی سے یہ صاف نظر آتا تھا کہ ان کی رندی، اضطراری تھی، اختیاری نہ تھی ان کی زندگی پر بہ یک وقت دو اثرات کارفرما تھے ایک تو ان کی خاندانی شرافت نیز وہ نسبتِ روحانی جو انھیں شاہ عبدالغنی صاحبؒ کے دستِ طریقت اور اصغر صاحب گونڈوی کی ذاتِ بابرکات سے بدرجۂ کمال حاصل تھی دوسرے وہ نازک احساسات جو کارسازِ حقیقی نے ان کی فطرت کو ودیعت کئے تھے..... ایک دفعہ جگر، اصغر کے ہمراہ پیدل جا رہے تھے تو اثنائے راہ میں جگر صاحب نے یکایک اصغر صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے ایک عجیب انداز میں کہا کہ "اصغر صاحب ایک بات ہے میں اتنی دعائیں کرتا ہوں، آخر خدا میری دعا کیوں نہیں

---

[1] "حیاتِ جگر" کا ایک باب حضرت جگر کی زبانی' از فیض الفاروقی ۔ قومی آواز ۱۹ ستمبر سنہ ۶۰ء صفحہ ۴

سنا اور یہ میری شراب کیوں نہیں چھٹ جاتی اصغر صاحب نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ یہ بات نہیں ہے تم دل کے ایک گوشے سے دعا کرتے ہو، مکمل دعا کرو تو مکمل قبولیت کی توقع بھی کرو۔ مکمل دُعا یہ ہے کہ تم سر سے پاؤں تک دُعا بن جاؤ، ناقص دُعا کرتے ہو تو مکمل قبولیت کیسے ہو۔ؔ

وہ خود بھی شراب چھٹنے کی دعائیں مانگتے تھے اور اپنے احباب و مخلصین اور علمائے دین سے بھی اس کے چھٹنے کے لئے دُعائیں مانگنے کو کہتے اور خطوط میں بھی لکھتے رہتے تھے۔

جگر صاحب نے شراب پی کر کبھی فخر نہیں کیا بلکہ اس دور کو وہ ہمیشہ اپنے دورِ جاہلیت اور دورِ سیہ کاری سے تعبیر کرتے رہے، اپنی اس گناہ آلود زندگی پر ہمیشہ تاسف کا اظہار کیا کرتے تھے اس خیال کا ثبوت جگر کے ایک خط سے بھی ملتا ہے جو انھوں نے نواب سید شمس الحسن صاحب کو لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں :-

"گنہگار ہوں اور اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کہ خود کو گنہگار سمجھتا ہوں۔ میاں میں جبر کا قائل ہوں اور صرف جبر کا، لیکن اپنے گناہوں کو اپنے ساتھ منسوب کرتا رہتا ہوں اور شاید یہی جبر ہو ؎

مجرم بنا ہوا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں
میں وہ ہوں تو نے ظالم خود جسکی آرزو کی"[1]

جگر صاحب اپنی اس گناہ آلود زندگی کی وجہ سے اپنے کو مجرم سمجھتے تھے یہی ان کے نیک بندے ہونے کی دلیل ہے اور خدا نے اپنے نیک بندوں کے لئے قرآن شریف میں چوتھے پارہ میں فرمایا ہے :-

" وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ
اور وہ لوگ ایسے دنیک دل) ہیں کہ (بتقاضائے بشریت) جب کوئی بے حیائی کا کام کر بیٹھتے ہیں یا
فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۪ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۪۟
(کوئی اور بے جابات کر کے) اپنا (یعنی اپنے دین کا کچھ) نقصان کر لیتے ہیں تو خدا کو یاد کر کے
وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝
اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگتے ہیں اور خدا کے سوا (بندوں کے) گناہوں کا معاف کرنے والا (اور) ہے ہی کون؟ اور جو بے جابات کر بیٹھتے ہیں تو دیدہ و دانستہ اس پر اصرار نہیں کرتے ہیں"[2]

---

[1] "جامعہ" نومبر ۱۹۶۳ء صفحہ ۲۴۲ و ۲۴۳

[2] "حمائل شریف مترجم" ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۱ء صفحہ ۱۰۵

جگر نے بھی بتقاضائے بشریت جو گناہ کیا اس کو اُنھوں نے گناہ سمجھ کر خدا کو یاد کر کے اس سے معافی مانگی اور اپنے بے جابات کر بیٹھنے پر اُس پر دیدہ و دانستہ کبھی اصرار نہیں کیا وہ اپنے کو یہی سمجھتے رہے کہ ؎

شاید جگر حزیں ہمیں است
از بار گنہ کمر خمیدہ

آخر کار خدا نے ان کی دعاؤں کو قبول کیا اور ان کے گناہ معاف کرنے کیلئے انھیں ۱۹۵۳ء میں خانۂ کعبہ کی زیارت اور حج بیت اللہ سے بھی نوازا۔

جگر صاحب کی وہ بات سچ ثابت ہوئی جسے انھوں نے بہت عرصہ پہلے نواب سید شمس الحسن صاحب سے کہا تھا کہ :۔

"شمس صاحب میں بغیر توبہ کے مروں گا نہیں آپ اطمینان رکھیں[۱]"

آخر کار وہ وقت بھی آگیا جب جگر کے" احساس غیرت کو تحریک ہوئی ان کی آنکھیں کھلیں، دلِ بیدار ہوا اور عالم ہوش میں اس عزم و استقلال کے ساتھ آئے کہ پھر کبھی مدہوش نہ ہوئے اور آخر وقت تک دین و ایمان کا احترام کرتے رہے اس حیرت انگیز انقلاب میں در اصل ان کی قوتِ ارادی کے ساتھ ساتھ در پردہ توفیقِ الٰہی بھی کچھ معاون تھی۔

جگر نے اپنے مدہوشی کے زمانے اور قوتِ ارادی کے متعلق لکھا ہے :۔

" انسان زندگی میں عجیب عجیب مقامات سے گزرتا ہے اس کو خود خبر نہیں ہوتی کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے لیکن یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے انسان کو اپنے آپ پر قابو ہونا چاہیے۔ ...... میں انسان کو مجبور نہیں سمجھتا۔ اگر وہ قوتِ ارادی سے کام لے تو سب کچھ کر سکتا ہے[۲]"

جگر صاحب نے اپنی قوتِ ارادی سے کئی بار کام لیا، انھوں نے کئی بار شراب نوشی ترک کی لیکن بار بار توبہ کو توڑ تاڑ کے تھوڑا کے پیتے رہے ایک دفعہ انھوں نے ۳۳ء میں شراب ترک کر دی تھی جس کے متعلق انھوں نے اپنے ایک خط میں (جس پر تاریخ درج نہیں ہے۔ لیکن نواب سید شمس الحسن صاحب نے اس کا جواب ۲۴ر ستمبر ۳۳ء کو دیا تھا) لکھتے ہیں :۔

"شراب بالکل ہی ترک کر دی ہے قطعاً تائب ہو چکا، آپ کو یقین نہ ہوگا لیکن ہے

---

[۱] " جائسہ" دسمبر ۶۳ء صفحہ ۲۵۲

[۲] " ہم قلم" کراچی سالگرہ نمبر ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۹

ایسا ہی۔ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ کبھی ان مشاغل میں مبتلا نہ دیکھئے گا۔ غالباً یہ مسرت آپ کے لئے کچھ کم نہ ہوگی"۔[1]

لیکن جگر صاحب نے اس توبہ کو اور بقول شمس صاحب کے اور بہت سی توبائیں توڑیں۔

۱۱ر دسمبر ۱۹۶۳ء کی ایک ملاقات میں جوش صاحب نے راقم الحروف سے بتایا کہ غالباً ۱۹۳۲ء میں انھوں نے جگر کی شراب نوشی پر کچھ پابندیاں عائد کر دی تھیں انھوں نے ان کی (جگر صاحب کی) داڑھی منڈوا دی تھی ان کے نہانے دھونے اور پینے پلانے کا وقت اور شراب کی مقدار تک مقرر کر دی تھی لیکن جگر صاحب ان اصولوں کی پابندی زیادہ دنوں تک نہ کر سکے۔

۵ر نومبر ۱۹۶۳ء کی ایک ملاقات میں تسکین قریشی صاحب نے راقم سے بتایا کہ ایک دفعہ جگر صاحب نے شراب ترک کی اور نماز بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ شروع کی، جہاں جاتے جانماز ساتھ ہوتی تھی لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ کراچی یا کسی اور دور دراز مقام پر ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے گئے تو واپسی میں تسکین صاحب نے ان کو دیکھا کہ جانماز وغیرہ ان کے پاس کچھ نہیں ہے۔ اور نماز پڑھنے کے بجائے وہ شراب کے نشے میں جھوم رہے ہیں۔

بہر نوع ۱۹۳۹ء میں انھوں نے شراب نوشی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ترک کر دی۔

جگر صاحب نے اپنے شراب چھٹنے کے مختلف اسباب خود بیان کئے ہیں۔ ملاحظہ ہوں انھوں نے اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے کہ:۔

"غالباً جھانسی یا الہ آباد کا ایک اور واقعہ یاد آتا ہے۔ غالباً جھانسی کا ہے ایک صاحب دل تھے میری بدحالی سے ان کا دل بہت دکھتا تھا، ایک دن میں نے کہا کہ ترک کر دوں گا اگر آپ کسی دن میرے ساتھ میخانہ چلیں۔ لوگ مجھ سے بہت مانوس تھے اور حیرت کہ علماء کا طبقہ بھی میری رعایت کرتا تھا میں انھیں میخانے لے گیا، مجھے اس کے بعد یاد نہیں کیا کیا باتیں ہوئیں، بہر حال یہ یاد ہے کہ گفتگو کر رہا تھا اور رندوں نے مجھے گھیر لیا تھا، کوئی میرے ہاتھ پاؤں دابنے لگا اور کوئی دست بوسی کر رہا تھا وہ بیٹھے دیکھتے رہے اور جب میں آیا تو وہ بھی واپس آ گئے، دوسرے دن انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں تم سے یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ پیو، مگر تمھیں اب رندوں کا بھی لحاظ نہیں"[2]

شمس العلماء نواب علی حسن خاں صاحب (بھوپال) جگر سے بہت محبت کرتے تھے، ایک دفعہ جگر صاحب بھوپال ہاؤس میں بیمار تھے ایک دن نواب صاحب ان کے پاس آئے اور

---

[1] "مادرِ وطن" ۱۲ر دسمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۷

گلوگیر لہجے میں بولے "جگر میرے بڑھاپے پر رحم کرو اور شراب ترک کردو۔"[1] جگر صاحب کا کہنا ہے کہ ان پر اس بات کا اتنا اثر ہوا کہ انھوں نے اس زمانے میں شراب ترک کردی تھی۔

"جامعہ" میں ایک استاد شرف الدین صاحب یاس ٹونکی صاحب ذوق اور متشرع بزرگ تھے جگر صاحب ان کی خدمت میں بہت گستاخ تھے یہاں تک کہ شراب میں مست ان کے گلے میں باہیں ڈالکر ان کی سفید داڑھی کے بوسے بھی لے لیتے تھے اور مولانا بڑے حلم سے سب انگیز کرتے رہتے تھے، ایک دفعہ جب وہ حج سے واپس آئے تو جگر سے فرمایا "جگر میں نے مدینہ طیبہ میں حضورؐ کے مزار اقدس کی جالی پکڑ کر صرف دو دعائیں مانگی تھیں ایک تو اپنی مغفرت کی اور دوسری تمھاری شراب چھٹنے کی۔"[2]

جگر کے شراب چھٹنے کی دعا خانہ کعبہ میں جاکر حمید صدیقی نے بھی مانگی تھی۔

جگر کی ترک شراب میں مین پوری کی شیرازن بیگم کا بھی حصہ ہے جس کے متعلق انھوں (شیرازن بیگم) نے اپنی ایک ملاقات میں محمد عظیم فیروزآبادی سے ۱۹۶۱ء میں بتایا کہ:۔

"پہلا حج میں نے آج سے تیئس سال[3] پہلے کیا تھا واپسی پر اصغر حسین اور جگر صاحب مبارکباد دینے آئے تو میں ان کے سامنے نہیں آئی اور حج کا تبرک (آب زمزم کچھ کھجوریں وغیرہ) صرف اصغر صاحب کے لئے بھجوادیا۔ جگر صاحب کی فرمائش پر ان کو کہلادیا کہ جس حلق سے آب زمزم اتر جائے میں اس کا شراب سے آلودہ ہونا گوارا نہیں کرسکتی۔ جگر صاحب سناٹے میں آگئے، تھوڑی دیر چپ چاپ بیٹھے رہے پھر اُٹھ کر چلے گئے، اصغر حسین بدستور بیٹھے رہے تھوڑی دیر میں نہا دھو کر کپڑے بدلکر آئے اور کہلوایا میرے حصہ کا تبرک بھجوا دیجئے۔ شراب اب میں کبھی نہیں پیوں گا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ وعدہ تو آپ کتنی بار کرچکے ہیں۔ جگر صاحب نے کہا نہیں اب میں نے مصمم ارادہ کرلیا ہے اب آئندہ آپ کو شرمندگی نہیں ہوگی دن گزرا، دو دن ہوئے، ہفتہ آیا اور گزر گیا انھوں نے شراب نہیں پی، بھوپال یا کہیں اور جگہ مشاعرہ تھا بھائی ـــــــ کو ساتھ لے گئے واپسی پر بھائی نے شہادت دی کہ جگر صاحب نے واقعی شراب کو منہ نہیں لگایا۔ میرے یہاں برابر آتے رہے سامنے آنا میں نے چھوڑ ہی دیا تھا۔ لیکن وہ برابر کہتے رہے کہ دیکھئے

---

[1] "حیات جگر" کا ایک باب حضرت جگر کی زبانی از نفیس الفاروقی قومی آواز ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۴

[2] "تذکرہ جگر" صفحہ ۳۶

[3] شیرازن بیگم کے بیان کے مطابق یہ واقعہ ۱۹۳۸ء کا ہوگا۔

اب میں شراب نہیں پیتا ہوں، جب تین مہینے ہو گئے تو انھوں نے عقد کی فرمائش کی، میں نے کہا تین مہینے بہت قلیل عرصہ ہے اگر آپ سال بھر تک ثابت قدم رہے تو مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔ کبیدہ خاطر ہوئے کسی قدر جھلائے بھی۔ اسی دوران میں اصغر گونڈوی کے انتقال کا تار آیا، چلے گئے، وہاں سے خبر بھجوائی، میں نے نسیم سے عقد کر لیا ہے۔[۵]"

علی منظر صاحب نے راقم الحروف سے ۲۶ رمئی ۱۹۶۳ء کی ایک ملاقات میں بتایا کہ بھائی صاحب (جگر صاحب) نے جب بھابھی سے دوبارہ نکاح کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں منگلور شاہ عبدالغنی صاحب منگلوری کے صاحبزادے سے ملنے گئے تو تین دن تک اُن سے ملاقات نہ ہو سکی اور چوتھے دن جب بھائی صاحب (جگر صاحب) ان سے ملنے کے لئے مُصر ہوئے تو انھوں نے کہا کہ جو شخص شراب پیتا ہے میں اس سے نہیں ملتا ہوں، بھائی صاحب نے ان سے کہا کہ حضرت نے تو کبھی منع نہیں فرمایا، شاہ صاحب کے صاحبزادے صاحب نے کہا' وہ ان کا زمانہ تھا اور یہ میرا زمانہ ہے' میں کسی شرابی سے نہیں ملتا' اس بات سے بھائی صاحب بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ اب شراب نہیں پیوں گا۔ اس کے بعد انھوں نے کبھی شراب نہیں پی۔

علی منظر صاحب نے بتایا کہ جگر صاحب نے ان سے بھی کئی دفعہ ساتھ رہنے کو کہا لیکن انھوں نے (علی منظر صاحب نے) بھی ان سے ہمیشہ یہی کہا کہ اگر آپ شراب پینا ترک کر دیں تو میں آپ کے ساتھ رہوں، لیکن نہ انھوں نے شراب ترک کی اور نہ وہ ان کے ساتھ رہے۔

جگر سے عقد ثانی کیلئے نسیم بیگم کی بھی شرط ترکِ مے نوشی تھی۔ ہوا یہ کہ جب اصغر صاحب سخت بیمار ہوئے تو انھوں نے اپنی آخری علالت کے زمانہ میں نسیم بیگم کو وصیت کی تھی کہ ان کے انتقال کے بعد اگر جگر صاحب شراب چھوڑ دیں تو وہ ان سے نکاح کر لیں اس وصیت کے چند دن بعد اصغر صاحب کا انتقال ہو گیا جگر صاحب کے دل میں نسیم بیگم سے بیس سال کی علیحدگی کے باوجود اُن کی محبت کی آگ سلگتی رہی اور جب ان کی واپسی کے امکانات پیدا ہوئے تو یہ آگ بھڑک اٹھی، نسیم بیگم کے عدت کے دن پورے ہونے کے بعد جگر صاحب نے کہلا بھیجا کہ وہ دوبارہ ان کے ساتھ نکاح کر کے زندگی گزارنا قبول کر لیں۔ انھوں نے اصغر صاحب کی وصیت بتائی اور کہا کہ دوبارہ نکاح کے لئے صرف ایک شرط ہے کہ وہ شراب بالکل ترک کر دیں پہلے تو جگر صاحب یہ سنکر جز بز ہوئے لیکن جب انھیں اصغر صاحب کی وصیت کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے ایکدم شراب ترک کر دی، اور

۵۔ "نگار" مارچ ۱۹۶۱ء صفحہ ۳۶۔۳۷

خواجہ مسعود علی ذوقی کی تحریر کے مطابق "غالباً ۵ مئی سنہ ۱۹۳۹ء کو گونڈہ میں نہایت سادہ اور شرعی طریقے سے حضرت اصغر کے مکان میں ان کی بیوہ سے بعد نماز عصر جگر صاحب کا عقد ہو گیا"[۱]۔ اب اس عقد ثانی کے بعد جگر صاحب کی باقاعدہ متاہل زندگی شروع ہو گئی۔

جگر صاحب کی اس وقت کی ترکِ مے نوشی کے سلسلے میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھا ہے:

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جگر صاحب کو مسلسل ایک سال تک اس بدلی ہوئی حالت میں دیکھنے کے بعد جب مجھے پوری طرح یقین ہو گیا کہ واقعی جگر صاحب کی کایا پلٹ گئی ہے تب میں نے اپنی ذاتی نوٹ بک میں یہ چند فقرے لکھے تھے۔

'یہ اکتوبر سنہ ۴۱ء ہے جگر صاحب کو شراب چھوڑے ایک سال سے زیادہ ہو چکا ہے ورنہ اس سے قبل تو یہ حالت تھی کہ شراب کے بغیر ان کا زندہ رہنا ہی مشکل تھا سب کے سامنے کھلے خزانے پیتے پھرتے تھے یہ انقلاب واقعی ان کی زندگی کا بہت بڑا انقلاب ہے'"[۲]

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے ان چند فقروں سے یہ اندازہ ہوتا کہ جگر صاحب نے اکتوبر سنہ ۳۹ء[۳] میں شراب ترک کی ہو گی۔

رمی کا کھیل جگر صاحب نے شراب ترک کی تو اس کے بعد ان کو رمی کے کھیل سے غیر معمولی انہماک پیدا ہو گیا ایک دفعہ محمود علی خاں جامعی نے جگر سے اس معاملہ میں تبادلہ خیال کیا تو جگر صاحب نے فرمایا۔

"تمھیں اندازہ ہو گا کہ کسی چیز میں غرق رہنا یعنی خود فراموشی میری فطرت ہے یا بن گئی ہے جوانی تک میں شاعری میں کھویا رہتا تھا۔ جوانی گزرنے کے بعد جذبات میں وہ اُمنگ جو شاعری پر مجبور کرتی ہے صرف کبھی کبھی پیدا ہوتی ہے اس لئے شاعری میں اب وہ انہماک یا خود فراموشی باقی نہیں رہی۔ رہا احباب کی مجلس میں شعر سنانا تو ایک تو جب تک کوئی نئی غزل نہ ہو وہی پرانے اشعار سنانا طبیعت کو پسند نہیں دوسرے

---

[۱] راقم کے خیال میں ذوقی صاحب سے سنہ کا سہو ہو گیا ہے مئی سنہ ۳۹ء کے بجائے مئی سنہ ۴۰ء ہونا چاہیے تھا۔ جیسا کہ ڈاکٹر عبادت بریلوی کی تحریر سے آگے چل کر واضح ہو گا۔

[۲] تحریک۔ اکتوبر سنہ ۶۲ء صفحہ ۸ [۳] "ہم قلم" سالگرہ نمبر سنہ ۶۱ء صفحہ ۱۷

[۴] مسعود علی ذوقی نے "تحریک" اکتوبر سنہ ۶۲ء میں صفحہ ۸ پر لکھا ہے کہ جگر صاحب نے "غالباً اکتوبر یا نومبر سنہ ۳۸ء میں .... شراب ترک کر دی" لیکن چونکہ ذوقی صاحب نے اندازاً لکھا ہے اس لئے ڈاکٹر عبادت بریلوی کی تحریر مستند معلوم ہوتی ہے۔

شعر سنانے میں جو پھیپھڑوں پر زور پڑتا ہے، اب گرتی ہوئی صحت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی اب رہا خود فراموشی کا دوسرا ذریعہ یعنی شراب وہ ترک ہی کر دی ہے، پھر مجھے خود فراموشی اور وقت گزاری کے لئے کچھ نہ کچھ تو چاہیئے۔ اور یہ میری عادت ہے جو کام بھی کرتا ہوں اس میں اعتدال کی حدود پر نظر نہیں رہتی لہٰذا میں نے تاش شروع کر دیا ہے اور اس میں اس قدر انہماک پیدا ہو گیا ہے۔[٥]

جگرؔ صاحب کے رمی میں اس قدر منہمک رہنے کی وجہ سے ان سے اور ان کی بیگم سے لڑائی ہوتی رہتی تھی۔ اسی لڑائی کی وجہ سے ایک دفعہ ان کو بھوپال میں اس کھیل سے توبہ کرنی پڑی، احباب کی محفل جمی تو ایک دو دن تو اُسے ٹالا۔ آخر احباب کہنے لگے کہ وہ لوگ تاش کھیلیں لیکن جگر صاحب تاش نہیں کھیل سکتے کیونکہ ان پر دفعہ ۱۴۴ نافذ تھی اور جب احباب نے کھیلنا شروع کیا تو وہ ذرا ہٹ کر بیٹھے، پھر کھسکتے کھسکتے کھیلنے والوں کے قریب تک آ گئے اور اُچک اُچک کر ان کے پتّے دیکھنے لگے کبھی کبھی کھیلنے والوں کو کوئی ضروری مشورہ بھی دینے لگے اس پر بھی اگر کھیلنے والے نے کوئی غلطی کی تو اُنھوں نے خود غصّہ میں جھنجھلا کر اس سے کہنا شروع کیا کہ 'یہ پتّہ نہیں وہ پتّہ ڈالو' اگر اس کے باوجود بھی کھیلنے والے نے غلطی کی تو انھوں نے اس کے ہاتھ سے پتّے چھین لئے اور خود اس کی جگہ بیٹھ گئے اور اس طرح دفعہ ۱۴۴ توڑ دی۔

اس رمی میں تو وہ اس قدر گم ہو جاتے تھے کہ وہ تین تین چار چار روز مسلسل رمی کھیلتے رہتے تھے اور انھیں کھانے پینے تک کا ہوش نہیں رہتا تھا۔

رمی کے کھیل سے ان کی دلچسپی کا اندازہ مندرجۂ ذیل واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے

ایک دفعہ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے ایک دوست کے یہاں جگر صاحب کے اعزاز میں شہر کے ادباء و شعراء کی دعوت کی گئی تاکہ شعر و سخن کی محفل سے جگر صاحب کی تواضع کی جا سکے۔ تمام لوگ جمع ہوئے کھانے کے بعد ۱۲ بجے رات تک شعر و سخن کی محفل بھی جمی اس کے بعد بیشتر مہمان رخصت ہو گئے تو جگر سے ڈاکٹر عبادت نے کہا کہ اب وہ تھک گئے ہوں گے اس لئے آرام کریں تو مناسب ہے۔ جگر صاحب یہ سنکر مسکرائے اور بولے "جی ہاں، خیال تو اچھا ہے لیکن"

ڈاکٹر عبادت ان کے اس 'لیکن' کا مطلب سمجھ گئے کہ وہ ابھی آرام نہیں کرنا چاہتے ہیں، بلکہ تاش کھیلنا چاہتے ہیں اور جب ڈاکٹر عبادت نے ان سے رمی کھیلنے کے لئے پوچھا تو جگر صاحب نے کہا "احباب چاہیں گے تو دو چار ہاتھ کھیل لیں گے" آخر کار سب لوگوں نے محسوس کیا کہ جگر صاحب

٥؎ تذکرہ جگرؔ صفحہ ۳۲

رمی کھیلنا چاہتے ہیں چنانچہ تاش منگوائے گئے اور جگر صاحب رمی کے کھیل میں مشغول ہو گئے

ایک دفعہ اور اسی طرح کا واقعہ پیش آیا جبکہ جگر صاحب ساڑھے گیارہ بجے رات میں موٹر میں بیٹھنے جا رہے تھے اس وقت انھوں نے اپنے رمی کھیلنے کے شوق کو احباب کے اس انداز میں ظاہر کیا کہ احباب کو مجبوراً یہی طے کیا کہ تھوڑی دیر کے لئے رمی ضرور ہونا چاہیئے۔

جگر صاحب کی صحت کی خرابی کے خیال سے احباب ان کو رمی کھیلنے سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے لیکن جگر صاحب رمی کھیلنے کی کوئی نہ کوئی صورت نکال ہی لیتے تھے اور احباب کی تمام کوششیں بیکار ہو جاتی تھیں۔

جگر کی مری میں رمی کے انہماک کو دیکھکر ہی شوکت تھانوی نے ایک دفعہ لکھا تھا کہ "پتہ نہیں چلتا کہ مری میں رمی ہے یا رمی میں مری۔"

جگر کی رمی میں انہماک کا اندازہ مندرجۂ ذیل ایک واقعہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ رمی کسقدر ڈوب کر کھیلتے تھے۔

ایک دفعہ ان کے رمی کے کھیل کے دوران ایک نوجوان یہ کہتے ہوئے وارد ہوئے 'جگر صاحب آداب عرض' لیکن وہاں کون سنتا تھا۔ وہ صاحب بیٹھ گئے، ذرا موقعہ دیکھا تو کہنے لگے، 'جگر صاحب میں پچھلے سال بھی حاضر ہوا تھا، میرے والد صاحب بھی میرے ہمراہ تھے۔ جگر صاحب نے کہا' جی' اور پھر کھیل میں محو ہو گئے، نوجوان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا وہ جگر صاحب سے تاسف بھرے لہجے میں کہنے لگا "جگر صاحب، میرے والد صاحب ......، یہ کہا ہی تھا کہ جگر صاحب نے کہا 'آپ کے والد صاحب ......' اور اتنے میں تاش کا پتہ اٹھاتے ہوئے معاً کہہ دیا 'جوکر' سب لوگ قہقہہ مار کر ہنسے لیکن جگر صاحب پھر رمی میں غرق ہو گئے اور انھیں یہ احساس بھی نہ ہوا کہ 'جوکر' کون بنا۔[۱]

جگر صاحب کا یہ سارا انہماک ان کی فطرتِ خود فراموشی کی وجہ سے تھا، ترکِ شراب کے بعد کھیل میں ان کا انہماک رمی سے تھا اور کھانے پینے میں چائے اور پان کی کثرت ہو گئی تھی۔

حج جگر بقول سید سلیمان ندوی عشقِ حقیقی کے جویا تھے جس کا احساس سید سلیمان ندوی کو سنہ ۱۹۳۲ء ہی میں ہو گیا تھا۔ دراصل یہ جگر کی عشقِ حقیقی ہی کی تلاش تھی جس کے سبب سے انھیں سنہ ۱۹۵۳ء میں زیارتِ کعبہ و حج بیت اللہ نصیب ہوا

جگر صاحب کے حج کا محرک ایک عجیب و غریب واقعہ ہوا اس واقعہ کے علاوہ حمید صدیقی وغیرہ

۱۔ "آجکل" جنوری سنہ ۱۹۶۱ء صفحہ ۳۳

کی دعائیں اور جگر کی پاک طینتی کو بھی اس میں بڑا دخل تھا

ایک دفعہ ۱۹۳۸ء میں ' زائران حرم کی آمد پر حمید صاحب نے ایک نظم لکھی جس میں دعائیہ اشعار کے سلسلے میں بیاختہ ایک شعر ان کے دل کی گہرائیوں سے نکل کر زبان پر آگیا۔ ؎

حاضر در نبیؐ پہ جگر بھی ہوں اے خدا
آنکھوں میں جوش اشک ندامت لئے ہوئے

یہ نظم حمید صاحب نے جب پہلی بار بغرض اصلاح جگر صاحب کو دکھائی تو مندرجہ بالا شعر کو پڑھکر وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ رونے لگے اور ان سے فرمایا کہ " دل دکھانے کی چیز نہیں ورنہ دکھاتا کہ تمھارے اس پر خلوص محبت کا کتنا اثر ہوا ہے[۱]"

ایک دفعہ ۱۹۵۱ء میں الحاج مولانا عبدالوہاب صاحب مہاجر مدنی نے ایک شب مدینہ میں خواب دیکھا کہ " ایک سرسبز و شاداب کھجوروں کے باغ میں ایک صاحب چارپائی پر بیٹھے ہوئے چہرے پر بال بکھرائے ہوئے، آشفتہ و بے قرار آنکھیں عجیب سرمستی کے عالم میں والہانہ انداز سے جھوم جھوم کر اشعار پڑھ رہے ہیں۔ اردگرد اہل مدینہ کا مجمع ہے، سامنے گنبد خضرا جلوہ گر ہے اور وہ صاحب دو تین شعر پڑھنے کے بعد قبۂ نور کی طرف ہاتھ اٹھا کر عرض کرتے ہیں کہ ' یا رسول اللہ اپنی رحمت کے صدقہ میں کچھ مجھے بھی عطا فرمائیے ' خواب دیکھنے والے نے سامعین میں سے کسی ایک بزرگ سے دریافت کیا ' یہ کون صاحب ہیں؟ ان بزرگ نے جواب میں کہا ' تم ان کو نہیں جانتے ' یہ مشہور شاعر جگر مرادآبادی ہیں ' اس کے بعد ان کی آنکھ کھل گئی اور اس خواب کا حال اپنے عم محترم مولانا عبدالغفور شاہ صاحب سے بیان کیا مولانا عبدالوہاب صاحب نے اب تک جگر صاحب کو کبھی دیکھا بھی نہ تھا[۲]"

اس خواب کا حال ۱۹۵۱ء ہی میں مولانا عبدالغفور شاہ صاحب نقشبندی مہاجر مدنی نے حمید صاحب کو تحریر فرمایا اور ان کو ہدایت کی کہ راقم السطور یہ خواب جگر صاحب سے بیان کرکے ان کو مبارکباد پیش کردے۔

حمید صاحب یہ خط پڑھ کر حسب ہدایت جگر صاحب کی خدمت میں بھوپال ہاؤس، ان کی قیامگاہ پر پہونچے، وہ اس وقت آرام فرمارہے تھے ' حمید صاحب تھوڑی ہی دیر بیٹھے تھے کہ وہ بیدار ہوگئے سلام و مزاج پرسی کے بعد حمید صاحب نے اس خط کو پڑھ کر جگر صاحب کو سنایا۔ خواب کا حال سن کر جگر صاحب اشکبار ہوگئے اور کہنے لگے کہ ان پر ابھی اسی قسم کا عالم طاری تھا، اور وہ ایک طرح

---

[۱] " فروغ اردو " لکھنؤ فروری مارچ ۱۹۶۱ء صفحہ ۹۶
[۲] " آجکل " جنوری ۱۹۶۱ء صفحہ ۵۱

کا کرب محسوس کر رہے تھے۔

حمید صاحب نے جگر صاحب سے کہا ان کی وہ نعتیہ غزل یقیناً مقبول بارگاہ رسالت ہے[۱]

اک رند ہے اور مدحتِ سلطانِ مدینہ
ہاں کوئی نظرِ رحمتِ سلطانِ مدینہ

اور جب اسی خواب کو حاجی مصطفےٰ خاں صاحب نے جگر صاحب سے بیان کیا تو جگر صاحب کی عجیب حالت تھی۔ ان کی آنکھوں میں جو نمی بڑھ رہی تھی اس کو روکنے کی کوشش کی اور اظہار خوشی میں ہلکی سی لبوں پر مسکراہٹ جس سے امتزاجِ انفعالِ مسرت کا پتہ چلتا تھا غالباً گہرے تصور میں ڈوب کر خاموش ہو کر رہ گئے اور کچھ نہ فرمایا، کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ حج کی تیاری ہے[۱]

دراصل یہی خواب جگر کے حج بیت اللہ کا محرک بنا، اس کے بعد ان کو فریضہ حج کا احساس شدت سے ہونے لگا، اس سلسلے میں وہ ۱۱ر جون ۵۳ء کو تسکین صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"فریضۂ حج" ادا کرنے کا عزم اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حقیقتاً عملی شکل اختیار کر کے رہیگا کچھ حالات ایسے ہوتے چلے جا رہے ہیں کہ جیسے "غیب خود مدد و معاون بن گیا ہے"[۲]

اس کے بعد آخری جولائی ۵۳ء میں تسکین صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"ہم لوگ اس سال فریضۂ حج ادا کرنے کا عزم محکم کر چکے ہیں۔ خدا پاک ہم لوگوں کی سعی مشکور فرمائے ...... میرے لئے آزاد صاحب، حمید صاحب یا اسی طرح دوسرے احباب کی معیت ازحد ضروری ہے"[۳]

جگر صاحب کے حج میں ان کے مذہبی خلوص اور حضور اکرمؐ سے اُن کی عقیدت و محبت کا بھی دخل تھا ورنہ کہاں جگر اور کہاں حج۔

حضور رسول مقبولؐ سے ان کی محبت کے سلسلے میں عزیز الحسن صاحب مراد آبادی نے راقم سے ۲۵ر دسمبر ۶۳ء کی ایک ملاقات میں ان کی مے نوشی کے زمانہ کا ایک واقعہ بیان فرمایا کہ جگر صاحب نے ان سے اس واقعہ کو یوں بیان کیا تھا:۔

"ایک دفعہ وہ عالمِ مدہوشی میں سو گئے اور خواب میں حضور احمد صاحب[۴] کو دیکھا تو ان سے دریافت کیا کہ کیا کبھی رسول مقبولؐ کی خدمت میں کبھی حاضر ہوتے ہو یا کبھی ان سے کبھی ملاقات ہوتی ہے حضور احمد صاحب نے کہا جی ہاں، کبھی کبھی ملاقات تو ہوتی ہے جگر صاحب نے اسی عالم خوابی میں حضور احمد سے کہا کہ اگر آپ کی ان کی خدمت میں حاضری ہو تو میرا سلام کہہ دینا"

۱؎ "نظام جدید" ۱۶ و ۲۳ ستمبر ۶۲ء صفحہ ۲۸۔ ۲؎ و ۳؎ "مکاتیب جگر" صفحہ ۱۹۱ و صفحہ ۹۲ و ۹۳۔

۴؎ حضور احمد صاحب مراد آبادی جگر کے ابتدائی زمانہ میں شعر و شاعری میں شریک رہتے تھے جگر کے مخصوص دوستوں میں تھے صوفی شاعر تھے ان کا جوانی میں انتقال ہو گیا اور ان کے انتقال کے بعد جگر صاحب نے ان کو خواب میں دیکھا تھا۔

تو دراصل جگر کا حضور اکرمؐ سے یہ دلی تعلق تھا جس کا اظہار انھوں نے نشے کے عالم میں عالمِ خوابی میں حضور احمد صاحب سے کیا تھا اور یہی ان کے دل کی پکار تھی جس نے اُنھیں آخری عمر میں حج بیت اللہ پر آمادہ کیا۔

غرضیکہ جگر صاحب اپنے عزمِ محکم میں کامیاب ہوئے اور اگست ۱۹۵۳ء میں حج کے لئے روانہ ہوگئے۔

حج کے دوران ان کے احساسات اُنھیں کے الفاظ میں سنئے:-

"میں جب حج کے لئے گیا تو قدم قدم پر شکوک و شبہات تھے مگر مدینہ منورہ پہونچکر تمام شکوک اس طرح رفع ہو گئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں، حج سے واپسی کے بعد ایک یا ڈیڑھ سال تک نعت نہیں ہوئی، میں ایک کرب میں مبتلا تھا۔ نعت مری میں ہوئی اسی ردیف کی غزل اور قطع بھی مری میں ہوئے۔

نعت میرے لئے عطیات میں سے ہے جی چاہتا ہے کہ موت آجائے تو یہ سامنے ہو، اس میں میرا کچھ نہیں، اس میں عنوانات ہیں۔ احتراماً کہیں نام نہیں لیا ہے اور اپنے لئے کچھ مانگا بھی نہیں ہے خصوصیاتِ محمدیہ، عہدِ خلافت و عہدِ حاضر میں دو دو اشعار ہیں مگر انھیں اقوام کی تاریخوں کے پس منظر میں دیکھنا چاہئیے معراج و تتمہ از حقیقت معراج اس کے بارے میں صاحبِ عقل شکوک پیش کرتا ہے۔ عقیدت کے علاوہ حقیقت بیان کرنی تھی، ایک سامنے کی چیز نثار کی ہے مگر یہی جان و ایمان ہے۔

اے بر تو نثار "شرمِ عصیاں"

اے بر تو فدا "دلِ تپیدہ"

قطع اور مقطع بھی غور طلب ہیں۔ یہ اندر کی بات ہے کسی نے اندر سے کہا ورنہ

اے از لبِ صادقت شنیدہ

نادیدہ خدا احد اے دیدہ

میرے بس کی بات نہیں تھی پہلے یہی مطلع ہوا، کسی نے دل میں کہا۔ 'تم نادانستہ توہین کر رہے ہو اسے محرومی سمجھنا گستاخی ہے کہ اتنی بڑی بارگاہ سے محروم واپس آئے اور پھر یہ جواب بھی ملا کہ یہ نعت نتیجہ ہے کرب محرومی کا، نثار کرنے کیلئے دلِ تپیدہ اور شرمِ عصیاں کہاں سے لائے"[1]

---

[1] "حیاتِ جگر" کا ایک باب حضرت جگر کی زبانی از قیسی الفاروقی، قومی آواز ۱۰ ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۴

جب حجاز مقدس میں جگرؔ صاحب کی حاجی اصطفیٰ خاں صاحب سے ملاقات ہوئی تو جگرؔ صاحب نے اصطفیٰ خاں صاحب سے فرمائش کرکے عبدالوہاب صاحب سے ملے جنھوں نے ان کو خواب میں دیکھا تھا۔ جگرؔ صاحب نے کچھ دیر بیٹھ کر ان کو اپنا کلام بھی سنایا۔ جب عبدالوہاب صاحب نے ان کی غزل سُنی تو انھوں نے فرمایا۔

"واللہ یہی شکل و صورت اور یہی حلیہ کا شخص اسی لہجہ میں کلام سنا رہا تھا"

جگرؔ صاحب کے ان واقعات سے سید سلیمان ندوی کی پیشین گوئی کی تصدیق ہوتی ہے جو انھوں نے سنہ ۳۳ء میں کی تھی کہ جگرؔ مجاز کی راہ سے حقیقت تک پہونچنا چاہتا ہے۔

جگرؔ واقعی مجاز کی راہ سے حقیقت تک پہونچ گئے اور سید سلیمان ندوی کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوگئی۔

شعر کہنے کی کیفیت

جگرؔ صاحب کے شعر کہنے کی بھی عجیب کیفیت ہوتی تھی جب ان پر شعر کہنے کی کیفیت طاری ہوتی تو وہ کئی دن پہلے سے کہنے لگتے کہ ابھی غزل آنا چاہتی ہے یہ کہتے ہوئے وہ جھومنے لگتے اور واقعی انھیں ایام میں ان پر غزل کا نزول ہوتا تھا۔ جب شعر کہتے تھے تو ان کے چہرے پر عجیب عجیب طرح کی کیفیات نمایاں ہوتی تھیں، کئی کئی شعر مسلسل ایک ہی کیفیت میں کہہ ڈالتے تھے اور کبھی کبھی کسی مصرع پر مصرع لگانے میں ان کی طبیعت میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی تو وہ وہاں دوسرے مصرع کی جگہ پھول بنا دیتے تھے اور اس کے آگے فکر کرنے لگتے تھے کبھی کبھی ان کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ بے حد غصہ میں شعر کہہ رہے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ جگرؔ صاحب اِس وقت غزل کہہ رہے ہیں۔ دوسرا کوئی اس مقام پر نہیں پہونچ سکتا، طرحی غزلوں کی صورت میں ان کا یہ عالم خصوصاً نمودار ہوتا تھا۔ اور جب ان سے اس کی وجہ دریافت کی جاتی کہ جب وہ طرح میں غزل کہتے ہیں تو ان کے تیوروں پر بل کیوں آجاتے ہیں۔ تو وہ مسکرا کر فرماتے کہ وہ ازل سے فاتحانہ طبیعت لیکر آئے ہیں جس کی وجہ سے شعر کہتے وقت ان کے اوپر ایک ایسا عالم طاری ہوجاتا ہے کہ کوئی صاحب ان کے شعر کے برابر سے نہ گزرنے پائیں، یہی سبب تھا کہ جب وہ مشاعروں میں اپنی غزلیں پڑھتے تو ان پر ایسی کیفیت طاری ہوجاتی کہ دوسرا شاعر مشاعرے میں ان کے سامنے کامیاب ہی نہ ہو پاتا۔

جگرؔ سے زبردستی غزل کہلوانے کا واقعہ

بعض اوقات جگرؔ صاحب شغل شعر و شاعری ترک کردیتے تھے اس وقت ان کے احباب اُن سے زبردستی بھی غزل کہلواتے تھے ایک دفعہ ایک موقعے پر انھوں نے شعر کہنا ترک کردیا جب احباب کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے ان کو ایک کمرے میں مقفل کردیا اور کہہ دیا کہ جب تک وہ نئی غزل

نہیں کہہ لیں گے ان کو کھولا نہ جائے گا جگرؔ صاحب تاڑ گئے کہ بغیر کہے کام نہ چلے گا چنانچہ بقول عمران انصاری انھوں نے (جگرؔ نے) "طبیعت کو آمادہ کیا کچھ پینے پلانے کی ضرورت پیش آئی مگر وہاں سوائے حقّہ کے کچھ بھی نہ تھا جس میں جلدی میں کوئلے ڈالنے بھی وہ لوگ بھول گئے تھے۔

جگرؔ صاحب نے اپنی قمیص پھاڑ کر اس سے حقّہ روشن کیا اور غزل شروع کر دی یہ وہی غزل ہے جس کا مشہور شعر یہ ہے کہ:۔

کل اتنی حقیقت تھی منصورؒ (انا الحق) کی
ناچیز سا اک قطرہ دریا کے مقابل تھا

صبح تک سترہ اٹھارہ شعر کی غزل تیار ہو گئی تھی۔ مگر سوائے کمبل کے جگرؔ صاحب کے جسم پر کچھ نہ تھا وہ پورا لباس حقّہ کی راہ سے پی چکے تھے مگر جب احباب نے غزل سُنی تو جھوم جھوم گئے ہیں"[۱]

اسی سلسلے کا ایک واقعہ محمود علی خاں جامعی نے لکھا ہے کہ:۔

"جگرؔ صاحب سے کبھی کبھی ڈنڈے کے زور سے بھی شعر کہلوایا جاتا تھا۔ مولوی خورشید الحسن صاحب جنھیں بڑے بھیا کہا جاتا ہے بڑے دلچسپ بزرگ تھے یہ آپ جگرؔ صاحب کے بہت ہی خاص دوست تھے ایک زمانے میں جگرؔ صاحب پر جمودی کیفیت طاری ہوئی اور مسلسل ایک یا ڈیڑھ سال تک شعر نہیں کہا، بڑے بھیا کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ جگرؔ صاحب کو گجنور لے گئے جہاں مولوی صاحب موصوف کسی کالج میں پرنسپل[۲] تھے کتنے ہی دنوں تک انھوں نے جگرؔ صاحب کا موڈ بنانے کے لئے مختلف تدابیر اختیار کیں، مشاعرے کئے، ادبی بیٹھکیں فراہم کیں سیر و تفریح کا سامان مہیا کیا۔ لیکن جگرؔ صاحب جب کسی طرح شعر کہنے کی طرف مائل نہ ہوئے تو ایک دن بڑے بھیا ڈنڈا لیکر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ ابھی شعر کہو ورنہ سر پھاڑ دوں گا، جگرؔ صاحب نے ہر چند راہِ فرار اختیار کی مگر بڑے بھیا بلائے بے درماں کی طرح ڈٹے ہوئے تھے آخر مجبور ہو کر جگرؔ صاحب نے شعر کہے اور تھوڑی ہی دیر میں پوری غزل کہہ لی اگر میری یاد دھوکا نہیں کھاتی ہے تو وہ غزل یہ تھی:۔

فصلِ حسن ہے ان کی موسمِ شباب ان کا[۳]"

اس واقعہ کی تصدیق مولوی خورشید الحسن صاحب نے ۲۷؍ دسمبر ۶۳ء کی ملاقات میں راقم الحروف سے کی۔

---

[۱] "صبح امید" جولائی ۵۱ء صفحہ ۳۵

[۲] خورشید الحسن صاحب کسی جونیر ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے

[۳] "تذکرۂ جگرؔ"، صفحہ ۱۰۹ و ۱۱۰

آسمانی مشاعرہ جگر صاحب نے ۱۹۴۱ء یا ۱۹۴۲ء میں ایک مختصر فلم "آسمانی مشاعرہ" میں داغ کا پارٹ ادا کیا۔ لیکن محمود علی خاں جامعی صاحب نے سہواً اس فلم کا نام "چورنگی" لکھدیا ہے اور لکھا ہے کہ :۔

"فلم سازوں کی انتہائی کوشش کے باوجود جگر صاحب فلمی جال سے ہمیشہ محفوظ رہے صرف ایک مرتبہ فلمی شاعرے کی تمثیل میں داغ کا پارٹ ادا کرنے کے سلسلے میں ضرور گرفتار ہوگئے ہوا یہ کہ جب ایک فلم ساز (فضلی صاحب) نے آپ کو یہ پیش کش کی تو ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ جو رقم آپ لینا چاہیں تار سے مطلع کر دیں۔

آپ نے صاف انکار کرنے کے بجائے یہ مناسب سمجھا کہ اتنی زیادہ رقم مانگی جائے جسے فلم ساز منظور نہ کر سکیں انھیں اس وقت تک فلمی صنعت کے معاوضوں کی ادائگی کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی نظر میں ایک بڑی رقم طے کر کے تار دیدیا۔ فوراً جواب آیا کہ منظور ہے فلاں تاریخ کو اسٹوڈیو پہنچ جائیے اب جگر صاحب کے سامنے جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ ایفائے وعدہ کے سختی سے پابند ہیں۔ لہٰذا طوعاً وکرہاً وہاں جانا پڑا۔ اور فلم چورنگی میں آپ کو داغ کی حیثیت سے فلمایا گیا۔"[۱]

لیکن فضل احمد کریم فضلی صاحب نے خود اس کی تردید کرتے ہوئے راقم الحروف کو ایک خط مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۹۶۲ء میں لکھا ہے کہ :۔

"جامعی صاحب کو کچھ سہو ہوا ہے جگر صاحب نے داغ کا پارٹ "چورنگی" میں نہیں کیا تھا بلکہ "آسمانی مشاعرے" کے نام سے ایک مختصر فلم علیحدہ بنائی گئی تھی جس کی خصوصیت یہ تھی کہ زندہ مشاہیر نے گذشتہ مشاہیر کی نمائندگی کی تھی۔ چنانچہ مولوی عبدالحق صاحب حالی بنے تھے خواجہ حسن نظامی نظیر اکبرآبادی، خان بہادر رضا علی وحشت غالب اور جگر صاحب داغ، اس فلم کا منظر نامہ میانے ہی لکھا تھا۔ بدقسمتی سے اس فلم کا نگیٹو جل گیا جس کا مجھے بڑا افسوس ہے ورنہ ایک یادگار چیز محفوظ ہو جاتی۔ اسی فلم میں شرکت کے سلسلے میں جگر صاحب سے میری پہلی خط و کتابت ہوئی پہلے تو وہ بہت چراغ پا ہوئے مگر دو چار خطوط کے بعد کچھ نرم پڑے اور جب میں نے انہی کا شعر ان کی نذر کیا ؎

تغافل، تجاہل، تبسم، تکلم
یہاں تک تو پہونچے وہ مجبور ہو کر

---

[۱] تذکرہ جگر، صفحہ ۵۷، ۵۸

تو فوراً راضی ہو گئے اور میرے ہی ساتھ ٹھہرے، اس طرح ہماری دوستی کی ابتدا ہوئی جو بحمد اللہ برابر بڑھتی گئی، اس فلم کے بنانے کی تاریخ تو مجھے ٹھیک سے یاد نہیں مگر غالباً یہ ۱۹۴۱ء یا ۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے۔"

فلم میں غزلیں دینے سے انکار

اس دور میں جسے فلمی دور کہنا بے جا نہ ہوگا جب شاعر نے ذرا سی شہرت کمائی فلمی لائن میں پہونچ گیا۔ ملک کے بڑے بڑے مشاہیر شعرا تک نے فلمی لائن اختیار کی جگر صاحب کا تو ان دنوں میں بول بالا تھا ہر فلم ساز اس کوشش میں تھا کہ جگر صاحب اس کے کسی فلم کے لئے کوئی غزل دیدیں لیکن جگر صاحب جیسی عظیم المرتبت ہستی نے کبھی اپنے آپ کو اس سے ملوث نہ ہونے دیا۔ وہ اس کو گناہ سمجھتے تھے اور اسی خیال سے وہ کبھی اس گناہ کے مرتکب نہ ہوئے۔

صرف ایک بار ۱۹۴۵ء میں بمبئی میں "کاردار فلم" کی جانب سے ان سے "دس غزلوں" کے لئے شدید اصرار کیا گیا اور ان کی آزاد طبیعت کے ماتحت غیر مشروط طریقے پر ان سے وعدہ لیا گیا کہ انھیں اختیار ہے جب چاہیں غیر معینہ مدت میں دس غزلیں کہہ کر "کاردار فلم" کو دیدیں۔ انھوں نے اپنے ایک عزیز دوست کے اصرار پر وعدہ کر لیا اور ان کو اس فلم کی طرف سے پانچ ہزار روپے پیشگی بھی دیدیے گئے یہ جگر صاحب کے کل معاوضہ کی آدھی رقم تھی۔ اسی روز شب میں انھوں نے ایک عجیب وغریب خواب دیکھا ایک چھوٹا سا غلیظ کا پہاڑ ہے جس پر ایک شیر بیٹھا ہوا ہے پہاڑ کے دامن میں بہت سے لوگ جمع ہیں وہ شیر اپنے پنجوں سے چاروں طرف غلیظ اچھال رہا ہے اور اس غلیظ کو لوگ اپنے دامن میں لے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ غلیظ ان کے دامن میں بھی آیا۔ اسی قدر دیکھنے کے بعد ان کی آنکھ کھل گئی، ان کے دل نے اسی وقت خواب کی تعبیر دی اور ان کے ضمیر نے انھیں ملامت کی کہ فلم کے لئے غزلوں کا جو کنٹریکٹ ان سے ہوا ہے وہ ان کے لئے کسی طرح مناسب نہیں چنانچہ انھوں نے فوراً توبہ کی اور پانچ ہزار روپے اسی روز کاردار فلم کو واپس کرادئے۔ اس کے بعد پھر کسی فلم سے کبھی کوئی معاہدہ نہیں کیا۔

جگر صاحب کی تاریخی غزل کی ریکارڈنگ

جگر صاحب دُنیاوی معاملات میں زیادہ ہوشیار نہ تھے۔ وہ ان معاملات سے بالکل بے نیاز و بے خبر رہتے تھے اسی سلسلے کا ایک واقعہ جگر صاحب کی ایک تاریخی غزل کے ریکارڈ کرتے وقت کا ہے۔

جگر صاحب بہ سلسلۂ علاج اسلم رضوی صاحب کے یہاں مقیم تھے، ڈاکٹر عبد الحمید صاحب نے جگر صاحب کے قلب کا معائنہ کرنے کے بعد یہ رائے دی کہ جگر صاحب مشاعرے میں تو شرکت نہ کریں

البتہ غزل ریکارڈ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے چنانچہ پہلی یا دوسری نومبر ۵۹ء کو جگر صاحب کا کلام ریکارڈ کرنے کی تاریخ مقرر ہوئی۔

آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کی طرف سے شفاعت علی صاحب صدیقی جو ریکارڈ کرنے کی غرض سے ان کی قیام گاہ پر گئے تھے لکھتے ہیں کہ:۔

"بیماری نے جگر صاحب کو نڈھال کر دیا تھا، مرض پہلے ہی کچھ کم ہو لیکن نقاہت اتنی تھی کہ بغیر کسی سہارے کے بیٹھ بھی نہ سکتے تھے، انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے مسکرا کر ہم لوگوں کا استقبال کیا۔ خیریت پوچھی، اپنی خیریت بتائی، پھر بہت تھکی ہوئی اور نڈھال آواز میں ڈاکٹر عبدالحمید صاحب سے اپنے مرض کے متعلق دو چار باتیں کیں انھوں نے باتوں ہی باتوں میں انھیں ایسا بہلایا اور ایسی پھلجھڑیاں چھوڑیں کہ کمرے کی فضا ایک دم بدل گئی، ہوتے ہوتے بات شعر و شاعری تک آ گئی۔ جیسے جگر صاحب کو کوئی بھولی بات یاد آ گئی ہو، فرمایا "آپ لوگوں کو کافی دیر ہو گئی، بڑا وقت برباد ہوا، کہئے میں تیار ہوں آپ ریکارڈنگ شروع کیجئے" اب ان سے کون کہتا کہ قرب جگر سے بڑھ کر اس وقت کوئی دوسری چیز قیمتی نہیں ہے، ہم نے تعمیل ارشاد کی، جگر صاحب تکیوں کے سہارے سنبھل کر بیٹھ گئے بڑی کمزور آواز میں انھوں نے غزل شروع کی۔

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے

مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پھولتی ہوئی سانس کمزوری سے لڑکھڑاتی ہوئی زبان اور نحیف آواز میں یہ مطلع سنتے ہی جتنے لوگ بھی وہاں بیٹھے تھے سب کے چہروں کا رنگ اُتر گیا تھا، آنے والے اندیشے سے سب کے دل دھڑکنے لگے تھے"[1]

حبیب احمد صدیقی جگر کی دنیاوی معاملات سے بے خبری کے سلسلے میں اسی واقعہ سے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔

"ماتھر صاحب اور دیگر اراکین ریڈیو اسٹیشن نے ہمارے پہونچنے سے پہلے ہی دو غزلیں جن کے مطلعے مندرجۂ ذیل ہیں ریکارڈ کر لیں"

کیا چیز غمِ عشق کی دیوانہ وشی ہے	رونا ہے تو رونا ہے ہنسی ہے تو ہنسی ہے
جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے	مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

---

[1] "قومی آواز" ۱۹ ستمبر ۶۰ء صفحہ ۴

اور پھر یہ درخواست کی کہ وہ اپنی غزلوں کو مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں، قواعد کے مطابق ایک غزل کا معاوضہ زیادہ سے زیادہ ایک روپیہ دیا جا سکتا ہے لیکن چونکہ مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے غزلیں نشر ہوں گی تو ان کی تعداد کافی ہو جائیگی اور سال بھر میں ایک معقول رقم معاوضہ کی مل جائے گی جگر صاحب نے جب یہ سنا کہ ان کی غزل کا معاوضہ صرف ایک روپیہ ہوگا تو وہ بہت برہم ہوئے 'یہ واقعہ ہمارے پہونچنے سے پہلے پیش آچکا تھا۔ اطہر صاحب صدیق حسن صاحب کو اور مجھے کمرے سے باہر لے گئے اور واقعہ بیان کیا انھوں نے فرمایا کہ جگر صاحب یہ سمجھ رہے ہیں کہ اس طرح ان کی ہر غزل ایک روپے میں بک جائے گی، حالانکہ یہ سلسلہ برسوں چلے گا۔ اور ہر غزل بارہا پڑھی جائے گی انھوں نے کہا اگر قواعد اجازت دیتے تو ہم معاوضہ میں اضافہ کر دیتے مگر یہ ہمارے اختیار کی بات نہیں۔ انھوں نے بے حد اصرار کیا کہ کسی طرح جگر صاحب کو منوا کر اجازت دلوا دیجئے کمرے میں واپس آکر میں نے سلسلۂ جنبانی کی تو جگر صاحب نے کہا کہ آپ صاحبان جانتے ہیں کہ میں روپیہ کا حریص نہیں ہوں، مگر میری شاعری اتنی سستی نہیں ہے کہ ایک روپیہ فی غزل کے حساب سے بیچ دوں یہ میری اور میری شاعری کی سخت توہین ہوگی، میں نے کہا کہ آپ کی شاعری کے گرانقدر ہونے میں کسے کلام ہے اگر گراں قدر نہ ہوتی تو ریڈیو والوں کو کیا پڑی تھی کہ اسے ملک کے گوشہ گوشہ میں نشر کرنے کی تجویز پیش کرتے مگر آپ کے بڑے شاعر ہونے کے یہ معنی نہیں کہ ہر معاملہ میں آپ کی بڑائی مان لیں آپ اس معاملہ کو سمجھے ہی نہیں۔ حسرت موہانی بھی کچھ کم بڑے شاعر نہ تھے مگر انھوں نے خود مجھ سے کہا تھا کہ ان کی غزلیں جب نشر ہوتی ہیں تو فقط آٹھ آنہ فی غزل ملتے ہیں۔ یہ توہین نہیں عزت افزائی ہے کہ کسی شاعر کے کلام کو اتنا وقیع سمجھا جائے کہ ملک بھر میں اسے پہونچانے کی کوشش کی جائے، صدیق حسن صاحب نے بھی سمجھایا کہ نہ آپ کی غزل خریدنا مقصود ہے نہ آپ کی توہین کرنا، اس بات کو یوں سمجھئے کہ آپ کی کئی سو غزلوں کا مجموعہ چار پانچ روپے میں بکتا ہے تو کیا اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ اپنی ہر غزل چند پیسوں میں بیچ دیتے ہیں ہم دونوں نے انھیں کچھ ایسے آڑے ہاتھوں لیا کہ گھبرا کر پوچھنے لگے کہ اچھا یہ بتائیے کہ مجھے کس کس جگہ دستخط کرنے ہیں۔ پھر جہاں جہاں بتایا گیا وہاں خاموشی سے دستخط کر دیئے[1]

---

[1] "آجکل" جنوری ۶۱ء صفحہ ۱۳-۱۴

اس کے بعد ۳ نومبر ۱۹۵۹ء کو مشاعرے کی رات میں جب اناؤنسر نے جگر صاحب کی غزل کا مطلع پڑھا تو ایسا معلوم ہوا جیسے کھچا کھچ بھرے ہوئے اسٹوڈیو میں ہر شخص کو سکتہ سا ہو گیا اور جیسے ہی انھوں نے سُنا ؎

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

تو بہتوں کے زبان سے آہ نکلی اور بہتوں نے کہا "خدا آپ کی عمر دراز کرے۔"

جگر کی وفات | موت کی خبریں:- جگر صاحب کی حیات ہی میں ان کی موت کی خبریں دو مرتبہ اخبارات میں شائع ہوئیں پہلی دفعہ یہ خبر ۱۹۳۸ء میں اڑی جس کے متعلق ایڈیٹر 'زمانہ' نے مئی ۱۹۳۸ء کے پرچہ میں صفحہ ۲۹۳ پر جگر کی دو غزلیں شائع کی ہیں اور اس کے حاشیے پر لکھا ہے:

"۴ مئی کو کسی شخص نے مراد آباد سے جگر صاحب کے انتقال کی خبر اڑا دی جس سے ملک بھر میں رنج و ملال کی لہر دوڑ گئی، مگر شکر ہے کہ دوسرے ہی دن اس خبر کی تردید ہو گئی خدا کرے عرصۂ دراز تک آپ اپنے کمالِ شاعری سے ملک کو مستفید کرتے رہیں۔"

یہ خبر اس وقت اُڑی جبکہ جگر صاحب اور محمد رفیق صاحب مراد آبادی (جگر کے ایک قدیم مخلص دوست جو خود راقم سے اس واقعہ کے ۲۴ دسمبر ۱۹۶۳ء کی ملاقات میں راوی ہوئے) ایک دفعہ مُراد آباد کے قریب کے ایک گاؤں "تارپور" کھیر وغیرہ کھانے کے لئے چلے گئے تھے اسی درمیان میں کسی دشمن نے جگر کی موت کی خبر اڑا دی، محمد رفیق اور محمود علی خاں جامعی کے خیال میں جگر کی اس موت کی خبر ۱۹۳۵ء میں اڑی تھی لیکن صحیح سنہ کا تعین زمانہ ۱۹۳۸ء کے دستاویزی پرچہ سے ہوتا ہے وہی زیادہ مستند ہے کیونکہ مندرجۂ بالا دونوں حضرات نے محض قیاس کی بنا پر سنہ کی قیاس آرائی کی ہے۔

دوسری دفعہ ۱۹۵۸ء میں لکھنؤ میں جب ان پر دل کا شدید دورہ پڑا تو کسی نے ان کی موت کی خبر اڑا دی تھی۔

زہر دینے کا واقعہ | محمد رفیق صاحب نے ۲۴ دسمبر ۱۹۶۳ء کی ملاقات میں راقم سے بتایا کہ جگر صاحب کو ایک دفعہ غالباً ۱۹۱۹ء میں ان کے ایک ایجنٹ ساتھی نے کاروباری حسد میں پڑ کر زہر دے دیا تھا لیکن جگر صاحب بچ گئے۔

قمر مراد آبادی لکھتے ہیں کہ جگر کو "ایک بار دورانِ قیام بھوپال میں زہر دیا گیا وہ اس حملہ سے بچ گئے"[۱]

---

[۱] "نظام جدید" ۱۶ تا ۲۳ دسمبر ۱۹۶۲ء صفحہ ۱۳

حیات کیلئے خواب دیکھنا

قمر مرادآبادی ان کے اس واقعہ کے متعلق لکھتے ہیں۔

"بہت پرانی بات ہے کہ جگر صاحب شدید طور پر بیمار ہوئے اور ان کی حالت مایوسی کی حد تک پہونچ گئی۔ لیکن وہ ابھی مرنا نہیں چاہتے تھے، انھوں نے خواب میں دیکھا کہ ان کے دوست حضور احمد حضور، مرادآبادی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہیں۔ جگر صاحب بھی وہاں پہونچ گئے ہیں۔ حضور احمد صاحب نے جگر صاحب کو دیکھکر دریافت کیا "جگر کیا چاہتے ہو" جگر صاحب نے جواب دیا "حیات" حضور احمد نے کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں ان سے مانگو۔ جگر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی اور ادھر سے حیات کے لئے اشارہ ہو گیا۔

جگر کہتے ہیں صبح کو جب میں اُٹھا تو میرے اندر کوئی مرض باقی نہ تھا جو کمزوری تھی وہ بھی دو چار ہی دن میں دور ہو گئی"[1]

جگر کی علالت

جگر کو دورِ سرشاری ہی میں دل کی تکلیف تھی اسی وجہ سے کبھی کبھی جب وہ اپنا کلام سناتے اور دل میں درد پیدا ہو جاتا تو وہ اس پر ہاتھ رکھ لیتے تھے ترکِ شراب کے بعد صحت کچھ اچھی ہو گئی تھی لیکن مرض بالکل اچھا نہیں ہوا تھا غالباً ۱۹۴۱ء یا ۱۹۴۲ء میں جوناگڑھ میں ان کو سب سے پہلا شدید وجع القلب کا دورہ پڑا تھا۔

جگر صاحب کو مشاعروں میں شرکت کے لئے رات رات بھر جاگنا بھی پڑتا تھا اور ہمیشہ ان کا سفر وطن میں اور وطن سفر میں رہتا تھا ایک تو رات رات بھر جاگتے دوسرے کثرت مے نوشی کی وجہ سے کئی کئی دن کھانا بھی نہ کھاتے تھے جس کی وجہ سے انھیں معدے کی شکایت ہو گئی "گیس" کی تکلیف کے ساتھ ساتھ جگر اور دل دونوں بڑھ گئے پھر یکایک شراب ترک کر دی تو اس کا بھی اثر دل، جگر اور معدے پر پڑا۔

سنہ ۴۹ء سے ان کی طبیعت میں بشاشت کی کمی ہونے لگی سنہ ۵۲ء میں ان کا وزن صرف سو پونڈ رہ گیا اور سنہ ۵۶ء میں وہ زندگی اور صحت سے جس قدر مایوس ہو گئے تھے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے۔ سنہ ۵۸ء میں ان کو دل و دماغ پر قابو نہیں رہ گیا۔ اور مسلسل علالتوں سے وہ بے حال ہو گئے۔ اسی سال لکھنؤ میں ان کو دوبارہ دورہ پڑا جہاں ان کو دوبار آکسیجن دینے کی ضرورت پڑی اسی سال سے انھیں موت کے آثار نظر آنے لگے ان کی قوت حافظہ، توانائی اور حیات سے دلچسپی جواب دینے لگی۔ رات رات بھر کی نیند خواب آور دواؤں کے استعمال کے بعد بھی غائب رہنے لگی۔

---

[1] "نظام جدید" ۱۶ / ۲۳ ستمبر سنہ ۶۳ء صفحہ ۲۶

جسم میں درد، دماغ ماؤف، قلب پر بار اور طبیعت مکدّر رہنے لگی اور مرض نے نازک سے نازک تر صورت اختیار کرلی۔ معدے کا فعل خراب ہونے لگا۔ بغل چہرے اور سر میں سخت خارش ہونے لگی اور موت کا چہرہ ان کو جھلکیاں دکھانے لگا۔ ۵۹ء میں ان کا ضعف و اضمحلال کافی زیادہ بڑھ گیا اور ان کو محسوس ہونے لگا کہ طویل علالت کا مقابلہ اب وہ نہیں کرسکیں گے۔ اگست ۵۹ء سے مئی ۶۰ء کے درمیان وہ بالکل ناتواں ہوگئے آنکھوں سے بھی معذور ہونے لگے اور موت سے ڈر نہیں بلکہ اس کے انتظار سے سخت تکلیف محسوس کرنے لگے، جون ۶۰ء میں ان کو ایک عجیب قسم کی تکلیف محسوس ہوئی ان کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے کوئی ان کے دل کو دبوچ رہا ہے۔ اگست ۶۰ء سے ان کو اپنی موت کے آثار دکھائی دینے لگے تھے اور ستمبر کے مہینے میں پہلی دوسری تاریخ ہی سے لوگوں کو اپنی چیزیں بطور یادگار دینے لگے تھے۔

وفات کیلئے جگر کی پیشین گوئی اور ان کی وفات

۸ ستمبر ۶۰ء کی شام کو ساڑھے سات بجے جب سیّد اجتبیٰ علی علوی صاحب ان سے ملنے گئے تو انھوں نے ان کو دیکھتے ہی مسکرا کر کہا "آپ آگئے" پھر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا اور ہاتھ ملاتے ہوئے ان سے کہا "الوداعی سلام ہے پیارے"۔ علوی صاحب کے عرض کرنے پر کہ ابھی وہ ان کا الوداعی سلام لینے کو تیار نہیں ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ طبیعت خراب ہے پھر بیگم صاحبہ سے فرمانے لگے کہ "آج کل ہم بہت چڑچڑے ہوگئے ہیں معاف کرنا"۔ اس رات جگر صاحب انجکشن لگوانے کے لئے اصرار کر رہے تھے پھر سو گئے اور ساڑھے چار بجے صبح جاگ گئے بیگم صاحبہ اور مظفر صاحب کو جگایا۔ چائے کی فرمائش کی۔ اور جب ان کو چائے دی جانے لگی تو انھوں نے وقت پوچھا، ۵½ بجے کا وقت ان کو بتایا گیا۔ تو جگر صاحب نے فرمایا "تاخیر ہو رہی ہے" پھر تھوڑی دیر کے بعد فرمانے لگے کہ وہ زیادہ سے زیادہ نو دس بجے تک اور مہمان ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے ڈاکٹر کو بلانے کو کہا۔ مظفر صاحب ڈاکٹر کو بلانے گئے اور اسی درمیان میں جگر صاحب نے دو تین اُبھی ہچکیاں لیں اور رحلت فرما گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کے انتقال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق علی حسین (ملازم حضرت اصغر مرحوم) اور مولوی عبدالباری صاحب نے ضمیر کی مدد سے غسل دیا۔ چار بار نماز جنازہ ہوئی اور شہر کے اندر محمد علی پارک میں شام کو چھ بجے سپردِ خاک ہوگئے۔ تکفین و تدفین کی گئی — تصاویر ایک فوٹو گرافر نے لیں۔

ان کے انتقال سے متاثر ہو کر تحر مرادآبادی نے سچ کہا ہے ؎

بکھرے ہوئے ہیں نغمے ہر سو ترے چمن میں
جادو جگا گیا ہے دنیائے شعر و فن میں
تو جانِ شاعری تھا اے حافظ زمانہ
تجھ سا ہوا نہ ہوگا اب کوئی انجمن میں
کیوں نالہ و فغاں میں نغمات ڈھل نہ جائیں
مرگِ جگر کا ماتم ہے چارسو وطن میں

جگر کے استاد **استاد کی خصوصیات:-** مصلح یا استاد میں چند خصوصیات کا ہونا ضروری ہے اگر اس میں یہ خصوصیات نہیں ہیں تو وہ اصلاح کا کاروبار نہیں سنبھال سکتا اور نہ وہ ایک کامیاب استاد ہو سکتا ہے۔ صفیر احسنی جلال آبادی نے استاد میں مندرجہ ذیل خصوصیات کا ہونا بجا طور پر لازمی قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں:-

"(۱) مصلح صاحب نظر اور صاحب علم و فن ہو، عیوب و محاسن شاعری سے آگاہ ہو، بہت دقیقہ رس ہو، (۲) مصلح اپنے شاگردوں پر مہربان ہو ان کی ترقی کا دل سے خواہاں ہو ان کی عزت کو اپنی عزت سمجھنے والا ہو (۳) بخیل نہ ہو یعنی فن و نکاتِ سخن بتانے میں شاگرد سے بخل نہ کرے خالی اصلاح دے دینا اور وجہ اصلاح کی طرف اشارہ نہ کرنا شاگرد کو کوئی فائدہ نہیں پہونچاتا۔ شاگرد ہمیشہ جاہل رہتا ہے (۴) حریص نہ ہو، لالچی نہ ہو اگر ایسا ہوگا تو قدم قدم پر شاگرد سے الجھے گا اور جلد ہی شاگردی استادی کا رشتہ منقطع ہو جائے گا اس کی توجہ شاگرد کی ترقی کی طرف نہ ہوگی بلکہ ہمہ وقت جلبِ منفعت کی جانب نگاہ رہے گی اور شاگرد استاد میں بہت جلد نفرت دخل پا جائے گی، (۵) استاد کو ہمہ وقت شاگرد کی خدمت کیلئے تیار رہنا چاہیے اور جلد سے جلد اس کا کلام اصلاح کر کے وقت پر پہونچانا چاہیے ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں استاد کو اپنا آرام و سکون، عیش و راحت سب کچھ قربان کر دینا پڑیگا اور در حقیقت یہ بہت بڑی قربانی ہے۔ اپنی ہستی شاگردوں پر وقف کر دینی پڑتی ہے اپنے تمام کام پسِ پشت ڈال دینے پڑتے ہیں۔ اور شاگرد کے کام کو مقدم سمجھنا پڑتا ہے (۶) وہ صابر و سنجیدہ ہو کیونکہ اکثر شاگرد ابتدا میں الجھا ہوا بلکہ مہمل حتیٰ کہ ناموزوں کہتے ہیں اور مدتوں یہ سلسلہ جاری رہتا ہے اگر استاد کمال صبر و شفقت سے ان کو راہ پر نہ لائے گا تو وہ ہمیشہ کو شعر گوئی سے محروم ہو جائیں گے ابتدائی کلام میں ایک استاد کو کتنی الجھنیں اور محنت پیش آتی ہے اس کا اندازہ استاد کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ (۷) اصلاح میں ہمیشہ شاگرد کا خیال باقی رکھے شعر کاٹ کر دوسرا شعر لکھ دینا اصلاح نہیں ہے اگر تمام و کمال خیال باقی نہ رکھا جائے تو جزوی طور پر باقی رہے اور اسی خیال کو ترقی دی جائے بندش الفاظ اور ہر طرح کی غلطیوں سے شعر کو پاک کر دیا جائے۔

شاگرد کے فرائض:- شاگرد نہایت محنت اور غور و فکر کے بعد مصلح کا انتخاب کرے ہوا پر دوڑنے والے یا ہر کسی کے سامنے شعر برائے اصلاح

پیش کردینے والے لوگ محروم بھی رہتے ہیں اور انھیں جلد ہی استاد بدلنا بھی پڑتا ہے جو نہایت معیوب بلکہ گالی کے مترادف ہے (۲) جب استاد کا انتخاب کرے تو اسی کے ساتھ زندگی گزار دے اگر اس میں کوئی خرابی بھی ہو تو اسے برداشت کرے اس لئے کہ شاگرد خود یا کوئی بھی انسان برائی سے خالی نہیں ہو سکتا، (۳) استاد سے عقیدت کو پختہ کرے، عقیدت ہی شاگرد کو کامیاب بناتی ہے اور یہی چیز شہرت و مقبولیت نیز عزت دلاتی ہے اگر کسی شاگرد کو اپنے استاد سے والہانہ عقیدت نہیں اور وہ قابل بھی ہے تو قدرت کم سے کم اس کے کلام سے تاثیر ہی سلب کرلے گی اور اس کے شعر باوجود سب کچھ ہونے کے بیکار ہو جائینگے وہ کبھی ترقی و شہرت کے مقام تک نہیں پہونچ سکتا، (۴) دنیا میں تمام کاروبار اجرت و مبادلہ پر چلتے ہیں ہر چیز کی ہر کام کی ہر محنت کی قیمت ہوتی ہے اور اس لحاظ سے استاد کی محنت کی قیمت بہت زیادہ ہوئی کیونکہ اس نے اپنے دماغ کا لطیف و قیمتی خون اصلاح پر صرف کیا اس لئے شاگرد کا اولین فرض ہے کہ وہ اس خون کی حتی الامکان قیمت ضرور ادا کرتا رہے، اگرچہ اس کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی، خود غرض شاگرد تائید ایزدی سے بھی محروم رہتے ہیں، اگر استاد خدمت لینے سے بے نیاز بھی ہو تو بھی شاگرد کمال شوق اور کمال تدبیر سے اس چیز سے غافل نہ رہے، پھر یہ اس لئے بھی کہ ایک شخص اپنی زندگی تو وقف شاگردوں کے لئے کردے، تمھاری فرمائشِ اصلاح کو لازم کی طرح ہر وقت انجام دے اور پھر برائے حیات روزی حاصل کرنے کی فکر کرے تو کیا ان شاگردوں کی، نالائق اولاد کی طرح یہ بے حمیتی و بے غیرتی نہیں ہے (۵) استاد جو ہدایتیں دے انھیں خوب یاد کرے اور بتائی ہوئی غلطیاں دوبارہ شعر میں داخل نہ ہونے دے یہی اصلاح کا اصل فائدہ ہے۔ برے شعر کا اچھا بن جانا اصلاح نہیں ہے (۶) شاگرد اصلاحی کاغذ فائل کی صورت میں جمع کرتا جائے اور وقتاً فوقتاً انھیں دیکھتا رہے اس سے اسے اپنی رفتار ترقی معلوم ہوگی اور ایسا وقت بھی آتا رہے گا کہ اسے اپنے پچھلے کہے ہوئے کلام اور استاد کی اصلاح پر ہنسی اور شرم آیا کرے گی کہ سبحان اللہ میں نے بھی کیا کہا اور استاد نے کیا اصلاح کی، اصلاح ہمیشہ کلام کے معیار کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔ اچھے کلام پر اچھی اصلاح اور برے کلام پر بری اصلاح دی گئی کبھی اشد ضرورت کیوں نہ ہو شاگرد غیر اصلاحی کلام کسی جلسہ یا مشاعرہ وغیرہ میں نہ سنائے کیونکہ اس میں کہیں نہ کہیں غلطیاں ضرور ہوں گی اور ایک غلطی انسان کا تمام بھرم کھو دیتی ہے[۱]"

۱؎ "صبح امید" جولائی سنہ ۵۱ء صفحہ ۵۷-۵۸

اب اگر صغیر احسنی صاحب کے بتائے ہوئے استاد کی خصوصیات اور شاگرد کے فرائض کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے جگر کے استاد کی تلاش کی جائے تو ان کا کوئی بھی استاد نہ ملے گا اور یہ حقیقت بھی ہے کہ شعر سوری حیثیت سے جگر کا ذوقِ سلیم اور مشقِ سخن ہی ان کے استاد تھے ورنہ باقاعدہ ان کا کوئی استاد نہیں پھر بھی انھوں نے سیفی گنوری کی تحریر کے مطابق "پہلے باپ سے اکتسابِ فیض کیا ہے"[۱] اس کے بعد انھوں نے استاد داغ دہلوی سے رجوع کیا جن کو صرف ایک غزل دکھا سکے۔ داغ کا انتقال ۱۰ فروری ۱۹۰۵ء کو ہوا۔ اس وقت جگر کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی یہ جگر کا عنفوانِ شباب اور شاعری کی بالکل ابتدا تھی، داغ کے انتقال کے بعد رسا رامپوری کو دو تین غزلیں دکھائیں رسا ہی کو وہ اپنا استاد مانتے تھے۔

جگر باقاعدہ طریقہ پر رسا رامپوری کے شاگرد تھے۔ شاگردی کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ پہلے کچھ غزلیں بذریعہ ڈاک روانہ کیں پھر دو ایک مرتبہ خود رامپور تشریف لے گئے۔ منشی امیر اللہ تسلیم سے بھی رامپور ہی میں نیاز حاصل ہوا۔ منشی امیر اللہ تسلیم محض عقیدتاً استاد ہیں دراصل ان کی خدمت میں خود جناب رسا نے جگر کو بھجوایا تھا لیکن اصلاحِ غزل کی کبھی کوئی تقریب پیش نہیں آئی۔

مکش اکبرآبادی لکھتے ہیں :-

"کہا جاتا ہے کہ جگر صاحب نے مرزا خادم حسین رئیس اکبرآبادی مرحوم (متوفی ۱۹۱۲ء) کو بھی غزلیں دکھائی تھیں[۲]"

ڈاکٹر شفا گوالیاری نے بھی "صبح امید" جولائی ۱۹۵۱ء میں صفحہ ۶۳ پر رئیس مرحوم اکبرآبادی اور سیماب اکبرآبادی[۳] کو بھی جگر کا استاد بتایا ہے لیکن جگر نے احمر رفاعی کی تحریر کے مطابق "تیج دیکلی" دہلی میں اور راز مرادآبادی کی تحریر کے مطابق "مدینہ" میں تردیدی خط شائع کرایا۔ اور راز سے سیماب کے اپنے استاد ہونے کے دعوی کرنے کی بابت فرمایا کہ "چاند پہ خاک کس نے ڈالی سیماب صاحب اگر کہتے ہیں تو کہنے دو، دنیا جانتی ہے کہ میں ان کا شاگرد نہیں ہوں، میرا اندازِ شعر ان سے مختلف ہے، میں ان سے

---

[۱] "صبح امید" جولائی ۱۹۵۱ء صفحہ ۱۶

[۲] "تحریک" اکتوبر ۱۹۶۲ء صفحہ ۱۶

[۳] "تبسم نظامی صاحب نے جگر کی کہانی (غیر مطبوعہ) میں لکھا ہے کہ جگر صاحب نے "سیماب اکبرآبادی سے بھی اصلاح لی۔ اس کا مجھے ذاتی تجربہ ہے" لیکن تبسم صاحب کا یہ ذاتی تجربہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ جگر نے اور دوسرے حضرات نے بھی اس واقعہ کی تردید کی ہے۔

زیادہ مشہور ہوئے۔

اس سلسلے میں جگر صاحب نے احمر رفاعی صاحب سے بتایا تھا کہ وہ دور اُن کی بے خبری کا ایک عجیب دور تھا۔ ممکن ہے کہ ان کی کوئی غزل سیاب کے یہاں رہ گئی ہو اور انھوں نے اس پر اصلاح کرکے بعد کو اس کا عکس رسالہ "شاعر" میں شائع کرادیا ہو۔

اسی واقعہ کے متعلق جلیل قدوائی لکھتے ہیں:-

"میں غالباً انٹرمیڈیٹ کے آخری یا بی اے کے پہلے سال میں تھا کہ سیاب صاحب نے جگر کی ایک غزل شاید "پیمانہ" میں جسے انھوں نے ساغر کے نام سے آگرہ سے نکالا تھا شائع کردی پہلے تو جگر صاحب کو کچھ خیال نہ ہوا، انھوں نے اپنی غزل مطبوعہ شکل میں نہیں دیکھی تھی، سمجھے کہ کتابت کی غلطیاں ہوں گی جب مطبوعہ غزل دکھائی گئی تو بہت برہم ہوئے مجھے اتنا یاد ہے کہ ایک مشاعرہ کی تقریب میں مولانا احسن مارہروی مرحوم کے ہاں جو اُن دنوں ظہور وارڈ کے بالمقابل بھوس کے ایک بنگلے میں رہتے تھے، کئی اساتذہ جمع ہوئے تھے بسیاب، نوح ناروی، قمر بدایونی تو مجھے یاد ہیں باقی اور نہ جانے کون کون شاعر تھے، ان کی موجودگی میں سیاب صاحب نے جگر سے اظہارِ افسوس کیا تھا کہ ان کی غزل چھپنے میں بے احتیاطی ہوگئی اور حاضرین کے اصرار سے جگر صاحب نے بھی ان کی معذرت قبول کرلی تھی .... اس واقعہ کی کہ جگر سیاب کے شاگرد تھے یا انھوں نے اپنی کوئی غزل یا اپنا کلام سیاب صاحب کو بغرضِ اصلاح پیش کیا تھا کوئی اصلیت نہیں ہے[۲]"

جگر اصغر گونڈوی کے بھی شاگرد نہیں تھے۔ کیونکہ انھوں نے جہاں داغ اور رسا وغیرہ کا نام اپنے استادوں میں گنایا ہے۔ اصغر کا نام نہیں لیا ہے جگر نے کہیں بھی نہ تو کسی سے کھل کر بتایا نہ لکھا کہ اصغر بھی ان کے استاد ہیں لیکن ان کا احترام وہ ایک استاد ہی کی طرح کرتے تھے ورنہ ابرا حسنی گنوری کی تحریر کے مطابق "جاننے والے جانتے ہیں جگر کو اصغر کی شاگردی کا کوئی علاقہ نہیں۔ جس زمانے میں اصغر سے عقیدت کا سلسلہ چلا ہے اس وقت سے کافی پہلے جگر مسلمہ استاد تھے اور بہت سے لوگ خود کو جگر کی شاگردی سے منسوب کرتے تھے[۳]" اس کے باوجود اگر سچ پوچھئے تو علی سکندر کو جگر بنانے کے مواقع فراہم کرنے والی ہستی تھی

---

[۱] "فروغ اُردو" فروری تا مارچ ۱۹۶۱ء صفحہ ۳۱ و ۳۲

[۲] "العلم" جولائی تا ستمبر ۱۹۶۳ء صفحہ ۲۱

[۳] "صبح امید" جولائی ۱۹۵۱ء صفحہ ۵۰

جگر میں تمام صلاحیتیں تو پہلے ہی سے موجود تھیں لیکن اصغر کے پرتو نے اسے جلا دے کر چمکا دیا۔ اور جگر کا شاعرانہ رُخ واضح طور پر متعین ہوگیا جس کا تذکرہ اور اس حقیقت کا اعتراف جگر نے اپنے کلام میں جا بجا کیا ہے اور جہاں تک جگر کی صوفیانہ شاعری کا تعلق ہے جگر کو اصغر کا شاگرد معنوی سمجھنا غلط نہ ہوگا جگر صاحب نے خود بھی اقرار کیا ہے کہ :۔

"روحانی اور معنوی بلندیوں کا جہاں تک تعلق ہے ان کے لئے تمام تر زندگی کے ساتھ حضرت اصغر گونڈوی کی تربیت کا صحیح معنوں میں شکر گزار ہوں[1]۔"

پروفیسر رشید احمد صدیقی (جو جگر اور اصغر دونوں کے قدیمی دوست ہیں) نے لکھا ہے :

"جگر کو اصغر سے گہری عقیدت ہے لیکن شاعری میں اصغر سے بالکل علٰحدہ ہیں۔ اصغر سے انکا شغف شخصی ہے شاعرانہ نہیں جس طرح حالی کا غالب سے تھا[2]۔"

راز مرادآبادی نے بھی لکھا ہے کہ حضرت جگر کو حضرت اصغر کا شاگرد بتانا بالکل غلط ہے۔ جگر صاحب شریف النفس اور باادب انسان تھے اور چونکہ اصغر صاحب کے ان پر احسانات تھے اس لئے جگر صاحب نے اپنی زندگی میں اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کبھی کوشش نہیں فرمائی راز جگر صاحب کی خدمت میں ایک بیٹے کی طرح گستاخ تھے ایک دفعہ جگر سے اصغر صاحب کے ان کے اُستاد ہونے کے متعلق انھوں نے سوال کیا تو جگر صاحب نے ان سے فرمایا۔

"حضرت اصغر سے مجھے شاعرانہ عقیدت نہیں ہے بلکہ وہ بزرگ شخصیت میں نہایت محبت کرنے والے، مہربان اور میرے محسن اسی لئے میں نے ان کی شان میں یہ مقطع لکھا ہے ؎

حریم حُسنِ معنی ہے جگر کاشانۂ اصغر
جو بیٹھو باادب ہو کر، تو اٹھو باخبر ہو کر

مگر نہ معلوم ہمارے ناقد اور اخبار والے کس قسم کے لوگ ہیں کہ اس کھلے اعتراف کے باوجود مجھے ان کا شاگرد کہتے ہیں[3]۔"

اس پر راز نے کہا کہ اگر جگر صاحب ان کو اجازت دیں تو وہ علی گڑھ میگزین میں (جس کے وہ ایڈیٹر تھے) ایک مضمون لکھ کر اصغر صاحب اور ان کے تعلقات کی وضاحت کردیں تو جگر صاحب نے اس کی اجازت نہ دی اور کہا کہ" اس میں میرا کیا نقصان ہے اگر لوگ سمجھتے ہیں کہ میں اصغر کا شاگرد ہوں تو انھیں خوش ہو لینے دو۔"

---

[1] "یادگار جگر" (غیر مطبوعہ) از تنہا الفاروقی

[2] "آتش گل" صفحہ ۳۳

[3] "فروغ اردو" فروری و مارچ ۱۹۶۱ء صفحہ ۳۰

غرضیکہ حضرت اصغر اور جناب جگر کے درمیان نہایت برادرانہ تعلقات تھے استادی اور شاگردی کا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔

جگر صاحب دراصل اپنے آپ استاد یا شاعر فطرت تھے ورنہ اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو جگر صاحب کو کسی نے بھی باقاعدہ شاعرانہ تربیت نہیں دی اور نہ جگر صاحب کی آزاد فطرت اس کی پابندی کر سکتی تھی جگر صاحب خود شعر کہنے کے بعد اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مطمئن نہیں ہو جاتے تھے بلکہ اکثر و بیشتر ان پر غور کر کے ان میں ضروری ترمیم بھی کرتے رہتے تھے وہ تنگ نظر بھی نہ تھے بلکہ وہ اپنے شعر کے بارے میں خلوص و دیانت سے دیئے گئے صحیح مشورے کو فوراً قبول کر لیتے تھے۔

ایک دفعہ انھوں نے مراد آباد میں اپنی مجلسِ احباب میں جس میں صہبا صاحب بھی شریک تھے ایک تازہ غزل سنائی جس کے متعلق تمر مراد آبادی لکھتے ہیں۔

"جب وہ غزل پڑھ چکے تو صہبا صاحب مراد آبادی مرحوم نے کہا کہ اگر بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔ جگر صاحب نے کہا 'ضرور کہئیے' صہبا نے کہا 'ذرا مقطع پھر پڑھ دیجئے' جگر صاحب نے مقطع پھر پڑھا ؎

آنسو تو بہت سے ہیں آنکھوں میں جگر لیکن
بندھ جائے سو موتی ہے ورنہ وہی دانہ ہے

صہبا صاحب نے مشورہ دیا کہ اس کا دوسرا مصرع یوں ہو تو اچھا ہے ؎

بندھ جائے سو موتی ہے رہ جائے سو دانہ ہے"

جگر صاحب نے اس مشورہ کو فوراً قبول کر لیا۔[1]

جگر صاحب تسکین قریشی کی ایک آزادانہ رائے میں سے ان کے ایک لفظ کو مشورہ کے طور پر قبول کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"نعت شریف" کے متعلق آپ کی آزادانہ رائے کا صحیح معنوں میں شکر گزار ہوں۔ 'رقصاں' کی جگہ 'جوشاں'[2] کر دیا ہے غالباً اب آپ کو اختلاف نہ ہوگا 'مرداں' کے متعلق میں مطمئن نہیں۔ 'مثالش' ضمیر کا معاملہ سامنے کی بات تھی لیکن شاید میں اپنے مافی الضمیر کو پوری طرح واضح نہ کر سکا۔ تینوں شعر حضور نبی کریم صلعم کے زمانے سے متعلق ہیں اور میں اپنی جگہ یہ محسوس کرتا ہوں کہ حضور کا زمانہ مبارک خلفائے راشدین تک کا تھا۔

---

[1] "نظام جدید" ۱۶ و ۲۳ ستمبر ۶۲ء صفحہ ۲۶

[2] اصل شعر آتش گل مطبوعہ ۵۸ء میں صفحہ ۱۵۱ میں اس طرح درج ہے۔

جنت بہ نگاہت آرمیدہ   رحمت بہ اشارۂ تو جوشاں

، مثالیں" جس شعر میں ہے وہ در اصل ایک تلمیح سی ہے دوسری تمام اقوام رسول اللہ صلعم کے اصحاب کی جیسی سرفروشانہ مجاہدانہ مثالیں پیش نہیں کر سکتیں۔ بہر حال آپ سے اس کے متعلق گفتگو رہے گی"[1]

محمد مسلم صاحب جگر کی دوسروں کی اصلاح قبول کرنے کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

" ایک بار شبلی کالج کے ایک مشاعرے میں انھوں نے اپنی ایک غیر مطبوعہ غزل کا جب یہ مطلع پڑھا۔

ہر وہ حلقہ جو تری کاکُل دل گیر میں ہے
گوشۂ امن بلا خانہ زنجیر میں ہے

تو سہیل صاحب نے سنکر کہا "دلگیر" کے بجائے "شبگیر" تو پڑھو، پورے مجمع میں جگر نے یہ اصلاح قبول کر لی اور اس شعر کو اسی قافیہ کے ساتھ پڑھا"[2]

حیرت گونڈوی نے ۱۰ جون ۶۳ء کی ایک ملاقات میں راقم الحروف سے بتایا کہ ایک دفعہ انھوں نے جگر صاحب کے اس شعر

دورِ خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

پر جگر صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ اس شعر میں " دور" کو بدل کر " جہل" کر دیں تو جگر صاحب نے ان کے اس معقول مشورہ کو فوراً قبول کر لیا اور " دور" کو بدلکر " جہل" کر دیا۔

یہ اور اس طرح کی اور بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ اتنے عظیم المرتبت شاعر ہونے کے باوجود احباب کے پرخلوص اور جائز مشورہ کو کس فراخدلی سے قبول کر لیتے تھے۔ یہ بھی ان کی عظمت کا ایک راز تھا۔

جگر کے شاگرد پچھلے صفحات میں استاد کی خصوصیات اور شاگرد کے فرائض کے بارے میں تفصیل کے ساتھ لکھا جا چکا ہے، اگر اس کی روشنی میں جگر کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جگر نہ کسی کے استاد تھے نہ شاگرد۔ استاد یا مصلح کو جن چیزوں کی ضرورت ہے ان میں مقدم مصلح کا ایک جگہ مستقل قیام ہے تاکہ تلامذہ اپنا کلام اس جگہ بھیجتے رہیں اور وہ کلام انھیں وقت پر مل سکے، دوم، مصلح تحریری کام کرنے کا عادی ہو اور آرام طلب نہ ہو، سوم وہ صحیح الحواس رہتا ہو، چہارم اس کی زندگی پرسکون ہو[3]

[1] مکاتیب جگر، صفحہ ۱۱۰۔ ۱۱۱۔
[2] "شبلی کالج میگزین" ۶۱۔۱۹۶۰ء صفحہ ۵۳
[3] "صبح امید" جولائی ۱۹۵۱ء صفحہ ۵۹

جگر کی زندگی میں یہ چاروں باتیں عنقا تھیں۔ عمر کے ایک بڑے حصہ میں نہ ان کا کہیں مستقل قیام رہا اور نہ شراب نے انھیں کسی وقت حواس میں رہنے دیا انھیں ایک خط تک لکھنا بار رہتا تھا چہ جائیکہ تلامذہ کے کلام پر اصلاحیں کرتے یہ سکون بھی کبھی نصیب نہیں ہوا۔ گھر میں ہوتے تو سفر کی تیاری میں مصروف رہتے اور سفر میں ہوتے تو عقیدتمندوں کے نرغے میں گھرے رہتے غرضیکہ وہ لوازم جو ایک مصلح یا استاد کو اپنے شاگردوں کی تربیت کے لئے ضروری ہیں۔ جگر کو کبھی میسر نہ آئے۔

وہ خود بھی استادی اور شاگردی کے قائل نہ تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے اپنے استاد ہونے کے متعلق بات کرتے ہوئے (جیسا کہ صفیر احسنی جلال آبادی نے لکھا ہے) کہا

"بھائی کون شاگرد اور کون استاد، مجھے شاگرد سازی کی کہاں فرصت۔ یہ سب معاملہ یوں ہی چل رہا ہے چلنے دیجئے، لوگ میرے نام کی نسبت سے فائدہ اٹھانے کو میرے شاگرد بن جاتے ہیں، میں یہ سوچ کر کہ اگر میری وجہ سے کسی کا کام ہو جائے تو میرا کیا ہرج، میں بھی کہہ دیتا ہوں کہ ہاں یہ میرے شاگرد ہیں ورنہ اصلیت یہ ہے کہ مجھ سے کوئی نسبت نہ مجھ پر ان کے کسی فعل کی ذمہ داری"[۱]

ان کے خیال میں جس طرح بلبل کو کسی نے چہکنا نہیں سکھایا اسی طرح کوئی کسی کو شعر کہنا بھی نہیں سکھا سکتا شعر کہنے کے لئے شاعر میں فطری صلاحیت کا ہونا ضروری ہے اس کے بعد شاگرد میں استاد سے فیض حاصل کرنے کی صلاحیت ہونا چاہیے وہ اصل چیز 'تربیت' سمجھتے تھے۔ جو ان کے خیال میں صحبت سے آتی ہے وہ کسی کے مصرع پر مصرع لگا کر دے دینا اس کی صلاحیت کو خون کرنے کے برابر سمجھتے تھے۔

اس سلسلے میں فنا نظامی نے راقم سے ۲۷ مئی ۱۹۶۳ء کی ایک ملاقات میں بتایا کہ ایک دفعہ انھوں نے جگر کو ایک شعر سنایا ؎

بے تشنگی گوارا خودداریوں کی خاطر
یوں ہی لئے رہوں گا ہاتھوں میں جام خالی

اور جگر صاحب سے کہا کہ انھوں نے خود اس شعر پر بہت غور کیا لیکن اس میں کوئی اصلاح ان کی سمجھ میں نہ آئی اس لئے اب جگر صاحب اس میں کوئی اصلاح کر دیں تو جگر صاحب نے فنا سے ان کی اور اپنی شیروانی کا رنگ دریافت کیا۔ فنا نے دونوں کے الگ الگ رنگ بتائے اور کہا کہ شیروانی کے رنگ اور شعر سے کیا تعلق؟ میں تو شعر پر اصلاح کے لئے کہہ رہا تھا۔ جگر صاحب نے کہا، میں آپ ہی کی بات کا جواب دے رہا ہوں۔ اگر آپ کی شیروانی میں میری شیروانی کا پیوند لگا دیا جائے تو کیا یہ اچھا معلوم ہوگا اس کے علاوہ آپ کی شیروانی میں

---

[۱] "صبح امید" جولائی ۱۹۵۱ء صفحہ ۶۰،

میری شیروانی کا پیوند یہ صاف ظاہر کر دے گا کہ یہ پیوند میری شیروانی کا ہے بالکل اسی طرح اگر آپ کے شعر میں میں نے کوئی لفظی ردّ و بدل کر دیا تو میرا لفظی ردّ و بدل یہ ظاہر کر دے گا کہ میں نے اس میں وہ لفظ لگا دیا ہے اور اس لفظی ردّ و بدل سے میرا رنگ آپ کے کلام میں نظر آنے لگے گا اس لئے آپ خود اپنے رنگ کا کوئی لفظ ڈھونڈ کر اس میں ردّ و بدل کیجئے تاکہ شعر میں آپ کا رنگ باقی رہے۔ جگر صاحب نے کہا جس طرح ہماری آپ کی شیروانی کا رنگ الگ الگ ہے اسی طرح ذہنوں کا بھی رنگ الگ الگ ہوتا ہے اور اس میں دوسرے کا رنگ نہیں کھپ سکتا۔

فنّا نے اس شعر پر پھر سے غور کیا اور ؎

یونہی لئے رہوں گا ہاتھوں میں جام خالی

کو بدل کر ؎

یونہی لئے رہوں گا تا عمر جام خالی

کر دیا اس طرح انھیں کا رنگ ان کے شعر میں باقی رہ گیا اور ان کے فطری صلاحیت کا خون بھی نہیں ہونے پایا۔ اپنے شاگردوں کے سلسلے میں جگر نے خود بیان فرمایا ہے کہ:-

"میں کسی کو شاگرد نہیں بناتا۔ میں شعراء میں گروہ بندی کو پسند نہیں کرتا۔ جب کسی نے کوئی شعر سنایا اور اصلاح چاہی تو میں ایک آدھ لفظ کی ترمیم پیش کر دیتا ہوں یہی میری اصلاح ہے مجھے اس کا ہمیشہ خیال رہتا ہے کہ شاعر کی اپنی ذاتی استطاعت بڑھتی رہنی چاہیئے۔ محنت عجیب چیز ہے اس سے جو گھبراتا ہے وہ کامیاب نہیں ہوتا۔ مطالعہ اور اچھی صحبت شاعری کی ترقی کے لئے ضروری ہے شاعری بغیر محنت کے ترقی نہیں کر سکتی۔ میں نے معظم جاہ بہادر شجیع کے دیوان دیکھے ہیں۔ اور ان پر اصلاح دی ہے، مولوی عبد الرزاق بخود صاحب اور ئی کے مشہور وکیل تھے، وہ میرے شاگرد تھے، شارق ایرایانی نے مجھ سے اصلاح لی تھی۔ جب میں کانپور میں تھا عارف عباسی کے کلام میں بھی میں نے ردّ و بدل کی ہے، مجروح سلطان پوری بھی مجھ سے بہت قریب ہے، شکیل بدایونی کے کلام پر بھی میں نے اصلاح کی ہے راز مرادآبادی میرے دوست کے لڑکے ہیں: کبھی کبھی اشعار پڑھتے وقت الفاظ میں ردّ و بدل کی ہے کانپور کے دوران قیام میں ذر ہاشمی کی غزلیں میں نے دیکھی ہیں وہ بہت ہی ذہین اور طبّاع تھے مگر کانپور کی ایک عورت نے انھیں تباہ و برباد کر دیا۔ ساحر صدیقی (لاہور) کی کئی غزلوں پر میں نے اصلاح کی ہے اور بھی بہت سے حضرات ہیں جن کی غزلوں پر میں نے لفظی ردّ و بدل کیا ہے مگر یہ انھیں کے لئے کرتا ہوں جن سے خصوصیت ہو اور دوستانہ اور مخلصانہ مشورہ کے طور پر شاگردی استادی کا سوال نہیں اٹھتا۔"[1]

---

[1] "حیاتِ جگر" از کلیم اللہ فاروقی' قومی آواز ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء صفحہ ۴۔

جگر صاحب اپنے دور کی استادی اور شاگردی کو نہایت خطرناک سمجھتے تھے ان کے خیال میں اجمال کی تفصیل سے قطع نظر کرکے اگر دیکھا جائے تو استاد زیادہ سے زیادہ لفظی و معنوی حد تک اصلاح کر سکتا ہے خود شاگرد کی فطری استعداد و مزاج کو تبدیل کرنا اس کے اختیار سے باہر ہے، ان کا کہنا تھا کہ ان کے زمانے میں گروہ اساتذہ اخلاقی معیار سے علمی اور ذہنی اعتبار سے گر چکا تھا۔ عام طور پر گروہ بندی حصول داد کے لئے تھی اور حصول داد کے ماتحت تمام لغو ترین حرکات کرتے تھے یہی چیزیں اساتذہ کی فطرت ثانی بنی ہوئی تھیں اور یہی مجرمانہ جراثیم وہ اپنے شاگردوں میں بھی منتقل کرتے رہتے تھے۔ جگر کے کسی کو شاگرد نہ بنانے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ شعراء میں گروہ بندی کے مخالف تھے۔

۱۰ رجون ۶۲ء کی ایک ملاقات میں بندشوری پرشاد تقدیر جو اس وقت چیرمین میونسپل بورڈ گونڈہ ہیں اور اصغر کے قدیمی احباب میں سے ہیں اور جب جگر گونڈہ پہنچے ہیں تو اصغر صاحب سب سے پہلے ان کا تعارف تقدیر سے کرانے لے گئے تھے) نے راقم سے بتایا کہ جگر صاحب نہ تو کسی کو شاگرد بناتے تھے اور نہ کسی کے کلام پر اصلاح دینا گوارا کرتے تھے وہ اس اصول کے خلاف تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ہر شخص اپنا ایک مخصوص نظریہ رکھتا ہے اور اپنے اسی مخصوص نظریئے کے تحت کو چلتا ہے اور اسی نظریئے کو وہ الفاظ کی گرفت میں لاکر شعری جامہ پہناتا ہے دوسرا شخص اس میں اصلاح کیسے کر سکتا ہے کیونکہ شاعر نے اپنے نقطۂ نظر سے اپنے خیالات کو نظم کیا ہوگا اور مصلح اپنے نقطۂ نظر سے اس میں اصلاح کرے گا اس لئے صحیح اصلاح ممکن ہی نہیں ہے۔

حاجی مصطفےٰ خاں صاحب نے جگر کی اصلاحوں کے متعلق لکھا ہے کہ جگر صاحب کو ان کے اشعار میں "کوئی لفظ اگر کہیں تبدیل کرنا ہوتا تو فرماتے' خانصاحب یوں تو پڑھیئے' مگر خانصاحب یہ میری ذاتی رائے ہے"[1]

غلام محی الدین صاحب نے ۲۸ رنومبر ۶۳ء کی ایک ملاقات میں راقم سے بتایا کہ ایک دفعہ انھوں نے جگر سے اپنے کلام پر اصلاح کے لئے بہت اصرار کیا تو جگر صاحب نے کہا "بھئی میں اصلاح دینے کا اہل نہیں میں اصلاح نہیں دے سکتا۔ آپ کو دھوکا بھی نہیں دینا چاہتا کیا فائدہ کہ غزل آپ مجھے اصلاح کے لئے بھیجیں اور میں اس لفافہ کو چھ چھ مہینے تک کھول بھی نہ سکوں البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ میں جب کہیں آپ کو مل جاؤں تو مجھے آپ اپنی غزل دکھا دیا کریں وہیں جو کچھ میری سمجھ میں آیا کرے گا اصلاح کر دیا کروں گا"۔ اور اس طرح کی اصلاح بقول غلام محی الدین صاحب، جگر نے زندگی بھر میں دو یا تین غزلوں میں دی ہوگی۔

جگر صاحب نے خود سے کبھی کسی کو شاگرد نہیں بنایا بلکہ کبھی کبھار زبردستی کرکے بھی لوگ ان کے

---

[1] "نظام جاریہ" ۱۹ ر ۲۳ ر ستمبر ۶۲ء صفحہ ۲۸

شاگرد بنے ہیں، اس ضمن میں راز کا واقعہ آتا ہے جب وہ ڈنڈا لیکر جگر کے کمرے میں مع ایک غزل کے پہونچے تھے اور جگر سے کہا تھا کہ "آج آپ کو اصلاح کرنی ہوگی"۔ جگر نے پہلے ان کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کی پھر جب ان کے تیور خراب دیکھے تو مجبوراً اپنا شاگرد بنا لیا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ نصیحت بھی کی کہ اگر ان کو واقعی جگر کا شاگرد بننا ہے تو وہ ان کے ساتھ رہا کریں اور جو باتیں وہ کہیں انھیں وہ غور سے سنیں اور سوچیں جس سے ان کی اصلاح آپ ہی آپ ہوتی رہے گی یہی مشورہ انھوں نے مجروح سلطان پوری کو بھی دیا تھا۔ جس کے متعلق مجروح سلطانپوری لکھتے ہیں :۔

"جونپور کے ایک مشاعرے میں جگر صاحب نے کبھی مجھے سنا، نہ جانے کیا چیز انھیں پسند آگئی کہ انھوں نے مجھے اپنے پاس بلا لیا اور پوچھا، کچھ دنوں میرے ساتھ رہو گے؟ میں نے بدل و جاں قبول کیا۔ وہ غزل کے شاعر، میں نظموں کا، لیکن یہ ان کی عالی ظرفی تھی کہ مجھ پر تربیت کی نظر ڈالی، میں چار مہینے تو مستقل طور پر ساتھ رہا۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً ملتا رہتا۔ انھوں نے کبھی میرے کسی مصرعے پر اصلاح نہیں فرمائی اور نہ کبھی یہ کہا کہ تم غزلیں کہا کرو..... علی گڑھ کے ماحول نے مجھے بہت کچھ دیا۔ اور میں از خود غزلوں کی طرف وہیں مائل ہوا۔ جگر صاحب سے ایک بار میں نے درخواست کی تھی تو فرمایا کہ زبان تم غلط لکھتے نہیں، رہ گئی خیال اور مزاج کی اصلاح تو یہ مصرعوں کی اصلاح سے نہیں اچھے لوگوں کی صحبت سے ہوتی ہے۔ تمام عمر مجھے اپنی اولاد کی طرح چاہا۔ مصرعوں کی اصلاح کی حد تک میرے ان کے درمیان کوئی رشتہ نہیں رہا لیکن انھوں نے اپنی باتوں سے وہی کچھ دیا جو ایک اُستاد دے سکتا ہے[1]"

جگر کے شاگردوں میں "بشیر درانی نے صرف ایک غزل جگر صاحب کو دکھائی ہے[2]"

اور محمود علی خاں جامعی نے (جو جگر کے قدیم ترین دوست ہیں) "تذکرہ جگر" میں مزید مندرجہ ذیل حضرات کی بابت لکھا ہے کہ انھوں نے جگر سے استفادہ کیا ہے نیز جگر صاحب نے بھی ارادی یا غیر ارادی طور پر ان کی رہبری اور اعانت فرمائی ہے۔

۱۔ تریبنی سرن شاد (مین پوری)
۲۔ بہاری چرن صادق (مین پوری)
۳۔ حمیدہ صدیقی لکھنوی
۴۔ محترمہ زلفی (بھوپال)

---

[1] مجروح سلطانپوری کا ۵ ستمبر ۱۹۶۲ء کا خط راقم الحروف کے نام
[2] "صبح امید" جولائی ۱۹۵۱ء صفحہ ۶۱

رازؔ صاحب جگرؔ کے شاگردوں کے متعلق لکھتے ہیں :-

"خمار بارہ بنکوی نے بھی گاہے گاہے جگرؔ صاحب سے استفادہ فرمایا ہے اور نواب سید شمس الحسن صاحب لکھنوی کو بھی یہ سعادت حاصل ہے ..... انھوں نے اپنے آخری خط میں لکھا تھا کہ یہ تمہارے معنوی بھائی ہیں، بے حد سعید ہیں، میری علالت کے دوران میری خط و کتابت کے فرائض انھیں کے سپرد ہیں[۱]"

یہ صاحب قیسی الفاروقی ہیں جنھوں نے "حیاتِ جگرؔ" لکھی ہے۔

رازؔ نے لکھا ہے کہ نواب زادہ راحت سعید خاں چھتاری کی جگرؔ صاحب کی شاگردی کی مراد شاید ۱۹۳۷ء میں بر آئی اور ان کے ایک دوست بشیر درانی جو حسن پور ضلع مراد آباد کے رہنے والے ہیں شاید وہ بھی جگرؔ کے شاگرد ہیں۔

قیسی الفاروقی لکھتے ہیں :-

"لکھنؤ سے ذوالنورین صاحب نے دو غزلیں بھیجی تھیں جن پر حضرت جگرؔ نے اصلاح فرمائی تھی[۲]"

حمید صدیقی نے خود جگرؔ کی شاگردی کا اعتراف کیا ہے :-

شادم حمیدؔ ایں فیضِ جگرؔ ہست
نازم بہ طبعِ جادو نگارے

نواب سید شمس الحسن صاحب شمسؔ نے بھی جگرؔ کی شاگردی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے

بہت ہیں یوں تو شاعر شمسؔ لیکن میں قائل ہوں جگرؔ کی شاعری کا

شمسؔ صاحب جگرؔ پر اپنی غیر مطبوعہ کتاب میں لکھتے ہیں :-

"ان کی نظر عام اور کھلی اغلاط کے برطرف شعر کے فنی کھلیوں سے زیادہ شعر کی روح تخیل اور عکسِ جذبات پر زیادہ رہتی تھی وہ فن شاعری کو اکتسابی نہیں بلکہ موہبی حقیقت سمجھتے تھے اس لئے ان کا یہ خیال تھا کہ شاعری میں استادی سہارا دے سکتا ہے لیکن اس میں جان نہیں پیدا کر سکتی، کلام میں جان پیدا کرنا بہت کچھ استعداد فطری پر ہے۔"

دراصل یہی وجہ تھی کہ جگرؔ نے استادی اور شاگردی کا سلسلہ کبھی باقاعدہ قائم نہیں کیا اگر کبھی کسی کے کلام پر کوئی اصلاح بھی کی تو یہ کہہ کر کہ "یہ ان کی ذاتی پر خلوص رائے ہے۔" اور بس۔

---

[۱] "فروغ اردو" فروری و مارچ ۱۹۶۱ء صفحہ ۳۵ و ۳۶

[۲] "حیاتِ جگرؔ" حالاتِ زندگی (غیر مطبوعہ) از قیسی الفاروقی

باب سوم

جگر کی شخصیت اور کردار

جگر کی سیرت کے چند نفسیاتی پہلو۔ طرزِ معاشرت (شکل و شمائل، لباس طعام، تواضع) استغنا، خودداری، فیاضی، حب الوطنی، لطفِ صحبت (دار الکملا) لطائفِ جگر۔ قلندرانہ زیست۔ ہمت

ترتیب

جگر کی شخصیت اور کردار

جگر کی سیرت سیرت اور شخصیت کی تعمیر میں نسلی اور جسمانی خصوصیات کے علاوہ ماحول اور تربیت کے اثرات بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں شخصیت کی تعمیر حالات وحادثات واقعات و معاملات کے زیر اثر ہوتی ہے جگر کی رگوں میں ان کے اسلاف کا صوفیانہ خصوصیات رکھنے والا خون تھا ان کو بچپن ہی سے ہندوستانی تصوف کے اثرات ملے جس نے ان کی طبیعت اور مزاج کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھال دیا۔

جگر کے احساس، سوز وگداز، انسانی درد ومحبت، محنت اور تحمل، استغنا وخود داری، بے نیازی اور پاس وضع معلوم کرنے کے لئے ان کی ابتدائی زندگی اور خارجی حالات کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

جگر نے خانگی، سماجی، تعلیمی اور مذہبی غرض ہر اعتبار سے ایک ایسی فضا میں آنکھ کھولی تھی جس میں زندگی کی قدیم قدروں کی عزت اور احترام تھا ان کا بچپن اور شباب تنگدستی وفاقہ مستی میں گزرا انھیں مروجہ اعلیٰ تعلیم اور جدید علوم وفنون سے استفادہ کرنے کا بھی زیادہ موقع نہ مل سکا پھر بھی اپنے گردوپیش کی فضا سے انھوں نے خودداری سیکھی، محنت اور تحمل کا درس لیا اور ان کے دل میں انسانی درد اور محبت کے شریفانہ جذبات پیدا ہوئے، جگر کو شاعری اور تصوف کا ذوق بھی اسی فضا سے ملا۔

جگر نے میر کی طرح "بے عشق زندگی وبال اور عشق میں دل کھونا اصل کمال" سمجھا[1] چنانچہ ابتدا میں انھوں نے عشق مجازی میں اپنا دل کھویا اور بعد کو اصغر اور اپنے پیرو مرشد کی فیض صحبت سے عشق حقیقی اختیار کیا جس کی پیشین گوئی علامہ سید سلیمان ندوی نے جگر کے انتقال سے ۲۷ سال پہلے ۱۹۳۳ء ہی میں شعلۂ طور کے مقدمہ میں کی تھی جس کا تفصیلی تذکرہ جگر کی مے نوشی کے سلسلے میں کیا جاچکا ہے۔

۱۹۱۹ء میں جگر اور اصغر کی ملاقات ان کے ایک دوست کے مشورہ کی بدولت ہوئی اسی ملاقات سے جگر کے دل کی دنیا بدلی یہ ملاقات بالکل اسی طرح کی ملاقات تھی جس طرح مولانا روم اور

---

[1] میر تقی میر۔ حیات اور شاعری"، ص ۲۸۸،

شمس تبریزی، مولانا روم کو شمس تبریزی کی اتفاقی ملاقات نے مولانا روم اور ان کی مثنوی کو "ہست قرآن در زبان پہلوی" بنا دیا۔ اصغر کی ملاقات کے بعد جگر کا بھی یہی حال ہوا ان کے فیضِ صحبت سے جگر کہیں سے کہیں پہونچ گئے اصغر نے جگر کے دل میں بندے کو خدا سے قریب کرنے والی روشنی دیکھی اور انھوں نے معاملہ فہمی کرتے ہوئے جگر کو اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ عبدالغنی صاحب منگلوری سے بیعت کرا کے انھیں موصوف کے حلقے میں داخل کرادیا جگر ان سے بڑی عقیدت کے ساتھ بیعت ہوئے شاہ عبدالغنی صاحب نے بھی ان پر کافی توجہ صرف کی جس سے جگر کے خیالات میں ایک عظیم انقلاب رونما ہوا۔

جگر کو اصغر اور شاہ عبدالغنی منگلوری سے انتہائی عقیدت تھی شاہ صاحب اور اصغر صاحب بھی ان سے بے حد محبت کرتے تھے ان کے فیضِ صحبت سے جگر کا مسلک بدلا اور وہ زندگی کی دیگر واضح بگراں قدر اور بہت سی دوسری حقیقتوں سے روشناس ہو گئے۔

جگر نے اصغر اور شاہ عبدالغنی منگلوری سے اپنے کلام میں جگہ جگہ عقیدت کا اظہار کیا ہے مثلاً اصغر سے ایک جگہ اس طرح اظہارِ عقیدت کرتے ہیں:۔

میں سُن کے حضرتِ اصغر کے اے جگر اشعار
وہ مست ہوں کہ کوئی پی کے بادہ خوار نہ ہو

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں :۔

حریم حسنِ معنی ہے جگر کاشانۂ اصغر
جو بیٹھو باادب ہو کر تو اٹھو باخبر ہو کر

اور حضرت شاہ عبدالغنی منگلوری سے احمد رفاعی کی تحریر کے مطابق ایک جگہ ازراہ عقیدت کہتے ہیں ؎

تجھ سے وحشی ترے غافل نہیں ہونے پاتے
روز آکر کوئی زنجیر ہلا دیتا ہے[1]

یوں تو جگر کو بچپن ہی سے تصوف سے رغبت تھی کیونکہ والد ماجد کو صوفیانہ خیال کی وجہ سے صوفیوں کی صحبت اور انھیں سے عقیدت تھی جگر کا گھریلو ماحول بھی صوفیانہ تھا جس کا اثر جگر پر پڑنا لازمی تھا جگر کے صوفیانہ رجحانات کو اصغر اور شاہ عبدالغنی منگلوری کی صحبت سے اور جلا ملی ان دونوں حضرات کا کمال یہ تھا کہ انھوں نے جگر کو ان کی بے راہ روی سے کبھی نہ روکا بلکہ

---

[1] "سہ ماہی اُردو" جنوری و اپریل ۵۹ء ص ۱۹۱

اپنی شخصیت اور کردار کا جگر پر ایسا اثر چھوڑا کہ وہ خود بخود راہِ راست پر آ گئے۔ اپنی بے راہ روی کے زمانے میں بھی جگر جب ان حضرات کی خدمت میں حاضر ہوتے تو بہت ہی مودب اور عقیدت کے ساتھ دوزانو ان کے حضور میں بیٹھتے اور ان کی باتیں بڑے غور سے سنتے تھے۔

سید صدیق حسن نے صحیح لکھا ہے کہ :۔

"جگر بنیادی طور پر مذہبی آدمی تھے اس زمانے میں جب وہ رندِ بلانوش تھے یہ اندرونی جذبہ ان کے کردار میں برابر ابھرتا رہا مجنوں گورکھپوری کے حوالے سے ایک واقعہ سننے میں آیا ہے کہ جگر گورکھپور کے ایک مشاعرے میں گئے تھے شاعروں کی خاطر و مدارات مجنوں کے ذمہ تھی ایک صبح کو مجنوں پہونچے تو دیکھا کہ جگر لحاف میں لپٹے لپٹائے الا اللہ کا ذکر بڑے شوق سے کر رہے ہیں مجنوں نے پوچھا کہ شام کو شراب پی تھی کہ نہیں؟ کہنے لگے پینا کیسا میں تو شراب میں نہایا تھا۔ یہ اس حادثہ کی طرف اشارہ تھا کہ بوتل اتفاقاً ٹوٹ جانے سے تمام بستر شرابور ہو گیا تھا شام کا یہ "رندِ دُردآشام" "دمِ صبح" اس مناجات کے عالم میں تھا جہاں "فرش سے تا عرش" "انوار" برس رہے تھے مذہب کی یہ رَو ہمیشہ سے جگر کی فطرت میں تھی شروع شروع میں ایک زیریں لہر کی شکل میں بعد کو ایک ابلتے ہوئے چشمہ کی روپ میں۔"[1]

جگر صاحب ایک سچے اور پختہ عقیدہ کے مسلمان تھے لیکن کٹر نہیں تھے روزے نماز کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے تھے خود سستی سے عمل نہیں کر پاتے تھے لیکن اس کا چھوٹنا اچھا نہیں سمجھتے تھے ان کا کہنا تھا کہ جو لوگ نماز اور روزے چھوڑتے ہیں ان سے باز پرس ہوگی اور ان کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ وہ توحید کے قائل تھے اور بعض اوقات صوفیوں جیسی باتیں بھی کرنے لگتے تھے۔ ان کا دل عشقِ رسول سے سرشار تھا اسی جذبہ کے تحت ایک نعت "سرورِ کونین" کہی تھی۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے خیال میں "سیرت کا حسن دنیا کے تمام حسن سے افضل ہوتا ہے یہ بات جتنی سچی اور کھری ہے افسوس ہے کہ اتنی ہی دیر میں اور کبھی کبھی وقت نکل جانے پر اس کا احساس اور یقین ہوتا ہے اخلاق مذہب سے برآمد ہوا ہے اور اس کا آوردہ و پروردہ ہے اخلاق مذہب کی عملی شکل ہے مذہب سے علیحدہ ہو کر اخلاق پر زور دینا ان لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے جن کی نیت بالعموم بخیر نہیں ہوتی مذہب اخلاق کا محافظ و محتسب ہے اور اخلاق بغیر مذہب عورت بغیر شوہر ہے۔"[2]

---

[1] "فروغِ اردو" لکھنؤ فروری و مارچ ۶۱ء صفحہ ۱۲۲ - ۱۲۳ -

[2] "نگارش" امرتسر (جگر نمبر) ماہ و سنہ رسالہ میں لکھا نہیں گیا ہے صفحہ ۳۳۵ تا ۳۳۶

رشید صاحب نے ایک دوسری جگہ جگر کی سیرت کے متعلق اپنی بڑی معقول رائے دی ہے کہ "جگر صاحب ان معنوں میں مذہبی آدمی ہیں کہ وہ اللہ رسول اور انسان کے حقوق پہچانتے ہیں اور اس کا لحاظ رکھتے ہیں کہ جس کا جو حق ہو اسے پہونچ جائے وہ نفع کے ضرر اور ضرر کے نفع کو جانتے ہیں ان میں حیا ہے وہ پرائی چیز کو اپنانے کے درپے نہیں ہوتے ان میں غیرت اور حمیت ہے ظلم اور زیادتی اپنے پر ہو تو جھیل جائیں گے لیکن دوسروں پر ہو تو اس کی حمایت میں اپنے کو خطرے میں ڈال دیں گے ان کے یہ جوہر تقسیم ملک کی ہلاکتوں میں کھلے" [1]

جگر صاحب نیک سیرت اور اعلیٰ کردار کے انسان تھے انھوں نے گناہ کو ہمیشہ گناہ سمجھا کبھی اس پر فخر نہیں کیا بلکہ اسے ہمیشہ وہ اپنا زمانۂ جاہلیت کہتے رہے انھوں نے اپنے معائب و معاصی پر دلائل و براہین کا پردہ بھی کبھی نہیں ڈالا وہ اپنی اس حرکت پر نادم رہے کیونکہ ان کا دل برا نہیں تھا اور نہ برے لوگوں کو پسند کرتا تھا جیسا کہ وہ اپنے ایک خط مورخہ ۳۰ ستمبر ۵۰ء [2] (جو سیکش صاحب کے پاس محفوظ ہے) میں سیکش اکبر آبادی کو لکھتے ہیں :-

"میں خود برا ہوں لیکن برے انسانوں سے میرا دل کبھی نہیں ملا"

یہ دراصل ان کی پاک طینتی تھی جو انھیں برے آدمیوں سے ملنے سے باز رکھتی تھی۔ جگر صاحب کو اپنی غلطیوں کا بھی اعتراف تھا جس کے متعلق وہ تسکین قریشی کو لکھتے ہیں :-

"ایک حیثیت سے کائنات مجموعہ ہے "مسلسل لغزشوں" کا اس لئے میں اپنی لغزشوں کو چھپاتا تو نہیں لیکن یہ بھی نہیں چاہتا کہ یہ میری فطرت بن جائیں" [3]

اسی طرح وہ اپنے ایک خط مورخہ ۱۲ر نومبر ۱۹۳۲ء (جو نواب سید شمس الحسن صاحب کے پاس محفوظ ہے) میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"گنہگار ہوں اور اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کہ خود کو گنہگار سمجھتا ہوں۔ یہاں میں جبر کا قائل ہوں اور صرف جبر کا۔ لیکن اپنے گناہوں کو اپنے ساتھ منسوب کرتا رہتا ہوں شاید یہ بھی جبر ہو ؎

مجرم بنا ہوا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں
میں وہ ہوں تو نے ظالم خود جس کی آرزو کی

جگر صاحب اپنے ایک دوسرے خط میں (جس پر تاریخ درج نہیں ہے اور وہ شمس صاحب ہی کے

۱؎ "نگارش" امرتسر (جگر نمبر) رسالہ پر ماہ و سنہ لکھا نہیں گیا ہے ص۴۲

۲؎ یہ اور اس طرح کے تمام خطوط جن کا حوالہ اس کتاب میں دیا گیا ہے۔ راقم نے "جگر کے خطوط" میں یکجا کر کے شائع کر دیا ہے۔

۳؎ "مکاتیب جگر" ص۴۶

پاس محفوظ ہے) شمس الحسن صاحب کو اپنی مے نوشی پر شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"بے شک آپ حضرات کو میری ذات سے شدید تکالیف پہونچیں لیکن آپ حضرات کی شدید تکالیف اور اپنے ضمیر کی بہیم لعنتوں سے جو حشر میرے دل و دماغ پر برپا رہتا ہے ..... بہرحال میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ جب تک میں اپنے آپ کو اس قابل نہ بنالوں کہ آپ حضرات کو میری ذات سے تکلیف پہونچنے کا امکان نہ رہے میں اپنے آپ کو تا امکان آپ حضرات سے جدا رکھوں گا اور غالباً آپ حضرات کی جانب سے بھی یہی مطالبہ ہے جسے میں بہت بلند تو نہیں سمجھتا لیکن عین انصاف ضرور سمجھتا ہوں"

جگر صاحب ایک حساس اور غیور طبیعت کے مالک تھے وہ اس قدر شدید الاحساس انسان تھے کہ ایک دفعہ حمید صاحب نے جگر صاحب کی نعت پڑھی اور جس وقت "اس امت عاصی سے نہ منہ پھیر خدایا" حمید صاحب نے پڑھا ہے "حضرت جگر سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ منہ پر دونوں ہاتھ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے"[1]

ادیب سہارنپوری لکھتے ہیں کہ جگر صاحب کہتے تھے کہ "معصیت میں لطف اسی وقت تک ہے جب تک معصیت اور عاصی میں فاصلہ باقی رہے یعنی اگر احساس گناہ گاری بیدار ہے تو گناہ میں لذت بھی ہے اور اصلاح کا امکان بھی۔ لیکن اگر معصیت مزاج بن جائے اور امتیاز کی حس مر جائے تو وجود خود معصیت بن جاتا ہے اور انسان میں سوائے حیوانیت کے کچھ باقی نہیں رہتا"[2]

جگر کی سیرت کے متعلق مالک رام کی رائے صحیح ہے کہ جگر صاحب "دل کے صاف۔ زبان کے کھرے، وہ کسی کے بُرے میں نہیں، میں نے کبھی کسی کی غیبت ان کی زبان سے نہیں سنی۔ صرف یہی نہیں وہ دوسرے کی صریح نقص کی جگہ بھی اس کی خوبیوں کا بیان کریں گے بلکہ کبھی کبھی وہ دوسرے کے نقص کی ایسی توجیہ کرتے ہیں کہ وہ نقص ظاہر میں کم دکھلائی دینے لگتا ہے"[3]

اور میکش اکبرآبادی نے ان کی سیرت کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جگر صاحب "میں بڑی شرافت اور رواداری تھی اور ان کی انسانیت بہت بلند تھی لوگ ان کی غزلیں اور دوسری چیزیں چرا لیتے تھے وہ غزلیں جب ان کے سامنے پڑھی جاتیں تو وہ مسکراتے اور بعض

---

[1] "مادر وطن" ۱۶ دسمبر سنہ ۶۰ء ص ۶

[2] "جام نو" دسمبر ۶۲ء ص ۱۵ [3] "شعلہ و شبنم" آزادی ایڈیشن سنہ ۶۰ء ص ۱۹

اوقات ایسا معلوم ہوتا کہ ان میں جرأت نہیں ہے لیکن ایسا نہیں تھا جب کسی بڑے سے بڑے آدمی کے سامنے سچی بات کہنے کا موقع آتا تو وہ بالکل نہیں چوکتے اور بڑی بے باکی سے سچی بات کہہ دیتے وہ کبھی خوشامد نہ کرتے اور نہ اپنی خوشامد سے خوش ہوتے اپنے دوستوں سے انھیں بڑا دلی تعلق تھا لیکن ان کے سامنے اس کا اظہار نہ ہوتا تھا غائبانہ دوسرے لوگوں سے ان کے متعلق کہتے رہتے تھے یا کبھی خطوں میں اس کا اظہار ہوجاتا تھا۔[1]

مکش صاحب کی اس رائے کی کہ جگر کو اپنے دوستوں سے دلی تعلق تھا جگر کے ایک خط بنام حمید صدیقی (جس پر تاریخ درج نہیں ہے اور خط حمید صاحب کے پاس محفوظ ہے) توضیح ہوتی ہے وہ حمید صاحب کی پریشانیوں سے پریشان ہوکر ان کو لکھتے ہیں:۔

"اللہ کے نیک بندوں کے اکثر اس طرح کے بھی اوقات گذرتے رہتے ہیں امتحان غیر دوں کا اور بزدلوں کا نہیں لیا جاتا بلکہ جن پر اعتماد رہا ہو یا جنھیں ایسا سمجھا جائے آپ کی جانب سے اکثر پریشانیوں کا تو اظہار ہوا لیکن آپ نے وضاحت و صراحت کے ساتھ کبھی کچھ نہیں کہا یہ بات اگرچہ آپ کی علو نفس اور خودداری طبیعت کی دلیل ہے لیکن مقامات کی تبدیلی سے حالات بھی بدل جایا کرتے ہیں وہی چیز ایک محل پر صحیح دوسرے پر غلط۔

میرا مقصد یہ ہے کہ آپ مجھے اس قابل سمجھیں کہ آپ مجھ سے اپنا کوئی ذاتی معاملہ نہیں چھپائیں "احباب" اگر صحیح معنوں میں احباب ہیں تو انھیں اسی دنیا میں اپنے خلوص اور محبت کا ثبوت دینا چاہیئے۔"

جگر صاحب اپنے احباب کی دامے، درمے اور سخنے ہر طرح کی مدد کرنا چاہتے تھے ایک دفعہ مسعود اختر جمال کی بیماری سے پریشان ہوئے تو حبیب احمد صدیقی کو ایک خط میں (جو انھیں کے پاس محفوظ ہے) لکھا:۔

"جمال کی بیگم کے خطوط سے میں شدید طور سے متاثر ہوں خود جمال نے بہت محتاط انداز بیان اختیار کیا ہے لیکن اس کے باوجود محسوس زیادہ ہوتا ہے بیگم کے خطوط نے میری دماغی و روحانی اذیتوں میں اضافہ کر دیا ہے للہ ان کی مدد کیجئے، جو کچھ بھی اور جس طرح بھی ممکن ہو سکے۔"

جگر صاحب کی احباب کی امداد کے سلسلے میں تسکین قریشی لکھتے ہیں:۔

"ہندو پاکستان کے اعلیٰ علمی و ادبی حلقوں میں موصوف نے ہی مجھے متعارف و روشناس کرایا ورنہ مجھ گمنام و گوشہ نشین کو کون جانتا تھا۔"[2]

جگر صاحب اپنے ایک خط مورخہ ۹ جنوری ۱۹۵۶ء میں بہزاد جالندھری کو لکھتے ہیں:۔

---

[1] تحریک اکتوبر ۱۹۶۲ء ص ۱۹ [2] "مکاتیب جگر" ص ۱۱

"میں مزاجاً بے تکلف انسان واقع ہوا ہوں آپ نے اندازہ تو کرہی لیا ہوگا۔ میں نے آپ پر واضح الفاظ میں ظاہر بھی کردیا تھا کہ اگر میری خدمت کی کوئی ضرورت کبھی واقع ہوجائے تو مجھے ضرور مطلع کردیں میں الفاظ کی دنیا کو بھی صاحب روح سمجھتا ہوں اور اسی لئے ان کے ساتھ میرا سلوک انسانوں ہی کا سا ہوا کرتا ہے۔

مجھے خیال سا ہوا تھا کہ شاید اقتصادی طور پر آپ کچھ پریشان سے ہیں خدا کرے میرا خیال غلط ہو اور ہمیشہ کے لئے غلط رہے لیکن خدانخواستہ اگر کچھ پریشانیاں واقع ہوجائیں تو مخلصین سے اس میں چھپانا کوئی اچھی بات نہیں...... مارچ میں ایک مشاعرہ ہونے والا ہے میں کوشش کروں گا کہ اس موقع پر آپ کو مدعو کیا جائے"۔[1]

اس طرح کے جگر کے بہت سے خطوط مل جائیں گے جن میں وہ احباب سے اپنے خلوص و ہمدردی کا اظہار کرتے رہتے تھے اور صرف اظہار ہی نہیں بلکہ عملی جامہ بھی پہناتے تھے۔ وہ ہر طرح سے احباب و مخلصین کی دلجوئی کرنا چاہتے تھے اور ان آبگینوں کو ٹھیس نہیں لگنے دینا چاہتے تھے۔

جگر صاحب کو احباب کا بے حد پاس رہتا تھا۔ ۱۶ر جولائی ۱۹۶۲ء کی ایک ملاقات میں شمس الہدیٰ قیسی الفاروقی نے راقم سے جگر صاحب کا اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک دفعہ جگر صاحب غالباً کشمیر کے مشاعرے میں شرکت کے ارادے سے مہتمم مشاعرہ کو خط سے اپنے ارادے کی اطلاع بھیج چکے تھے لیکن بیمار تھے اور اس حالت میں نہیں تھے کہ وہ اس مشاعرے میں شرکت کرتے جگر صاحب کو اس مشاعرے میں شرکت سے باز رکھنے کی ہر طرح کی کوشش کی گئی لیکن وہ رضامند نہ ہوئے آخر میں قیسی صاحب نے ان سے کہا کہ "اچھا! اگر آپ مشاعرے میں جانا ہی چاہتے ہیں تو آپ کو پہلا قدم میرے سینے پر رکھ کر جانا ہوگا اور یہ بھی یاد رکھئے کہ یہ ایک خادم کا سینہ ہے کسی رئیس یا امیر کا سینہ نہیں ہے"۔ یہ سن کر جگر صاحب سناٹے میں آگئے اور انھوں نے مشاعرے میں شرکت کا ارادہ ملتوی کردیا۔

یہ تھی جگر کی پاس داری۔

جگر کو اپنے ساتھی شعراء کا بھی ہر طرح کا خیال رہتا تھا اور ان سے وہ ہمیشہ ادب کی نمائندگی کی امید رکھتے تھے۔

جوش ملیح آبادی لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ جگر نے بھری محفل میں حفیظ جالندھری کا ایک واقعہ بیان

---

[1] "نظام جدید" ۱۶ و ۲۳ ستمبر ۶۲ء ص ۲

کیا کہ :-

"کس طرح ارباب مشاعرہ نے ان کے ساتھ اہانت کا برتاؤ کیا تھا۔ جب تخلیہ ہوگیا، میں نے کہا۔ جگر تو نے حفیظ کی توہین کرکے اپنی، میری اور تمام شاعروں کی ناک کٹوادی، سوچ تو میرے یار حفیظ ہماری برادری کا ایک فرد ہے اس کی ذلت ہم سب کی، یعنی پوری قوم شعراء کی توہین ہے تو نے حفیظ کی نہیں، تمام شعراء کرام کو رسوا کر دیا۔ جگر نے خجالت سے سر جھکا لیا کہنے لگے سچ کہتے ہو، ہو تو رافضی لیکن تم میں شرافت باقی ہے۔

غلطی کس سے نہیں ہوتی۔ مگر یہ جگر کی عالی ظرفی تھی سو انھوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا جگر کے تبسم میں ایک گھلاوٹ اور معصومیت تھی ان کے مزاج میں مروت تھی اور ان کی فطرت میں دوسروں کی خاموش امداد کا وہ جوہر نایاب تھا جو بہت کم خوش نصیبوں کے حصہ میں آتا ہے[1]"

ایک دفعہ رام پور کے مشاعرے میں جگر صاحب شریک تھے۔ چند شعراء آپس میں کسی معاملے پر الجھ گئے اور گالی گلوچ کی نوبت آگئی جگر صاحب کو پتہ چلا تو انھوں نے (جیسا کہ اختر رضوانی نے لکھا ہے) "ان سے نہایت عاجزی سے کہا۔ کیا یہی شاعری کا اخلاق ہے۔ میرے بھائی آپ لوگ تو ملک کی تہذیب کے علمبردار ہیں درس ادب دینا تو آپ کے فرائض میں سے ہے یہ حضرات بہت کھسیانے ہوگئے[2]"

مشاعروں میں جگر صاحب دوسرے شعراء کا بھی خیال رکھتے تھے اگر کسی محفل میں انھیں سے بار بار پڑھنے کی فرمائش کی جاتی تو وہ بقول تبسم نظامی خود سامعین سے کہہ دیا کرتے کہ

"دوسرے شعراء موجود ہیں ان کو بھی سنیئے یہ کیسے ممکن ہے کہ شروع سے لے کر آخر تک میں ہی آپ کو سناتا رہوں[3]"

جگر صاحب شاعروں میں پارٹی بندی کے سخت مخالف تھے۔ فنا نظامی کانپوری نے ۲۷/ مئی ۱۹۶۳ء کی ملاقات میں راقم سے ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک دفعہ جگر صاحب ایک موقعہ پر کانپور آئے جب ان کو وہاں کی پارٹی بندی کے متعلق معلوم ہوا تو انھوں نے کہا "جی ہاں! پارٹی بندی کی لعنت کانپور ہی میں نہیں سارے ہندوستان بھر میں ہے" اس کے

---

[1] جگر مرادآبادی از شوق مرادآبادی (غیر مطبوعہ)

[2] "صبح نو" اپریل مئی ۱۹۶۱ء ص ۶۵، [3] "جگر مرادآبادی از تبسم نظامی" ص ۴۶

بعد جگر صاحب نے فرمایا کہ مجھے تو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا اب تو میری حالت صرف اس مالی کی سی ہے جو چمن کے ایک ایک ہونہار پودے کی دیکھ بھال کرتا اور اس کی حفاظت کرتا ہے اسی طرح میں نوجوان شعراء کو دیکھتا اور ان کو سنبھالتا اور ان کا خیال رکھتا ہوں تاکہ آگے چل کر وہ ترقی کریں اور کسی پارٹی بندی کی لعنت میں نہ پھنسنے پائیں۔

وہ علم و ادب کی ادنیٰ سی توہین بھی نہیں برداشت کر سکتے تھے اس سلسلہ میں وہ اپنے ایک خط مورخہ ۴ فروری ۵۷ء (جو بیاض نمبر ۱۴ - گوشۂ جگر جامعہ ملیہ دہلی میں ہے) میں لکھتے ہیں:۔

"سفارشات کے معاملہ میں اگر تھوڑی سی میں اپنی توہین بھی کرتا ہوں تو خوشگواری کے ساتھ برداشت کر لیتا ہوں لیکن "ادب و علم" کی ادنیٰ سے توہین بھی نہ کبھی برداشت کی ہے اور نہ کر سکتا ہوں"

جگر صاحب بعض اوقات ادبی کانفرنسوں اور مشاعروں میں بلا اجرت بھی شرکت کر لیتے تھے اس سلسلے میں وہ ایک خط مورخہ ۲۱ فروری ۵۳ء میں لکھتے ہیں:۔

"انجمن ترقی پسند مصنفین کی جانب سے ۶، ۷، ۸ مارچ کو دہلی میں کانفرنس منعقد ہو رہی ہے مجھے بہ اصرار مدعو کیا گیا ہے فائدے کی تو کوئی صورت ہی نہیں لیکن اخلاقاً اور مروتاً اس میں شرکت کا ارادہ کر چکا ہوں" [1]

اور مظہر امام لکھتے ہیں:۔

"یتیم خانے" کا حوالہ دیا گیا تو جگر صاحب مشاعرے میں "بلا معاوضہ" شرکت کے لئے بلا تکلف تیار ہو گئے وہاں انھوں نے تین غزلیں سنائیں" [2]

اس قسم کے نہ معلوم کتنے مشاعروں میں جگر صاحب نے شرکت کی۔

جگر صاحب کو انگریزوں کی حکومت کا مشرقی علوم و ادب کے ساتھ ناانصافی کا بھی احساس تھا اور ان کا خیال تھا کہ مشرقی علم و ادب کے عالموں کے سینے حکومت برطانیہ کے طرز عمل سے چھلنی ہو گئے ہیں۔

جگر صاحب سخاوت بھی خوب کرتے تھے اس سلسلے میں رشید نعمانی صاحب نے ۲۰ دسمبر ۶۳ء کی ملاقات میں راقم سے جگر کے دو واقعات بتائے (جن کی تفصیل آگے آئے گی) مختصراً یہ کہ ایک دفعہ تو انھوں نے کڑکڑاتی سردی میں نشے کے عالم میں ایک فقیر کی آواز سن کر اس کو اپنے سارے کپڑے اُتار کر دے دیئے اور دوسری دفعہ ایک فقیر کی درد بھری آواز سن کر اپنی جیب کے سارے

---

[1] "مکاتیب جگر" ص ۸۶ [2] "صبح نو" اپریل و مئی ۶۱ء ص ۵۳

پیسے اور نعمانی صاحب کے سارے پیسے اس فقیر کے حوالے کر دیئے تھے۔

جگر صاحب گونڈے میں "اصغر رفاہ عام اسکول" کے سارے اخراجات خود ہی برداشت کرتے تھے اور گونڈے کے کئی خاندانوں کی پرورش بھی انھیں کے ذمّہ تھی۔ آخری ایام میں وہ خیر و خیرات بھی خوب کرنے لگے تھے ان کو یہ یقین تھا کہ اس سے ان کے پچھلے گناہوں کی کچھ نہ کچھ تلافی ہو جائے گی۔ اسی خیال کے تحت وہ گونڈہ کی ایک مسجد میں بھی کچھ نہ کچھ امداد فرماتے رہتے تھے۔

جگر صاحب کو ہندوستان کے مسلمانوں کی پریشانیوں کا بھی احساس تھا جس کا تذکرہ انھوں نے کئی جگہوں پر کیا ہے۔ وہ ایک خط راجہ محمد رفیق صاحب مراد آبادی کے پاس محفوظ ہے) مورخہ ۱۰ر جولائی ۹۴۶ء میں محمد رفیق صاحب کو لکھتے ہیں:-

"ہندوستان میں مسلم جن حالات سے گذر رہا ہے اس کی نزاکتوں کا احساس اس شدت سے کر رہا ہوں کہ بیان نہیں کیا جا سکتا مختصراً یہ کہ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے یہی خیالات وافکار، تاثرات، وخدشات دل و دماغ کا احاطہ کئے رہتے ہیں صحت پر بھی برا اثر پڑ رہا ہے خدائے عزّوجل اپنا رحم و کرم شامل حال فرمائے۔"

غرضیکہ جگر صاحب بڑے مخلص، سچے اور نیک انسان تھے ان کی عالی ظرفی، عالی ہمتی، تہذیب و شرافت، مشرقیت، وضعداری، اخلاق، مروّت اور سخاوت کی کوئی انتہا نہ تھی اور انھیں وجوہات سے انھوں نے ہر دلعزیزی اور ہر دل نشینی حاصل کرلی تھی۔

یہی وہ داخلی و خارجی حالات و حادثات، واقعات و معاملات تھے جن کے زیر اثر جگر کی سیرت و شخصیت کی تعمیر ہوئی تھی

جگر کی سیرت کے چند نفسیاتی پہلو

جگر کی زندگی اور شاعری میں بالکل مطابقت ہے تضاد کہیں نہیں ملتا ان کے انداز و اسلوب کی تعمیر میں ان کی سیرت کو بھی بڑا دخل ہے ان کے کلام میں ان کی سیرت کی جھلک جا بجا دکھائی پڑتی ہے ان کی سیرت کے نفسیاتی پہلو جاننے کے لئے ان کی زندگی کا ایک سرسری جائزہ لینا ضروری ہے۔

جگر کو بچپن ہی سے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی پندرہ سال کی عمر میں ان کے والد کا انتقال اور پچیس سال کی عمر میں والدہ کا انتقال ہو گیا والدہ کے انتقال اور ترکِ تعلیم کے بعد ان کے چچا نے ان کو ایک جگہ سرکاری نوکر کرا دیا اور وہی جگر کی سرپرستی کرتے رہے لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا اب جگر بالکل بے یار و مددگار ہو گئے۔ چچا کی حیات ہی میں (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) ایک حادثہ کی بنا پر وہ نوکری چھوڑ کر آگرہ چلے گئے تھے وہاں کچھ دنوں عینکوں کا کاروبار کیا پھر وہاں سے مراد آباد چلے آئے لیکن یہاں بھی ان کو ایک حادثہ پیش آیا جس کی وجہ سے انھوں نے مراد آباد کی سکونت بھی

ترک کر دیا اور اب گھومتے پھرتے فیض آباد، گونڈہ، اعظم گڑھ، مین پوری وغیرہ وغیرہ مقامات پر پہونچے گونڈہ میں ان کی اصغر سے ملاقات ہوگئی جنھوں نے ان کے زخمی دل پر پھایا رکھا ان کی ہمدردی و محبت سے جگر میں زندہ رہنے کی ہمت پیدا ہوئی ورنہ بقول خود جگر کے ایک دوست کے کہ اگر اصغر کا آستانہ نہ مل گیا ہوتا تو یا تو وہ کسی صحرا کی خاک چھانتے ہوتے یا خودکشی کر لیتے ان کی گونڈہ میں نسیم بیگم سے شادی ہوئی لیکن قسم سے باہمی اختلاف کے باعث انھیں گونڈہ بھی چھوڑنا پڑا اور اب وہ مین پوری پہونچے جہاں اصغر حسین ایڈوکیٹ نے ان کی کفالت کی۔ اسی زمانہ میں وہ اعظم گڑھ بھی پہونچ چکے تھے جہاں پر ادبی علمی حلقے نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی خاص طور سے مرزا احسان احمد صاحب ان کے بڑے قدر داں ہوئے انھوں نے ۱۹۲۰ء میں جگر پر پہلا تعارفی مضمون "اہالیان دہلی و لکھنؤ کے لیے ایک خوانِ ادب" لکھ کر ان کو دنیائے ادب سے متعارف کرایا اور ان کا پہلا دیوان "داغِ جگر" بھی انھیں کی وساطت سے شائع ہوا جگر صاحب بھی مرزا احسان احمد کے بڑے معتقد تھے کہتے ہیں ؎

میں جگر لاکھ ہوں آوارہ و سرگشتہ مگر
دل ہر اک حال میں ہے حضرتِ احساں کے قریب

اور مرزا احسان احمد لکھتے ہیں:۔

"وہ سراپا محبت تھے اسی کے سوز و گداز سے ان کا دل ہمیشہ آتش فشاں رہتا تھا یہی وہ بلا تھی جس نے ان کے آئینہ حیات کو بغض و عناد، رشک و حسد، غرور و تمکنت سے کبھی غبار آلود ہونے نہیں دیا وہ کسی انسان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھ نہیں سکتے ان کے دل میں انسان کا غم تھا مروم آزاری جس سے بڑھ کر ادا کوئی اخلاقی معصیت نہیں ہو سکتی ان کے دست و بازو میں اس کی مطلق قوت نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جہاں تک ان کی ذات کا تعلق تھا کوئی ان کا مخالف نہ تھا ذاتی اغراض رکھ کر بظاہر دوستانہ تعلقات پیدا کرنا ان کی مخلصانہ فطرت کے بالکل منافی تھی"۔ ؎۱

جگر صاحب پر اصغر گونڈوی کے بھی بڑے احسانات تھے اور جگر صاحب نے اس کا اعتراف اپنے کلام میں متعدد بار کیا ہے۔

جگر کی زندگی خاصی رنگین دلچسپ اور پُرکیف تھی ان کی جوانی دیوانی تھی ان کی زندگی سے ان کی ادبی زندگی میں دلکشی پیدا ہوئی ان کے مجازی عشق میں عشقِ حقیقی کی ابتدائی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

جگر ہندوستان کے مسلمان شرفا کے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو اب بقول آل احمد سرور

؎۱ "فروغِ اردو" فروری و مارچ ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۳

"روز بروز بکھرتا جا رہا ہے اور موجودہ دور کی ہوش ربا تلخیوں کی تاب نہیں لا سکتا اس طبقے کو ماضی سے محبت، تہذیب و شرافت کی پرستش ایک مذہبی شعور چند اخلاقی قدریں، ایک مبہم سی انسان دوستی ورثے میں ملی تھیں جگر انھیں قدروں میں پلے، بڑھے، جوان ہوئے تو شباب کے تقاضے اور فطرت کے مطالبے انھیں بہا لے گئے۔ چنانچہ اس دور میں ان کی زندگی کے دو رخ تھے جذباتی طور پر وہ شاعری اور رندی کے پجاری تھے ذہنی طور پر وہ اپنی چند قدروں کے دلدادہ جنھیں سہولت کے لئے مشرقیت کہہ لیجئے یہی وجہ ہے کہ عالم ہوش میں بظاہر وہ اپنی زندگی کے بڑے بھرپور اور جاندار حصّے سے بغاوت کرتے اور اپنی ذہنی قدروں کی طرف لوٹتے نظر آتے ہیں۔" [1]

جگر کا دل تیغِ عشق کا زخم خوردہ تھا ان کی شاعری اسی زندگی کی سچی اور بے لاگ تصویر ہے۔

دیکھا جوان کے ہاتھ میں دشمن کا ہاتھ ہے　　کچھ سوجھتا نہیں مجھے دن ہے کہ رات ہے

انھوں نے خود عشق کی آگ میں پھاند کر ذاتی تجربہ کر کے اس کا اثر قبول کیا یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جن کیفیات و واردات کا ذکر کیا ہے اس کا اثر براہِ راست دل پر پڑتا ہے کیونکہ ان کے دل کی نکلی ہوئی بات ہے جو دل پر براہِ راست اثر کرتی ہے اسی لئے ان کا کلام "از دل خیزد بر دل ریزد" کا مصداق بن گیا ہے۔ مثلاً

کیا کہہ دیا کسی نے کہ ملتے ہی چشمِ شوق　　دونوں طرف سے دستِ تمنا دراز تھا
ان سے تو عنایت کی نظر کی نہیں جاتی　　اور دل کی یہ حالت ہے کہ دیکھی نہیں جاتی
آکہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں　　جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں
اور تو کچھ کمی نہیں آپ کے اقتدار میں　　آپ مجھے بھلا سکیں یہ نہیں اختیار میں
جو دل کا راز تھا اسے کچھ دل ہی پا گیا　　وہ کر سکے بیان نہ ہم سے کہا گیا
نظر ملا کے مرے پاس آکے لوٹ لیا　　نظر ہٹی تھی کہ پھر مسکرا کے لوٹ لیا
ستم عشق میں آپ آساں نہ سمجھیں　　تڑپ جائیے گا جو تڑپائیے گا

جگر کو اپنے پہلے معاشقے میں ناکامی ہوئی یہ ناکامی معمولی نہیں تھی اس سے ان کے دل پر کاری ضرب لگی اور وہ ایک خاموش درد کی طرح ان کی ساری زندگی میں سمائی رہی ان کے خود مشغول اور کم اختلاط اور ہمہ وقت غرقِ مے ناب رہنے کی نفسیاتی وجہ یہی شکست اور محرومی تھی اسی شکست اور محرومی نے جگر کے دل میں ایک قسم کا سوز و گداز پیدا کیا اور اسی نے جگر کو جگر بنایا۔

وہ ایک طرح کی نفسیاتی کشمکش میں مبتلا تھے ان کے ذہن کے چھپے ہوئے گوشے میں ایک ہنگامہ برپا تھا ان کو اپنی برائی کا احساس بھی تھا اور اپنی محرومی اور بے کسی پر افسوس بھی۔ انھیں چیزوں سے

---

[1] "آتش گل" صفحہ ۴۱ تا ۴۲

ان کا دل مرجھا گیا تھا لیکن انھیں کی وجہ سے ان کی عشقیہ شاعری میں اثر کی بوندیں بھی چھلکیں)

جگر کی سیرت میں خارجی حالات کو بھی بڑا دخل تھا ان کے ایام جوانی میں انگریزوں کی حکومت اور ان کے ظلم و تشدد کا دور دورہ تھا جس کا ذکر انھوں نے اپنے کلام میں کئی جگہ کیا ہے پھر تقسیم ہند کے بعد ہر طرف نفسی نفسی اور ابتری کا عالم پھیلا ان بے رحم حالات میں ان کو اپنی شکست دکھائی پڑنے لگی تھی لیکن وہ ایک باہمت اور مرد مومن کی طرح ان کے آگے نہ تو سپر ڈالنے کو آمادہ ہوئے اور نہ اس دنیا سے کنارہ کش ہوئے ان حالات میں بھی انھوں نے اپنی مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کا ثبوت دیا۔

جگر صاحب کو بھی معاش کی فکر تھی ایسا نہیں ہے کہ وہ بالکل قانع اور قطعی متوکل آدمی تھے اور ان کے دل میں کوئی آرزو ہی نہ تھی انھوں نے ابتدا میں عینکوں کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کیا پہلے معاشقے میں ناکامی کے بعد بالکل لاابالی زندگی گذارنے لگے اور اس زمانے میں واقعی وہ بالکل قانع اور متوکل آدمی رہے نہ دین کی فکر تھی نہ دنیا کی۔ ان دنوں انھیں اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا تھا احباب نے ان کی ضروریات کی چیزیں بغیر ان کی فرمائش کے پوری کیں۔ اس زمانے میں نہ تو انھیں کھانے کی فکر ہوتی اور نہ کپڑے کی بس اگر فکر تھی تو شراب کی۔ اس کا خرچ بھی احباب ہی برداشت کرتے تھے لیکن وہ اس بات کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے کہ وہ اپنے احباب سے اتنے پیسے نہ طلب کریں جو ان پر بار ہو اسی لئے وہ عام طور پر احباب سے صرف ایک یا دو روپے طلب کرتے جسے ہر شخص بخوشی عنایت کر دیتا اور وہ اس روپیہ کو فوراً معمولی قسم کی شراب میں گھول دیتے ان کے کھانے کا انتظام ان کے احباب کرتے کپڑے بھی مہینوں جسم پر پڑے رہتے ان کے بدلوانے کی بھی ذمہ داری دوستوں ہی پر رہتی اگر کسی دوست نے خیال کر کے ان کے کپڑے بدلوا دیئے تو بدلوا دیئے ورنہ وہ خود مہینوں ایک ہی لباس پہنے رہتے اور اس کے بدلنے کی کوئی فکر نہ کرتے۔

رفتہ رفتہ انھیں بھی روزی کی فکر ہوئی نواب زادہ رشید الظفر نے تو ان کو سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ[1] بغیر

---

[1] جگر نے اپنے اس وظیفہ کے متعلق خود ہی قیسی الفاروقی کو لکھا یا تھا کہ :۔

"میں نے رشید احمد صاحب کے کہنے پر سو روپیہ ماہوار منظور کیا" (قومی آواز ۱۹ ستمبر ۱۹۶۰ء ص ۲)

لیکن جب راقم نے رشید احمد صدیقی صاحب کو خط لکھ کر اس واقعہ کی تصدیق چاہی اور ان کو سنہ کے تعین کرنے کے بارے میں لکھا تو رشید صاحب نے ۱۲ اگست ۱۹۶۳ء کے خط میں راقم کو لکھا۔

"آپ کے استفسار کے بارے میں عرض یہ ہے کہ مجھے بالکل نہیں یاد کہ وظیفہ مذکور (جگر صاحب کو) کب ملا تھا۔ اندازاً بھی نہیں کہہ سکتا۔

اسی وظیفہ کے لئے محمود علیخاں جامعی نے اپنی کتاب "تذکرہ جگر" میں ص ۵۶ پر لکھا ہے کہ :۔

"لکھنؤ کے قیام کے آخری زمانے میں نواب بھوپال کے بھتیجے (نواب زادہ رشید الظفر خاں) نے آپ کا ایک صد روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا تھا"۔ راقم کا خیال ہے کہ یہ وظیفہ جگر صاحب کو ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۵ء کے درمیان میں ملا ہوگا کیونکہ یہی زمانہ ان کے لکھنؤ کے قیام کا آخری زمانہ ہے اور اسی زمانے میں وہ عسرت کی زندگی بھی گذار رہے تھے۔

طلب اور بلا کسی شرط کے پروفیسر رشید احمد صدیقی کی وساطت سے جاری ہی ہو گیا تھا کیونکہ ان دنوں میاں رشید الظفر صدیقی صاحب کے شاگرد تھے لیکن انھوں نے خود بھی اسی زمانے سے مشاعروں میں شرکت کے لئے پابندیاں لگا دیں اور معاوضہ طلب کرنے لگے آخر کار رفتہ رفتہ انھوں نے مشاعروں کے لئے باقاعدہ فیس مقرر کر دی جسے آخری زمانے تک برقرار رکھا مشاعروں کے علاوہ زمانہ پیری ۱۹۵۸ء میں ان کو مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت سے ڈیڑھ سو روپیہ اور سو روپیہ ماہوار وظیفہ بالترتیب تاحیات ملتا رہا لیکن ان وظائف کے لئے بھی انھوں نے خود کوئی کوشش نہیں کی تھی یہ ان کی خودداری کے منافی تھا اسی لئے انھوں نے کبھی کسی قسم کی درباداری بھی نہیں کی حالانکہ اس کے لئے ان کو بہت کچھ میسر کیا جاتا رہا۔

جگر حریص قطعی نہیں تھے اسی لئے ان کے اندر گداگرانہ خو بھی نہیں تھی وہ فطری طور پر خوددار اور باحمیت انسان واقع ہوئے تھے ان کی خودداری اس حد تک تھی کہ بڑی سے بڑی مجبوری میں بھی نہ کسی کے سامنے دست سوال دراز کیا اور نہ اپنی غریبی کا دکھڑا رویا سوائے انتہائے مے نوشی کے زمانے کے اسی لئے انھوں نے نہ تو کسی کی شان میں قصیدے لکھے اور نہ کسی کی ستائش و مداحی کی۔ اور اگر کوئی قصیدہ لکھا یا مداحی کی بھی تو کسی طرح کی مالی منفعت بخشش کے لئے نہیں بلکہ اپنی عقیدت اور خلوص و محبت کا اظہار کر کے اپنے تسکین قلب کی خاطر کیا۔ انھوں نے قصیدے حضرت شاہ عبدالغنی منگلوری اپنے پیر و مرشد کی شان میں یا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت کے اظہار کے لئے لکھے ہیں کسی کی خوشامد میں کبھی کچھ نہیں لکھا حتی کہ نواب زادہ رشید الظفر یا ان کے خاندان کی شان میں بھی ایک شعر تک نہیں کہا حالانکہ ایک مدت تک ان کے ایام عسرت میں ان سے وظیفہ ملتا رہا۔

میر جیسے لوگ بھی شکایت روزگار سے باز نہ رہ سکے اور یہ کہنے پر مجبور ہوئے!

ایک محروم چلے میر ہمیں دنیا سے   ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

لیکن جگر کا پورا کلام چھان ڈالئے ایسی شکایت کہیں نہیں ملے گی البتہ وقت کی عکاسی مل جائے گی جگر کا یہ شعر ؎

چاندنی ہے ہوا ہے کیا کہئے   مفلسی کیا بلا ہے کیا کہئے

اور ع

نقد مل جائے کہیں سے تو بڑا کام چلے

ان کے وقت کی عکاسی اور ان کی زندگی کی صحیح تصویر پیش کرتے ہیں روزگار کی شکایت نہیں کرتے۔

جگر سے تمام ہندوستان و پاکستان کے عوام و خواص بے حد عقیدت رکھتے تھے اور وہ جدھر سے گذرتے ان کے ساتھ قیامت کا سا ہنگامہ چلتا تھا۔ امراء اور رئیس ہی نہیں گورنر اور وزیر اعظم تک ان کی عزت کرتے تھے جب حج کو گئے تو شاہ سعود نے بھی ان کی بڑی قدر و منزلت کی اور ان کو شاہی مہمان رکھا یہ حقیقت ہے کہ جگر کے زمانے کے حالات و معیار کو دیکھتے ہوئے جگر کی حالت بہت سے لوگوں کے مقابلہ میں افضل تھی۔

شکایت روزگار تو مختلف شعرا مثلاً میر مصحفی اور غالب تک کے یہاں ہے لیکن یہ شکایت اگر نہیں ہے تو جگر کے یہاں نہیں ہے۔

مصحفی اپنی تنخواہ کے نہ ملنے پر شکایت کرتے ہیں ؎

ہر چند کہ ہم فاقوں سے جان دیتے ہیں — تنخواہ تو کب نعیم خاں دیتے ہیں
ہے لب پہ خوشامد اور غضب کے مارے — بیٹھے ہوئے جی میں گالیاں دیتے ہیں
ظاہر میں تو ہاں نعیم کے نوکر ہیں — باطن میں نہ لے کریم کے نوکر ہیں

مرزا غالب کہتے ہیں ؎

میری تنخواہ جو مقرر ہے — اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردہ کی چھ ماہی ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقید حیات — اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

میر لکھتے ہیں :-

معرفت ان کے بعد صد خواری — فرد دستخط ہوئی جو یک باری
جیسے کھینچے لکیریں کوئی نقاش

اس لکھے کا نہیں ٹھکانا کچھ — وہم میں بھی نہیں ہے پانا کچھ

یا

مدت مدید گزری مجھے کرتے انتظار — خجلت ہوئی جو حال لکھا میں نے بار بار
اس فرد دستخطی کو ہے یہ ماہ ہفتمیں — تنخواہ کا نہیں ہے ٹھکانا ابھی کہیں
برسوں ہوئے مہینوں گئے نہ علاے ہوئے وعید — سچ کہتے ہیں کہ کچھ نہیں ان جھوٹوں سے بعید

(جگر کے یہاں اس قسم کے اشعار ہی نہیں ملتے جن سے شکایت روزگار کا اظہار ہوتا ہو بہت ممکن ہے کہ اس میں حالات زمانہ کو بھی دخل ہو لیکن اس میں جگر کی بلند سیرتی اور خودداری کو بھی بہت دخل ہے کہ انھوں نے شکوہ و شکایت روزگار سے پرہیز کیا ورنہ گذرنے کو تو ان پر ایسے ایسے زمانے گذرے ہیں کہ انھیں کئی کئی روز تک فاقہ کرنا پڑا ہے لیکن کیا مجال کہ حرف شکایت زباں پر لے آتے۔

ان کو اوائل عمر سے لے کر جوانی تک نہ صرف مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا بلکہ عشق میں بھی شدید ناکامی ہوئی ان دونوں اسباب سے ان کے کلام میں سوز و گداز پیدا ہوا ان کی رمزی علامتیں ان کے معاشی حالات کی بہترین ترجمان ہیں اور اس کی شہادتیں مختلف لوگوں کے بیانات میں بھی ملتی ہیں۔)

جگر صاحب کو بالکل ابتدائی زمانہ ہی سے گھر سے نکلنا پڑا اور سرد وگرم زمانہ سے دوچار ہونا پڑا۔ انھوں نے دنیا کو گھر سے نکل کر دیکھا اور اس کا مشاہدہ کیا اسی لئے ان میں ہوشمندی اور دنیوی زیرکی پیدا ہوئی لیکن اس ہوشمندی اور دنیوی زیرکی کے باوجود ہمیشہ بے ہوش اور دنیوی زیرکی سے بے بہرہ رہے جس میں ان کی طبیعت کے لاأبالی پن کو کافی دخل رہا انھوں نے بھی میر کی طرح ع

کم پائی عمر پھر بھی کیا سیر دو جہاں

اسی لئے ان کے یہاں زندگی کا ارادہ اور جذبہ دونوں موجود ہے وہ زندگی کے تمام ہنگاموں میں شریک ہوئے اور زیادہ سے زیادہ لطف اندوز بھی ہوئے ان کو بھوپال کے دوران قیام نسیم بیگم کی کمی کا احساس ہوا تو کہتے ہیں ؎

بھوپال گرچہ خلد بداماں ہے اے جگر
دل کیا شگفتہ ہو کہ نسیم جگر نہیں

اور شیرازن بیگم کی محبت کا ذکر یوں کرتے ہیں ؎

وہ کہتے ہیں سب دل کے انداز سے کہیے
محبت کا انجام و آغاز سے کہیے
ہر اک راز ہے ہمدمِ راز کہیے
کہاں تک غمِ عشق شیراز سے کہیے

کہ ہر آرزو محشر آرزو ہے

(جگر کی ابتدائی زندگی ناجوانی خون گشتہ تمناؤں کا مظہر ہے وہ ایسے حالات وواقعات کے سائے میں پلے کہ ان کا نازک مزاج ہوجانا ناگزیر تھا ان کے کمالِ فن میں تیزی ان کے خارج اور باطن میں اندرونی پیکار کے مسلسل جاری رہنے سے آئی بعض محرومیوں نے ان کے احساس کو بھڑکایا اور ان کی انفرادیت کی لے بہت بڑھ گئی اسی لئے ان کو خود بھی اپنی عظمت کا احساس ہوا)

عالم تمام میرا ثناخواں ہوا جگر
میں آپ اپنے شعر کا جب قدرداں ہوا

تیرا دیوانہ غریب جگر
فخرِ ہندوستان ہے پیارے

واہ کیا مست غزل تو نے پڑھی آج جگر
ایک اک لفظ چھلکتا ہوا پیمانہ ہے

بزم مشاعرہ ہے یا گلشنِ تخیل
بلبل چہک رہا ہے یا حضرتِ جگر ہیں

گلوں سے مستی چھلک رہی ہو سراپا بلبل ٹپک رہی ہو
جگر کسی گوشۂ چمن میں غزل کوئی اپنی گا رہا ہے

قیسی الفاروقی نے جگر کی عظمت کی متعلق صحیح لکھا ہے :-

"وہ دوسروں کے فائدے کے لئے وہ اپنی شخصیت کا بھی خیال نہیں کرتے مگر جب ان کی شاعرانہ عظمت کا سوال آتا تو وہ اپنے مقام سے نہیں ہٹتے اور نہ کسی ایسی بات کو برداشت کرسکتے ہیں جو اس عظمت کے منافی ہو مجھے اکثر محسوس ہوا کہ علی سکندر ایک سادہ مزاج خاکسار اور معصوم انسان ہیں اور جگر ایک ایسے خوددار شاعر ہیں جنھیں نہ جاننے والے مغرور بھی کہہ سکتے ہیں"[1]

---

[1] "حیاتِ جگر" از قیسی الفاروقی (غیر مطبوعہ)

(جگر کے کمالات کا اعتراف ہر چہار طرف تھا نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان میں بھی ان کے کمالات کی شہرت تھی ہندوستان اور پاکستان کے تمام لوگ جگر کے دیوانے تھے جگر صاحب پاکستان منتقل تو نہیں ہوئے تھے لیکن وہاں کے لوگ بھی جگر کے بغیر مشاعرہ کو "بے دولھے کی بارات" سمجھتے تھے۔)

ماہر القادری کا ان کی مقبولیت کے متعلق بیان ہے کہ

"جگر صاحب کی ذات اور شخصیت میں بڑی محبوبیت اور دلکشی پائی جاتی ہے یہی سبب ہے کہ جس شہر میں جاتے ہیں لوگ سچ مچ انھیں آنکھوں پر بٹھاتے ہیں اور ان کی قیامگاہ پر میلہ لگا رہتا ہے ان کی طبیعت کا یہ رنگ ہے کہ ملنے والوں سے جی اکتا بھی جاتا ہے اور جب کوئی اتفاق سے ملنے نہیں آیا اور تنہا ہوتے ہیں تو بھی ان کا جی گھبراتا ہے

حضرت جگر کو مقبولیت، عام شہرت، محبوبیت اور عام پسندیدگی حاصل ہے اس کی مثال دنیائے شاعری میں بہت کم ملے گی طوائفوں کے کوٹھوں اور ایکٹریسوں کے شبستانوں سے لے کر قیصر و ایوان اور مدرسہ اور خانقاہ تک ان کے کلام کی دھوم مچی ہوئی تھی ان کی شاعری ہر طبقہ میں پسند کی جاتی ہے میں نے بڑے درجہ کے قومی لیڈروں، گورنروں، وزیروں، ہائی کورٹ کے ججوں اور اعلیٰ عہدہ داروں کو جگر سے عقیدت کے ساتھ پیش آتے دیکھا ہے، مشاعروں کی تو وہ جان اور رونق و آبرو ہیں۔" (۱)

جگر کو اپنی شہرت کے ساتھ ساتھ اپنی خود کی بھی قدر و منزلت بڑھی اور ان کو مشاعرے میں شرکت کے لیے آخری ایام میں تو دو دو ہزار روپے تک پیش کیے گئے اتنی بڑی رقم ان کے زمانے کے کسی شاعر کو پیش نہیں کی گئی وہ اپنے آپ کو سب سے بڑا شاعر ضرور سمجھتے تھے لیکن میر کی طرح مغرور قطعی نہیں ہوئے کہ خود کو اژدر اور معاصرین شعراء کو کیڑوں کی طرح ہیچ و پوچ سمجھا ہو ان کے مرتبہ کے لحاظ سے ان کی قدر و منزلت بھی خوب ہوئی اسی لیے ان کو کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ

جواہر تو کیا کیا دکھائے گئے ؎ ؎ خریدار لیکن نہ پائے گئے

یہ جگر کی خوش قسمتی تھی کہ انھوں نے جیسے جیسے جواہر دکھائے ویسے ویسے ہی ان کو خریدار بھی ملتے گئے۔

جگر کی سیرت اور کلام میں کچھ خامیاں اور نقائص بھی ملتے ہیں وہ بد دماغ اور مغرور تو نہیں تھے لیکن انھوں نے بقول جلیل قدوائی اپنے یا اپنے کرم فرماؤں کو البتہ بھلا دیا اور ان کی کوئی پرواہ نہ کی

---

(۱) "حیات جگر" از قیسی الفاروقی (غیر مطبوعہ)

نہ تو خود ان کا کہیں ذکر کیا اور نہ کلام میں کوئی نشانات چھوڑے بعض اوقات ایک فرشتے کی برائی بھی کھلے عام کی، شراب بھی سر محفل پی اور طوائفوں کے کوٹھوں پر بھی گئے انھوں نے احسانات سے بھی قطع نظر کی لیکن ذاتی عناد کی بنا پر کسی کی عیب جوئی نہیں کی

ان کے کلام میں بعض نقائص بھی ہیں بعض اشعار میں تو تاثیر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور بعض دنیائے شاعری میں لاجواب ہیں ساتھ ہی ساتھ بعض اشعار معمولی قسم کے بھی ہیں جو نہایت پست قسم کے اشعار میں شمار کیے جا سکتے ہیں لیکن اسی پستی و بلندی میں ان کے اشعار کا اعجاز ہے۔

ان کے کلام کا بیشتر حصہ بہت بلند ہے جو ان کو بقائے دوام بخشنے کے لیے کافی ہے۔

یہی وہ حالات و واقعات ہیں جن سے جگر کی سیرت و کردار کے نفسیاتی پہلو پر روشنی پڑتی ہے اور اس کی جھلک ان کے کلام میں جا بجا دکھائی دیتی ہے

طرز معاشرت شکل و شمائل:- جگر صاحب صورت و شکل کے اعتبار سے بہت اچھے نہیں تھے بلکہ کسی حد تک ان کو بد صورت کہا جا سکتا ہے کیونکہ ان کا قد میانہ، رنگ سیاہ فام ناک چپٹی ہوئی اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں بات کرنے میں ان کے سامنے کے دانت قدرے نمایاں رہتے تھے، سر پر لمبے لمبے بے ترتیب پٹے دار بال تھے اور چہرے پر خشخاشی ڈاڑھی تھی جو چھتری رہتی تھی اس کے باوجود ان میں ایک عجیب جذب و کشش کی کیفیت پائی جاتی تھی جو ہر شخص کو اپنا گرویدہ بنا لیتی تھی

لباس:- جگر کا لباس عام طور سے تمام عمر علی گڑھ کا تنگ مہری کا پائجامہ قمیض شیروانی اور (لمپ) جوتا رہا لیکن مختلف زمانے میں ان کی ترتیب میں کچھ کم و بیش فرق ہوتا رہا، مثلاً ان کے ۱۹۲۲ء کے لباس کے بارے میں سید عماد الحق کا بیان ہے کہ

"جگر صاحب چشمہ کے ایجنٹ تھے، قمیص اور چوڑی دار پائجامہ پہنتے تھے قمیص پر واسکٹ بھی ہوتی تھی واسکٹ کی جیب میں ایک جیبی گھڑی بھی رہتی تھی جس کی زنجیر کے دوسرے سرے پر قطب نما ہوتا تھا۔ ٹوپی کلپاک کی پہنتے تھے ازاربند اس وقت بھی لٹکتا رہتا تھا" (۱)

تسکین قریشی نے جگر کے ۱۹۲۷ء کے حلیہ کے متعلق بیان کیا ہے کہ:۔

"۱۹۲۷ء میں مین پوری میں زین الدین صاحب کلکٹر تھے، وہاں ایک مشاعرہ ہوا میں بھی گیا تھا، اصغر حسین صاحب مختار کے یہاں جگر صاحب کا قیام تھا اس وقت

---

(۱) "حیات جگر" از قیسی الفاروقی (غیر مطبوعہ)

ان کی عمر ۲۵، ۲۶ کی ہوگی، چھریرہ بدن، شوخ رنگ کی اچکن اور چوڑی دار پائجامہ پہنے ہوئے تھے سنہری کمانی کی عینک لگاتے تھے خشخشی داڑھی تھی، مجھ سے اصغر حسین صاحب کے مکان پر ملاقات ہوئی اور دو میں یہ غزل سنی، ع سوز میں بھی وہی نغمہ ہے کہ جو ساز میں ہے"۔ [۱]

اور غلام احمد فرقت کاکوروی لکھتے ہیں:۔

"یہ ۱۹۲۹ء کا زمانہ ہے ...... جگر صاحب اس زمانے میں چشموں کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتے تھے غالباً وہ انکا بھی بڑا صبر آزما دور تھا، معمولی قسم کے سوتی کپڑے کی شیروانی، سر پر اونی بال دار ٹوپی اور ہاتھ میں چمڑے کا بیگ جسمیں مختلف قسم کی عینکیں، بجلی کمپنی ان سے عینکیں خریدتی تھی، پان وہ اسوقت بھی اچھی طرح کھاتے تھے جس طرح میں کھاتا ہوں یا مرتے دم تک وہ کھاتے رہے نہایت بے ہنگم اور بے دردانہ انداز سے"۔ [۲]

ماہر القادری نے ان کا ۱۹۳۲ء کا حلیہ اس طرح لکھا ہے:۔

"ان کے حلیے اور وضع قطع کو دیکھکر ہی پہچان گیا کہ یہ وہی صاحب ہونے چاہئیں جن کی غزل کا یہ مقطع ہے

سب کو مارا جگر کے شعروں نے ٭٭٭ اور جگر کو شراب نے مارا

وہ ان کے بال کی بکھری ہوئی لٹیں ان پر ٹوپی عجیب انداز سے رکھی ہوئی، شیروانی کے بٹن کھلے ہوئے ملگجی قمیص جس کے دامن پہ پان کے ہلکے ہلکے دھبے بھی تھے تنگ مہری کا پائجامہ، سیاہ پمپ جس کی پالش اور خاص طور سے فیتے اپنے پہننے والے کے الھڑپن اور بے نیازی کی زبانِ حال سے شکایت کر رہا تھا"۔ [۴]

محمود علی خاں جامعی لکھتے ہیں:۔

"لباس میں انھوں نے کوٹ پتلون کبھی نہیں پہنا، ہمیشہ بالوں والی سیاہ اونچی باڑھ کی ٹوپی اور شیروانی پہنتے ہیں جاڑوں میں کسی ملائم کپڑے کی قمیص، گرمیوں میں باریک ململ کا کرتا، علی گڈھ فیشن کا تنگ مہری کا پائجامہ جسمیں رنگین ریشمی کمر بند آگے کا نی لٹکا ہوا، ایسا بوٹ جو بغیر ہاتھ لگائے آسانی سے کھل سکے یا سیاہ پمپ یا پھر سلیم شاہی جوتا اور موزے ان کا عام لباس ہے ہر لباس صاف ستھرا اعلیٰ نازک نفیس اور خوب صورت پہنا کرتے ہیں چاہے تھوڑی دیر بعد اس پر پان کی چھینٹیں پڑی ہوں۔

جاڑوں میں روئی کی مرزئی کے بجائے وہ سوئٹر البتہ پہنتے ہیں اس کے علاوہ چوڑی دار لکھنوی پائجامے بھی انھیں بہت پسند ہیں اور اکثر پہنا کرتے ہیں"۔ [۵]

جگر کے آخری ایام کے لباس کے سلسلے میں قیس الفاروقی نے لکھا ہے کہ جگر صاحب کے یہاں "ایک سے ایک اچھی سلی ہوئی شیروانی ہر موسم کی اور ہر رنگ کی سفید و سیاہ، گلابی گندمی سرمئی، چاکلیٹی، کھونٹیوں پر آویزاں رہتی ہے کوئی لکھنؤ کی سلی ہوئی ہے کوئی بمبئی کی کوئی حیدرآباد کی کوئی کراچی یا لاہور کی کپڑا بھی قیمتی سے قیمتی ہے مگر حضرت جگر کی شیروانی وہی ہوتی ہے جسپر

---

[۱] حیات جگر، قیس الفاروقی (غیر مطبوعہ) [۲] بجلی کمپنی دفع قیصر باغ لکھنؤ [۳] "فروغ اردو" فروری ۱۹۶۲ء ص [۴] انجام، جنوری ۱۹۶۲ء ص
[۵] تذکرہ جگر ص ۲۸، ۲۹

پان کی جھلیاں ہوں، پائجامہ چوڑی دار پہنتے ہیں ادھر ایک سال سے اتارنے چڑھانے کی سہولت سے علی گڑھ کٹ کے پائجامے بھی بنوالیے ہیں گرمیوں میں کرتا اور جاڑوں میں قمیص پہنتے ہیں ان کے بکس میں ہر چیز درجن کے حساب سے رہتی ہے، کرتا ایک درجن ہے تو موزے اور بنیائن بھی ایک درجن ہیں رومال کی کوئی تعداد متعین نہیں ہوسکتی اسلیے کہ ایک ایک دن میں دو دو تین تین رومال خراب ہوتے ہیں اور لاپتہ بھی ہوجاتے ہیں ...... تہ بند پہننے کا انھیں بہت شوق ہے رنگ برنگ کی سوتی اور ریشمی تہ بند ان کے پاس ہیں مدراس سے منگواتے ہیں اور اب جبکہ مرض نے بہت دبالیا ہے یہ تہبند اُن کے لیے بہت ضروری ہوگیے ہیں،، [۱]

طعام :- جگر صاحب ناشتہ پر انڈا پراٹھا اور بالائی زیادہ پسند کرتے تھے، ان کو بسکٹ، کیک پیسٹری اور توس مکھن سے کوئی رغبت نہیں تھی، اور کھانے میں چٹپٹے دار قیمہ، پسندہ، قورمہ، کباب، آلو اور ارد کی دال بڑے شوق سے کھاتے تھے، مرغن چیزیں بھی زیادہ پسند نہیں کرتے تھے، انکو میٹھی چیزوں کے مقابلہ میں نمکین چیزیں زیادہ پسند تھیں، بیسنی روٹی کے ساتھ اچار چٹنی اور دہی کا رائتہ انھیں اس قدر پسند تھا کہ اس کے سامنے وہ بریانی اور مرغ کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے، چائے کا بیحد شوق تھا، اور پھلوں میں آم بہت پسند کرتے تھے وہ پان بھی بہت کھاتے تھے اور جب ان کے مالی حالات بہتر ہوئے تو وہ پاندان اپنے ساتھ رکھنے لگے تھے

تواضع :- جگر صاحب اپنے یہاں ہر آنے والے کا بڑی گرمجوشی کے ساتھ استقبال کرتے تھے اور اس کی ہر طرح کی تواضع کرتے تھے، وہ واقعی اپنے اس شعر پر تا عمر عمل پیرا رہے، ع

وہ حلم اور وہ تواضع اور وہ طرز خود فروشی ✗ خدا بخشے جگر کو لاکھ انسانوں کا انساں تھا

جگر صاحب اپنے یہاں آنے والے کی ضیافت دلجوئی کے لیے اُسے پان سگریٹ چائے وغیرہ پلاتے غزل اور لطیفے بھی سناتے اور ضرورت پڑتی تو اسے روپے پیسے بھی دیتے کھانے اور پوشاک کے معاملے میں بہت نفاست پسند تھے اور اگر دوسروں میں کوئی کمی دیکھتے تو انھیں تکلیف ہوتی تھی اور وہ بعض اوقات کا اظہار بھی کردیتے تھے، مہمان کے کھانے اور آسائش کا ہر طرح کا خیال کرتے تھے، اور اگر خود کہیں مہمان جاتے تو اپنے میزبان کے بچوں وغیرہ کے لیے مختلف قسم کے تحفے تحائف لے جاتے تھے اور میزبان کے ملازمین کو بھی انعام دیتے تھے اور ہمیشہ اس کا خیال رکھتے کہ ان کی وجہ سے میزبان پر کوئی بار نہ پڑنے پائے۔

اپنے گھر پر ہر آنے والے کو کم سے کم چائے کا پلانا لازمی سمجھتے تھے اور کبھی کبھی یہ سلسلہ منہ سے لے کر عشا تک برابر چلتا رہتا تھا،

استغنا و خودداری جگر صاحب کی زندگی اور ان کی استغنا و خودداری کے واقعات سے بھری

---

[۱] "حیات جگر" از قیس الفاروقی (غیر مطبوعہ)

پڑی ہے کیونکہ وہ انتہائی خود دار اور مستغنی قسم کے انسان تھے، انھوں نے خود بھی کہا ہے کہ
انسان کو خود دار ہونا چاہئے "۔۱

وہ اپنے اس قول پر ہمیشہ عامل رہے اسی وجہ سے روپیہ کبھی ان کا مقصود زندگی نہ بن سکا نہ روپیہ کے لیے انھوں نے کسی کے آستانے پر سر جھکایا بلکہ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ "میں سیٹھوں اور دولتمندوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتا میری خودی یہ بات گوارہ ہی نہیں کر سکتی"۔۲

جگرؔ صاحب کو روپیوں کی فکر نہ زمانہ رندی میں رہی اور نہ اس کے بعد، جب بھی ان کو جتنا بھی روپیہ ملجاتا وہ بے دریغ خرچ کر دیتے اور "کل" کی فکر نہ کرتے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جس طرح انھوں نے روپیہ خرچ کرنے میں کوئی احتیاط نہیں برتی اسی طرح قدرت نے بھی ان کو روپیہ دینے میں کوئی احتیاط نہیں برتی جیسے ہی ان کی جیب خالی ہوتی ویسے ہی قدرت کہیں نہ کہیں سے ان کے خرچ کے لیے روپیہ فوراً بھیج دیتی اور وہ سارا روپیہ ملتے ہی پھر اپنے احباب، عزیز، غریب، نادار، محتاج اور بیواؤں پر اور بعض اوقات اسکول کی امداد وغیرہ میں بغیر کسی پس وپیش کے خرچ کر دیتے۔

انھوں نے اپنی ضرورت کے وقت بھی اپنی خودداری کو برقرار رکھا کئی کئی دن کھانے کو نہیں ملا لیکن کسی کے سامنے دست طلب دراز نہ کیا زمانہ رندی میں اکثر احباب اپنے یہاں قیام کی دعوت دیتے لیکن وہ اپنی خوددار طبیعت کی وجہ سے ان کو زحمت نہیں دیتے تھے اس سلسلہ کا ایک واقعہ اثرؔ لکھنوی نے راقم سے اکتوبر ۱۹۶۲ء کی ایک ملاقات میں بتلایا جب وہ بلیا میں بسلسلہ ملازمت رہتے تھے جگرؔ اکثر مشاعروں میں شرکت کی غرض سے وہاں جاتے رہتے تھے اور دوسروں کے یہاں قیام کرتے تھے اثرؔ صاحب نے ان سے کئی دفعہ اپنے یہاں قیام کرنے کی پیش کش کی لیکن چونکہ اس زمانے میں جگرؔ کی مینوشی اپنے عروج پر تھی اثرؔ صاحب کے ساتھ عورتیں رہتی تھیں جو اس بات کو پسند نہ کرتیں اس خیال سے جگرؔ نے ان کے یہاں کبھی قیام نہیں کیا، اثرؔ صاحب کا کہنا ہے کہ یہ بڑی خودداری اور غیرت کی بات ہے اگر وہ کھانے پینے یا کسی اور چیز کے لالچی ہوتے تو میرے یہاں ضرور قیام کرتے لیکن ان کی خودداری اور غیرت نے کبھی اس بات کی اجازت نہ دی کہ وہ اپنی بری عادت سے دوسروں کو تکلیف پہونچاتے

وہ خوددار ایسے تھے کہ ۱۹۳۷ء کے زمانے میں جب کہ وہ خود پیسوں کے ضرورت مند تھے، لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں شرکت کی اراکین مشاعرہ نے انکو اخراجات نہ دیے تو انھوں نے ۲۹ جنوری ۱۹۳۷ء کو نواب سید علی حسن صاحب کو لکھا ہے "اگر روش صاحب، ساغر صاحب، سیماب صاحب کو طلب کر کے ان کے تمام اخراجات ادا کیے گئے تو آخر مجھے کیوں نقصان پہونچا ناگوارا کیا جار ہا ہے؟ ممکن ہے حضرت موصوف کی تمنا ہو کہ میں براہ راست ان کی خدمت میں حاضر ہو کر کہوں، لیکن میں انشاء اللہ کبھی بھی ایسا نہ کر سکوں گا خواہ کتنی ہی تکلیف و اذیت پہونچے"

۱۔ "فروغ اردو"، فروری و مارچ ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۴۱، ۲۔ "یاد جگر" صفحہ ۴۹۔

لکھنؤ ہی میں ایک دفعہ ایک حادثہ اور پیش آیا، ہوا یہ کہ ایک زمانے میں ان کو "انجمن بہار ادب" لکھنؤ کا اعزاز بڑھانے کے لیے اس کا ممبر بنا لیا گیا، جگر صاحب اس نکتہ سے واقف تھے اس لیے انھوں نے ادائیگی فرض کے متعلق صابر کو لکھا کہ وہ معاملات و واقعات کی تحقیق کر لیں اور نتائج تحقیق و ادائیگی فرض کے لیے بالکل آمادہ رہیں اور اگر ان کی صاف گوئی کسی ممبر کو شاق گزرے تو اسی تحریر کو ان کا استعفیٰ تصور کیا جائے،

اس کے بعد دوسرے خط میں انھوں نے اس انجمن کی ممبری سے استعفیٰ دیتے ہوئے لکھا کہ "میں نے محض چند حضرات کے شدید اصرار سے مجبور ہو کر اور ان کے ارشادات کو صحیح باور کر کے اس ننگ کو گوارہ کر لیا تھا کہ مجھے بھی ممبری قبول کر لینی چاہیئے ننگ میں نے اس لیے کہا کہ در اصل میں اپنی ذات کو کسی محدود جماعت کیساتھ وابستہ کر دینا اپنے نزدیک ننگ ہی سمجھتا ہوں"۔ ۱؎

جگر صاحب ایسے مستغنی قسم کے انسان تھے کہ ایک دفعہ عبد الحمید خاں بو بیرے نے ان کی حیات میں سنہ ۱۹۵۱ء میں "صبح امید" کا جگر نمبر نکالنا چاہا جس کے لیے وہ جگر صاحب کو توجہ دلاتے دلاتے عاجز آ گئے تب بمشکل تمام وہ بمبئی "صبح امید" کے دفتر گئے

وہ اس قدر بے نیاز قسم کے انسان تھے کہ علی گڑھ کی اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری اور ساہتیہ اکیڈمی سے "آتش گل" پر پانچ ہزار روپیے کے انعام کو بقول محسن علی صدیقی ۲؎ اپنے ایک مصرعہ سے بھی کم وقعت سمجھتے تھے اور ایک دفعہ جب انکی علالت کے دوران بمبئی میں دی شنکر کی کوشش سے جشن جگر منانے کا انتظام ہوا تاکہ اس کی آمدنی جگر صاحب کی نذر کر کے ان کی مالی امداد کی جائے تو جگر صاحب اس کی اطلاع پر سخت ناراض ہوئے اور کہا کہ یہ جشن ہر گز نہ منایا جانا چاہیئے ورنہ اس سے ان کی روح کو تکلیف ہوگی پھر جب لوگوں نے ان کو بہت سمجھایا بجھایا اور ان سے بڑے اصرار سے ایک تازہ غزل مانگی تو انھوں نے بہت مجبور ہو کر اپنی ایک غزل "جشن جگر" کے لیے بھیجی جسے بمبئی میں مختلف ایکٹروں اور ایکٹریسوں نے اس جشن میں پڑھی اور اس جشن کی آمدنی سے جگر صاحب کو دس ہزار روپے کی رقم نذر کی گئی، ایسی گراں قدر رقم کو بھی وہ ایک مصرعہ سے زیادہ نہ سمجھتے تھے اور جب جشن جگر ختم ہو گیا تو انھوں نے دی شنکر کو ۲۴ ستمبر سنہ ۵۸ء کے خط میں لکھا

"خوشامد میرا شیوہ نہیں ہے جہاں کہیں سچی محبت اور اخلاص، شرافت نفس اور انسانیت محسوس کر لیتا ہوں میں اس کا ہو جاتا ہوں ...... خود دارانہ زندگی بسر کی اور اپنی اسی روش پر نازاں بھی ہوں ہندوستان میں اکثر ...... ریاستوں کے علاوہ حیدر آباد دکن میری خود داریوں کی شکست خوردہ ہے اس کے بعد پاکستان ...... آج سے بہت پہلے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ آپ بہ نفس نفیس جشن جگر کے سلسلہ میں حصہ لے رہے ہیں ایسے مواقع پر دانستہ بھائی میں نے

۱؎ جگر کا ایک خط بنام سکریٹری انجمن بہار ادب لکھنؤ، رجسٹر تاریخ درج نہیں ۲؎ اہلیہ جگر کی اہلیہ کے بھائی کے داماد جنھوں نے راقم سے دوران سفر گونڈہ جون ۱۹۶۸ء میں یہ باتیں بتائیں

کوئی خط لکھنا مناسب نہیں سمجھا، غالباً آپ کے علم میں ہوگا کہ جشن جگر یا معاونت کے سلسلے میں میری جانب سے ادنیٰ سی بھی تحریک نہیں تھی حکومت ہندوستان کا اس لیے سچے دل سے بیحد شکر گزار ہوں کہ میری جانب سے نہ کوئی کوشش ہوئی اور نہ کاوش نہ کسی قسم کی تحریک لیکن اس سے (یعنی مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت نے مجموعی رقم ڈھائی سو روپیہ ماہانہ مقرر کر دی لیکن ایک سال کے لیے بہر حال اس نے اپنا فرض کسی نہ کسی حد تک تو ادا ہی کر دیا اب کہ جشن جگر بخیر و خوبی ختم ہو چکا، شدت سے اپنا اخلاقی اور مخلصانہ فرض محسوس کرتا ہوں کہ روح اور اس کی گہرائیوں کے ساتھ ہدیہ تشکر پیش کر دوں،،

جگر صاحب کو جو رقومات مرکزی اور صوبائی حکومت سے بطور وظیفہ کے جب ۱۹۵۸ء میں موصول ہوئیں تو انھوں نے وظیفہ کے چک پر دستخط بھی احباب کی بڑی سفارش کے بعد کیے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وظیفہ تو حکومت فن کی وجہ سے دیتی ہے لیکن فارم پر دستخط کراتی ہے کہ وہ فنکار غریب ہے وہ کہتے تھے کہ کوئی خوددار آدمی یا فنکار اپنی غریبی کا ڈھنڈورہ کیسے پیٹ سکتا ہے اسی لیے اول تو وہ فارم ہی پر دستخط نہیں کر رہے تھے اور بعد کو وظیفہ کے چک پر بھی دستخط کرنے سے انکار کیا لیکن احباب کے کہنے سننے پر دستخط کر دیے،

ان کی خودداری کا ایک واقعہ یہ بھی ہے جب یکم یا دو نومبر ۱۹۵۹ء کو ان کی تاریخی غزل کا ریکارڈ ہوا تھا اور انھوں نے اپنی نئی غزل ایک روپیہ معاوضہ لینے سے انکار کر دیا تھا اس واقعہ کی تفصیل پچھلے صفحات میں بیان کی جا چکی ہے،

"صدیق حسن صاحب نے جگر کی خودداری کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ

"آتش گل" کی طباعت ہو چکی تھی اس کی جلدیں میرے پاس رکھی ہوئی تھیں میں نے دو ایک دوستوں سے مشورے کے بعد طے کیا کہ کوئی پچاس جلدوں پر جگر اپنے دستخط کر دیں تاکہ یہ نسخے زیادہ قیمت پر بک سکیں میں جگر کی خدمت میں کافی گستاخ تھا، چنانچہ ایک سہ پہر کو جب میں نے دیکھا کہ جگر بہت ہی اچھے موڈ میں ہیں، میں نے نہایت بے تکلفی سے کہا کہ کچھ نسخوں پر دستخط کر دیجیے، کہنے لگے کیا کیجیے گا؟ میں نے کہا کروں گا کیا جہاں اور نسخے بکیں گے انھیں بھی بیچ دوں گا اور شاید مصنف کی دستخطوں کی وجہ سے ان کی قیمت اچھی آ جائے یہ سنکر مسکرا دیے کہنے لگے میں اپنے دستخط بیچوں؟ جی نہیں۔ میں نے ہر چند اصرار کیا مگر جگر کو اس پر آمادہ نہ کر سکا ،، ۲

جگر صاحب نے اس زمانے میں بھی جب کہ ان کو روپیوں کی سخت ضرورت رہتی تھی اور فلم کمپنیوں کی طرف سے انھیں گرانقدر رقمیں بھی پیش کی جاتی تھیں انھوں نے کبھی اس ننگ کو گوارا نہ کیا سوائے ایک دفعہ کے جس کا تذکرہ پچھلے صفحات میں آ چکا ہے، وہ بھی دھوکے میں آ کر

۱۔ ایک سال کے بعد یہ وظیفے پھر جاری ہو گئے تھے، کیونکہ یہ وظیفے سال بسال دیے جاتے ہیں ۔۔۔۔۔۔
۲۔ "فروغ اردو،، فروری و مارچ ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۲۱

جگر صاحب کی خودداری طبیعت نے انھیں کبھی کسی دربار سے بھی منسلک نہیں ہونے دیا، نوابزادہ رشید الظفر سے ایک عرصہ تک وظیفہ ملتے رہنے کے باوجود انھوں نے اس کی کبھی پرواہ نہیں کی ایک دفعہ انھوں نے (نواب صاحب) شملہ کوٹھی میں کوئی بات کہی ان کے مصاحبین نے تو ان کی ہاں میں ہاں ملائی لیکن جگر صاحب نے ان سے کہا کہ "انھیں لوگوں نے آپ کا دماغ خراب کیا ہے" جگر صاحب کی یہ بات نواب صاحب کو ناگوار گزر سکتی تھی، لیکن نواب صاحب نے اپنی اعلیٰ ظرفی کی وجہ سے جگر صاحب کی رائے سے اتفاق کیا اور کہا کہ "جگر صاحب! آپ ٹھیک کہتے ہیں؛" ع۱

وہ اپنی خودداری طبیعت ہی کی وجہ سے نواب زادہ سعید الملک کرنل سعید الظفر میاں جو نواب زادہ رشید الظفر کے بڑے بھائی تھے ان کے سانحِ رحلت پر جب رشید الظفر کو ایک نظم کی ضرورت پڑی اور انھوں نے (رشید الظفر نے جگر کو سعید الظفر میاں کے سانحِ رحلت پر نظم کہنے کے لیے لکھا تو وہ (جگر) خود نہ کہہ سکے مجبور ہو کر تسکین قریشی کو سعید الظفر کے سانحِ رحلت پر ایک نظم کہنے کے لیے لکھا کہ "میں نے چاہا تھا کہ آپ کو تکلیف نہ دوں خود ہی چند اشعار کہہ لوں لیکن غالباً اب مہینہ دو مہینہ تک اس طرح کا کوئی امکان نہیں ہے"۔ ع۲

جگر صاحب کے استغنا کا ایک واقعہ مولوی حکیم محمد احمد صاحب مرادآبادی سے ۲۴ دسمبر ۱۹۶۳ء کی ملاقات میں معلوم ہوا کہ ایک دفعہ جگر حیدرآباد میں شراب کے نشے میں دھت پڑے ہوئے تھے قاضی عبدالغفار بھی وہیں تھے جنھوں نے محمد احمد صاحب سے یہ واقعہ بتایا کہ دوران قیام حیدرآباد کسی نے جگر سے حیدرآباد ریاست والوں کی بات چھیڑ دی اور ان کی ریاست کی تعریفیں کرنے لگے جگر صاحب نے ان کی تعریفیں سنکر کہا "یہ تو نمک حراموں کی ریاست ہے جنھوں نے سلطان ٹیپو کو شہید کرا کے یہ ریاست حاصل کی ہے" جگر صاحب کا یہ جملہ سن کر سب لوگ سناٹے میں آ گئے اور سوچنے لگے کہ اب خدا معلوم کیا ہو جائے کیونکہ اس وقت سب لوگ حیدرآباد ہی میں موجود تھے اس لیے انھوں نے جلدی سے جو بھی ٹرین اوّل وقت ملی ٹکٹ دلا کر انھیں گاڑی میں بٹھا دیا۔

جگر صاحب روپیوں کے غلام کبھی نہ بن سکے اور نہ روپیہ کی وجہ سے وہ کبھی کسی کے پابند ہوئے

ع۱ "یادِ جگر" ص۹۶ ، ع۲ "مکاتیب جگر" ص۲۳

اس سلسلے میں وہ میکش اکبرآبادی کو ۱۲ دسمبر ۴۵ء کے خط میں (جو میکش صاحب کے پاس محفوظ ہے)، لکھتے ہیں۔

"ریاستوں کے تعلق کو پسند نہیں کرتا کسی "فلم کمپنی" سے تعلق رکھنا معصیت عظیم سمجھتا ہوں کچھ ہی زمانہ ہوا کہ "دس ہزار روپیہ" دس گیتوں کا واپس کر چکا ہوں ان حالات کے ساتھ خدمت کا ایک اخلاقی اور مذہبی جذبہ شدت کے ساتھ رکھتا ہوں"

ایک دفعہ مجروح سلطانپوری نے جگر صاحب کی طرف سے حیدرآباد کے چھوٹے شہزادے معظم جاہ بہادر کے دیوان پر اصلاح کے لیے پانچ ہزار روپے طے کر لیے اور دونوں حضرات نظام پیلس میں رہنے لگے "ایک آدھ ہفتہ کے بعد گونڈہ سے نسیم جگر کی علالت کی خبر موصول ہوئی اور حضرت جگر نے وہاں سے آنے کی اجازت چاہی معظم جاہ بہادر نے ازراہ محبت انکار کیا کہ ابھی تو اجازت نہیں ملیگی تو جگر صاحب نے فرمایا کہ میاں دراصل یہ غلامی ان روپیوں کی ہے مجھے نہیں چاہئیں یہ روپے لے جاؤ اور انھیں دیدو میں تو اب نہیں رکتا" [۱]

اس سلسلہ کا ایک واقعہ قیسی الفاروقی نے اور بھی لکھا ہے کہ جب عارف صاحب عباسی راجہ ناناپارہ کے یہاں انکے راجکمار کے اتالیق تھے تو مسوری میں راجہ صاحب نے انکے ذریعہ حضرت جگر کے پاس یہ پیغام بھجوایا کہ اگر حضرت جگر ان کی ریاست سے وابستہ ہو جائیں تو ایک معقول مشاہرہ کے علاوہ انھیں ہر قسم کی آسانیاں بہم پہونچائی جائیں گی حضرت جگر اس بات کے لیے مجبور نہیں ہوں گے کہ راجہ صاحب کے ساتھ زیادہ تر رہیں، مگر حضرت جگر نے یہ پیغام سن کر عارف عباسی صاحب سے کہا "آپ میری فطرت اور مزاج سے واقف ہیں پھر بھی ایسی پیشکش کرتے ہیں جو میرے لیے ناقابل قبول ہے" [۱]

ایک دفعہ جگر صاحب پاکستان گیے جہاں وہ ناظم الدین صاحب گورنر جنرل کے خاص مہمان تھے، ایک دن ان کے عملہ کے کچھ آدمی آئے اور جگر صاحب سے کہنے لگے "حضور وہ کوٹھی دیکھ لیجیے"، جگر صاحب نے حیرت سے پوچھا کیسی کوٹھی؟ انھوں نے کہا گورنر جنرل صاحب کا حکم ہے کہ آپ کے لیے ایک کوٹھی اور تین ہزار روپے ماہوار زندگی بھر کے لیے حکومت پاکستان کی طرف سے نذر کیے جائیں گے، جگر صاحب نے فرمایا "لیکن میں نے تو اس قسم کی کوئی آرزو نہیں کی" جواب ملا "حضور اب تو حکم ہو چکا ہے" جگر صاحب اپنے مخصوص انداز میں بولے "نہیں میاں نہیں، میرا پاکستان میں رہنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے"، [۲]

۱۔ "حیات جگر"، از قیسی الفاروقی، (غیر مطبوعہ)

جگر کے استغنا و خودداری سے متعلق ایک واقعہ عاصی کرنالی نے لکھا ہے کہ ایک مشاعرہ میں اس مشاعرے کے ایک منتظم نے اعلان کیا کہ

"حضرات بیٹھے رہیے، اب ایک ڈرامہ پیش کیا جائے گا جگر صاحب سمجھے کہ دورِ ثانی کا اعلان کیا گیا ہے، وہ سامنے کی کرسی پر بیٹھے تھے، مجھے بلایا اور فرمایا کہ ایک دور ختم ہو گیا۔ کافی وقت گزر چکا ہے اب دوسرے دور کا کیا تک، میں نہیں پڑھوں گا۔ سرمایہ دار سمجھتے ہیں کہ میں نے معاوضہ طے کر کے شاعر کا ضمیر اور اس کی آزادی چھین لی ہے۔ نہیں صاحب ایسا نہیں ہو گا۔ جگر صاحب کے چہرے پر ایسی دردمندی اور ہمدردی کی جھلک تھی جو ارباب فن سے ان کی محبت اور خیر خواہی کا اظہار کر رہی تھی اور ان کے اس احتجاج میں اہلِ فن کے لیے خودداری اور استغنا کا زبردست پیغام تھا۔" ۱؎

تبسم نظامی نے بھی جگر کی خودداری کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ

"۱۹۳۰ء میں حیدرآباد دکن سے دار گل گئے وہاں "دار گل کالج کی یونین میں بھی ایک مشاعرہ ہوا اس کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے کالج کے طلباء نے مشاعرہ کے اختتام پر اپنی یونین کی طرف سے جگر کو ایک کیسۂ زر پیش کیا جسے انھوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ میں شاعر ہوں گدا نہیں ہوں اس جواب سے طلباء بہت متاثر ہوئے اور سب نے دست بستہ عرض کیا کہ یہ ہمارے یہاں کا دستور ہے اس کے بعد بھی جگر نے وہ کیسۂ زر قبول نہیں کیا۔" ۲؎

جگر صاحب ۱۹۵۳ء میں حج کو گئے، اور ان کا جہاز جب جدہ پہنچا تو سعودی عرب کے افسران جگر کو لینے بندرگاہ پر آئے اور شاہی دعوت نامہ دیا جگر نے کہا کہ

"میرے ساتھ یہ سب حضرات بھی ہیں ان کا ساتھ چھوڑنا مجھے گوارا نہیں۔ شاہی افسران نے گزارش کی کہ یہ سب حضرات بھی شاہی مہمان ہوں گے۔ آپ ذرا انتظار کریں تو ہم دعوت نامے لیکر ابھی آتے ہیں۔ جگر نے مجبوراً رضامندی کا اظہار کیا آدھ گھنٹہ تک انتظار کرنے کے بعد جگر سب حضرات کے ساتھ رباط حیدرآباد میں مقیم ہو گئے۔ بعد میں دعوت نامے آ جانے پر بھی جگر نے رباط سے منتقل ہونا گوارا نہ کیا۔ یہ استغنیٰ ایک صاحب کردار ہی کا شیوہ ہو سکتا ہے۔" ۳؎

جگر کی خودداری کے متعلق محمود علی خاں جامعی لکھتے ہیں کہ

"ایک مرتبہ جگر صاحب کہیں جانے کو تیار تھے کہ اتنے میں ایڈمنسٹریٹر کراچی کا ایک آدمی آیا۔ اور کہا کہ موصوف کے یہاں احباب کی محفل گرم ہے مجھے آپ کو لینے کو بھیجا ہے۔ انھوں نے جانے سے انکار کر دیا۔

۱؎ "نظام جدید" ۱۶، ۲۲ ستمبر ۱۹۶۳ء صفحہ ۲ ۲؎ "جگر کی کہانی" از تبسم نظامی (غیر مطبوعہ) ۳؎ فروغ اردو فروری تا مارچ ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۲۲

اور کہا کہ انھیں پہلے مجھ سے ملنا چاہیے تھا پھر میرا پروگرام طے کرتے تب آپ کو لینے کو بھیجتے تو میں چلتا۔ میں اپنا دوسری جگہ کا پروگرام نہیں چھوڑ سکتا پھر علیحدہ کہنے لگے یہ افسران ہم کو اپنے احباب کی محفل کی رونق اور تفریح کا سامان سمجھتے ہیں کہ ہر شاعر ان کے دربار میں حاضر ہو کر اپنا کلام سنانے جائیگا لیکن اس کے لیے بھی چند آداب ہوتے ہیں۔ جن کا لحاظ رکھنا فریقین کے لیے ضروری ہوتا ہے۔" ؎۱

اور شیفتہ رازی نے لکھا ہے کہ

"مسز سروجنی نائیڈو جگر کی بڑی معتقد تھیں اور انھیں ہندوستان کا واحد حقیقی شاعر کہا کرتی تھیں جگر سے ان کی اکثر ملاقاتیں رہا کرتی تھیں لیکن جونہی وہ گورنر بنیں اور جگر کی ملاقات کیلیے گورنمنٹ ہاؤس سے پیغام بھجوایا جگر نے آمد و رفت بند کردی مسز سروجنی نائیڈو نے متعدد بار انھیں ملاقات کے لیے بلوایا۔ لیکن وہ کبھی نہیں گئے۔ انتہا یہ ہے کہ مسز سروجنی نائیڈو کے زیر اہتمام ہونے والے مشاعروں میں کبھی شرکت نہیں کی؎۲

جگر کی خودداری کے سلسلے میں تسکین قریشی نے راقم الحروف سے ۱۲ ستمبر ۱۹۶۲ء کی ایک ملاقات میں بتایا کہ ایک دفعہ لاہور میں ایچ ایس این کالج میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں گورنر بھی مدعو تھے اس مشاعرے میں انھوں نے اپنی ایک غزل سنائی اور جب گورنر کی خوشنودی کے لیے ان سے ایک غزل اور سنانے کی فرمائش کی گئی تو جگر نے دوسری غزل سنانے سے انکار کردیا

ایک دفعہ نواب صاحب رامپور کے یہاں مشاعرہ میں جگر صاحب غزل پڑھنے کے بعد چل دیے تو نواب صاحب نے خود ہی کہا کہ "جگر صاحب! ہاتھ تو ملا لیجیے"۔ تب جگر صاحب نے ان سے ہاتھ ملایا۔

ایک دفعہ میرٹھ کے مشاعرے میں جب وہ اپنی غزل پڑھ چکے تو اس وقت یوپی کے ایک منسٹر صاحب نے جو اس وقت وزیر انصاف تھے ان سے غزل سنانے کی فرمائش کی لیکن انھوں نے ان کے کہنے پر غزل نہیں سنائی۔

جگر صاحب نہ صرف رد بیوں کے معاملہ میں مستغنی تھے بلکہ شاعر بھی اس مزاج کے تھے کہ ان کو اپنا کلام ہر وقت اور ہر شخص کو سنانے کا شوق نہیں تھا وہ اپنے کلام کے خود قدردان تھے۔ اسی بارے میں شہید فرنگی محلی نے لکھا ہے کہ

"شاعر تو سننے والے کو ڈھونڈھا کرتا ہے اور یہاں ایک شاعر ایسا بھی پایا ہے جس کو حاصل کرنے اور سننے کے لیے بڑی سے بڑی وہ رقم جو عہد مغلیہ کے ختم ہونے کے بعد کسی شاعر کو مشاعرہ میں چند شعر پڑھ دینے پر بے جگری کے ساتھ نہیں پیش کی گئی ہے پیش کی جاتی اور وہ اُدھ کہہ کے گویا ان نوٹوں کی گڈیوں کو کمہتا ہے

؎۱ "تذکرہ جگر"، صفحہ ۲۲۸، ؎۲ "جام نو" جنوری ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۸

ع ورایں دفتر بے معنی غرقِ مے ناب اولیٰ ۔ میں اس بے نیازی اور استغنا سے بہت متاثر ہوا،" ؎١

غرضیکہ جگر صاحب بے انتہا خود دار اور مستغنی قسم کے انسان تھے وہ اپنی خودداری کی شان کو ہر حال میں قائم رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ جس میں رعونت قطعاً نہ ہوتی وہ اپنی عزت خود کرتے تھے اسی لیے دوسرے لوگ بھی ان کو قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے ان کی انفرادیت کی تعمیر و تشکیل ان کی خودداری اور وضع داری کی وجہ سے ہوئی وہ اپنے احترام کے ساتھ ساتھ دوسروں کے جذبات و احساسات کا بھی اسی طرح احترام کرتے تھے جیسا کہ خود اپنی انفرادی کیفیت کا

فیاضی — جگر صاحب انتہائی فیاض قسم کے انسان تھے، وہ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ غریبوں، بیواؤں، یتیموں، عزیزوں، دوستوں، ضرورتمند شاگردوں اور مختلف اسکولوں پر صرف کرتے رہتے تھے، ادیب سہارنپوری کی تحریر کے مطابق "لکھنؤ اور کانپور میں مظلوموں، یتیموں، اور بیواؤں کا ایک ایسا گروہ تھا جن کی کفالت جگر صاحب کی معرفت ہوتی تھی"۔ ؎٢

وہ کسبِ زر تو کرتے تھے لیکن اپنی عالی ظرفی و بلند نظری کی وجہ سے دولت پرستی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اپنے سرمایہ مکسوبہ میں دوسرے حاجتمندوں کا حق بھی سمجھتے تھے، پاکستان میں ان کو بے اندازہ رقم ملتی تھی لیکن وہ ساری رقم اپنے نیازمندوں دوستوں کے بچوں اور بعض غریبوں کی امداد میں خرچ کر کے وہاں سے ہاتھ جھاڑ کر چلے آتے تھے، نواب سید شمس الحسن صاحب جگر کے دورِ رندی میں ان کی فیاضی کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اس دور میں جب کہ انھیں خود شراب کے لیے ہر وقت پیسہ کی ضرورت ہوتی تھی اگر کوئی پریشان حال آ جاتا تو خواہ ان کا جاننے والا ہو یا نہ ہو جو کچھ ان کے پاس اسوقت ہوتا کونے میں جا کر دیدیتے اور خود ان کے پاس نہ ہوتا تو دلوا دیتے۔ ایسے وقت اضطراب اور دردمندی کی وہ ایسی تصویر بن جاتے جو دیکھنے ہی تعلق رکھتی تھی، بارہا ایسا بھی ہوا کہ ان سے کہا گیا کہ یہ شخص جو آپ کی مروت اور شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے ہم جانتے ہیں کہ وہ ہرگز حاجتمند نہیں۔ مگر وہ کہتے تھے کہ وہ جو کچھ بھی ہو میں اس کی دل شکنی نہیں دیکھ سکتا"۔ ؎٣

جگر کے اسی زمانے کے دو واقعات رشید نعمانی صاحب نے راقم سے ٢٠ دسمبر ٦٣ء کی ایک ملاقات میں بتائے کہ:۔

؎١ قومی آواز ١٩ ستمبر ٦٣ء صفحہ ٣)، ؎٢ "جام نو" دسمبر ٦٣ء صفحہ ١٤، ؎٣ جگر مراد آبادی پر نواب سید شمس الحسن صاحب کی ایک غیر مطبوعہ کتاب جس کا انھوں نے ابھی تک کوئی نام نہیں رکھا ہے)

ایک دفعہ جگر نشے کے عالم میں تھے کہ ایک فقیر کچھ پیسوں کے لیے صدا لگاتا ہوا ادھر سے گزرا جگر صاحب نے اس کی آواز سن کر رشید نعمانی صاحب سے پوچھا کہ آپ کے پاس کتنے پیسے ہیں نعمانی صاحب صحیح صحیح پیسے بتانے میں کچھ پس و پیش کی تو جگر صاحب نے ان کو ڈانٹا اور کہا کہ تم جھوٹ بولتے ہو آخرکار نعمانی صاحب کی جیب خالی کرا کے اور جو کچھ ان کی جیب میں تھا سب نکال کر اس فقیر کے حوالے کر دیئے، تب چین لیا۔

ایک دوسرا واقعہ نعمانی صاحب ہی نے بتایا کہ

ایک دفعہ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی جگر صاحب نشے میں دھت پڑے تھے انھیں اپنے تن بدن کا ہوش نہیں تھا کہ اسی وقت ایک فقیر درد انگیز گڑگڑاتی آواز سے سوال کرتا ہوا نکلا۔ جگر اسکی آواز سن کر چونک پڑے اس فقیر کی آواز سے اس کی سمت کا اندازہ لگایا اور اسی طرف چل پڑے کافی دور پر جاکر اسے پکڑ پائے وہیں انھوں نے اپنے کپڑے اتار کر اس فقیر کو پہنا دیے، اور خود ننگے بدن واپس آگئے جب احباب نے ان سے دریافت کیا کہ انھوں نے اپنے کپڑے کیا کیے تو انھوں نے جواب دیا کہ "اس فقیر کو دے آیا جو ابھی ادھر سے درد انگیز آواز میں سوال کرتا ہوا گزرا تھا میں نے دیکھا کہ وہ سردی سے ٹھٹھر رہا ہے اور کوئی اس کی آواز پر کان نہیں دیتا، مجبوراً مجھے اپنے کپڑے دینے پڑے، آخر وہ بھی انسان ہی ہے افسوس ہے کہ آپ لوگوں میں سے کسی نے اس کی پرواہ نہیں کی اور سب کے سب اس کی آواز خاموشی سے سنتے رہے"

غلام احمد فرقت کاکوروی نے ان کی فیاضی کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

"رفیع احمد خاں صاحب سے ان کے بڑے مراسم تھے اور غالباً تنہا جگر ہی صاحب کی ذات تھی جس نے مرنے کے بعد بھی دوستی کا پورا پورا حق ادا کیا اور جب تک وہ لکھنؤ میں رہے جگر صاحب ان کی مالی اعانت کرتے رہے، جب کبھی وہ لکھنؤ آتے کچھ نہ کچھ ان کے بچوں کو دے جاتے میرا خیال ہے کہ پاکستان میں بھی انھوں نے یہ سلسلہ جاری رکھا ہوگا کیونکہ ان کے ملنے کے معنی ہی یہی ہوتے تھے گونڈہ میں بھی نہ جانے کتنی بیواؤں کی وہ خفیہ طور پر کفالت کرتے، زندگی کے دور میں بھی اور اس دنیا سے کنارہ کش ہونے کے بعد بھی"[۱]

شوق مرادآبادی نے بھی ایک واقعہ لکھا ہے کہ ان کے مرادآباد کے ایک پرانے ساتھیوں میں ایک خوش مزاج قسم کے شاعر تھے اور مرادآبادی کام کی فنکاری ان کا ذریعہ معاش تھا لیکن بڑھاپے کی وجہ سے انکی مزدوری گھٹ گئی اور وہ پریشان

۱؎ "فروغ اردو" فروری ۱۹۶۲ء ص ۱۷

رہنے لگے تو جگرؔ نے اپنا مستقل رویہ کر لیا تھا کہ جب مراد آباد جاتے تو ایک ایسی معقول رقم کا بندوبست کر کے لے جاتے جو اکثر ان کے لیے انکی دوسری آمد تک کار آمد ہوتی۔

جگر صاحب اپنے احباب پر طرح طرح سے روپیہ خرچ کرتے رہتے تھے جب سے ان کے دوست بھی ان کو منع نہ کر پاتے تھے، مثلاً جب وہ کسی دوست سے ملنے اس کے گھر جاتے تو اس کے بچوں کے لیے مٹھائی لے جاتے گھر پہونچ کر بچوں میں مٹھائی بھی بانٹتے اور پیسے بھی اور کبھی کبھی تو اپنے سے کم عمر احباب کے دوستوں کی بیویوں تک کو روپیے دیتے اور جب کوئی ان کی اس بات پر تعجب کرتا تو اس کی حیرت کو یہ کہہ کر دور کر دیتے کہ "یہ منھ دکھائی کے روپیے ہیں"۔

فناؔ نظامی نے راقم الحروف سے ۲ مئی سنہ ۶۳ء کی ایک ملاقات میں بتایا کہ جگر صاحب کی دعوت کرنا ان کو لوٹنے کے مترادف تھا کیونکہ اگر انکی دعوت کر کے کوئی انکے اوپر دس روپیے خرچ کرتا تو وہ اس کے بیوی بچوں پر پچاسوں روپیے مختلف بہانے کر کے خرچ کر دیتے، فناؔ نے کہا کہ اسی وجہ سے وہ انکی دعوت نہیں کرتے تھے پھر بھی وہ کبھی کبھار ان کے مکان پر پہونچ کر انکی بیوی اور بچوں کو کچھ نہ کچھ روپے ضرور دے جاتے اور اگر وہ ان کو منع کرتے تو جگر صاحب ان سے کہتے "آپ سے کیا مطلب"؟ میرا جو جی چاہتا ہے میں کرتا ہوں اس طرح سے وہ ٹوکنے والوں کی زبان پر مہرِ خاموشی ثبت کر دیتے تھے،

ان کی فیاضی کے متعلق تمکینؔ قریشی نے ۱۲ ستمبر سنہ ۶۲ء کی ایک ملاقات میں راقم الحروف سے بتایا کہ جگرؔ کو روپیوں سے کوئی محبت نہ تھی ان کے ایک نیاز مند اکثر ان کے پاس آتے اور کہتے کہ حضور! اب کی فلاں کاروبار کرنے کا ارادہ ہے لیکن کیا کروں کہ پیسے نہیں ہیں اس کاروبار کیلیے پانچسو روپے چاہئیں، اور جگر صاحب ان کو اکثر و بیشتر تین تین سو اور چار چار سو روپے دیتے رہتے جس کی واپسی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

انھوں نے بتایا کہ جب جگرؔ کو ساہتیہ اکاڈمی سے پانچ ہزار روپیوں کا انعام ملا تو انھوں نے دہلی سے اپنے ایک دیرینہ دوست کی لڑکی کی شادی کے لیے کئی سونے کی زیورات اور بیش قیمت کپڑے خرید لیے اور شادی میں ان کو بطور تحفہ کے پیش کیے اسی طرح دوسرے احباب کے لیے بھی تحفے تحائف خرید کر تین ہزار روپے خرچ کر دیے اور گونڈہ پہنچتے پہنچتے ان کے پاس صرف دو ہزار روپے رہ گئے۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں برہان پور میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں ان سے اور ادیبؔ سہارنپوری سے پہلی ہی دفعہ ملاقات ہوئی اسی مشاعرہ میں ادیبؔ کی جیب سے ان کے مشاعرے کی ملی ہوئی رقم ڈیڑھ سو روپیوں پر کسی نے ہاتھ صاف کر دیا۔ اور جب جگرؔ کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے ادیبؔ کو بلایا اور اپنا پرس ان کی جانب بڑھا کر کہا کہ وہ اپنی ضرورت کے روپے اس میں سے نکال لیں۔

خواجہ مسعود علی ذوقی نے شعراء کی امداد کے سلسلے میں جگر کی ۱۹۲۳ء کی فیاضی کے متعلق لکھا ہے:۔

"وہ اسقدر فیاض ہیں کہ بعض مشاعروں کو کامیاب بنانے کے لیے وہ اپنی غزلیں دوسرے لوگوں کو دے ڈالتے ہیں اور پھر غزلیں بھی کیسی معمولی نہیں بلکہ ایسی مکمل کہ جس کا ایک ایک شعر موتیوں میں تولنے کے قابل ہوتا ہے" (۱)

جگر صاحب کے بعد خطوط سے بھی انکی فیاضی کا پتہ چلتا ہے یہاں صرف ان خطوط سے کچھ اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں جن سے انکی فیاضی پر روشنی پڑ سکے

وہ اپنے ۱۹۲۵ء کے ایک خط میں تسکین قریشی کو روپیہ کے متعلق لکھتے ہیں "اب اس کی قدر ضرور کرنے لگا ہوں محض اسلیئے کہ اس کے ذریعہ بہت سے حقوق جو میرے ذمہ عائد ہوتے ہیں ادا ہو جاتے ہیں" (۲)

اور تسکین ہی صاحب کو ۱۹۲۶ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

"گونڈہ میں "اصغر ہائی اسکول" کے نام سے ایک درسگاہ قائم کیگئی تھی جو انفرادی خود غرضیوں کا شکار ہو گئی، زاں بعد ایک دوسری درسگاہ "اصغر رفاہ عام اسکول" کی بنیاد ڈالی گئی اب اسکا تمامتر بار میرا اوپر ہو اسی سلسلے میں بنارس کے لیے پابہ رکاب ہوں کانپور میں بھی ایک عظیم الشان مشاعرے کی تحریک بھی بار آور معلوم ہوتی ہے یہ مشاعرہ نومبر میں ہوگا تاریخ کا تعین ابھی نہیں ہو سکا اس ذریعہ سے جتنی بھی آمدنی ہوگی نذر اسکول سمجھی جائیگی" (۳)

حبیب احمد صدیقی کو ۲۰ مارچ ۱۹۳۲ء کے خط میں (جو صدیقی صاحب کے پاس محفوظ ہے) لکھتے ہیں:۔

"بھائی اس زمانے میں کہ ہر شخص ضرورتمند ہو اور میری ضرورتیں تو تنہا میری ہی ضرورتیں نہیں ہیں بلکہ کئی خاندانوں کی خدمت میرے ذمہ ہو صرف اپنی کاہلی کی بنا پر اپنا نقصان خود کرتا رہتا ہوں"

اور حمید صدیقی کے ایک خط میں (جس پر تاریخ درج نہیں ہے اور وہ خط حمید صدیقی صاحب کے پاس محفوظ ہے) لکھتے ہیں۔

"خود مجھے موجودہ منہمک زندگی کسی طرح گوارہ نہیں لیکن محض ایک خیال ہے جو ابھی تک یہ سب گوارا کیے ہوئے ہے اور اس طرح چند مستحقین کی کچھ خدمت کر گزرتا ہوں اور اس خدمت کو ایسا سمجھتا ہوں کہ جیسے میری گذشتہ زندگی کی کچھ تلافی اس ذریعہ سے ہو رہی ہے"

جگر صاحب کی فیاضی کے سلسلے میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم لکھتے ہیں کہ جگر صاحب

"تقسیم ہند سے پہلے بھی گاہے گاہے انجمن کی امداد کرتے رہتے تھے جب دہلی آتے تھے تو دو سو روپے انجمن کو ضرور امداد دے جاتے تھے تقسیم کے بعد بھی انھوں نے یہ روایت ترک نہیں کی یہاں بھی انھوں نے انجمن کو ضرور یکھ نہ کچھ دیا کراچی سے واپس جانے لگتے تو مجھ سے ایک بار پھر ملنے کے لیے آئے یہاں انجمن ترقی اردو کالج کے میدان میں انھوں نے ایک مشاعرہ بھی کروایا تھا یہ ۱۹۵۷ء کا ذکر ہے۔

---

(۱) "مرقع" جون ۱۹۳۰ء ص ۳۲ ، (۲) "مکاتیب جگر" ص ۲۹ ، (۳) "مکاتیب جگر" ص ۵۰

اس مشاعرے کی تمام آمدنی انھوں نے انجمن ترقی اردو کالج کو دے دی تھی یہ بہت بڑا ایثار تھا اور وہ ایسے ایثار سے کبھی گریز نہ کرتے تھے ۔[1]

جب جگر کے دورِ سرشاری میں ان کے دلی اور لکھنؤ کے قیام میں ان کو مشاعرہ میں شرکت کی دعوت دی جاتی تو وہ اس دعوت کو اس شرط پر قبول کرتے تھے کہ فیس بلائے شرکت مشاعرہ انھیں نہ دی جائے بلکہ جامعہ ملیہ یا ندوۃ العلماء کو اتنی ہی رقم کا چندہ بھیج دیا جائے یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جگر صاحب کی شہرت اور ہر دلعزیزی کافی بڑھ چکی تھی ۔

جگر صاحب کی فیاضی کا ایک واقعہ لاہور کے ایک پبلشر سے متعلق ہے ۔ ہوا یہ کہ ایک پبلشر صاحب جگر صاحب کے پاس بہت آتے تھے کچھ دنوں کے بعد انھوں نے جگر صاحب سے ان کی کوئی کتاب چھاپنے کو مانگی جگر صاحب نے ان پر ترس کھا کر اپنی ایک کتاب ان کو چھاپنے کے لیے دے دی ناشر نے جگر صاحب کے کلام کی ترتیب بدل کر اسے چھاپا جس سے جگر صاحب کو افسوس ہوا ناشر نے اس کتاب سے خوب فائدہ اٹھایا ۔ لیکن جگر صاحب سے ملاقات ہونے پر ہمیشہ یہی کہتا رہا کہ ادبی کتاب بہت کم بکتی ہے اس میں ناشر کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا ۔

چند مہینوں کے بعد ایک دن انارکلی میں جگر صاحب کی جیب سے گیارہ سو روپیہ کا بٹوہ نکل گیا اب ان کو روپیے کی شدید ضرورت پڑی چنانچہ انھوں نے ناشر کے پاس جاکر سارا واقعہ بتایا اور رائلٹی طلب کی لیکن ناشر صاحب پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا ، انھوں نے پھر اپنی پریشانیاں بیان کیں اور وہ خود ضرورتمند بن گئے ، جس پر جگر صاحب الٹے شرمندہ ہوئے کہ انھوں نے ایک ضرورتمند سے اپنی ضرورت کا اظہار کیا ۔ اسی زمانے میں چند دنوں کے بعد ان کو کہیں سے ایک ہزار روپیے مل گئے تو جیسا کہ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھا ہے :-

"اس رقم کو لے کر وہ سب سے پہلے اپنے ناشر کے پاس پہنچے اور کہا کہ آپ آجکل پریشان ہیں آپ کو روپے کی ضرورت ہے میرے پاس ایک جگہ سے کچھ رقم آگئی ہے سوچا یہ رقم آپ کو دے دوں ۔" "یہ رقم لے لیجئے" "میں اسی وقت اسی مقصد سے آپ کے پاس آیا ہوں" یہ سن کر ناشر کے تو ہوش اڑ گئے غیرت سے پانی پانی ہو گیا ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے رقم لینے سے انکار کر دیا ۔ اور یہ کہا کہ اب حالات کچھ بہتر ہو گئے ہیں ایک جگہ سے کچھ روپیہ قرض مل گیا ہے"[2]

ایک دفعہ جگر صاحب کے ایک عقیدتمند لیکن بد باطن دوست ان کے ساتھ تانگے میں جا رہے تھے اس عقیدتمند نے جگر کی جیب سے بٹوہ جس میں کافی رقم تھی نکال لیا جگر صاحب نے اس کو یہ حرکت کرتے ہوئے

---

[1] "نظام جدید" ۱۶ و ۲۳ ستمبر ۱۹۶۲ء ص ۲ ، [2] "دہم قلم" کراچی سالگرہ نمبر ۱۹۶۱ء ص ۲۴

دیکھکر نگاہیں پھیر لیں اور جب تانگے سے اترے تو شرمندگی کے لہجے میں دوست سے بولے کہ ان کا بٹوہ کہیں رہ گیا ہے اسلئے وہ تانگے کا کرایہ ادا کرنے کے لیے کچھ پیسے ادھار دیدیں جب یہ واقعہ جگر کے ایک دوسرے دوست کو معلوم ہوا تو بقول اویس احمد اعرابی وہ جگر صاحب کے چور دوست سے استفسار کرنے کے لیے تیار ہوئے لیکن جگر نے ان سے کہا کہ آپ ایسا کریں گے تو میں خودکشی کر لوں گا ...... جگر صاحب کے کوئی اولاد نہ تھی، اسلئے جو کچھ کمایا عزیزوں کی ذات پر بے دریغ خرچ کیا اور ان کو دکھ رہا کہ وہ اپنے حوصلوں کے مطابق ان کی خدمت نہ کر سکے، ان کو معلوم ہوتا کہ ان کے کسی عزیز کو کوئی معمولی ضرورت آپڑی ہے تو اسکو اپنے یہاں بلاتے اور علیحدہ کمرے میں لے جاتے اور چپکے سے ایک رقم دیکر کہتے کہ کبھی اسمیں تکلف نہ کرو مجھ کو ضرورت ہوگی تو میں تم سے لے لوں گا اس وقت تم کام چلالو" اور رقم دیدیتے پھر واپسی کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا"۔[۱]

جگر صاحب کے علالت کے زمانے میں گونڈہ میں ایک مشاعرہ ہوا، مشاعرے کے دوسرے دن بعض شعراء ان سے ملنے گئے اور بتایا کہ مشاعرہ والوں نے ان کو کرایے کے روپیے نہیں دیے تو جگر صاحب نے ان سب کو بیس بیس روپیے کرایہ کے دیے لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ ان سب کو مشاعرہ والوں سے بھی پیسہ مل چکا تھا۔

قیسی الفاروقی نے ان کے آخری ایام کی فیاضی کے متعلق ایک واقعہ لکھا ہے کہ

"جب جون ۱۹۶۰ء میں بمبئی سے واپسی پر ان کی حالت خراب ہوئی ہے تو ایک دن مجھے اندر بلاکر فرمایا کہ میرے پاس جو کچھ ہے اسے تقسیم کر دیجیے میں نہیں چاہتا کہ میرے بعد میرے بھائی اور میری بیوی میں کسی قسم کی الجھن ہو میں نے ہر چند منع کیا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے آپ فکر نہ کریں مگر ان کے اصرار سے مجبور ہو کر میں نے بینک سے روپے نکلوالیے کل رقم چھ ہزار تھی جو میرے ہی اصرار سے جمع کر دی گئی تھی میں نے تین ہزار روپیے بیگم صاحبہ اور ڈیڑھ ہزار روپیے مظفر صاحب کے سامنے اور ڈیڑھ ہزار روپے جگر صاحب کے سامنے رکھ دیے کہ میرے حساب سے یہی تقسیم مناسب معلوم ہوتی ہے۔ حضرت جگر نے فرمایا کہ میں کیا کروں گا یہ بھی انھیں لوگوں میں تقسیم کر دیجیے"۔[۲]

قیسی الفاروقی نے ۱۵ جولائی ۱۹۶۲ء کی ایک ملاقات میں راقم سے بتایا کہ جگر صاحب شاعروں کی آمدنی کا بیشتر حصہ احباب اور غرباء پروری پر خرچ کرتے تھے غریبوں کی امداد وہ اپنی بیگم اور گھر کے دوسرے افراد سے بھی چھپا کر کرتے رہتے تھے، وہ باہر سے جب کوئی خاص رقم لاتے تو اس کا کچھ حصہ گھر والوں سے چھپا کر اپنے سرہانے رکھ لیتے اور وقت ضرورت جب کوئی حاجتمند پہونچتا تو وہ اس سے

---

[۱] ماہنامہ شبلی کالج میگزین ۱۹۶۰ء اعظم گڑھ ص ۷۰ [۲] "حیات جگر" از قیسی الفاروقی (غیر مطبوعہ)

اس کی امداد کرتے رہتے تھے۔

تمکین قریشی نے راقم الحروف سے ۱۹۶۲ء کی ایک میں بتایا کہ جگر کے ایام آخر میں تو کچھ دنوں تک لوگ ان سے روپیہ مانگ کر لیتے تھے لیکن بعد کو ان کے بٹوے یا جیب سے اس طرح روپیہ نکال لینے لگے گویا کہ وہ روپئے انھیں کے ہیں اس لیئے جگر صاحب سے اجازت کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ جگر صاحب بھی ایسے احباب کو نہیں ٹوکتے تھے اور جب کبھی اس کے متعلق کوئی بات ہوتی تو کہتے کہ ضرورت مند ہوں گے جب ہی تو یہ لوگ روپیے مانگتے اور لے جاتے ہیں ورنہ کیوں مانگتے اور لے جاتے اس زمانے میں تو وہ اپنی ایک ایک چیز لٹاتے تھے جو شخص بھی ان کی کوئی چیز ان سے مانگتا اسے بطور یادگار کے دیدیتے تھے۔

حب الوطنی

جگر صاحب کا جذبۂ وطن دوستی اور ان کے حب الوطنی کے ترانے درحقیقت ہمارے لیے درس عمل اور مشعل راہ ہیں انھوں نے ایک سچے اور مخلص وطن پرست کی حیثیت سے ہمیں چمن کے گلوں کے ساتھ ساتھ کانٹوں سے بھی محبت کرنے کا درس دیا انھوں نے نہ صرف ارباب وطن کو بلکہ وطن کے ان رہنماؤں کو بھی جن کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور ہے وطن پرستی اور وطن میں ہر جگہ بہار لانے کا درس دیا۔ جہاں ان کو ان سیاسی چالوں سے اختلاف ہوا وہاں انھوں نے فوراً اس کا اظہار بھی کر دیا ہے

بازیچۂ ارباب سیاست سے گذر جا ‏ ‏ ‏ ‏ اس کارگہہ مکر و ضلالت سے گذر جا

جس طرح گاندھی جی کا اصرار (بقول جواہر لال نہرو) "بس خلوص اور قربانی پر" تھا اسی طرح جگر بھی وطن کی ترقی کے لیے خلوص اور قربانی پر اصرار کرتے تھے اس نظریئے کے تحت انھوں نے ملک میں فسادات اور افراتفری کی طرف توجہ دلاتے ہوئے وزیر اعلیٰ (غالباً وزیر اعلیٰ یوپی) کو ایک خط لکھا ہے جس میں انھوں نے وزیر موصوف کو خلوص و ایمانداری کے ساتھ انصاف کی طرف متوجہ ہونے کے لیے لکھا ہے خط طویل ہے لیکن پورے خط سے اس زمانے کے سیاسی حالات اور خلوص و صداقت اور حب الوطنی کا پتہ چلتا ہے اس لیے یہاں وہ خط من و عن نقل کیا جاتا ہے تاکہ یہ اندازہ کیا جا سکے کہ جگر صاحب کی حب الوطنی میں کس قدر خلوص تھا وہ لکھتے ہیں :۔

"عالیجناب ! غالباً آپ کو یاد ہوگا کہ میں ایک ڈیپوٹیشن کے سلسلے میں آپ کی خدمت میں باریاب ہو چکا ہوں مجھے اپنے چند جملے یاد ہیں نامناسب نہ ہوگا اگر انھیں دہرا دوں میں نے عرض کیا تھا کہ انصاف کرنا حقیقتاً مقصود ہو تو انصاف دور نہیں" "انصاف" کا مطالبہ انصاف کی توہین ہے" صرف انصاف و مساوات محض بطور فریب یا دکھاوے کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں تو ... مجھے بجز اس کے اور کچھ کہنا نہیں کہ آج اگر ایک طبقہ ..... بے بس اور بے دست و پا ہو کر مظالم برداشت کیا کیا تو اس کا لازمی

نتیجہ نفرت ہوگی معمولی معمولی سے تاثرات دل و دماغ پر اپنے نقوش چھوڑ جاتے ہیں یہ نقوش ابتداً چھوٹے چھوٹے واقعات و حالات میں بستے رہتے ہیں۔ اور پھر چھوٹے چھوٹے واقعات ہی رفتہ رفتہ بڑے بڑے حادثات انقلابات کی صورت اختیار کر لیا کرتے ہیں دیکھنا یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی سے کس جذبہ اور کس قسم کی فکر و نظر کی پرورش کر رہے ہیں ظاہر ہے کہ جب کسی قوم میں من حیث القوم نفرت راسخ ہو جاتی ہے تو پھر اس کا تبدیل کرنا دشوار ہو جاتا ہے لیکن اگر کسی لفظی طلسم کاری سے یکسر ہٹ کر اپنی صاف و سادہ اور بے لوث زندگی سے واقعتاً اپنے مفید اور مفید تر ہونے کا ثبوت دیتے رہیں تو بالکل ہی ناممکن ہے کہ اس کا رد عمل خوشگوار اور دیرپا نہ ہو حسن سلوک بجائے خود حسن سلوک کی ضمانت ہوا کرتا ہے آج بھی کہ واقعات ناقابل برداشت حد تک گزرتے چلے جا رہے ہیں میں صاف الفاظ میں صرف انھیں چند جملوں پر اکتفا کرتا ہوں الیقین ہے کہ آپ جیسے سیاست داں اس اجمال میں اس کی تفصیل خود بخود محسوس کر لیں گے

میں بڑی حد تک موجودہ صورت حال سے مایوس ہوں، اس حالت میں ضرورت نہ تھی کہ یہ عذر بھی عرض کیا جاتا لیکن میں بحیثیت انسان، اور بحیثیت شاعر اب اور زیادہ سکوت ایک عمل مجرمانہ محسوس کرنے لگا ہوں صرف ادائے فرض میرا مقصد ہے آپ کو اس طرح کے یقین دلانے کی ضرورت نہیں کہ میں واقعتاً اپنے وطن کو بڑی سے بڑی حد تک عزیز رکھتا ہوں اور صحیح معنوں میں اس کا خیر طلب ہوں اور میری زندگی اور اس کے حالات شہادت کامل ثابت ہو سکتے ہیں اگر نیک دلی اور وسعت فکر و نظر سے جائزہ لیا جا سکے۔

اس وقت چند خیالات و تاثرات نے پھر مجبور کر دیا کہ انھیں بھی پیش کر دوں شاید آپ ان پر پوری طرح توجہ کریں اور سمجھیں کہ اس طرح نہ صرف یہ کہ آپ کی حکومت رسوائے عالم ہو رہی ہے بلکہ کانگریس کا وقار بھی رفتہ رفتہ زوال پذیر ہوتا جا رہا ہے میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ عام طور پر "مسلمان" اپنے آپ کو خصوصاً صوبہ یو۔پی میں ہر اعتبار پر غیر محفوظ سمجھنے لگے ہیں، حکومت کی عدالتوں پر سے ان کا اعتماد اٹھتا چلا جا رہا ہے اور جو کچھ برائے نام نامی رہ بھی گیا ہے، اگر حالات کی رفتار یہی رہی تو وہ بھی اٹھ جائے گا، مسلمانان بھارت کے یہ احساسات کہ ان کے خون کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں رہ گئی اور یہ کہ ان کا مسلمان ہونا ہی ان کا سب سے بڑا جرم ہے نہ صرف اکثریت کے لیے قابل شرم و ملامت ہے بلکہ خود حکومت کے لیے بھی۔

میری حقیر رائے ہے کہ صورت حال یکسر بدل سکتی ہے بشرطیکہ ارباب حکومت بلند اور بلند تر انسان بننے کی کوشش کرتے رہیں اور تنہائیوں میں وسعت فکر و نظر کے ساتھ اپنی زندگیوں کا جائزہ لینے کے بعد اپنی اصلاح کی جانب مضبوط ارادہ کے ساتھ مائل ہو جائیں ان کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ حق و صداقت، انصاف و دیانت کی موافقت میں عملاً نہایت درجہ جری اور

بہادر انسان بن جائیں۔ "مصلحتوں" کی خاطر حق و صداقت کا خون روا نہ رکھیں، عزم و استقلال کے کوہ گراں بن جائیں۔ اور پھر جلد ہی انھیں معلوم ہو جائے گا کہ جس دنیا کو انھوں نے اپنے ہی اعمال سے جہنم بنا رکھا تھا آناً فاناً کس طرح جنت زار بن (سکتی ؟) گئی ہے"۱؎

میں عملاً سیاسی آدمی نہیں بلکہ مجھے سیاست سے ایک طرح کی نفرت بھی ہے لیکن عملی طور پر میں حالات و تغیرات سے کبھی غافل نہیں رہتا اگر میرے مشوروں کو شرف قبولیت عطا کیا گیا تو میں آئندہ بھی اس طرح کی جرأت کرتا رہوں گا، صرف اسلیے کہ میں اپنے وطن کو صحیح معنوں میں بہت بلند مرتبہ پر دیکھنے کا آرزومند ہوں، یقیناً باتیں کچھ تلخ سی ہیں لیکن تلخیاں ہی اکثر مفید بھی ہوا کرتی ہیں۔ بشرطیکہ انھیں گوارہ بھی کیا جا سکے میرا ایک حقیر لیکن بہت ہی اہم اور قابل غور مشورہ یہ بھی ہے کہ "کانگریس" سے بہترین اصلاح یافتہ اور پاکیزہ اخلاق افراد کی ایک جماعت سیاست سے قطعاً جدا ہو کر اخلاق عامہ کی اصلاح کی جانب نہایت خلوص اور سرگرمی کے ساتھ متوجہ ہو جائے۲؎ میں بلند و برتر "اصولوں" کا مطلق قائل نہیں بلکہ (بلند تر۳؎) بلند و برتر مقاصد کیساتھ بلند و برتر انسانوں کو اصل چیز سمجھتا ہوں۔

میرا مقصد ہے کہ "انقلاب آزادی" اخلاق عامہ کی صحت و توانائی کی صورت میں رحمت و رافت ہوا کرتا ہے لیکن جب اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ بھی مریض اور کمزور ہو تو صرف ایک عذاب ہو کر رہ سکتا ہے۔ "جگر"۴؎

اگرچہ وہ عملاً سیاسی آدمی نہیں تھے جیسا کہ ان کے مندرجہ بالا خط سے ظاہر ہوتا ہے۔ پھر بھی سیاست کے مکر و فریب کو بخوبی سمجھتے تھے، وہ وطن کے نہ صرف سیاسی بلکہ سماجی اور معاشی حالات سے بھی باخبر تھے لیکن ایک مخلص وطن پرست کی حیثیت سے وہ اپنے دور کی سیاست۵؎ اور سماج میں کچھ ضروری تبدیلیاں کرنا چاہتے تھے، اور یہ تبدیلی صرف خلوص نیت کی چاہتے تھے لیکن افسوس کہ ان کے اس پیغام پر آج تک عمل نہ ہو سکا،

جگر صاحب کو اپنی قوم کی بے شعوری پر بھی افسوس رہتا تھا اور کہتے تھے کہ "بہت افسوس ہوتا ہے جب یہ سوچتا ہوں کہ ایسی بے شعور قوم میں پیدا ہوا ہوں بے شعور نہیں بدشعور کہیئے"۶؎

وہ اپنے آخری زمانے میں وطنیت اور قومیت کو ناپسند کرنے لگے تھے۔ کیونکہ ان کی نظر میں وسعت پیدا ہو گئی تھی، اسلیے وہ اس کے لیے کوئی حد نہیں مقرر کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ اسکا اظہار بھی کیا ہو کہتے ہیں کہ

۱؎ جگر صاحب سہواً "سکتی" لکھ گئے ہیں راقم کے خیال میں "گئی" ہونا چاہیئے۔ ۲؎ ۱۹۶۳ء میں کامراج پلان جسکے تحت وزیراعظم بخشی غلام محمد وزیراعلیٰ پنجاب پرتاب سنگھ کیروں اور وزیراعلیٰ یوپی سی بی گپتا وغیرہ اپنے عہدوں سے مستعفی ہو کر محض اصلاحی کاموں کے لیے مستعفی ہوئے۔ ۳؎ جگر صاحب سہواً "بلند تر" لکھ گئے ہیں راقم کے خیال میں "بلند و برتر" ہونا چاہیے۔ ۴؎ یہ خط راقم کو حمید صدیقی صاحب کی عنایت کی ہوئی جگر کی ایک بیاض میں لکھا ہوا ملا۔ ۵؎ وہ ان کے مندرجہ بالا خط میں سے صرف ایک رائے یعنی کانگریس کی ایک جماعت کا سیاسی عہدوں کو چھوڑ کر اخلاق عامہ کی اصلاح میں لگ جانا، نے تقریباً پندرہ سال کے بعد عملی جامہ پہن لیا جو کامراج پلان کے نام سے مشہور ہے۔ ۶؎ "یاد جگر" ص۹۱

"واقعہ کانپور کے متعلق جو نظم ہے وہ بیشک، بالکل بے اختیارانہ طور پر لکھی گئی ہے۔
لیکن اس میں ایک لفظ ایسا آگیا ہے جس کے مفہوم کی محدودیت پر مجھے اکثر تاسف رہا وہ لفظ
"مادر وطن" ہے میں وطنیت اور قومیت دونوں کو سخت ناپسند کرتا ہوں ناظرین میں سے
کسی کو اللہ اگر توفیق عطا فرمائے تو انھیں میری طرف سے قطعاً اجازت ہے کہ وہ اس کو
صحیح کر دیں" (۱)

جگر صاحب نے ایک دوسرے موقع پر بھی اپنے اس خیال کی وضاحت کی ہے کہ
"میں کسی محدود وطن کے تصور کا حامی نہیں ہوں۔ میں ساری دنیا کو اپنا وطن سمجھتا ہوں میرے
نزدیک مصنوعی حد بندیاں کوئی معنی نہیں رکھتیں" (۲)

وہ اپنے آخری ایام میں ذات پات قوم و نسل اور فرقوں کی تفریق سے بالاتر انسان ہو گئے تھے اور
تمام نوع انسان سے محبت کرنے لگے تھے، اور وہ اپنی —— محبت کو عام کرنا چاہتے تھے ؎

جگر کی ہے زندگی محبت، نہیں ہے اسکو کسی سے نفرت ÷ جگر کے دل میں ہے سبکی عزت جگر ہر یار دکھایا اب بھی
محبت، محبت، محبت، محبت ÷ جگر بس یہی گیت گاتا چلا جا

انھوں نے ہمیشہ محبت ہی کے گیت گائے ان کو گلوں سے ہی نہیں کانٹوں سے بھی نباہ کرنا پڑا لیکن اپنا
طرز محبت نہیں بدلا، کیونکہ وہ ایک سچے گلشن پرست تھے۔ (۳)

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز ÷ کانٹوں سے بھی نباہ کیے جا رہا ہوں میں

ان کی محبت میں وسعت اور وطنیت و قومیت کی مخالفت کا جذبہ زمانۂ پیری میں آیا اس سے
پہلے تو کٹر اور نڈر ہندوستانی قوم پرست تھے اور صرف ہندوستان سے والہانہ محبت کرتے تھے۔
چنانچہ انگریزوں کے دور حکومت میں جب لکھنؤ میں قیصر باغ بارہ دری میں "وار فنڈ" کے لیے مشاعرہ
ہوا تو انھوں نے اسی ہندوستانی قومی جذبہ کے تحت اپنی نظم "قحط بنگال" بڑی جرأت کے ساتھ
پڑھی، حتیٰ کہ یہ شعر ؎

صیاد نے لوٹا تھا عنادل کا نشیمن ÷ ÷ صیاد کا لٹتے ہوئے گھر دیکھ رہا ہوں

بھی پڑھ دیا اور اپنے اس اقدام کے نشیب و فراز کی ذرا بھی پرواہ نہ کی،
اسی جذبے کے تحت انھوں نے کانپور، بمبئی، چھپرا، دہلی، دہرہ دون، نواکھالی اور بہار میں
قتل عام کی سنسنی خیز وارداتوں، انسانیت فروش خود غرضیوں اور حیا سوز تباہ کاریوں سے متاثر ہو کر
ایسے اشعار بھی کہے۔

---

(۱) "تذکرہ جگر" ص ۱۹۸، "جام نو" جنوری ۱۹۶۱ء ص ۵۳،

چشم کشاد جانب رزم گہہ وطن جگر ٭ ٭ ٭ مقتل کا نور ہیں لاشہ ہے بے کفن نگر ! !
حکومت کے مظالم ربھی ان آنکھوں نے دیکھے ہیں ٭ جگر ہم بھی اُس کو حسیں قاتل سمجھتے ہیں
آنکھیں ابھی کچھ اور بھی ہیں منتظر جگر ... پھر اکی قتل گاہ کا منظر لیے ہوئے
دہلی و دہرہ دون دکھا گیا دیہار ... انساں ہے اور ماتم انساں ہے آجکل
اور انھوں نے ابنائے وطن کی رگ حمیت کو بھی ٹٹول کر کہا ہے

پرائے ہاتھوں جینے کی ہوس کیا ... نشیمن ہی نہیں تو پھر قفس کیا
کرم صیاد کے صدہا ہیں پھر بھی ... فراغ خاطر اہل قفس کیا
قفس سے ہے اگر بیزار بلبل ... تو پھر یہ شغل تزئین قفس کیا

احباب کو وطن کی حقیقت کا احساس دلاتے ہیں اور اغیار پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں

صیاد کی نظر میں وہ نشتر سے کم نہیں ... اک لرزش خفی جو مرے بال و پر میں ہے

اور جب قوم بیدار ہونے لگی تو انھوں نے کہا سه

ابھی اک جرم پر اغیار میں بر پا قیامت ہے ... کہ ہم بیدار ہیں اور اپنا مستقبل سمجھتے ہیں

وہ اپنی حب الوطنی کو کسی کی حب الوطنی سے کم نہیں سمجھتے تھے سه

پھولوں کو ناز حسن اگر ہے تو ہو جگر ... کانٹے بھی ہیں غرور گلستاں لیے ہوئے

پھر جب پاکستان بنا تو ہندوستان کے تمام مسلمان رؤسا و امراء شعراء و ادیب اور اہل ہنر پاکستان جانے لگے کیونکہ یہاں کے روح فرسا حالات و حادثات کیوجہ سے بظاہر مسلمانوں کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی اور ان کو عرصۂ حیات تنگ نظر آنے لگا تھا۔ اسلئے ان جانیوالوں میں لیگ اور پاکستان کی مخالفت کرنیوالے اور قوم و ملک و وطن سے بے اندازہ محبت کرنے والے لوگ بھی پاکستان چلے گئے، جگر کے بہت سے احباب بھی پاکستان منتقل ہو گئے جس کا انھیں بیحد افسوس رہا اور اس افسوس کا اظہار انھوں نے اپنے ہندوستانی احباب کے خطوط میں کیا، مثلاً حمید صدیقی کو ایک خط (جسپر تاریخ درج نہیں ہے اور خط انھیں کے پاس محفوظ ہے) میں لکھتے ہیں۔

"حمید صاحب! احباب ہیں کہ پاکستان سدھارے چلے جا رہے ہیں اور ہم ہیں کہ تنہا رہے جاتے ہیں بیان نہیں کرسکتا کہ اب یہ تصور کس حد تک اذیت آفریں بن گیا ہے اور خدا جانے کہاں تک بنتا چلا جائے بہر حال احباب جہاں رہیں خوش رہیں"

اسی زمانے کے ۱۹۴۸ء کے خط میں تسکین قریشی کو لکھتے ہیں:-

"آجکل جسمانی تکالیف کم ہیں لیکن روحانی اذیتیں بڑھتی چلی جا رہی ہیں جس طرف دیکھیے احباب ہیں" پاکستان" چلے جا رہے ہیں میں ہوں کہ شدید طور پر اس تنہائی سے تنہائی محسوس

کر رہا ہوں "تنہائی" کس قدر اذیت آفریں ہو سکتی ہے یہ حقیقت اب کھلتی جاتی ہے"۔ ۱۰

جگر نے ۱۹۴۸ء کے پُر آشوب زمانے میں گونڈہ کے سیاسی حالات کی نزاکت کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"یہاں کے سیاسی حالات نازک سے نازک تر ہوتے جا رہے ہیں دو مسلمان شہید کر دیے گئے، برادران وطن کی گرفتاریاں برائے نام، لیکن مسلمان عام طور پر گرفتار کیے جا رہے ہیں وہ بھی جنکا تعلق عوام سے ہے، وہ بھی جنکا عمائدین میں شمار ہے، ایسی حالت میں غیرت گوارہ نہیں کرتی کہ سب کو چھوڑ کر لکھنؤ چلا آؤں البتہ خود یہاں کے حالات ہی کے متعلق لکھنؤ پہونچنا یقیناً مفید ہو گا، اس لیے ارادہ تو کر رہا ہوں لیکن تین چار دن کے بعد، تاکہ یہاں کے تمام حالات معلوم ہو جائیں یعنی جو کچھ ابتک پس پردہ ہے تا امکان اس کا بھی علم ہو جائے، عام طور پر مسلمانان سخت خوف زدہ اور گھبرائے ہوئے ہیں، بہت سے حضرات گونڈہ چھوڑ چکے ہیں میں نے آج ڈپٹی کمشنر کو ایک خط لکھا ہے شاید کل جواب مل سکے، دل و دماغ پر جو عالم چھایا ہوا ہے آپ خود بھی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں؟" ۱۱

اور جگر صاحب ڈپٹی کمشنر گونڈہ کا جواب پانے کے بعد ۱۹۴۸ء ہی میں گونڈہ کی فضا اور ڈپٹی کمشنر کے رویے کے متعلق لکھتے ہیں ۔۔

"گونڈہ کی فضا بہت خراب ہو گئی ہے یہاں کا ڈپٹی کمشنر شیطان بصورت انسان ہے۔ میں نے اس کے خلاف قدم اٹھالیا ہے یہاں کہ سیاسی جمود ختم ہو رہا ہے ایک وفد کے سلسلے میں رکن کی حیثیت سے یو پی کے وزیر اعظم ۱۲ سے کل ہی مل لیا ہے"۔ ۱۳

اسی زمانے میں ہندوستان کی نزاکت دیکھتے ہوئے جگر کے احباب نے ان کو بھی ترک وطن کا مشورہ دیا، لیکن انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو کس مپرسی کے عالم میں چھوڑ کر جانا گوارا نہ کیا حالانکہ پاکستان میں ان کو ہر طرح کی سہولتیں فراہم کی جا رہی تھیں، اس سلسلے میں انھوں نے ماہنامہ "نقوش" کے مدیر طفیل احمد کو لکھا کہ

"بظاہر مسلمانوں کا ہندوستان میں رہنا مشکل نظر آتا ہے میں اگر پاکستان آنا چاہوں تو میرے لیے بڑی آسانیاں بھی ہیں لیکن جب میں بھی احباب کی طرح سوچتا ہوں تو میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے وہ صرف اسلیے کہ اگر تمام صاحب رسوخ پاکستان چلے گئے تو ان تمام بے سہارا مسلمانوں کا کیا ہو گا جو صرف خدا کی ذات پر بھروسہ کیے بیٹھے ہیں جنکے پاس نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا ہے نہ ایک وقت کی روٹی

۱۰؎ "مکاتیب جگر"، ص ۱۵ ۱۱؎ "مکاتیب جگر"، ص ۶۲، ۶۷ ۱۲؎ جگر صاحب سہواً وزیر اعلیٰ کو وزیر اعظم لکھ گئے ہیں۔
۱۳؎ مکاتیب جگر ص ۶۹

میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جیوں گا تو ہندوستان میں اور مروں گا تو ہندوستان میں ۔؎۱

اور جگر صاحب تا عمر اپنے اس فیصلہ پر قائم رہے

جگر صاحب کے بیشتر احباب نے ان کو پاکستان میں قیام کے سلسلے میں اپنے خلوص و محبت اور علم و آگہی کی پوری قوت کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ وہاں قیام کرنے کے لیے کبھی رضامند نہ ہوئے

ایک دفعہ پاکستان میں جس وقت خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل تھے، جگر صاحب کو حکومت پاکستان کی طرف سے ایک کوٹھی اور تین ہزار روپے ماہوار تاحیات نذر کرنے کی پیش کش کی گئی، لیکن جگر صاحب نے اسے قبول نہیں کیا۔

حاجی اصطفیٰ خاں صاحب جو جگر کے نہایت ہی مخلص احباب میں سے تھے جگر کے پاکستان کے قیام سے متعلق ایک واقعہ لکھتے ہیں:۔

"تقسیم ہند کے بعد جب احباب نے مجبور کیا کہ کراچی تشریف لے آیئے اور حکومت کی طرف سے ہر طرح کی آسانی بہم پہونچانے کا اظہار کیا گیا۔ تو فیصلہ یہ ہوا کہ خاں صاحب پر فیصلہ چھوڑا جائے، چنانچہ وقت مقررہ پر لوگ جمع ہوئے اور مجھے حالات سے مطلع کرتے ہوئے نہایت ہی باریک اشارات کے ساتھ اپنا خیال مجھ پر ظاہر کر دیا جسے لوگ نہ سمجھ سکے ہوں گے، جس کے سننے کے بعد میں مجبور تھا کہ یہی فیصلہ دیتا کہ جگر صاحب کو ہندوستان چھوڑنا مناسب نہیں اور میرے اس فیصلہ سے جو اطمینان اور خوشی آپ کے بشرے سے عیاں تھی اس کا لطف میں نے جو محسوس کیا اب تک وہ چہرہ میرے تصور میں ہے"۔؎۲

جگر صاحب نہ صرف یہ کہ خود ہی پاکستان میں نہیں رہنا چاہتے تھے بلکہ اپنے کسی مخلص کو بھی وہاں قیام کرنے کا مشورہ نہیں دیتے تھے، چنانچہ جب ان سے اور بیگم شیراز سے غالباً ۱۹۵۶ء یا ۱۹۵۷ء میں پاکستان میں ملاقات ہوئی اور انکی ہمشیر (شیراز بیگم) نے ان سے کہا کہ "میں نے پاکستان میں رہنے کا ارادہ کر لیا ہے آپ کی کیا رائے ہے؟ کہنے لگے میں تو ہرگز اس کا مشورہ نہیں دونگا۔ اتنی بڑی جائیداد ہے آپ کی۔ ڈیڑھ دو سو روپیہ ماہوار کی آمدنی ہے آخر آپ کو وہاں کیا تکلیف ہے جو آپ یہاں آنا چاہتی ہیں، یہاں کتنے لوگ ہیں جو مصر ہیں میں یہاں ٹھہر جاؤں لیکن میں یہاں رکنے والا نہیں جب میں نے اپنے ارادہ کا کسی قدر مضبوطی سے اظہار کیا تو کہنے لگے پہلے ہی آپ نے کب میری بات مانی ہے جو اب مانیں گی"۔؎۳

اور ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب حکومت ہندوستان نے ایک مخلص محب وطن پر شکوک و شبہات کرنا شروع کر دیے جس کے متعلق جگر صاحب نے ۱۹۵۸ء کے ایک خط میں لکھا۔

؎۱ "صبح نو" اپریل دہلی ۱۹۶۱ء ص ۱۵ ؎۲ "نظام جدید" ۶ و ۲۲ ستمبر ۱۹۶۲ء ص ۲۱ ؎۳ "نگار" مارچ ۱۹۶۱ء ص ۳۷

"حکومت ہندوستان کے شکوک وشبہات کا مجھے کافی احساس تھا، اور ہے، لیکن مجبوری،
پھر الحمد اللہ کہ سیاست سے اپنا دامن بھی پاک وصاف پاتا ہوں ضمیر کی کمزوری محسوس نہیں کرتا دد محابہ" سے باک ہو تو کیوں؟ .... تاہم مصلحت ناشناس بھی نہیں۔"[1]

حکومت ہندوستان کے شکوک وشبہات کے باوجود جگر صاحب پاکستان آنے پر کبھی آمادہ نہ ہوئے ہمیشہ انھوں نے یہی جواب دیا کہ جب تک بھارت کی حکومت اپنے برتاؤ سے مجھے ہجرت کرنے پر مجبور نہ کر دے میں یہاں آنے کو تیار نہیں ہوں کیوں کہ اگر سب مقتدر مسلمان بھارت چھوڑنے لگیں تو بتلائیے کہ وہاں کے عام مسلمانوں کے دلوں پر کیا گزرے گی اور وہ کس کے سہارے وہاں زندگی گزار سکیں گے۔"[2]

جگر صاحب نہ صرف یہ کہ پاکستان منتقل ہونے کے لیے کبھی رضامند نہ ہوئے بلکہ ایک مرتبہ وہاں بیمار پڑے تو کہنے لگے کہ

"مجھے ایسی تکلیف کبھی نہیں ہوئی تھی میں تو یہ سمجھا کہ اب الوداع ہے مگر یہاں مرنا نہیں چاہتا۔"[3]

ان کی حب الوطنی میں اس قدر خلوص تھا کہ وہ پاکستان میں ہندوستان کی برائی بھی نہیں برداشت کر سکتے تھے، اور جب انھوں نے ایک صاحب کو ہندوستان کی ——— برائی کرتے سنا تو کہنے لگے کہ

"نمک حرام تو بہت دیکھے تھے لیکن وطن حرام آج دیکھا۔"[4]

اور جب ہندوستان کے مہاجر جو پاکستان چلے گئے تھے جب جگر صاحب سے وہاں کی تکالیف کا تذکرہ کرتے تو جگر صاحب کہتے کہ

"یہ وطن حرامی کی سزا ہے"

جگر صاحب نے پاکستان جا کر کبھی ہندوستان کے خلاف کوئی زہر نہیں اُگلا، نہ برا بھلا کہا بلکہ ایک دفعہ پاکستان کے مشاعرہ میں مقامی شاعر کی اس نظم کے خلاف جس میں جہاد کے لیے کشمیر چلنے کی دعوت دی گئی تھی احتجاجاً مشاعرے سے اٹھ کر چلے آئے تھے لیکن انھوں نے کبھی ہندوستان کی خوشامدانہ پالیسی بھی نہیں اختیار کی، نہ کبھی کشمیر کے خیر سگالی کے مشاعروں میں شریک ہوئے بلکہ ہندوستان ہی میں رہ کر "بھاگ مسافر بھاگ" والی نظم کہی جس میں ہندوستان کی ابتری دکھائی گئی ہے، لیکن اس نظم کو انھوں نے

---

[1] "مکاتیب جگر"، ص ۱۲۷، [2و3] "تذکرہ جگر" ص ۵۸، [3] "آجکل" جنوری ۱۹۶۱ء ص ۹ [4] یہ واقعہ راقم الحروف سے تسکین صاحب نے ۱۹ ستمبر ۱۹۶۲ء کی ایک ملاقات میں بتایا تھا!

پاکستان میں کبھی نہیں سنایا، اور جب وہاں ان سے اس نظم کی فرمائش کی گئی تو انھوں نے کہا کہ
وہ وہ اپنوں کی شکایت اپنوں سے تھی اسے غیروں کے سامنے نہیں پڑھ سکتا۔

اسی کتاب "آتش گل" پر جس میں یہ نظم شامل ہے ہندوستان کی ساہتیہ اکیڈمی نے انکو ۵ ہزار روپئے کا انعام دیا جس کو جگر صاحب پاکستان کے لیے درسِ عبرت کہا کرتے تھے، اس انعام کے ملنے پر انھوں نے فرمایا کہ

"میری دنیا صرف محبت ہے، شاعر نفرت کا اہل نہیں ہے۔ مجھے پاکستان میں بہت کچھ دیا جا رہا تھا، مگر میں نے وطن نہیں چھوڑا، میں نے "آتش گل" میں موجودہ نظام پر تنقید بھی کی ہے، سوال یہ نہیں کہ تنقید کیوں کی؟ سوال یہ ہے کہ شاعر اپنے وطن کو کس مقام پر دیکھنا چاہتا ہے اگر شاعر صادق ہے تو اپنے محسوسات کا اظہار ضرور کرے گا، دیکھنا یہ چاہئیے کہ خود شاعر کی زندگی کیا بتاتی ہے، مجھے انعام ملا ہے مجھے مسرت ہے کہ اس سلسلے میں میری کوئی تحریک یا خواہش نہیں تھی۔"[۱]

جگر صاحب حقیقی شاعر تھے انھوں نے جب بھی جو کچھ محسوس کیا اسے بلا خوف و تردد کے کہدیا یہی ان کے خلوص کا ثبوت ہے نہ انگریزی حکومت سے ڈرے نہ تقسیم ہند کے بعد یہاں کی حکومت سے خوف کھایا وہ ہمیشہ بے باکانہ طور پر جو کچھ محسوس کرتے کہتے رہے، جب ملک میں مذہب کے نام پر صف بندیاں شروع ہوئیں تو انھوں نے کہا :

خلوصِ شوق، نہ جوشِ عمل، نہ دردِ وطن
یہ زندگی ہے خدایا کہ زندگی کا کفن

اور جب اپنے وطن میں فرقہ پرستی اور تنگ نظری کے جاں سوز حالات دیکھ کر ان کو بے وطنی کا احساس ہوا تو بڑے افسوس کے ساتھ انھوں نے یہ بھی کہا۔

معاذ اللہ اس کی وارداتِ غم معاذ اللہ
چمن جس کا وطن ہو اور چمن بیزار ہو جائے

آپڑا کچھ وقت ایسا گردشِ ایام سے
زندگی شرما رہی ہے زندگی کے نام سے

آجکل میخانے میں تقسیم ہوتے ہیں جگر
زہر کے ساغر شراب زندگی کے نام سے

بھری بہار میں تاراجیٔ چمن مت پوچھ!
خدا کرے نہ پھر آنکھوں سے وہ سماں گزرے

جب انھوں نے ملک کے سرپرستوں کو بھی اکثریتی فرقہ کی طرفداری کرتے دیکھا تو ان سے برداشت نہ ہو سکا انھوں نے ان سیاستدانوں کا بھی پول کھولنا شروع کیا۔

کہتے ہیں بھائی بھائی ہیں اہلِ وطن تمام
پھرتے ہیں آستینوں میں خنجر لیے ہوئے

---

[۱] "مادرِ وطن" ۱۲ دسمبر ۱۹۵۹ء ص ۶

ان کے حساس دل نے ماحول کی ہر قسم کی تلخی کو محسوس کیا اور اس تلخی سے اکتا کر وہ کہنے لگے ؎

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آجکل — شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آجکل
اس سے تو خودکشی ہی غنیمت ہے اے جگرؔ — وہ مصلحت جو پیشۂ مرداں ہے آجکل

جگرؔ صاحب نے ایسے رہبرانِ قوم بھی دیکھے جو زبان سے گاندھی جی کا نعرہ لگاتے تھے لیکن ان کے دلوں میں چور تھا، جگرؔ صاحب انکی ان چالوں سے باخبر تھے اسی لیے انھوں نے رہبرانِ قوم اور اہلِ وطن دونوں سے کہا کہ ؎

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی — چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی
اگرچہ آزادیٔ وطن کو گزر چکا ایک سال کامل — مگر خود اہلِ وطن کے ہاتھوں فضا ہے ناسازگار اب بھی
اسی کا ہے نام اگر ترقی تو اس ترقی سے باز آئے — کہ خونِ مخلوق سے خدا کی زمین ہے لالہ زار اب بھی
ہمیں ملاکر بھی خاک و خوں میں نہیں ہیں وہ مطمئن ابھی تک — ہماری خاکِ لحد کے ذرے ہیں انکے دامن پہ بار اب بھی
وسیع مسلک، رفیع فطرت، خلوصِ ایماں خلوصِ نیت — انھیں فضائل پہ ہر وطن کے وقار کا انحصار اب بھی

انھوں نے انسان نما درندوں اور دوست نما دشمنوں کو بھی دیکھا ہے ؎

ہندوستاں میں خیر سے ان کی کمی نہیں — لب پر ہیں جو خلوص کا دفتر لیے ہوئے
ظاہر میں اک مجسمۂ امن و آشتی — باطن میں لاکھ فتنۂ محشر لیے ہوئے
کہتے ہیں بھائی بھائی ہیں اہلِ وطن تمام — پھرتے ہیں آستینوں میں خنجر لیے ہوئے

اپنے وطن میں اس قسم کے انسانوں کو دیکھ کر ان کی زبان سے بددعا بھی نکلی ؎

بر شکلِ ناخدا جہاں ہیں ابتک جعفر و صادق — وہ کشتی غرق ہو جائے تو بیڑا پار ہو جائے

جب ملک میں انتشار دیکھا تو پکار اٹھے ؎

اٹھو اٹھو کہ زندگی ہی زندگی پہ بار ہے — بڑھو بڑھو کہ چار سو پکار ہی پکار ہے

اور حالات کی سختی نے ان سے یہ بھی کہلوا لیا ؎

بھاگ مسافر میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ — اوپر اوپر پھول کھلے ہیں بھیتر بھیتر آگ
بھاگ مسافر بھاگ . . . . . .

لیکن ان کی روشن ضمیری اور عارفانہ شان ہمیشہ قائم رہی اور وہ اپنے آپ کو مایوسیوں سے ہمیشہ بچاتے رہے ؎

جگرؔ ان حوادث سے گھبرا نہ جانا — یہی تو ہے دلچسپیوں کا زمانا
زمیں کو روندتے ہوئے صفوں کو چیرتے ہوئے — بڑھے چلو بڑھے چلو یہ وقت کی پکار ہے

انھوں نے وطن کے رہنماؤں کو ان کے منصب سے آگاہ کیا ہے اور ان کو جمہوریت کے

تقاضوں کی طرف رجوع کرنے کی بھی کوشش کی ہے

چمن چمن ہی نہیں جس کے گوشے گوشے میں ۔ کہیں بہار نہ آئے کہیں بہار آئے
یہ میکدے کی یہ ساقی گری کی ہے توہین ۔ کوئی ہو جام بکف کوئی شرمسار آئے
نہ ہو جو عام مسرت محال ہے اے دوست ۔ کہ زندگی کو کسی حال میں قرار آئے

وہ اپنے وطن سے حد درجہ محبت کرتے تھے اور اہل وطن کو خوش و خرم دیکھنا چاہتے تھے، لیکن خوشی اس دور میں عنقا تھی ہر طرف نفسی نفسی کا عالم تھا، چنانچہ وہ یہ بھی کہہ اٹھے ؎

یہ سنتا ہوں کہ پیاسی ہے بہت خاکِ وطن ساقی ۔ خدا حافظ چلا میں باندھ کے سر سے کفن ساقی

اور جشن جمہوریت کے موقع پر انھوں نے اپنے جذباتِ وطن پرستی کے تحت یہ دعائیہ کلمات بھی پڑھے ؎

خدا کرے کہ یہ دستور ساز گار آئے ۔ جو بیقرار ہیں اب تک انھیں قرار آئے
وہ سرخوشی ہو کہ خود سرخوشی بھی رقص کرے ۔ وہ زندگی ہو کہ خود زندگی کو پیار آئے
زبان و دل میں بہم ارتباط ہو ایسا ۔ کہ جو زبان کہے دل کو اعتبار آئے
نہ ہو جو عام مسرت محال ہے اے دوست ۔ کہ زندگی کو کسی حال میں قرار آئے

غرضیکہ جگرؔ ایک سچے محب وطن تھے اور انھوں نے وقت بہ وقت کبھی رہنمایان ملک و قوم کو تلقین کی کبھی عوام کو صبر و تحمل کا درس دیا اور اس صبر و تحمل میں خود بھی شامل رہے اور ہر حال میں وطن کو ترقی کے راستے پر گامزن رہنے کی تلقین کی ؛

لطفِ صحبت

جگر صاحب کے خلوص و محبت، انسانیت و شرافت، دلداری اور محبوبیت کی وجہ سے ان کا دائرہ احباب بہت وسیع تھا اور یہی احباب ان کی زندگی کا جزو تھے، ہندوستان و پاکستان دونوں ممالک میں وہ یکساں طور پر محبوب و مقبول تھے، وہ جس شہر میں جاتے بیشمار احباب ان کو گھیر لیتے، اور جب تک وہ شہر میں رہتے ان کی صحبت سے لطف اندوز ہوتے رہتے

ان کی صحبت میں راجے، مہاراجے، نواب، شہزادے، رؤسا و امرا اور غریب و نادار سبھی قسم کے لوگ تھے، سرکاری اعلیٰ افسروں میں گورنر بھی تھے، اور معمولی درجہ کے کلرک بھی، یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی تھے اور پروفیسر و لکچرر بھی، ادیب و نقاد بھی تھے اور شاعر بھی، بڑے سے بڑے سیاستداں بھی تھے اور وکیل و بیرسٹر بھی، میجر بھی تھے اور فلم ایکٹر و ایکٹرس بھی تجار بھی تھے اور معمولی درجے کے مزدور بھی غرضیکہ ہر قسم کے لوگوں سے ان کی صحبت رہتی تھی، لیکن یہ جگر کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ وہ ان سب میں کسی قسم کی کوئی تفریق نہیں کرتے تھے اور سب سے ایک سا برتاؤ رکھتے تھے، ان کی زندگی کا بیشتر حصہ احباب ہی کے نرغہ میں گزرا ؎

بالکل ابتدائی زمانے میں مرادآباد میں حضور احمد صاحب مرحوم اور شوق مرادآبادی وغیرہ کی صحبت میں شعر و شاعری کی گرماگرمی رہی، پھر جب مرادآباد چھوٹا اور شراب کا بدترین دور شروع ہوا تو اصغر گونڈوی، مرزا احسان احمد، اصغر حسین مختار مین پوری، رشید احمد صدیقی اور سید سلیمان ندوی مرحوم وغیرہ کی صحبتیں نصیب ہوئیں جنھوں نے جگر کے کلام اور زندگی میں ایک نیا موڑ پیدا کر دیا۔

کچھ عرصہ کے بعد جب ۱۹۳۹ء میں شراب ترک کر دی تو مختلف قسم کے احباب سے لطفِ صحبت اٹھاتے رہے۔ جگر کے بدترین دورِ شراب میں ان کے احباب ہی نے ان کو ہر وقت سنبھالے رکھا ترکِ شراب کے بعد بھی وہ ہمہ وقت احبابِ مخلصین میں گھرے رہتے تھے جس سے کبھی کبھی وہ گھبرا بھی جاتے تھے ایک خط میں اصطفا جان صاحب کو لکھتے ہیں:-

"انسان نما خلقت کا ہجوم میرے لیے عذاب سے کم نہیں اپنے دل کو اس صورت سے بہلا لیا کرتا ہوں کہ گنہگار ہوں دنیا ہی میں سزائیں مل جائیں تو خوش قسمتی ہی خوش قسمتی ہے" (۱)

لیکن اگر کوئی دوست کبھی ان سے روٹھ جاتا تو وہ اسے طرح طرح سے منانے کی کوشش بھی کرتے تھے، ایک دفعہ عالم بدمستی میں ان سے دوستی کے ساتھ کوئی نازیبا عمل ہوا جس کا انھیں

---

(۱) یہ خط راقم نے "جگر کے خطوط" میں شامل کر دیا ہے

عالم ہوش میں احساس ہوا تو ان کو لکھا

"مائی ڈیر وحشی۔ سلام شوق

کیا عالم دیوانگی پر کوئی قانون جائز سمجھا جاتا ہے؟ غالباً نہیں میں تو بہرحال عالم بدمستی میں تھا لیکن بتائیے کہ آپ کو کیا ہوگیا تھا؟ تاہم مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں پہلے بھی ایک طرح کا خیال ضرور تھا۔ لیکن حادثہ کے اس خیال میں کوئی منتقمانہ جذبہ کبھی بھی شامل نہ تھا بہرحال ماضی اسی لیے ہوا کرتی ہے کہ ہم اسے بھول جائیں میں آپکو دیانتدارانہ یقین دلاتا ہوں کہ مجھے نہ صرف یہ کہ کوئی خیال نہیں بلکہ اپنے طرز عمل پر سچے دل سے افسوس بھی ہے۔

میرے اندر ایک خاص جذبہ ہمیشہ کارفرما رہا کرتا ہے اور وہ یہ کہ اگر میرے کسی دوست یا غیر سے میرے خلاف کوئی طرز عمل ظہور میں آتا ہے تو محض یہ سمجھ لینے پر کہ ان کے متعلق احساس پیدا ہوگیا ہی فوراً معاف کردیتا ہوں اور پھر از سر نو زندگی کے دور کا آغاز اسی محبت واخلاص کے ماتحت کرتا ہوں جو پہلے موجود تھا، یقیناً احباب سائنٹفک اعتبار پر اس واقعیت سے باخبر ہوں گے کہ غصہ کیا چیز ہوا کرتا ہے میرے نزدیک غصہ بھی ایک رحمت ہے اگر اس کا صحیح حق ادا کیا جائے اور اس کی حقیقت کو سمجھ لیا جائے۔ یہ مسئلہ خود کسی قدر نازک ہے میں آپ کی بصیرت پر چھوڑتا ہوں اور آخر میں صرف اس قدر کہہ کر آپ کے جواب کا منتظر ہوں کہ تخلقو باخلاق اللہ ہمیں ایک دوسرے کو معاف کرتے رہنا چاہیئے ایسا نہ ہو کہ اللہ ہمیں نہ معاف کرے غالباً میری آزادنگاری کا آپ احترام کریں گے۔ عزیز عارف کو سلام

مخلص آپ کا دعاگو

جگر" [۱]

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے احباب ومخلصین کو کسقدر عزیز رکھتے تھے وہ احباب ومخلصین کے اسقدر دلدادہ تھے کہ ایک دفعہ جب ان پر لکھنؤ میں دل کا دورہ پڑا اور ان پر احباب ومخلصین سے ملنے پر پابندی لگادی گئی تو انھوں نے ایک ملاقات میں شہید فرنگی محلی سے فرمایا

مرض سے تو خدا معلوم کب مگر احباب اور بزرگوں سے جدائی نے میری موت کو قریب کردیا ہے۔[۲]

ترک مے نوشی کے بعد ان کی دلچسپی کھیلوں سے بڑھی کیونکہ انکو خود فراموشی کے لیے جو ان کی فطرت بن گئی تھی کوئی نہ کوئی شغل چاہیئے تھا، شراب سے توبہ کرچکے تھے اور جوانی کے ساتھ شاعری کی امنگ بھی رخصت ہوچکی تھی اس لیے انھوں نے کھیلوں سے اپنا انہماک بڑھایا کھیلوں میں وہ شطرنج اور کیرم اچھا

---

[۱] یہ خط راقم نے جگر کے خطوط میں شایع کردیا ہے [۲] "قومی آواز" ۱۰ ستمبر سنہ ۶۰ء صفحہ ۳

کھیلتے تھے لیکن زیادہ دلچسپی تاش سے تھی پہلے وہ "حکم کی بیگم" جسے وہ ٹیفون کہتے تھے زیادہ کھیلتے تھے لیکن رفتہ رفتہ رمی کا زور زیادہ بڑھا پھر وہ شرط سے بھی تاش کھیلنے لگے تاکہ ان کی دلچسپی قائم رہے اور وقت اچھا گزرے اس کھیل سے جو بھی رقم جیتتے زیادہ تر بچوں میں تقسیم کر دیتے تھے ایک زمانہ میں بقول جلیل قدوائی پلانچٹ (Planchette) بھی کھیلتے تھے اور شطرنج کے کھیل کے لیے تو وہ بہترین کھلاڑیوں کی تلاش کرتے رہتے تھے اور جب کوئی ان سے[۱] بہتر کھلاڑی مل جاتا تو وہ اس کے آگے پیچھے گھومتے رہتے۔

جگر صاحب کو تنہائی سے سخت الجھن ہوتی تھی اور وہ ہمیشہ یہی چاہتے تھے کہ ہر وقت احباب ان کے گرد جمع رہیں اور ایک ہنگامہ ہوتا رہے اس سلسلے کے دو واقعے ڈاکٹر عبادت بریلوی کے یہاں پیش آئے جنکی تفصیل جگر کی رمی کے کھیل میں انہماک کے سلسلے میں آچکی ہے کہ انھوں نے دونوں دفعہ رمی کھیلنے کی خواہش کا اظہار خود کیا اور رات رات بھر احباب کے ساتھ محفل جمی رہی

جگر صاحب کے لطف صحبت کے سلسلے میں محمود علی خاں جامعی نے ایک دلچسپ واقعہ "دارالکھلاؤ"[۲] کے قیام کے متعلق لکھا ہے جسے اس کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے جامعی صاحب لکھتے ہیں:-

"دسمبر ۱۹۳۲ء میں جگر صاحب بھوپال تشریف لائے اور میرے یہاں کئی مہینے قیام رہا۔ ان کے قیام کے زمانے میں بھوپال کے بعض باذوق حضرات ان سے روزانہ ملنے آیا کرتے تھے، عموماً شب کے نو بجے سب جمع ہو جاتے اور تین بجے صبح تک بیٹھتے۔ روزانہ کی لمبی نشست سب کے لیے بہت تکلیف دہ تھی اس لیے طے ہوا کہ رات کی نشست میں مختلف آداب و قیود اٹھا دیے جائیں تاکہ ہر شخص آزادی، آرام اور بے تکلفی سے اپنا وقت گزار سکے اس مقصد کے لیے ایک انجمن قائم کی گئی جس کے بنیادی اصول درج ذیل ہیں:-

> آجکل دنیا میدان جدال و قتال بنی ہوئی ہے، جدھر دیکھو ہلاکتوں، ہولناکیوں اور تباہیوں کا بازار گرم ہے اگر اس کے اسباب پر غائر نظر ڈالی جائے تو پتہ لگے گا کہ یہ سب سُرعت رفتار کا نتیجہ ہے ابتدا میں انسان پیدل چلا کرتا تھا پھر معذور لوگوں کے لیے سواری کا رواج ہوا اس کے بعد اس کا غلط استعمال ہونے لگا پہلے پہل بیل گاڑی رائج ہوئی اس کی جگہ گھوڑا گاڑی نے لی پھر تو بھاپ اور بجلی سے چلنے والی سواریاں تابڑ توڑ میدان میں آگئیں بائیسکل نے موٹر کار کی صورت اختیار کرلی، ریل دوڑنے لگی، سمندر کے سینے کو چیرتے ہوئے جہاز اور ہوا کے پردوں پر اڑتے ہوئے ہوائی جہاز اڑنے لگے حتی کہ اب تو یہ آسانی سے ممکن ہو گیا کہ صبح کا ناشتہ ہم دہلی میں کریں تو دوپہر کا کھانا ہم

---

(۱) یہ واقعہ راقم سے جلیل قدوائی نے کراچی میں دسمبر ۱۹۶۳ء کی ایک ملاقات میں بتایا تھا۔

(۲) مالک رام صاحب نے بھی یہی مضمون نقوش میں لکھا ہے اور اسی کی نقل "شعلہ و شبنم" دہلی آزادی ایڈیشن ۱۹۶۱ء نے صفحہ ۱۵ تا ۱۸ دیا ہے یہ دونوں مالک رام اور جامعی کے مضامین ایک دوسرے کی نقل معلوم ہوتے ہیں کیونکہ انکا ایک ایک جملہ ایک جیسا ہے

تہران میں کھائیں، پرانے زمانے میں اگر کوئی غنیم حملہ کرتا تھا تو منزل مقصود تک پہونچتے پہونچتے اسے کم از کم ایک ماہ ضرور لگ جاتا تھا، اس اثنا میں جس ملک پر حملہ ہونے والا ہوتا تھا اسے تیاری کا کافی موقع مل جاتا تھا۔ لیکن آج تو حال یہ ہے کہ صبح ۵ بجے الٹی میٹم دیا اور ۶ بجے بمباری شروع ہوگئی، یہ سب سرعت رفتار کا کرشمہ ہے، لہٰذا امن پسند لوگوں کو اس کے سدباب کے لیے سکون کی اشاعت یعنی کاہلی کی تبلیغ کرنی چاہیے۔ چنانچہ ہم امن پسند باشندگانِ عالم "انجمن الکھلار" کے نام سے ایک انجمن بناتے ہیں اس کا اجلاس روزانہ ۱۰ بجے شب سے ۳ تین بجے صبح تک ہوا کرے گا یہ اجلاس اسی کمرے میں ہوا کرے گا جس میں جگر صاحب کا آجکل قیام ہے۔

(میں اس زمانہ میں بھوپال کے محلہ مسجد شریف خاں میں حفیظ میاں کے مکان میں رہتا تھا۔ جگر صاحب کا اس کے دیوان خانہ میں قیام تھا) اور اسے "دار الکسلا" کے نام سے یاد کیا جائے گا۔ اس انجمن کی فیس ممبری ایک عدد تکیہ ہوگی جو ہر ممبر اپنے مکان سے لاکر "دار الکھلار" میں ڈال دے گا۔ پھر یہاں سب ممبر روزانہ شب میں جمع ہوں گے اور لیٹ کر داد کاہلی دیا کریں گے چونکہ کاہلی کے معنی خواب غفلت کے نہیں بلکہ بیداری میں بے عملی کے ہیں اسلیے دورانِ اجلاس میں سونا ممنوع ہوگا، اجلاس میں چند سکنڈ کے لیے ہر شخص کھڑا ہو سکتا ہے یا پھر لیٹ سکتا ہے بیٹھنا سخت جرم متصور ہوگا اور جس کسی رکن سے یہ جرم سرزد ہوگا اسے سزا کے طور پر تمام ممبروں کی خدمت کرنا ہوگی ان کی دیر کی رکی ہوئی ضرورتیں پوری کرنا ہوں گی یعنی ان کی فرمائشیں پوری کرنا ہوں گی۔ مثلاً پانی پلا دینا، پان بنا کر کھلانا اگالدان اٹھا کر دینا چلم بھر کر لانا وغیرہ وغیرہ۔

خیال نہیں پڑتا کہ کبھی کسی ممبر کو اس جرم کے سلسلے میں یہ سزا بھگتنا پڑی ہو کیونکہ تمام ممبران تھے ہی ایسے ضابطہ کے پابند۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ اجلاس کے دوران ایک رکن لیٹے لیٹے حقہ پی رہے تھے اتفاق سے کسی کا ہاتھ لگا اور انگاروں سے بھری ہوئی چلم ان کے سینے پر لوٹ پڑی وہ نہ اٹھ کر بیٹھے نہ گھبرائے، اپنے حواس قائم رکھتے ہوئے ایک طرف کو سرک کر کروٹ لے لی سارے انگارے نیچے جا گرے۔۔

غرض اس اجلاس کا یہ طریقہ تھا کہ ممبران تشریف لاتے اجلاس میں کھڑے ہو کر اپنے بدن کو تولتے اور ویسے ہی کھڑے کھڑے دھم سے لیٹ جاتے حاضری کے تمام ممبر نہایت سختی سے پابند تھے۔ بارش ہو، آندھی ہو، طوفان آئے کچھ ہو جائے مگر ممبران اجلاس کی شرکت ضرور کرتے بھوپال میں بارش کا اوسط ۶۰ انچ ہے بارش کا عین زمانہ ہے اور پانی موسلا دھار برس رہا ہے لیکن ۹ بجتے ہی ممبران برساتیاں اوڑھے، چھتریاں لگائے چھپ چھپ کرتے چلے آرہے ہیں۔

اس انجمن کے صرف چار عہدہ دار تھے اور انھیں کاہلی کا اعلیٰ سے اعلیٰ ثبوت دینے کے بعد منتخب کیا گیا تھا، اس کے صدر خود جگر صاحب تھے۔ انھیں صدر الکہلا کا خطاب ملا تھا، جگر صاحب اس وجہ سے صدر منتخب نہیں ہوئے کہ وہ کوئی بڑے شاعر ہیں بلکہ ان کا بھی کاہلی میں امتحان لیا گیا اور جب کاہل ثابت ہو گئے تب انھیں یہ عہدۂ جلیلہ تفویض کیا گیا تھا ان کے نائب حسرت لکھنوی تھے انجمن کا ناظم مجھے منتخب کیا گیا تھا اور "ناظم الکہلا" کا خطاب دیا گیا تھا ان کے علاوہ غلام حسنین خاں عزم بنارسی کو نقیب الکہلا یا ([illegible]) منتخب کیا گیا تھا، یہ صاحب بہت ہیبت ناک جسم اور قد و قامت کے مالک اور خوب پاٹ دار آواز رکھتے تھے ان کا فرض تھا کہ صدر کے احکام یا انجمن کے اعلانات با آواز بلند دہرا دیں، تاکہ سب مطلع ہو جائیں؛

مذکورہ بالا چار عہدہ داران کے علاوہ تقریباً ۲۱ ممبران اور تھے جو شہر کے مقتدر اور تعلیم یافتہ حضرات میں سے منتخب لوگ تھے جن میں سے ہر ایک کو اپنی ذاتی خصوصیات کی بنا پر ایک ایک خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا،

۵۔ ام الکہلا، محمد مہدی صاحب، نائب مہتمم تاریخ بھوپال (یہ خطاب ان کی مادرانہ شفقت کی وجہ سے تھا)

۶۔ فتنۃ الکہلا، محمود عظیم فہمی ترمذی بھوپالی (چھوٹے قد اور بڑے اچھے شاعر ہونے کی مناسبت سے)

۷۔ دبیز الکہلا، محمد عبدالباسط باسط بھوپالی (دوہرے جسم کی مناسبت سے)

۸۔ قبتہ الکہلا، محمد شریف خاں فکری بھوپالی (قبہ نما توند کی مناسبت سے)

۹۔ طویل الکہلا، شاکر علی خاں، حال مزدور لیڈر بھوپال (اپنی طوالت اور بھولی سادہ حرکتوں کی بنا پر)

۱۰۔ قند الکہلا، محمد اشرف، ایڈیٹر نئی روشنی کراچی (چائے میں بہت زیادہ شکر کھانے کی وجہ سے)

۱۱۔ ملیح الکہلا، باسط کے بھائی تھے انتقال ہو گیا۔ (ملیح رنگ اور صورت کی وجہ سے)

۱۲۔ صبیح الکہلا، افسر الاطبا کے پوتے تھے (صبیح رنگ ہونے کی وجہ سے)

۱۳۔ خطاب یاد نہیں، محمود احمد مکی

۱۴۔ " محمد کریم ذکی بھوپالی

۱۵۔ " احمد اللہ خاں شاکی شاہجہانپوری سپرنٹنڈنٹ لیجسلیٹو اسمبلی

۱۶۔ " سید علی اکبر کاظمی سپرنٹنڈنٹ صحت عامہ تعلیمات

۱۷۔ منظور حسین سرور بھوپالی

۱۸۔ محمد اصغر شعری بھوپالی

۱۹۔ ذوالفقار علی خاں شاہجہانپوری

۲۰۔ سید حسن عبداللہ زیدی (پاکستان کی فوج سے حال میں میجر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے ہیں)

۲۱ سید احمد ولی شاہجہانپوری

۲۲ تا ۲۵ نام یاد نہیں صورتیں یاد ہیں۔

چونکہ پورا خطاب زبان سے ادا کرنے میں زبان کی کاہلی کو صدمہ پہونچتا ہے اس لیے ان کا مخفف صدرُل، تنڈُل وغیرہ رائج تھا۔

اس انجمن کی کوئی خاص سرگرمیاں نہ تھیں سرگرمی کے معنی ہیں عمل کے اور عمل اور کاہلی میں تضاد ہے، البتہ بعض اوقات تفریحات ضرور ہوتی تھیں اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ کوئی ممبر تجویز پیش کرتا کہ اس وقت شاعری ہوجائے یا شطرنج یا کیرم ہو یا چائے پی جائے۔ صدر تمام ممبروں کا ایما معلوم کرکے فیصلہ کا اعلان کردیتے پھر اس پر عمل شروع ہو جاتا۔

انجمن کی تفریحات میں ایک تفریح اجتماعی کھانا بھی تھا یوں تو اکثر قریب رہنے والے ممبران روزانہ اپنے گھر سے کھانا لیکر آجاتے تھے اور جگر صاحب کے ساتھ ہی کھاتے تھے لیکن کبھی کبھی یہ اجتماعی کھانا لازمی ہوتا تھا۔

یہ پہلے سے معلوم کرلیا گیا تھا کہ کس ممبر کے یہاں کون سی چیز اچھی پکتی ہے بس اسی کے ذمہ مقرر تھا کہ جب اجتماعی کھانے کا اعلان کیا جائے تو یہ ممبر وہی سی چیز جو اس کے یہاں اچھی پکتی ہے اس کے ذمہ مقرر کردی گئی ہے صرف دو افراد کے لائق لے کر دار الکھلا پہنچ جائے دو افراد سے زیادہ کھانا لانا یا مقررہ کھانے کے علاوہ کوئی چیز لانا جرم تھا اور کبھی کسی ممبر نے اس قاعدے کی خلاف ورزی نہیں کی، چیزوں میں کچھ اعلیٰ کھانوں پر منحصر نہیں، بلکہ کریلے، ماش کی دال اور کڑھی تک شامل تھی نمیں میٹھے اور نمکین سب کھانے ہوتے تھے ہر شخص اپنے ذمہ کا کھانا میر مکان کے زنانے دروازے سے پہونچا دیا کرتا تھا اس طرح پچیس ممبران کے یہاں سے پچاس افراد کا کھانا جمع ہو جاتا تھا کچھ غیر اراکین بھی مدعو کرلیے جاتے گھر میں سے کھانا ترتیب دے کر بھیجا جاتا اور باہر سب مل جلکر کھاتے تھے۔

اس انجمن میں جگر صاحب کو شامل کرکے دس شاعر تھے اس لیے انجمن کے اجلاس کی فضا عام طور پر شاعرانہ تھی دوسرے شعرا کو سنانے اور داد تحسین وصول کرنے کے خیال سے لوگ زیادہ سے زیادہ غزلیں اور نظمیں کہتے پھر اجلاس میں آکر سناتے، جگر صاحب پر بھی اس زمانے میں شاعری طاری رہتی وہ بھی دوسروں کے مقابلے میں بہتر سے بہتر غزلیں کہنے کی کوشش کرتے۔ نتیجہ یہ کہ جگر صاحب نے بھوپال کے اس قیام کے دوران اتنی قلیل مدت میں جتنی زیادہ تعداد میں اور جتنی اعلیٰ درجے کی غزلیں کہی ہیں اپنی عمر میں کبھی نہیں کہیں مثلاً ان کی حسب ذیل غزلیں اسی زمانے کی یادگار ہیں :۔

(۱) جواب کبھی نہ تکلیف فرمائیے گا (۲) نظر ملا کے مرے پاس آکے لوٹ لیا (۳) ہجوم تجلی سے معمور ہو کر (۴) عشق میں لاجواب ہیں ہم لوگ (۵) حسن معنی کی قسم جلوۂ صورت کی قسم (۶) دل حریف حال دبے حالی نہیں (۷) غم عاشقی کا صلہ چاہتا ہوں (۸) محبت میں یہ کیا ستم دیکھتے ہیں (۹) جبتک شباب عشق مکمل شباب ہے (۱۰) سنتا ہوں کہ ہر حال میں وہ دل سے قریں ہے (۱۱) تڑپ کر دل انھیں تڑپا رہا ہے (۱۲) دل کو جب دل سے راہ ہوتی ہے ؛

اس انجمن کے اجلاس کی شرکت کی ممبروں میں کچھ لت پڑگئی تھی کہ ہر حال میں کھنچے چلے آرہے ہیں۔ پھر تین بجے رات سے پہلے گھر نہیں پہونچتے، تو ممبران کی بیویوں میں جو بغاوت پھیلی ہوگی وہ ظاہر ہے۔ بعض ناواقف بیویوں کا قول تھا کہ ہو نہ ہو جگر کوئی طوائف ہے شاعر ماعر تو باتیں ہیں، جبھی تو مردوے ایسے دیوانے ہو رہے ہیں (اس شک کو دور کرنے کے لیے جگر صاحب کو خود بعض ممبروں کے گھر جانا پڑا تب جا کر ان ممبران کی بیویوں کے شبہات دور ہوئے)

چونکہ لوگ صدر کو شاعری کے بہانے مدعو کرکے صدر کی کاہلی کو ٹھلیں پہونچاتے تھے ادہر باقی تمام ممبران بے صدر کے پڑے رہتے تھے، اس لیے یہ قانون بنا دیا گیا کہ صدر چاہے یا کھانے کی کسی دعوت میں شریک نہ ہوں گے تا وقتیکہ پوری انجمن کو مدعو نہ کیا جائے اور ان کے اجلاس یعنی لیٹنے کا انتظام نہ ہو پھر بھی چند منچلے ایسے نکل ہی آتے تھے جو پوری انجمن کو مدعو کرتے تھے اور سب کے لیٹنے کا بھی انتظام کرتے تھے۔

شب میں تین بجے اجلاس بے دودھ کی چائے کے دور پر جسے لیپا درمیں قہوہ کہتے ہیں اور جو فنجانوں میں پی جاتی تھی ختم ہوتا تھا۔"(۱)

لطائف جگر جگر صاحب کے اسقدر لطیفے مشہور ہیں کہ اگر سب کو یکجا کر دیا جائے تو لطیفوں کی ایک کتاب تیار ہو جائے، لیکن اختصار کے خیال سے یہاں ان کے چند اہم اور مخصوص لطائف لکھے جارہے ہیں :

ایک دفعہ جگر صاحب سرشاری کے زمانے میں سخت بیمار ہوئے تو لوگوں نے ان کے متعلق تشویشناک خبریں پھیلانی شروع کر دیں اس پر دہلی کے ایک رئیس نے جگر صاحب کو گرفتار کرکے اپنی حویلی کے ایک آرام دہ کمرے میں قید کر دیا اس قیدی کے زمانے میں عظمت صاحب بھوپالی ان کو تلاش کرتے ہوئے ان رئیس کی حویلی تک پہونچ گئے، جہاں جگر صاحب مقید تھے اس ملاقات کے سلسلے کا ایک لطیفہ عمران انصاری لکھتے ہیں جسے جگر نے خود بیان کیا انھوں نے کہا۔

"کھانا نہایت پر لطف مگر پرہیز کا ملتا ہے ایک حکیم صاحب قبلہ بڑی شفقت سے علاج پر مامور ہیں۔ جو بہتر سے بہتر دوائیں کھلانے کے بعد اب مقویات کھلاتے رہتے ہیں آپ دیکھ نہیں رہے

(۱) "تذکرہ جگر" صفحہ تا ۸۸

ہیں۔ ہاتھ پاؤں اور چہرے کے نکھار پر اشارہ کرتے ہوئے) کہ کسقدر بے عزتی کا گوشت چڑھ گیا ہے واللہ اچھا خاصہ گاما ہو رہا ہوں (یقیناً اس وقت صحت بہت ہی اچھی تھی) مگر میرے بھائی بس ایک دکھ سب سے بڑا یہ ہے کہ پینے کو کیا سونگھنے کو بھی اب نہیں ملتی اور یار باشی کو بالکل موقع نہیں ملتا اگر یہ دونوں باتیں حاصل ہو جائیں تو عمر بھر کہیں جانے کا نام نہ لوں"۔(۱)

محمود علیخاں جامعی ان کا ایک لطیفہ لکھتے ہیں۔

"جگر صاحب دہلی میں میرے یہاں مقیم تھے میرا مکان قرولباغ میں ایک سڑک پر تھا جو طبیہ کالج کو جاتی ہے، طبیہ کالج میں مشاعرہ تھا اور جگر صاحب کو اس میں مدعو کیا گیا اگرچہ جگر صاحب کا سرشاری و سرمستی کا دور تھا لیکن لوگ کہاں چھوڑنے والے تھے پکڑ لا کر لے گئے۔ مشاعرہ ختم ہونے پر ہم لوگ جگر صاحب کے ہمراہ پیدل گھر کو روانہ ہوئے ابھی ہم سڑک پر آئے ہی تھے کہ پیچھے سے ایک آواز آئی مڑکر دیکھا کہ ایک بزرگ صورت سے شخص لمبے لمبے ڈگ بھرتے چلے آرہے ہیں۔ ہم لوگ رک کر کھڑے ہو گئے انھوں نے قریب آکر انتہائی عقیدت سے جگر صاحب سے مصافحہ کیا پھر اپنے ذوقِ ادب و شعر گوئی کا تذکرہ کیا اس کے بعد آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً جگر صاحب سے یہ درخواست کر بیٹھے کہ مجھے اپنا شاگرد بنا لیجئے یہی نہیں بلکہ جیب سے ایک پرچہ نکال کر دہیں کھڑے کھڑے کہنے لگے "ایک تازہ غزل ہوئی ہے ملاحظہ کیجئے۔

مطلع عرض کیا ہے"۔ اب وہ مطلع پڑھنے کے لیے کھانس کھنکار کے حلق صاف کر ہی رہے تھے اور جگر صاحب ہکا بکا ان کا منھ تاک رہے تھے کہ ہم لوگوں نے دیکھا۔ جگر صاحب جھک کر اپنا جوتا اتار رہے ہیں۔ ہم سب حیران کہ خیریت ہے۔ جوتا اتار کر وہ وہاں سے سیدھی سڑک پر بگٹٹ بھاگ کھڑے ہوئے اب سب ایک دوسرے کا منھ دیکھ رہے ہیں اور اب ہکا بکا ہونے کی ان حضرات کی باری تھی کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہوا، غرض تھوڑی دیر بعد ہم لوگوں نے جگر صاحب کے جوتے اٹھائے اور فکر مند گھر پہونچے کہ نہ جانے ہمارا دیوانہ کدھر نکل گیا ہو گھر عموماً یاد نہیں رہتا ہے، غرض گھر پہونچ کر جو دیکھتے ہیں تو جگر صاحب اپنے کمرے میں دروازہ بند کیے دبکے بیٹھے ہیں جب ہم لوگوں نے دروازہ کھولنے کو کہا تو بولے "پہلے یہ بتاؤ، یہ شاگرد تو تمہارے ساتھ نہیں ہے"، جب انھیں اطمنان دلایا تب کہیں دروازہ کھولا۔(۲)

مالک رام نے جگر کے دورِ سرشاری کا ایک لطیفہ جس میں وہ خود بھی شامل تھے جگر اور جوش کی جاڑوں کی آدھی رات کی ملاقات کی بابت جبکہ جگر صاحب نشے میں چور تھے اس

---

(۱) "صبحِ امید"، بمبئی جولائی ۵۸ء ص ۲۷ (۲) "تذکرۂ جگر" از محمود علی خاں جامعی ص ۹۲ تا ۹۳

طرح لکھا ہے۔

"قصہ کوتاہ خدا خدا کر کے وہ تین چار سو گز کا فاصلہ کوئی آدھ پون گھنٹے میں طے ہوا اور ہم لدے پھندے جوشؔ صاحب کے مکان کے بیرونی برامدے میں داخل ہوئے یہاں پہونچتے ہی جگرؔ نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا اندر سے ہڑبڑا کر آواز آئی "کون ہے" انھوں نے جواب دیا "جگر" "کون؟" "ارے، ایک مرتبہ جو کہا ہے جگر" "دروازہ کھولو" "بھائی ہم سو رہے ہیں صبح کے وقت آنا"، "سو رہے ہیں"! آئے بڑے سونے والے" ارے، ہم، ہم یہاں سردی میں باہر کھڑے ہیں اور تم سوئے پڑے ہو۔ جلد دروازہ کھولو یہ محمود بھی ہمارے ساتھ ہے"۔ اس پر جوشؔ طوعاً و کرہاً اٹھے اور انھوں نے دروازہ کھول دیا انھوں نے اگلے دن مجھ سے کہا کہ میں دروازہ یوں تھوڑی ہی کھولنے والا تھا، لیکن جب جگرؔ نے محمود کا نام لیا تو میں نے خیال کیا کہ ضرور کوئی حادثہ پیش آگیا ہے ورنہ محمود یوں رات کے اس وقت قطعاً نہ آتے یہ اس لیے کہ محمود صاحب پیتے نہیں اور جوشؔ صاحب کو معلوم تھا کہ وہ سنجیدہ آدمی ہیں

دروازہ کا کھلنا تھا کہ جگرؔ صاحب ایک کمرے میں داخل ہوئے اور اوپر کی گرم چادر پھینک شراب سے جوشؔ صاحب کے لحاف میں گھس گئے جیسے وہ گھر سے اسی کی تلاش میں یہاں تک آئے ہوں اور کہنے لگے "محمود اب کافی دیر ہو چکی ہے میں یہیں سوؤں گا آپ حضرات تشریف لے جائیے میں صبح کے وقت ناشتہ کے بعد آجاؤں گا جوشؔ بیچارے حیران و پریشان کہ یہ بلائے بے درماں کہاں سے نازل ہو گئی وہ کہتے رہے کہ "نہیں جگرؔ صاحب آپ جائیے محمود صاحب کے ساتھ" لیکن توبہ ہے یہ ٹس سے مس نہیں ہوئے ادہر ہم سب کو ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے آخر ہم نے دونوں دوستوں کو آپس میں راز و نیاز کرنے کے لیے شب بخیر کہا اور واپس چلے آئے"۔[1]

شوکت تھانوی کی تحریر سے چند اقتباسات محمود علی خاں جامعی صاحب نے نقل کیے ہیں شوکت تھانوی صاحب نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جگرؔ صاحب کی محفل میں

"ایک نہایت عالی مقام حاکم بھی کہیں سے آگئے ان کے سرکاری مرتبہ کا ہر ایک کو خیال تھا مگر شعر و سخن کے معاملہ میں وہ نہایت پھوہڑ ثابت ہوئے مثلاً شعر سن کر اظہار پسندیدگی کے طور پر ہنستے تھے اور اچھے سے اچھا شعر ان پر سے اس طرح گزر جاتا جیسے چکنے گھڑے سے بوند پھسل جائے کہ یکایک جگرؔ صاحب کے ایک شعر پر انھوں نے بیساختہ داد دی اور ذرا ادھر بیٹھیے" کہہ کر گویا اپنے نزدیک "لکڑ" ارشاد" کہا

---

[1] "شعلہ و شبنم" آزادی ایڈیشن سنہ ۶۰ء ص ۱۳-۱۴

تو جگر صاحب نے ان کی جیب میں لگے ہوئے قلم کی طرف اشارہ کرکے کہا "ذرا قلم مرحمت فرمائیے اس شعر کو میں کاٹ دوں اس میں ضرور کوئی خرابی ہے کہ یہ آپ کو پسند آیا ہے" وہ حضرت کھیسیں نکال کر رہ گئے باقی حاضرین کو جیسے سانپ ہی تو سونگھ گیا کہ کس جرأت کے ساتھ "توہین عدالت" کی گئی ہے۔"

"اس برجستگی اور بذلہ سنجی کے ساتھ ہی ساتھ وہ انتہائی سادہ، معصوم بلکہ بھولے بھالے بھی تھے۔ پچھلی مرتبہ جب پاکستان آئے تھے تو یہاں کے مشاعروں کی تمام آمدنی کا ایک ڈرافٹ بنوا کر بھارت بھیجدیا مگر واپسی کے لیے پا بہ رکاب ہی تھے کہ ایک اور مشاعرہ میں شرکت کرنا پڑی اور وہاں کی رقم کے لیے وہ بیحد پریشان نظر آئے کہ اب اس کو کس طرح لیجائیں کسی نے ان کو مشورہ دیا کہ قمیص کے بٹن بنوا لیجیے چنانچہ آپ نے قمیص کے بٹن بنوالیے اور اب جو واپس جانے کے لیے کسٹم پوسٹ پر پہونچے تو حسب دستور کسٹم آفیسر نے ان سے پوچھا کہ "آپ کے پاس کرنسی زیادہ تو نہیں ہے" نہایت بھولے پن سے بولے "تمام رقم کا تو میں ڈرافٹ بنوا چکا ہوں آخری مشاعرہ کی آمدنی ہوئی تھی تو میں نے یہ بٹن بنوالیے ہیں کسٹم آفیسر کو بھی ان کی سادگی پر ہنسی آگئی اور اس نے کہا کہ جگر صاحب، یہ بات اب انڈین کسٹم پوسٹ پر نہ کہئے گا"، تو جگر صاحب نے چونک کر پوچھا "کیوں صاحب کیا یہ جرم ہے؟" اور جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ واقعی یہ جرم ہے تو وہ برس پڑے ان صاحب پر جن کے مشورے سے بٹن بنوائے گئے تھے کہ صاحب آپ نے آخر مجھ سے یہ جرم کیوں کرایا"۔(۱)

خمار بارہ بنکوی نے ایک لطیفہ کو جب کہ جگر صاحب کی فلم جے، بی، ایچ واڈیا بمبئی کے ایک پروڈیوسر ڈائرکٹر نے بنانا شروع کیا لکھا ہے کہ فلم بننے کے دن واڈیا صاحب نے جگر صاحب سے ایک غزل سنانے کی درخواست کی

"جگر صاحب نے ایک غزل سنا دی جو فلم ہو گئی بعد میں واڈیا صاحب نے ایک اور غزل سنانے کے لیے کہا جگر صاحب رضامند ہو گئے، واڈیا صاحب نے کیمرے کا رخ بدلنے اور لائٹس کو از سر نو فٹ کرنے کا حکم دیا اسکے لیے کم و بیش ایک گھنٹہ درکار تھا جگر صاحب تنہا صوفے پر بیٹھکر سگرٹ پینے لگے واڈیا صاحب سامنے ہی مگر ذرا فاصلے پر اپنے مہمانوں سے بات چیت کرنے لگے۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا فوراً جگر صاحب کے پاس پہونچا اور ان سے عرض کیا کہ واڈیا صاحب کی یہ خواہش ہے کہ آپ جب دوسری غزل سنائیں تو ٹوپی کے بجائے سر پر پگڑی باندھ لیں تاکہ دونوں فلموں میں لباس کی یکسانیت آنکھوں کو بری نہ معلوم ہو جگر صاحب یہ سنتے ہی برہم ہو گئے غصہ سے کہنے لگے کہ خدا کی قسم میں پگڑی کبھی نہیں باندھوں گا میں نے پھر پگڑی باندھنے کیلیے اصرار کیا اب تو جگر صاحب جامے سے باہر ہو گئے صوفے سے اٹھ کھڑے ہوئے فرمانے لگے فلم جائے جہنم میں، میں ایسی نوبت کبھی نہیں

---

(۱) "تذکرہ جگر" از محمود علی خان جامعی ص ۱۰۲ تا ۱۰۳

کرسکتا پگڑی میں نے نہ کبھی باندھی ہے نہ باندھوں گا، میں نے جب دیکھا جگر صاحب کا پارہ بہت بڑھ چکا ہے تو کہا کہ اچھا آپ داڈیا صاحب سے خود فرمادیں کہ آپ پگڑی نہ باندھیں گے، جگر صاحب نے غصہ میں فرمایا بلائیے داڈیا صاحب کو میں داڈیا صاحب کے پاس پہونچا اور کہا کہ جگر صاحب آپکو یاد فرمارہے ہیں داڈیا صاحب فوراً جگر صاحب کے پاس پہنچے جگر صاحب برس پڑے کہنے لگے صاحب! یہ کیا لغویت ہے میں پگڑی وگڑی نہیں باندھوں گا، داڈیا صاحب سناٹے میں آگئے حیرت سے کہنے لگے جگر صاحب آپ کیا فرمارہے ہیں پگڑی کا کیا ذکر جگر صاحب نے پھر صراحت فرمائی کہ آپ ہی نے تو یہ کہا ہے کہ میں اپنی دوسری غزل سناتے وقت ٹوپی کے بجائے پگڑی باندھوں، داڈیا صاحب نے پوچھا کہ آپ سے کس نے کہا جگر صاحب بولے "خمار نے" میرا نام سنتے ہی داڈیا صاحب مسکرا پڑے اور کہنے لگے جگر صاحب خمار کی حرکتوں سے شاید آپ واقف نہیں انھیں کی شرارت ہے اب جگر صاحب پر سارا راز کھل گیا میں دور ایک کونے میں کھڑا ہوا تھا جگر صاحب نے بڑے غصے سے میری طرف دیکھا مجھے ہنسی آگئی، پھر دیکھا تو مرحوم کو بھی ہنستے ہوئے پایا،،(۱)

نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں کہ

"ایک بار میں نے جگر صاحب سے سوال کیا" اردو کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ ہندوستان میں اس کا مستقبل محفوظ ہے یا نہیں؟، تو نہایت اختصار کے ساتھ فرمایا کہ "جہاں

نامعقولیت کا دور دورہ ہو وہاں کوئی معقول بات کہنا یا کسی معقولیت کا مطالبہ کرنا سب سے بڑی نامعقولیت سمجھی جاتی ہے۔

ایک اور لطیفہ یاد آیا، کئی برس پہلے کی بات ہے آزاد ہند ہوٹل (۲) میں مخصوص محفل مشاعرہ تھی، جوش ملیح آبادی اور جگر بھی موجود تھے جگر نے اپنی غزل پڑھنی شروع کی تو جوش نے جو ان کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے اور سر خوشی کے عالم میں تھے، آہستہ سے باریک آواز بنا کر کہنا شروع کیا "اوئی" پھر جگر نے شعر پڑھا تو "اوئی اللہ"، تیسرا شعر پڑھا تو "اللہ میں مرگئی"! یہ گویا غزل کی نسائیت پر طنز ہو رہا تھا جگر صاحب ان کے ریمارک سنتے رہے جب تیسری یا چوتھی بار ویسی ہی آواز آئی تو مڑ کر جوش کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہنے لگے "ماشاء اللہ خوب ترقی کی ہے" یہ جوش کی ترقی پسندی پر چوٹ کی ساری محفل قہقہہ زار بن گئی،،(۳)

ادیس احمد عراقی نے ایک لطیفہ لکھا ہے کہ جگر صاحب

اپنی رندی اور سرمستی کے زمانے میں بھی مذہبی عقائد میں سخت رہے ایک بار وہ جوش ملیح آبادی

---

(۱) "فروغ اردو" فروری و مارچ ۱۹۶۱ء، ص ۳۰، ۱۲۹ (۲) آزاد ہند ہوٹل دہلی میں ہے جہاں پر جگر صاحب نے آخری بار ساہتیہ اکاڈمی کا انعام لینے کے لیے قیام کیا تھا (۳) فروغ اردو اگست دسمبر ۱۹۶۱ء ص ۵۴

کے ساتھ تانگے پر کہیں جا رہے تھے راستہ میں ان کے منھ سے یا اللہ کی آواز بلند ہوئی جوشؔ نے تمسخر کے خیال سے کہا جگرؔ صاحب آپ نے مجھ کو کیوں پکارا، جگر کب چوکنے والے تھے بولے۔ ارے یہ شیطان کہاں سے بول اٹھا میں نے تو اپنے رب کو پکارا تھا"

ایک بار کسی اثنا عشری کے یہاں مشاعرہ تھا اور شرط تھی کہ ہر غزل گو اپنی غزل میں بارہ شعر کہے بارہ اماموں کے لحاظ سے یہ شرط رکھی گئی تھی جگرؔ صاحب بھی اس مشاعرہ میں شریک ہوئے اور جب ان کی باری آئی تو اپنی غزل کے چار اشعار پڑھ کر خاموش ہو گئے لوگ چلائے کہ بارہ کی شرط ہے جگرؔ بولے کہ یہ چار سب پر بھاری ہیں" [1]

جوشؔ ملیح آبادی لکھتے ہیں

"جگرؔ جب دھولپور میں میرے ساتھ رہتے تھے تو ان سے کالی میم کھیلنے کے دوران میں بڑا مزہ آیا کرتا تھا میں ہر بات پر بے ایمانی کرتا تھا اور وہ ہر بار "تم پر خدا کی لعنت" کہہ کر اپنے پتے دور پھینک دیا کرتے اور چادر سے منھ چھپا کر لیٹ جاتے تھے .....

جگرؔ کو علم سے کوئی واسطہ نہ تھا عقل کو وہ ذلیل سمجھتے تھے اور جب مجھکو کسی کتاب کے مطالعہ میں غرق دیکھتے تھے تو چپکے چپکے پیچھے سے آتے اور کتاب کو دور پھینک دیا کرتے تھے میں چنچتا تھا کہ اے جگرؔ وا تو کتاب کی توہین کرتا ہے، وہ کہتے تھے اے جوشا کتاب بھی کوئی چیز ہوتی ہے" [2]

عزیز حسن صاحب مراد آبادی نے راقم الحروف سے ۲۵ دسمبر سنہ ۶۳ء کی ایک ملاقات میں ایک لطیفہ بیان کیا کہ سنہ ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ میں ایک مشاعرہ ہوا جسمیں جگرؔ بھی شریک تھے اسی مشاعرہ میں کسی لڑکے نے جگرؔ سے متعلق ایک ہتک آمیز نظم پڑھی جگرؔ خاموشی سے اس کی نظم سنتے رہے اور اس نظم کے ختم ہونے کے بعد انھوں نے اس کے جواب میں وہیں ایک فی البدیہہ شعر کہہ کر پڑھ دیا ؎

دیکھو ادھر منھ موڑ نا گھگھو ہے یا کٹ بھوڑ نا ہاں دم نہ اس کی چھوڑ نا اڑ جائے گا پروار ہے

درگا پرشاد شادؔ نے ایک لطیفہ لکھا ہے کہ ایک مشاعرہ میں

"تھوڑی دیر میں جگرؔ صاحب تشریف لے آئے اور مشاعرہ شروع ہو گیا سب لوگ اپنی اپنی ہوئی غزلیں اور نظمیں پیش کر رہے تھے تاجؔ بھوپالی کی غزل ختم ہونے پر ایک صاحب نے جنھیں سب خوباں بھوپالی کہا کرتے تھے (مجھے اسمیں شک ہے) کہا۔

"تاجؔ صاحب کیا کہنے ہیں پوری غزل مرصع ہے ذرا وہ مطلع کے پہلے والا شعر پھر سنانے کی زحمت

---

[1] شبلی کالج میگزین سنہ ۱۹۶۱ء ص ۷۷، ۷۸ [2] "جگر مراد آبادی" از شوق مراد آبادی (غیر مطبوعہ)

کیجیے،،

جگر صاحب نے سنکر سنجیدگی سے کہا:۔

"کیوں صاحب یہ مطلع سے پہلے والا شعر کون سا ہوتا ہے،، خوباں صاحب کچھ سٹ پٹائے اور بولے "جگر صاحب معاف کیجیے گا۔ میں پان کھا رہا تھا میرا مطلب یہ ہے کہ میرے منھ میں پان تھا،،۔ "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب آپ پان کھاتے ہیں تو منھ سے نہیں بولتے،، ۱؎

قلندرانہ زیست

جگر ایک آزاد فطرت اور مست قلندر قسم کے انسان تھے ان کو کبھی کسی چیز کی پرواہ رہی بھی تو صرف شراب کی وہ بھی اس زمانے میں جب ان کی مے نوشی کا آفتاب بامِ عروج پر تھا انھوں نے اپنی آزاد فطرت کے متعلق خود ہی کہا ہے ؎

میں لاکھ گرفتارِ تعین سہی لیکن ؛ ؛ فطرت مری آزاد ہے آزاد رہے گی ۲؎

انھوں نے اپنے ایک خط میں اپنی قلندرانہ زندگی کے متعلق لکھا ہے:۔

"میں ایک کھلا ہوا رند ہوں اور بس۔ ایک گوشۂ تنہائی، عالمِ خیال کی رنگینیاں، بستر نوازی، چند ساغرِ لبریز، مخصوص احباب، یہی میری دنیا ہے اور یہی میری جنت،، ۳؎

جگر کی قلندرانہ زیست کے متعلق محمود علی خاں جامعی نے صحیح لکھا ہے کہ ان کے پاس جیسے پیسے ہوتے "وہ اسی مناسبت کی شراب پیتے اگر کچھ پیسے بچتے تو فقیروں کو یا بچوں کو بانٹ دیتے تھے کبھی آئندہ کے لیے بچا کر نہیں رکھے ان کو یقین رہتا تھا کہ خدا آئندہ کا انتظام کر دے گا اور وہ ہمیشہ کرتا تھا ...... اکثر جگر صاحب نے شراب کے لیے اپنے پاس کی چیزیں تک بیچ دی ہیں حتیٰ کہ ریل کا ٹکٹ تک بیچ کر شراب پی لی، پانوں کی ڈبیہ، سگریٹ کیس کا تو اکثر نمبر آ جاتا تھا"۴؎

جگر نے نہ تو کبھی روپیوں کی اور نہ اپنی ہی کوئی پرواہ کی ان کو جب بھی اور جہاں سے بھی جو کچھ روپیہ مل جاتا وہ اسے آناً فاناً اڑا دیتے انھوں نے خدا معلوم کس قدر روپیہ مشاعروں سے کمایا لیکن اسے پانی کی طرح بہایا اور احباب پر تو رشید احمد صدیقی کی تحریر کے مطابق روپیہ اس طرح خرچ کرتے تھے جیسے ایک حکومت کسی دوسری حکومت کے شاہی مہمان پر خرچ کرتی ہو

جگر کی ۱۹۲۶ء کی قلندرانہ زیست کے متعلق ۲۰ جنوری ۱۹۶۳ء کی ایک ملاقات میں سراج لکھنوی نے راقم سو بتایا کہ اس زمانے میں جگر کپڑوں سے بالکل بے نیاز رہتے تھے ایک جوڑا کپڑا پہن لیتے تو اسے مہینوں اتارنے کی

۱؎ "یادِ جگر" ص۲۱، ۲؎ "جگر کی بیاض" ص۱ گوشۂ جگر لائبریری جامعہ ملیہ دہلی (یہ شعر غیر مطبوعہ تھا راقم نے اسے یادگارِ جگر میں شائع کر دیا ہے)، ۳؎ جگر کا خط کسی صنفِ نازک کے نام جس پر تاریخ و پتہ کچھ درج نہیں ہے یہ خط راقم کو نواب سید شمس الحسن صاحب نے کراچی میں دکھایا تھا ۴؎ "تذکرہ جگر" ص۵۰

نوبت نہیں آتی وہ جوڑا اسی وقت بدلا جاتا جب کوئی مخلص اس طرف توجہ کر لیتا۔

جگرؔ نے اپنے بعض اشعار میں بھی اپنی قلندرانہ زیست، کو بیان کیا ہے مثلاً ان کے یہ اشعار ان کی قلندرانہ زیست ہی کی غمازی کرتے ہیں :

جگرؔ یہ قیامت کی بے ہوشیاں ۔۔۔ اٹھو سر پہ اب آفتاب آ گیا

برنہ دیکھئے مریکب سے میں اسی طرح خانہ خراب ہوں ۔۔۔ جو نہ مٹ سکا وہ طلسم ہوں جو نہ اٹھ سکا وہ حجاب ہوں

خوشا وہ دور کہ جب عشق ہی زمانہ تھا ۔۔۔ نہ دشت و در تھے نہ گلشن نہ آشیانہ تھا

بیٹھے ہم ہر بزم میں جا کر ۔۔۔ جھاڑ کے اٹھے اپنا دامن

لاکھ آفتاب پاس سے ہو کر گزر گئے ۔۔۔ بیٹھے ہم انتظارِ سحر دیکھتے رہے

یہ منتخب اشعار اگرچہ صرف چند ہیں لیکن ان کی قلندرانہ زیست کی سچی تصویر پیش کرتے ہیں اسی قلندرانہ زندگی کا اثر تھا کہ وہ اپنے دل بے مدعا کا اکثر ذکر کرتے نظر آتے ہیں مثلاً

ہر ایک دل کو عطا کر کے مدعائے حیات ۔۔۔ جگرؔ کو اک دل بے مدعا دیا تو نے

گزر گیا ہوں یوں بھی میں مناظر حیات سے ۔۔۔ کہ جیسے کچھ غرض نہیں حیات سے ممات سے

عشق تو عشق، حسن سے بیزار ۔۔۔ دل کو کیا ہو گیا ہے، کیا کہیے

یہ بیدلی کا زور ہے ساقی کے ہجر میں ۔۔۔ جی چاہتا ہے پھینک دیں ساغر اٹھا کے ہم

ہمت : جگرؔ کی ہمت مردانہ بھی ملاحظہ فرمائیے اپنی ہمت کے متعلق فرماتے ہیں

میری ہمت دیکھنا میری طبیعت دیکھنا ۔۔۔ جو سلجھ جاتی ہے گتھی پھر سے الجھاتا ہوں میں

اور کبھی نصیحت آمیز انداز اختیار کر کے کہتے ہیں ؎

ابھی کوئی منزل نہیں تیری منزل ۔۔۔ ابھی پائے ہمت بڑھاتا چلا جا

ہمت جو ہے بلند تو کچھ اس سے کام لے ۔۔۔ ساقی کا انتظار نہ کر بڑھ کے جام لے

اور کبھی اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

جگرؔ ان حوادث سے گھبرا نہ جانا ۔۔۔ یہی تو ہے دلچسپیوں کا زمانہ

یہ اشعار جگرؔ کی ہمت مردانہ کا ثبوت ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بلند ہمت انسان تھے

بابِ چہارم

جگرؔ کی شاعری کا عہد بہ عہد ارتقاء

(۱) داغِ جگر: اشاعت۔ خالص رسمی شاعری حسن کے خارجی لوازم کا بیان عشقیہ شاعری۔

۲۔ شعلۂ طور: اشاعت۔ اصغرؔ کے اثرات۔ نیم صوفیانہ شاعری عشق کے گہرے ذاتی تجربات۔

۳۔ آتشِ گل: اشاعت۔ آتشِ گل میں محبوب کا تصور۔ عشق کا اعلیٰ تصور۔ گہری داخلیت۔

(ب)۔ داغؔ، مومنؔ اور دوسرے اساتذہ کا اثر۔ بنیادی تصورات۔ مشاعروں کے لئے غزلیں۔

(ج)۔ جگرؔ کا فارسی کلام

ترتیب

۱۔ داغِ جگر

اشاعت: مرزا احسان احمد ایڈووکیٹ (اعظم گڑھ) نے اپنے سنہ ۱۹۲۶ء کے ایک مضمون[1] میں جگر کے کلام کے متعلق لکھا تھا کہ جگر کے اوراقِ شاعری ابھی تک منتشر ہیں اور اس پریشان حالی نے بہت سے جواہرِ بے بہا کھو بھی دیئے تاہم جو بکھرے ہوئے چند پھول رہ گئے ہیں اگر ان کا گلدستہ بنا دیا جاتا اور جب اس گلدستے کو بنانے کی طرف کسی نے توجہ کی تو مرزا صاحب نے خود (جیسا کہ ان کے ایک خط بنام تبسم نظامی جو تبسم نظامی ہی کے پاس محفوظ ہے) سے ظاہر ہوتا ہے سنہ ۱۹۲۲ء میں[2] اس گلدستے کو سجا کر اہلِ علم و ادب کے سامنے پیش کیا۔ یہ مرزا صاحب کی ادب نوازی اور جگر کی قدردانی تھی اس گلدستہ کا نام "داغِ جگر" ہے اور اس میں جگر کا تقریباً سنہ ۱۹۰۳ء سے سنہ ۱۹۲۱ء تک کا کلام شامل ہے یہ زمانہ جگر کے مراد آباد، آگرہ، گونڈہ اور اعظم گڑھ کے قیام کا ہے اس مجموعہ کو جگر کے دورِ اول کا کلام بجا طور پر قرار دیا جا سکتا ہے یہی ان کی شاعرانہ زندگی کا آغاز تھا اور اس شاعرانہ زندگی کے آغاز کے متعلق تابش نقوی نے صحیح لکھا ہے کہ:-

"شاعر جب اپنی شاعرانہ زندگی کا آغاز کرتا ہے تو اس کے شعر میں "دل و دماغ" دونوں ہی کی پرکاری کو دخل ہوتا ہے مگر اس کی تخلیقی قوتوں کا اضمحلال اس تخلیق کو اسی انداز سے پیش کرتا ہے جو اس سن و سال میں ہونا چاہیئے جوں جوں زمانہ گزرتا ہے اس چمن کی آبیاری ہوتی جاتی ہے اور طرح طرح کے پھول کھلتے اور بکھرتے رہتے ہیں، ماحول، وقت، قوتِ مشاہدہ، اندازِ فکر، احساسِ قلب، قدرتِ بیان اور اپنے پیشروؤں یا ہمعصروں کا اثر قبول کرنے پر یہ ناپختہ نگاہ اور دل و دماغ مجبور ہو جاتے ہیں"[3]

جگر نے بھی ابتدا میں اپنے پیشروؤں اور ہمعصروں کا اثر قبول کیا یہی وجہ ہے ان کے ابتدائی دور کے کلام میں

---

[1] مرزا احسان احمد صاحب نے اس مضمون کے متعلق "فروغِ اردو" فروری و مارچ سنہ ۱۹۶۲ء میں ص ۱۶ پر خود لکھا ہے کہ:-

"سب سے پہلے "اہالیانِ دہلی و لکھنؤ کے لئے زنگِ خوابِ ادب" کے عنوان سے میں نے ایک مختصر مقالہ سپردِ قلم کیا تھا جس کو مولانا تاجور نجیب آبادی نے ایک خاص نوٹ کے ساتھ مطبوعہ سنہ ۱۹۲۶ء کے مخزن میں شائع کیا تھا" راقم الحروف کو یہ مقالہ "بشیر ضیائی صاحب لاہور کے کتب خانے میں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

---

[2] محمود علی خان جامعی نے "داغِ جگر" کی اشاعت کے سلسلے میں تذکرۂ جگر میں ص ۱۱۹ پر لکھا ہے "غالباً سنہ ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی ہے" جو غالباً نہیں یقیناً غلط ہے۔

[3] "نظامِ جدید" ۱۶ و ۲۳ ستمبر سنہ ۱۹۶۲ء ص ۱۵

خالص رسمی شاعری کا عنصر بڑی حد تک موجود ہے۔

۱۔ خالص رسمی شاعری جگر نے ابتدا میں اس حد تک رسمی شاعری کی کہ فحش اشعار تک کہے جس کے متعلق ایک دفعہ حافظ لدھیانوی کے دریافت کرنے پر انھوں نے فرمایا "ہاں بھئی ابتدا میں کچھ دنوں ایسے اشعار کہے تھے خود کا نقصان ہوتا تھا اسلئے جلدی ایسے اشعار کہنا ترک کر دیے"[۱]

اس بات کی تصدیق قمر مراد آبادی نے بھی راقم سے ۲۴/۱۰ دسمبر ۶۳ء کی ایک ملاقات میں کی سیفی گنوری کی یہ رائے ہے کہ جگر کے "دورِ اول میں آپ کی نظر شمع و پروانہ، صیاد و قفس، اسیر کا زلف دوتا، بادِ صبا، بجلی اور جنون" پر رہ گئی ہے۔

سیفی گنوری کے اس بیان کی تصدیق جگر کے دورِ اول کے ان اشعار سے ہوتی ہے جن میں انھوں نے پروانہ، شمع، قاتل، نشتر، تیر نظر، محبوب کی شوخی ستم ظریفی آنکھ، زہر، قید، نالۂ دل، حشر، آہ و زاری، خون، جوشِ جنوں، بیاباں، گریباں، دامن، صیاد، قفس، آشیاں، گیسو کی حکایت، برق، دشت، ہائے و ہو، آنسوؤں کی جھڑی، جنوں، زنجیر، پریخانہ، دل کا اضطراب، دہشت، نوردی وغیرہ وغیرہ کا تذکرہ بڑے شد و مد کے ساتھ کیا ہے

سب سے پہلے جگر کے بالکل ابتدائی دور کے چند اشعار جو انکے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں ملاحظہ ہوں

"تصورِ حبیب کسی دستِ نگاریں کا رہا دل میں — تو شمع طور ہو کر رنگ لائی کیا حنا دل میں
حسرت ہوں کہ حسرت کو ہے حسرت مری حسرت کی — وہ مضطر ہوں کہ گویا ہے گزر سیماب کا دل میں
مدد ہائے خنجر ابروئے قاتل تا نکل جائے — کہ چبھتا ہے مثالِ خار حرفِ مدعا دل میں
وہ میں ہوں جس سے باقی نام ہے مہر و محبت کا — وہ تم ہو جس سے فرماتے رہے جور و جفا دل میں
وہ بیکس ہوں کہ میری بیکسی پر بسکہ اے قاتل — کیا کرتی ہے حسرت خندۂ دنداں نما دل میں
وہ کہتے ہیں کہ اپنے جاں دیدی سکھیا کھا کر — خدا جانے جگر کمبخت کے کیا آ گیا دل میں"[۲]

راقم کو جگر کے ابتدائی دور کی دو غزلیں بشیر ضیائی صاحب (لاہور) کے کتب خانہ سے بھی دستیاب ہوئیں۔ کچھ اشعار ان غزلوں کے بھی ملاحظہ فرمائیے؎

"مقابل کاش میرے دیدۂ تر ہو گئے ہوتے — تمھاری بزم میں آئینے پتھر ہو گئے ہوتے
دیا صدقہ وفا کا بڑھ کے پروانوں کی حسرت نے — مرے داغِ محبت شمع کے سر ہو گئے ہوتے
بہت اچھا ہوا بسمل کیا دل کو جو قاتل نے — کہ اپنے خود مرے نالے ہی نشتر ہو گئے ہوتے"[۳]

"بیادِ نزع ہے، انکے لب پہ ہنسی ہے — کہاں میرے یارب مری بیکسی ہے"

۱۔ "نگارشِ جگر" نمبر (غالباً ۱۹۶۱ء رسالے پر ماہ و سنہ درج نہیں ہے) ص ۱۴۲

۲۔ "صبحِ امید" جولائی ۱۹۰۸ء ص ۱۷ ۳۔ "جلوۂ یار" میرٹھ۔ مئی ۱۹۱۰ء

۴۔ "نقاد" فروری ۱۹۱۲ء ص ۴۲

تمنا ہے دل کی کہ ہو جاؤں قرباں
ترے ایک تیرِ نظر کی کمی ہے

جواں ہوتے ہی حشر برپا کرے گا
قیامت کسی شوخ کی کمسنی ہے"[1]

یہ اشعار تو وہ تھے جو انکے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہیں لیکن خود داغِ جگر میں بھی ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے جن میں محض رسمی خیالات اور اپنے تجربات کو ایک خاص انداز میں پیش کیا گیا ہے جیسے ؎

چھپائے ہوئے تھے ترا رازِ عشق
مگر آہ تو سینہ بھی شق ہو گیا

کیا خاک جواب انکو دوں انکے سوالوں کا
لب خشک ہیں زخموں کے منہ بند ہے چھالوں کا

نقشِ وفا کا رنگ مٹایا نہ جائے گا
مل بھی گیا جو زہر تو کھایا نہ جائے گا

ایسا گماں بہار میں رنگینیوں کا جوش
شاملِ کسی کا خونِ تمنا ضرور تھا

دل کو نہ چھیڑ اے غمِ فرقت کہ اب یہ دل
تیرے بھی التفات کے قابل نہیں رہا

کس کس پہ جان دیجئے کس کس کو چاہیئے۔
گم ہو گئے ہیں بزمِ تمنا میں آ کے ہم

داغ ہی داغ نظر آتے ہیں
کس طرح قلب و جگر دیکھوں میں

ہر قدم پر، ہر روش پر، ہر ادا پر، ہر جگہ
دیکھنا پڑتا ہے اندازِ نگاہِ یار کو

پیہم ہجومِ یاس سے آتا نہیں یقیں
تم میرے سامنے ہو کہ دھوکا نظر کا ہے

گوشے گوشے میں نہاں جلوۂ جانانہ ہے
دل نہیں ہے مرے سینے میں پری خانہ ہے

کسی صورت بھی ہم سے بچ کر وہ رہ نہیں سکتے
جو ہم ایسا سمجھتے ہیں ہماری کم نگاہی ہے

مسرور وقتِ نزع جو بیمار ہو گئے
کیا جانے کیا اشاروں میں اقرار ہو گئے

ترکِ خودی سے مائلِ پندار ہو گئے
آزاد ہوتے ہوتے گرفتار ہو گئے

اب دل لگا کے روتے ہیں وہ حضرتِ جگر
رونا یہ ایک دن کا نہیں عمر بھر کا ہے

حسن کی سحر کاریاں عشق کے دل سے پوچھئے
وصل کبھی ہے ہجر سا ہجر کبھی وصال سا

میری رگ رگ میں سما کر بھی یہ پردہ مجھ سے
ظلم ہے ظلم جو آئینہ سے شرمائیں آپ

جسنے بنا دیا مجھے وحشی و خستہ حال سا
ہائے وہ شکل چاند سی ہائے وہ قد نہال سا

مندرجہ ذیل اشعار میں انھوں نے جوشِ جنوں، بیاباں، چشمِ شوق، منزل، دشت نوردی وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں جنکا شمار محض رسمی شاعری میں کیا جاتا ہے ؎

اللہ ری مری تیز روی جوشِ جنوں میں
مڑ کر جو نظر کی تو بیاباں نہیں دیکھا

دستِ جنوں کا ضعف میں اٹھنا محال تھا
کیا جانے کس طرح سے گریباں نکل گیا

---

[1] ''نقاد'' مارچ ۱۹۱۴ء صفحہ ۲۳

دل میں تو آگ ہے وہی اب تک لگی ہوئی
مانا کہ چشمِ شوق کا ارماں نکل گیا

بس اک نگاہِ محبت سے دیکھ لینا ہے
مگر، جو خاطرِ نازک پہ یہ بھی بار نہ ہو

کیا چیز تھی کیا چیز تھی ظالم کی نظر بھی
اُف کر کے وہیں بیٹھ گیا دردِ جگر بھی

آنکھوں میں بند جلوۂ جاناں کئے ہوئے
جاتا ہوں ذرے ذرے کو حیراں کئے ہوئے

گُم ہو گیا ہوں خیالِ جاناں میں
بیخودی میری جستجو نہ کرے

نگاہِ شوق نے محشر میں صاف تاڑ لیا
کہاں وہ چھپتے کہ آنکھوں میں تھے سمائے ہوئے

ہر سو دکھائی دیتے ہیں وہ جلوہ گر مجھے
کیا کیا فریب دیتی ہے میری نظر مجھے

ڈالا ہے بیخودی نے عجب راہ پر مجھے
آنکھیں ہیں اور کچھ نہیں آتا نظر مجھے

حاصلِ دشت نوردی ہیں یہ اے دستِ جنوں
آبلے ٹوٹ جائیں کہیں، زنجیر کے ساتھ

بچ رہا ہو جو کوئی جوشِ جنوں کے ہاتھوں
تار ایسا کوئی اب جیب و گریباں میں نہیں

مندرجہ ذیل اشعار میں انھوں نے گل و بلبل، صیاد، آشیاں قفس، برق وغیرہ جیسے رسمی مضامین نظم کیے ہیں مثلاً ؎

ہائے کس بلبل نے اے صیاد پھر دیکھا قفس
بال و پر بکھرے پڑے ہیں آشیاں سے تا قفس

رکھ دیئے ہیں سامنے لا کر کمالِ عشق نے
اک طرف صدہا گلستاں اک طرف صدہا قفس

آشیاں کے جو اٹھا لوں تنکے
اپنے ٹوٹے ہوئے پر دیکھوں میں

پھر برق سے مجھکو نہ رہے کوئی شکایت
ایسی ہی لگے آگ جو صیاد کے گھر میں

اٹھا نہ دیدۂ بلبل سے پردۂ غفلت
ہلاک ہو گئی کمبخت رنگ و بو کے لئے

نہ توڑ اسے دستِ گلچیں باغ میں ہونے دے کلی کو
کہ اس میں کچھ شباہت پائی جاتی ہے مرے دل کی

اب قفس میں یاد آیا تو یہ حیرت ہے ہمیں
کس طرح آنکھوں سے لٹتے آشیاں دیکھا کئے

ہر شاخ پر ہے باغ میں صیاد کی نگاہ
مطلب یہ ہے کہیں نہ مرا آشیاں رہے

کیا جانئے قفس میں رہے کیا معاملہ
اب تک تو ہیں عزیز مرے بال و پر مجھے

بنا کر اپنے ہاتھوں آشیاں برباد کرتے ہیں
جو تیرا کام تھا، وہ بھی ہم اے صیاد کرتے ہیں

بعض اشعار میں انھوں نے نالہ و فریاد، دل کی بیتابی، محبوب کی شوخی، اپنی مجبوری وغیرہ جیسے مضامین نظم کیے ہیں جنکا بیان عاشقانہ شاعری میں رسمی طور پر ہوتا ہے جیسے ؎

لب پہ نالہ نہیں شکوہ نہیں فریاد نہیں
پھر بھی فرماتے ہیں تو لائقِ بیداد نہیں

کسی بے کس کا پڑا صبر کسی پر شاید
آج اس سمت سے ناساز ہوائیں آئیں

بڑھی جاتی ہے وحشت ہر قدم پر
چھپا جاتا ہوں گردِ کارواں سے

وفا کا نام کوئی بھول کر نہیں لیتا
ترے سلوک نے چونکا دیا زمانے کو

یہ جرم الفت ہے تو وہ جرم دیدار
دل لے کے چلے ہو، تو لئے جاؤ نظر بھی

یہ نہیں تیری آرزو نہ کرے
دل مگر، خالی ہائے ہو نہ کرے

عشق پر کچھ نہ چلا دیدۂ تر کا قابو
اسنے جو آگ لگا دی وہ بجھائی نہ گئی

آج کن آنکھوں سے یہ جور خزاں دیکھا گیے
جب چمن لٹتا رہا اور باغباں دیکھا کیے

مجھے اسکے در پہ ہے مرنا ضرور
مری یہ ادا اسکو بھا جائے گی

یہ جانتا ہوں جانتے ہو میرا حال دل
یہ دیکھتا ہوں دیکھتے ہو کس نگاہ سے

دل نے اگر چھپا بھی لیا داغ آرزو
آنکھوں سے تو یہ راز چھپایا نہ جائے گا

لے چلا ہوں میں بھی نذر حسن جاناں کو مگر
ساتھ دل کے ایک ساز آرزو ٹوٹا ہوا

ان کے یہاں بعض ایسے رسمی اشعار بھی ملتے ہیں جنہیں شمشیر و تیر وغیرہ کا ذکر ملتا ہے مثلاً ؎

چلتے ان ہاتھوں کے مجھ کو بھی خبر تک نہ ہوئی
اس نزاکت سے گلے پر مرے شمشیر چلی

اب مری لاش پہ کیوں سوگ لئے بیٹھے ہو
تم نے شمشیر چلائی تھی تو شمشیر چلی

کس قیامت کی کشش اس جذبۂ کامل میں ہے
تیر انکے ہاتھ میں پیکاں ہمارے دل میں ہے

کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جنمیں محض گریبان و دامن وغیرہ جیسے رسمی الفاظ نظم کیے گئے ہیں ؎

پردہ رکھنا تھا جو منظور تو عاشق کے لئے
دامن یار کو لازم تھا گریباں ہونا

مجھ ناتوان عشق کو سمجھا ہے تمنے کیا؟
دامن پکڑ لیا، تو چھڑایا نہ جائے گا

عشق میں کار راز وہی سوختہ ساماں سمجھا
جسنے دامن کبھی جانا، نہ گریباں سمجھا

سخت مشکل سے پڑا آج گریباں پہ ہاتھ
میں سمجھتا تھا کہ یہ فاصلہ کچھ دور نہیں

حال وحشت میں ہوا یہ ترے دیوانوں کا
جیب پھوٹی تو گریباں لئے بیٹھے ہیں

آگئی کون سی حسرت دل سوزاں کے قریب
کچھ دھواں سا ابھی اٹھا تھا گریباں کے قریب

ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ جگر نے ابتدائی زمانے میں خالص رسمی قسم کی شاعری کی تھی جسے انکی ابتدائی یا مشقیہ شاعری کے نام سے بجا طور پر موسوم کیا جاتا ہے۔

۲۔ حسن کے خارجی لوازم کا بیان: اگرچہ حسن کے خارجی لوازم یا خارجیت کا بیان لکھنؤ اسکول کا حصہ ہے لیکن اردو شاعری میں بیشتر اردو شاعروں کے یہاں کچھ نہ کچھ خارجیت کا عنصر ضرور ملے گا کیونکہ خارجیت کا بیان عاشقانہ شاعری کا جزو لازم ہے اسکے بیان سے کوئی بھی عاشق شاعر نہیں بچ سکا ہے جگر بھی اس سے مبرا نہیں ہیں حالانکہ وہ نہ تو لکھنؤ اسکول کے شاعر ہیں نہ دلی اسکول کے۔ وہ دونوں اسکولوں سے آزاد ہیں لیکن عاشقانہ شاعری کی خصوصیات جو دوسرے شعراء کے کلام میں ملتی ہیں جگر کے یہاں بھی پائی جاتی ہیں انھوں نے بھی حسن کے خارجی لوازم کو

متقدمین و متاخرین اردو شعراء کی طرح اپنے اشعار میں بیان کیا ہے لیکن بہت کم کیونکہ وہ زیادہ تر دلی اسکول کے شعراء سے متاثر رہے ہیں اور دلی اسکول کے شعراء میں خارجیت کے بجائے داخلیت کا عنصر زیادہ ملتا ہے اسلئے جگر کے یہاں بھی خارجیت کا بیان کم ہے۔

جگر نے بھی خارجیت کے بیان کرنے میں دوسرے عاشق شعراء کی طرح اپنے اشعار میں محبوب کے رخ، زلف، سفاک چتون، قاتل نظر، فردوس نظر، نگاہ مست، نرگس مستانہ، چشم غزالیں، چشم مخمور، نقاب رخ، عارض وغیرہ وغیرہ جیسے الفاظ کا استعمال کر کے محبوب کے خارجی حسن کو اپنے مخصوص دلکش انداز میں بیان کیا ہے خارجیت سے متعلق انکے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

پریشاں ہو کے زلفوں کا وہ اس رخ پر بکھر جانا ۔۔۔ وہ سوتے سوتے چونک اٹھنا وہ لیٹے لیٹے ڈر جانا[۱]
جو عشوے کی ادائیں نکتہ نازیں ہیں ۔۔۔ چشم مخمور میں کل راز ہے میخانے کا
حیا میں گئے تو رنگِ مستی، ادا میں ہو تو حجاب پیدا ۔۔۔ وہ آنکھ خود ہی بنے گی ساقی نظر کرے گی شراب پیدا
ہوا کا اس طرف انکی نقاب رخ الٹ دینا ۔۔۔ ادھر ایک اک لہو کی بوند کا سرشار ہو جانا
دل کی کیا تاب کہ پہنچے صف مژگاں کے قریب ۔۔۔ جلوے خود لوٹ رہے ہیں رخِ تاباں کے قریب
کام آخر آ گئی وہ نرگس مستانہ آج ۔۔۔ بھر گیا بے منتِ ساقی، مرا پیمانہ آج
چھلک گیا ایک ایک میکش اس نگاہ مست سے ۔۔۔ تم ادھر دیکھا کیے، اور لٹ گیا میخانہ آج
وہ مست مست نیند آنکھیں وہ سرخ مثلِ شہاب عارض ۔۔۔ جو ہیں مجسم شراب آنکھیں تو ہے سراپا شباب عارض
برس رہا ہے یہ رنگ مستی، کہ ہوش باقی نہیں کسی کو ۔۔۔ نگاہیں انکی جھکی ہوئی ہیں پلا رہے ہیں شراب عارض
ہوچلی تھیں عرض غم پر وہ نگاہیں تیز تر ۔۔۔ پھر نہ جانے کیا خیال آیا، پشیماں ہو گئیں
کس ادا پر جان دوں تو ہی بتا اے چشم یار ۔۔۔ جس ادا کو دیکھتا ہوں حسن کی تصویر ہے
وہ ادھر محو تماشا ہیں ادھر مرعوب حسن ۔۔۔ وصل کی شب دونوں جانب عالم تصویر ہے
سفاک چتونیں بھی ہیں قاتل نظر بھی ہے ۔۔۔ کیا چیز ہو گئے ہو تمہیں کچھ خبر بھی ہے
اس چشم غزالیں کو میخانہ دل پایا ۔۔۔ اس روئے نگاریں کو فردوس نظر دیکھا

ان اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ ابتدائی دور میں جگر کے یہاں حسن کے خارجی لوازم بالکل سطحی اور سادہ انداز میں بیان ہوتے تھے جیسا کہ اس عہد کے اکثر شعراء کے یہاں ملتا ہے

---

[۱] اس عنوان کے تحت جتنے بھی اشعار پیش کیے گئے ہیں سب "داغ جگر" سے لیے گئے ہیں جو شائع شدہ ہیں باقی دوسرے عنوانات کے تحت بھی جو اشعار انکے مختلف مجموعوں سے پیش کیے گئے ہیں انکا حوالہ اس لئے نہیں دیا گیا ہے کیونکہ وہ اشعار انکے مجموعوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن جو اشعار مطبوعہ ہیں یا جن میں کوئی خاص تبدیلی وغیرہ ہوئی ہے انکے لیے حوالے کے ساتھ نوٹ لکھ دیا گیا ہے

۳۔ عشقیہ شاعری | عشق صرف اردو شاعری ہی کا نہیں بلکہ ہر زبان کی شاعری کا اہم ترین موضوع رہا ہے اور ہر زبان کی شاعری کا بیشتر حصہ عشق ہی کی واردات سے بھرا پڑا ہے۔ عشق دراصل ایک فطری لگن، تڑپ اور سوز کا نام ہے اور فطرت نے سلسلۂ حیات قائم کرنے کے لیے اسکے والہانہ پن سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے زندگی کا تسلسل، ربط و وصل کے بغیر ممکن نہیں تھا اور عشق کا جذبہ ہی اس وصل کا سب سے بڑا معاون ہوا۔

اگر قدیم شاعری کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اس شاعری میں عشق کا جذبہ درحقیقت خواہش وصل، ہی کا دوسرا نام تھا بعد کی شاعری میں فکری عناصر کی آمیزش سے عشق کا مزاج کافی حد تک بدل گیا اور اسکی تندی اور وحشت کے بجائے اسمیں رفعت اور لطافت پیدا ہوگئی پھر بھی عشق کی نوعیت یہی لگن اور تڑپ کی سی رہی جسکی منزل سوائے وصل کے اور کچھ نہیں تھی۔

جگر ایک عاشق شاعر تھے اسی لیے انکے سارے کلام میں عشق ہی کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے انھوں نے اپنے کلام میں تصور محبت، تصورِ عشق اسکی لگن اور تڑپ، تصورِ حسن، کیفِ آرزو اور شدتِ جذبات کا اظہار کثرت سے کیا ہے انکے ابتدائی دور کا کلام (داغِ جگر) ان کے عشقیہ جذبات و احساسات کا آئینہ دار ہے مثال میں مندرجہ ذیل اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں

مجھکو تسلیم حسیں ساری جماعت نے کیا — دیکھ کیا کام مرے دردِ محبت نے کیا
انکو بلا کے اور پشیماں ہوئے جگر — یہ کیا خبر تھی ہوش میں آیا نہ جائیگا
آج کیا حال ہے یارب سرِ محفل میرا — کہ نکالے لیے جاتا ہے کوئی دل میرا
کسی کا وعدۂ دیدار میرا جذبۂ شوق — بنا نہ دے کہیں، تصویرِ انتظار مجھے
نازک ترے مریضِ محبت کا حال ہے — دن کٹ گیا تو رات کا کٹنا محال ہے
وفا پہ دل کو صدقے، جان کو نذرِ جفا کر دے — محبت میں یہ لازم ہے کہ جو کچھ ہو فنا کر دے
شب وصل کیا مختصر ہو گئی — ذرا آنکھ جھپکی، سحر ہو گئی
جھک گئے سر تری دہلیز پہ سب آپ سے آپ — کچھ کسی کی نہ چلی جب ترے احکام چلے
وہ ہم سے ملتے نہ ملتے یہ انکی تھی مرضی — ہمارا کام یہی تھا کہ جستجو کرتے
دل بہلنے کی شبِ غم یہی صورت ہوگی — آپ کی دی ہوئی تکلیف بھی راحت ہوگی
نگاہِ یاس ذرا تو ہی کام کر اپنا — کہاں وہ چھوڑ کے جاتے ہیں بیقرار مجھے
ہر بار یاس و ہجر میں دل کی ہوئی شریک — ہر مرتبہ امید نے دھوکا دیا مجھے
ہاں ٹھیس نہ لگ جائے اے دردِ غمِ الفت — دل آئینہ خانہ ہے آئینہ جمالوں کا
پہلے جو ختم ہو گئی یہ داستانِ عشق — تو میں کہونگا عرصۂ محشر دراز تھا

بعض اشعار میں انھوں نے اپنے عشقیہ تجربے بھی بیان کیے ہیں مثلاً ؎

جاتے رہے دم بھر میں سارے وہ گلے شکوے — اس جانِ تغافل نے جب ایک نظر دیکھا
آہ میری یہ فغاں، اب نہ سنی جائیگی — اب نہ سنو داستاں اب نہ سنی جائیگی

عاشقی یاس کی محکوم ہوئی جاتی ہے — بیکسی اب مرا مفہوم ہوئی جاتی ہے
جگر اب بتائیے کچھ حالِ زار خیر تو ہے؟ — یہ کیوں برستی ہیں مایوسیاں نگاہوں سے
آیا نہ راس نالۂ دل کا اثر مجھے — اب تم ملے تو کچھ نہیں اپنی خبر مجھے
دے چکا جب دل تو کیسا خوف شہرت ہو تو ہو — اب یہ سر جائے تو جائے اور قیامت ہو تو ہو
سب کو ہم بھول گئے جوشِ جنوں میں لیکن — اک تری یاد تھی ایسی جو بھلائی نہ گئی
یاد ہے آج تک مجھے پہلے پہل کی رسم و راہ — کچھ انہیں اجتناب سا، کچھ مجھے احتمال سا
وہ تھے بہار تھی دلِ حسرت طراز تھا — پیہم ادھر سے ناز ادھر سے نیاز تھا
بھول سکتا ہوں کہیں انکی محبت کے مزے — میری آنکھوں میں وہ ایک ایک ادا پھرتی ہے
کہنے سننے کی غمِ عشق میں حاجت ہی نہیں — آنکھ سے ٹپکے گی گر دل میں محبت ہوگی
بزم سے باچشمِ تر اٹھ گئے کہتے ہوئے — "ہم سے تری داستاں اب نہ سنی جائیگی"

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعہ سے جگر کی عشقیہ شاعری، انکے عشقیہ جذبات و احساسات اور انکے عشقیہ تجربات کا پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے عشق میں کیسے کیسے تجربات کیے اور انکو اپنے مخصوص اندازِ بیان کے ساتھ اشعار کی شکل میں پیش کیا۔

(۲) شعلۂ طور

اشاعت: جگر کے کلام کا ایک انتخاب "شعلۂ طور" کے نام سے پہلی دفعہ علی گڑھ یونیورسٹی سے سنہ ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا تھا لیکن چونکہ یہ انتخاب اصغر گونڈوی نے بہت سختی سے کیا تھا اس لئے جگر کو یہ انتخاب پسند نہیں آیا بلکہ وہ ایک حد تک اس انتخاب سے کبیدہ خاطر بھی ہوئے جب نواب سید علی حسن خان صاحب (بھوپال ہاؤس لکھنؤ) کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو انھوں نے اس اڈیشن کی تمام کاپیوں کو جو تقسیم ہو چکی تھیں فراہم کر کے ضائع کرادیں اور اسکے دوسرے اڈیشن کے طبع کرانے کے لئے اپنے صاحبزادے نواب سید شمس الحسن کو از سر نو ترتیب دینے کے لئے مامور کر دیا اور جب دیوان ترتیب پا چکا تو انھوں نے اسے خود اپنے اخراجات سے غالباً سنہ ۱۹۳۲ء میں شائع کرایا اسکی طباعت کے سنہ کا سراغ "شعلۂ طور" کے ایک نسخے سے ملتا ہے جو نامی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا اور جو گوشۂ جگر لائبریری جامعہ ملیہ میں موجود ہے اگرچہ اسپر سنہ طباعت درج نہیں ہے البتہ اس مجموعہ کی ابتدا میں رشید الظفر اور جگر کی تصویریں بالترتیب دستخطوں کے ساتھ شائع ہوئی ہیں۔

رشید الظفر کے دستخط کے نیچے سنہ ۱۹۳۲ء لکھا ہے اور جگر کے دستخط کے نیچے سنہ ۱۹۳۲ء لکھا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ سنہ ۱۹۳۲ء[1]

---

[1] نواب سید شمس الحسن نے جگر پر اپنی غیر مطبوعہ کتاب میں اس مجموعہ کی سنہ طباعت سنہ ۱۹۳۳ء لکھی ہے (بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

میں شائع ہوا ہو گا کیونکہ رشید الظفر کی تصویر پر ۱۹۳۳ء لکھا ہے اسلئے بہت ممکن ہے کہ اسکی طباعت بھی ۱۹۳۳ء ہی میں ہوئی ہو کیونکہ اس سے پہلے والے ایڈیشن (جو علی گڑھ سے شائع ہو چکا تھا) کی تمام کاپیوں کو تلاش کر کے ضائع کرنے اور مجموعہ کو دوبارہ ترتیب دینے میں جسمیں جگر بھی بوجوہ درجہ کاہل اور مصروف انسان تھے) شریک رہے ہوں ایک ہی سال میں مکمل ہو جانا قرین از قیاس نہیں ہے یقیناً اس مجموعہ کو دوبارہ شائع ہونے میں دو سال لگ گئے ہونگے ان دلائل کے پیش نظر یہ مجموعہ ۱۹۳۳ء سے پہلے شائع نہیں ہو سکتا تھا۔

۱۔ اصغر کے اثرات: "شعلۂ طور" کا مطالعہ کرتے ہی سب سے پہلے یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ اس وقت تک جگر اصغر سے اچھی طرح متاثر ہو چکے تھے اور احمد رفاعی نے یہ صحیح لکھا ہے کہ اصغر نے "اپنے فیض صحبت سے جگر کا مسلک بھی بدل دیا اور انکو بھی یکسر طرفہ اور تنگ و تاریک نظریاتی بھول بھلیوں سے نکالکر زندگی کی وسیع، واضح، گرانقدر اور نہ معلوم کتنی حقیقتوں سے روشناس کرا دیا جگر کے اشعار مابعد میں اخلاقی نظائر کی جو کثرت نظر آتی ہے اسے براہ راست اصغر کے فیضان صحبت کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے،" ۔ انکی شاعری پر اصغر ہی کے تصوف کا اثر ہے جگر، اصغر کی ان غزلوں سے بھی جنمیں اصغر نے حقیقت و مجاز کا بیان کیا ہے متاثر ہوئے ہیں لیکن انھوں نے اپنی انفرادیت ہر جگہ قائم رکھی ہے انھوں نے ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے اصغر سے استفادہ تو کیا لیکن اپنی شخصیت کو بھی ہمیشہ نظر میں رکھا اسلئے انکو اصغر کا مقلد کہنا بیجا ہو گا کیونکہ تقلید انھوں نے کسی کی بھی پسند نہ کی بلکہ اسے فطری شاعر کے لئے وہ توہین سمجھتے تھے البتہ اہل علم و فن کا وہ بے حد احترام کرتے اور ان سے عقیدت بھی رکھتے تھے اصغر کا بھی وہ بے حد احترام کرتے تھے اور ان سے عقیدت رکھتے تھے جسکا اعتراف انھوں نے اپنے اشعار اور نثر دونوں میں کیا ہے اصغر اور جگر کی ملاقات ۱۹۱۶ء میں ہوئی اور جگر کا پہلا مجموعہ "داغ جگر" ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا اسلئے اصغر کا اثر ان کے پہلے

(بقیہ پچھلے صفحے کا حاشیہ) اور جگر کے ۱۹۳۲ء کے ایک خط بنام نواب سید علی حسن خاں، صہبا مراد آبادی کا کہا ہوا قطعہ تاریخ طبع "شعلۂ طور" بھی نقل کیا ہے ؎

زمانہ ہے اس بات پر متفق | زمانے سے اچھا جگر کا کلام
کہی دل نے صہبا یہ تاریخ طبع | کلام جگر خوش چھپا لا کلام

بہت ممکن ہے کہ جب "شعلۂ طور" کو ترتیب دیا جا رہا تھا اسی زمانے میں صہبا نے یہ قطعہ کہہ کر جگر کے حوالے کیا ہو اور جگر نے اسے نواب سید علی حسن کو لکھکر اسیوقت بھیجدیا ہو اور اسکی طباعت ۱۹۳۲ء میں ہوئی ہو کیونکہ اس مجموعہ کی دوبارہ طباعت ۱۹۳۳ء کسی طرح ثابت نہیں ہوتی

محمود علیخاں جامعی نے اس مجموعہ کی اشاعت کے متعلق "جامعہ" نومبر ۱۹۶۱ء میں ص۲۳۲ پر لکھا ہے کہ یہ دوبارہ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا لیکن جامعی نے جگر کے متعلق تمام باتیں اپنے قیاس سے لکھی ہیں جو بیشتر غلط ہیں اسلئے انکی اس بات پر بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور آخر کار اسی نتیجہ پر پہنچنا پڑتا ہے کہ یہ مجموعہ دوبارہ ۱۹۳۲ء ہی میں شائع ہوا ہو گا احمد رفاعی نے "تحریک" اکتوبر ۱۹۶۲ء ص۵۰ پر لکھا ہے کہ "شعلۂ طور" کا دوسرا انتخاب ۱۹۳۵ء میں مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوا، لیکن انھوں نے اسکا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے کہ انکو یہ کیسے معلوم ہوا کہ دوسرا انتخاب ۱۹۳۵ء میں دہلی سے شائع ہوا ہم نے محولہ بالا "شعلۂ طور" جو نامی پریس لکھنؤ سے چھپا ہے خود مطالعہ کیا ہے۔

۱۔ رسالہ "اردو" ۱۱ جولائی ۱۹۵۹ء ص۵۴

مجموعہ ہی سے نظر آنے لگتا ہے مثلاً یہ شعر جس میں انھوں نے اصغر کے کمالِ شاعرانہ اور ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے ؎

کیونکر بہارِ شعر سے ٹپکے نہ اے جگرؔ
رنگِ کلام حضرتِ اصغرؔ نظر میں ہے

"داغِ جگر" ہی میں ملتا ہے اسکے بعد "شعلۂ طور" میں تو انھوں نے اپنے متعدد اشعار میں اصغرؔ سے عقیدت اور انکے احترام کا ذکر کیا ہے بلکہ ایک جگہ تو وہ ان سے متاثر ہو کر انکو مخاطب کرتے ہوئے اپنے کو ان ہی جیسا بنا دینے کو کہتے ہیں مندرجہ ذیل اشعار سے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے ۔

نگاہِ حضرتِ اصغرؔ کی ہر ودیعتِ خاص
قرار بن کے جگرؔ کے دلِ حزیں میں رہی

یوں تو ہونے کو جگرؔ اور بھی ہیں اہلِ کمال
خاص ہے حضرتِ اصغرؔ سے عقیدت مجھکو

حریمِ حسنِ معنی ہے جگرؔ کاشانۂ اصغرؔ
جو بیٹھو باادب ہو کر تو اٹھو باخبر ہو کر

اپنا ہی سا اے نرگسِ مستانہ بنا دے
میں جب بھی تجھے جانوں مجھے دیوانہ بنا دے

جگرؔ نے اپنے اشعار ہی میں نہیں بلکہ نثر میں اصغرؔ کے فیضانِ توجہ اور برکاتِ تربیت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے "سب سے پہلے مولائی و آقائی حضرت مولانا اصغر حسین صاحب اصغرؔ گونڈوی قبلہ مدظلہٗ کی خدمت میں اپنے دل کی تمام گہرائیوں کے ساتھ حقیر ترین نذرِ عقیدت پیش کرتا ہوں کہ حضرت موصوف ہی کے فیضانِ توجہ اور برکاتِ تربیت کا نتیجہ وہ سب کچھ ہے جسکا ایک حصہ شعلۂ طور کی صورت میں حاضر کیا جاتا ہے "وگرنہ من ہمان خاکم کہ ہستم"۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دورِ قحط الرجال میں موصوف کی خاموش اور مقدس ترین ہستی نہ صرف غنیمت ہے بلکہ ہم گمراہانِ محبت و حقیقت کے لئے مشعلِ ہدایت و ارشاد ہے ۔

موصوف کی عظمت و جامعیت کا اندازہ صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے چشمِ بصیرت اور نورِ ایمان عطا فرمایا ہے ۔

میں ایک سخت آزاد اور رندِ لاابالی ہوں اور دورِ حاضر کی بڑی سے بڑی ہستی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا اپنے لئے ننگ سمجھتا ہوں لیکن حضرت موصوف ہی کی ایک ذاتِ گرامی ہے جسکے سامنے اپنے آپ کو ایک صیدِ زبوں سے زیادہ کچھ نہیں سمجھ سکتا ۔

آپ اسے خواہ مدح سرائی سمجھیں یا جو کچھ لیکن یہ الفاظ روح و قلب سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں باصداقت محض بقول حضرت اکبرؔ مرحوم :-

"وہ آنکھ کچھ دیکھتی ہے جب تو ادب کرتی ہے"[1]

جگرؔ کو اصغرؔ سے یہ عقیدت و محبت دل سے تھی یہی وجہ تھی کہ جب وہ اصغرؔ کی صحبت سے فیضیاب ہونے لگے تو بقول جلیل قدوائی وہ جہاں بھی جاتے "اصغرؔ کا کلام بھی ساتھ لے جاتے بڑی عقیدت کے ساتھ سناتے اور انکا نام بھی روشن کرتے" اصغرؔ کے صوفیانہ کلام میں روح کی بیداری اور ایک طرح کی کیف و مستی پائی جاتی ہے انھیں کی پاکیزہ صحبت جگرؔ کے خیالات میں محبت کا ایک اعلیٰ و ارفع تصور پیدا کیا اور جوں جوں وقت گزرتا گیا انکے کلام میں زیادہ سے زیادہ نکھار پیدا ہوتا گیا جگرؔ کے یہاں روح کی بیداری اور حقیقت و مجاز کے متعلق اپنے نظریات کا بیان

---

[1] شعلۂ طور دائیہ فیض، غالباً [illegible] پریس لکھنؤ کمشنہ [illegible] جولائی تا ستمبر سنہ ۶۲ء

اصغر کی صحبت کے ساتھ ساتھ قاضی شاہ عبدالغنی منگلوری سے بیعت اور انکے روحانی فیض کا بھی نتیجہ تھی ؎

تجھ سے وحشی ترے غافل نہیں ہونے پاتے ۔ روز اک کوئی زنجیر ہلا دیتا ہے

جگر کو قاضی شاہ عبدالغنی منگلوری سے بے انتہا عقیدت تھی اور ان میں روحانی بیداری دراصل قاضی شاہ عبدالغنی منگلوری سے بیعت کے بعد ہی پیدا ہوئی تھی قاضی صاحب کو بھی جگر سے خاص انس ہو گیا تھا اور ایک دفعہ جب انھوں نے جگر کے اشعار سنے تو بے حد خوش ہوئے اور انھوں نے اصغر سے کہا۔

"تم شاعر بے شک ہو لیکن شعر جگر کہتا ہے تم نے اس پر توجہ دی تو ایک دن اردو شاعری پر حکومت کرے گا"[1]

اصغر نے جگر پر توجہ دی اور قاضی صاحب کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی جگر نے اصغر کی توجہ کی بدولت واقعی اردو شاعری پر حکومت کی۔

اصغر کے فیض صحبت کے اثر سے جگر نے تصوف یا روحانیت کے بارے میں اپنے خیالات کا باقاعدہ اظہار کرنا شروع کر دیا حالانکہ تصوف کی ایک دھندلی سی جھلک انکے ابتدائی کلام میں بھی مل جاتی ہے جسمیں انکے والد اور خاندان کا اثر پایا جاتا ہے لیکن اصغر سے ملاقات کے بعد انکے یہاں کلیم و منصور کی تلمیحات، وحدت و کثرت کا مسئلہ بیخودی کے رموز و حقیقت، دیر و کعبہ اور شیخ حرم کونین اور برق وشی وغیرہ وغیرہ کا بیان ملنے لگتا ہے اور انھوں نے اصغر کی سنجیدگی و شائستگی اور وقار و رنگینی کا اثر بھی قبول کرنا شروع کر دیا۔

بعض حضرات کا یہ خیال کہ جگر کے مجموعہ "شعلۂ طور" ہی میں اصغر کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں صحیح نہیں ہے البتہ "شعلۂ طور" میں انکا نکھرا ہوا اور صاف ستھرا انداز دکھائی دینے لگتا ہے ورنہ اصغر کا اثر جگر پر ۱۹۱۹ء ہی سے پڑنے لگا تھا اور اسیوقت سے انکے خیالات میں تبدیلی پیدا ہونے لگی تھی اسلئے جگر کے پہلے دیوان "داغِ جگر" میں بھی جو ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا اصغر کے اثرات نمایاں ہیں۔

مندرجہ ذیل اشعار "داغِ جگر" ہی سے پیش کیے جاتے ہیں جن پر اصغر کے اثرات صاف ظاہر ہیں ؎

دیدۂ حق بیں میں کیسا فرق کیسا امتیاز ۔ ایک ہی جلوہ کہیں مجنوں کہیں لیلیٰ ہوا

مر دو کم نہ کبھی ہوگا اب قیامت تک ۔ خمِ حجازی کی پی کر شراب آتے ہیں

اللہ اللہ رے یہ رنگِ حقیقت کی بہار ۔ کون سا خون کا قطرہ ہے جو منصور نہیں

مجھے غیر سمجھیں، نہ اہلِ دل ہمہ تن اگرچہ حجاب ہوں
جو نہاں ہے میری نظر سے بھی میں اسی کے رخ کی نقاب ہوں

---

[1] "العلم" اپریل تا جون ۱۹۶۳ء ص ۸۵

کیا کرونگا اب بہارِ گل بداماں دیکھکر   محوِ حیرت ہوں خود اپنا حشرِ پنہاں دیکھکر
ہستی کے نکات پوچھتا ہوں   غافل تجھے اپنی بھی خبر ہے

"شعلۂ طور" تک پہنچتے پہنچتے انکے کلام میں اور زیادہ نکھار پیدا ہو گیا اور اصغر کے اثرات اور بھی واضح طور پر نظر آنے لگے مندرجہ ذیل اشعار میں اصغر ہی کے اثرات نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں ؎

صوفی نے جسکو شاہدِ مطلق سمجھ لیا   اک پرتوِ لطیف تھا حسنِ مجاز کا
شمع جب فانوس میں تھی آنکھ تھی محوِ جمال   جب ہوئی عریاں نگاہوں کو پریشاں کر دیا
میں اسکی نظر اور وہ مجھے دیکھ رہا تھا   اے حیرتِ خاموش! یہ منظر ابھی کیا تھا
جو میں خود اپنی حقیقت کا رازداں ہوتا   تمام منظرِ فطرت مری زباں ہوتا

قطعہ

کسی کے سامنے، وہ میری عرضِ شوق کا عالم   مرے ذراتِ ہستی کا مسلسل داستاں ہونا
کبھی دریائے بیتابی کا سینے میں سمٹ آنا   کبھی ہر اشک کے قطرے کو بحرِ بیکراں ہونا
پہنچا ہوں اسی راہ سے تا منزلِ عرفاں   کہتے ہیں جسے ہوش وہی ہوش ربا تھا
نمودِ حسن کی یہ گرمیِ مزاج تو دیکھ   ہزار قطرے فنا کرکے اک حباب اٹھا

مندرجہ ذیل اشعار میں وہ اصغر کے اہم خیال نظر آتے ہیں ؎

اُٹھے ہے جبیں کہ ہر موج کا رقص ما کا   وہ ایک قطرہ ہے، حاصل تمام دریا کا
ہر ایک ذرے سے نکلے تڑپ کے برقِ جمال   بنے تو کوئی طلبگارِ حسنِ معنیٰ کا
عشق جب مصروفِ اصلاحاتِ روح و تن میں تھا   دفترِ عالم مرے اک گوشۂ دامن میں تھا
ذوقِ سجدہ ہر بُنِ مو سے نمایاں ہو گیا   میں بھی کیا شے ہوں کہ اپنا آپ عنواں ہو گیا
روح قالب سے نکل کر اصل میں گم ہو گئی   نَے سے ہوتے ہی جدا نغمہ پریشاں ہو گیا
چشمِ نظر پرست میں جسکا جہان نام ہے   حسنِ تمام یار کا جلوۂ ناتمام ہے
سوز میں بھی وہی اک نغمہ ہے جو ساز میں ہے   فرق نزدیک کی اور دور کی آواز میں ہے

جگر کبھی اپنی بے بسی پر ناز کرتے ہیں کبھی بے خبری سے چھوٹ کو ہر چیز پر تحیر کی نگاہیں ڈالتے ہیں کبھی معشوق حقیقی کو ہر جلوے کے پردے میں سرگرداں پاتے ہیں انھیں کے الفاظ میں دیکھئے ؎

ان کو اپنی شانِ رحمت پر غرور   مجھکو اپنی بے بسی پر ناز ہے
کہتے ہیں جسے اہلِ نظر ہوش کی دنیا   کچھ کچھ ہے خبردار مری بے خبری سے
ہر چیز پہ پڑتی ہیں تحیر کی نگاہیں   چھوٹا ہوں جو اب سلسلۂ بے خبری سے
ہر جلوے کے پردے میں وہ خود سرگرداں ہیں   تنہا اسے ہنگامۂ محفل نہ سمجھنا

تمام اٹھ گئے پردے تو اس سے کیا حاصل — مزا تو جب تھا کہ میں بھی نہ درمیاں ہوتا
رحمت نے مجھکو مائل عصیاں بنا دیا — اک پیکر حقیقت عریاں بنا دیا

کبھی وہ اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ انسان کو اپنی ہی طرف دیکھنا چاہیئے کونین کی بھول بھلیوں میں نہ پھنسنا چاہیئے اور کبھی بنی نوع انسان کو آگاہ کرتے ہیں کہ اگر حسن حقیقی کے ایک ذرے کا حسن بھی نمایاں ہو جائے تو آدمی اسکی نور کی شدت سے حیران ہو جائے کبھی انکو پیکر خاکی میں حسن کا دریا اور نور کا طوفان بھی دکھائی پڑنے لگتا ہے ؎

کونین کی ان بھول بھلیوں سے گذر جا — اپنی ہی طرف دیکھ اِدھر جا نہ اُدھر جا
ایک ذرّے کا اگر حسن نمایاں ہو جائے — آدمی شدّتِ انوار سے حیران ہو جائے
اک حسن کا دریا ہے اک نور کا طوفاں ہے — اس پیکرِ خاکی میں یہ کون خراماں ہے
جب ملی آنکھ ہوش کھو بیٹھے — کتنے حاضر جواب ہیں ہم لوگ
مری طلب بھی اسی کے کرم کا صدقہ ہے — قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں
ظہورِ دو عالم، اک اعجاز جس کا — اسی نقشِ پا پر مٹا چاہتا ہوں
کہاں تک ہیں یہ رنگ و بو کی بہاریں — تجھے دیکھ کر دیکھنا چاہتا ہوں

کبھی وہ کہتے ہیں جو لوگ ازل ہی سے دنیا کے راز کو سمجھتے ہیں انکو یہ دنیا کے پردے دھوکا نہیں دے سکتے اور کبھی کہتے ہیں کہ مری ہستی خود وہ حقیقت ہے جس حقیقت کا میں پردہ دار ہوں کبھی انکو کونین عشق بے اماں سے عبارت نظر آتا ہے اور جب کبھی ان کو اپنی حقیقت نظر آتی ہے تو ان کی طبیعت خود اپنے اوپر آ جاتی ہے ؎

یہ دنیا کے پردے، انکو دھوکا دے نہیں سکتے — ازل کے دن سے جو رازِ دنیا سمجھتے ہیں
وہ حقیقت ہے خود مری ہستی — جس حقیقت کا پردہ دار ہوں میں
تو ہی کمالِ عشق ہے تو ہی کمال حسن ہے — اپنے سوا کسی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھ
ہمیں وہ اب ہیں جو کھوئے ہوئے سے پھرتے ہیں — ہمیں وہ تھے کہ ترے راز دارِ راز رہے
نفس کے پردے میں بھی ہے اسی کا عکس جمال — بہت نہ سوزِ محبت، نفس گداز رہے
جبین سجدہ میں ایسی کبھی تڑپ تو نہ تھی — وہ آج خود بھی مگر شاملِ نماز رہے
ایک منظر ہے کہ آنکھوں میں کھنچا آتا ہے — ایک دنیا ہے کہ روپوش ہوئی جاتی ہے
مجاز ہو کہ حقیقت، یہاں تو حال یہ ہے — ترے حضور سے اٹھے ترے حضور آئے
کونین ہے عبارت اک عشقِ بے اماں سے — نکلا یہی فسانہ الٹا ورق جہاں سے
جب نظر اپنی حقیقت آئی — مجھ پہ خود میری طبیعت آئی

ان اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصغر مرحوم سے جگر کسقدر متاثر ہوئے اور انھوں نے ان کا صوفیانہ رنگ کس حد تک قبول کیا۔

۲۔ نیم صوفیانہ شاعری یوں تو جگرؔ کے بالکل ابتدائی کلام میں بھی بعض صوفیانہ رنگ کے اشعار مل جاتے ہیں جو غالباً اس اثر کے تحت کہے گئے جو ورثتاً انھیں اپنے اصلاف سے ملا تھا لیکن جب سے انکی اصغرؔ گونڈوی سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے انکو قاضی شاہ عبد الغنی منگلوری کے حلقہ ارادت میں داخل کیا اسوقت سے ان پر قاضی صاحب کے روحانی فیض اور اصغرؔ کی پاک صحبت کا اثر ہونے لگا اور وہ اس دور کی شاعرانہ بھول بھلیوں سے نکل کر معرفت کی راہ تلاش کرنے لگے اس دور میں بہر حال کہیں کہیں قنوطیت بھی طاری رہی لیکن بعد کو وہ معرفت کی راہ مستقیم پر لگ گئے انکے اس دور کے کلام میں مندرجہ ذیل قسم کے اشعار مل جاتے ہیں جنمیں کہیں کہیں گہری قنوطیت ملتی ہے مثلاً ؎

یہ مزا تھا خلد میں بھی نہ مجھے قرار ہوتا
جو وہاں بھی آنکھ کھلتی یہی انتظار ہوتا

میں جنونِ عشق میں یوں ہمہ تن نگار ہوتا
کہ مرے لہو سے پیدا اثرِ نگار ہوتا

مرا حال ہی جگرؔ کیا وہ مریضِ عشق ہوں میں
کہ وہ زہر بھی جو دیتا مجھے سازگار ہوتا

لیکن بعض اوقات وہ متلون و متضاد کیفیات سے بھی دوچار ہوتے ہیں مثلاً ؎

آیا نہ راس نالۂ دل کا اثر مجھے
اب تم ملے تو کچھ نہیں اپنی خبر مجھے

ہر سو دکھائی دیتے ہیں وہ جلوہ گر مجھے
کیا کیا فریب دیتی ہے میری نظر مجھے

ڈالا ہے بیخودی نے عجب راہ پر مجھے
آنکھیں ہیں اور کچھ نہیں آتا نظر مجھے

مستانہ کر رہا ہوں رہِ عاشقی کو طے
لے جائے جذبِ شوق مرا اب جدھر مجھے

مسرور ہوں کیفیتِ دردِ جگری سے
کچھ کام اثر سے ہے نہ بے اثری سے

ہنستے ہیں جسے اہل نظر ہوش کی دنیا
کچھ کچھ ہے خبر دار مری بے خبری سے

اسکے باوجود انکے اسی زمانے کے کلام میں ایک قسم کا جذباتی توازن اور اعتدال پسندانہ کیفیت بھی ملنے لگتی ہے ؎

لے چلا تھا سوئے صحرا کھینچ کر جوشِ جنوں
پاسِ ناموسِ وفا نے پا بہ زنداں کر دیا

بیخودی حد سے زیادہ بڑھ چلی جب عشق میں
بے حسی کو پردہ دارِ رازِ پنہاں کر دیا

رفتہ رفتہ انکا جسم انکی روح کی رنگینیوں سے بھی فیضیاب ہونے لگا اور وہ کہنے لگے ؎

روح کی رنگینیوں سے جسم بھی ہے فیضیاب
کم نہیں تصویر سے آئینۂ تصویر بھی

اور چونکہ عشق حقیقی و مجازی دونوں حالات میں حسن و عشق کی بنیاد دل ہی پر رہتی ہے اور عشق حقیقی میں ہیجان و ہوس نہیں رہتی بلکہ اسمیں دل کی کیفیتیں زیادہ لطیف اور پاکیزہ ہوتی ہیں اسلئے جب انکو تصوف سے گہرا لگاؤ ہوا تو انھوں نے دل سے متعلق بھی بہت سے اشعار کہے مثلاً

قیامت کیا کہاں کا حشر کیسا دیر کیا کعبہ
یہ سب ہنگامے برپا ہیں مرے اک مضطرب دل سے

تنہائی فراق میں کیوں کر یہ سمجھیے
اے دل یہ وقت خاص ہے راز و نیاز کا

اللہ رے اثر نگہِ مست ناز کا / ہر ذرہ ارتعاش میں ہے دل کے ساز کا
تو نے ہی جگر انگوٹھی میں ملایا ہے / ورنہ یہ ترا دل تھا اک آئینۂ نوری
سینے سے دل اچھلتے ہی رفعت نشاں ہوا / یہ ذرہ جب بلند ہوا آسماں ہوا
روح جب تڑپی نگاہِ شوق عاشق بن گئی / دل جب اچھلا جلوہ گاہِ حسنِ جاناں ہو گیا
کونین کا غم دل نے سب لے لیا اپنے سر / آغاز کا دیوانہ انجام سے غافل تھا
کیا چیز ہے کل عالم کیا چیز مرا دل ہے / حیرت کا اک آئینہ حیرت کے مقابل ہے
حیراں ہوں کہ یہ آخر کیوں بیچ میں حائل ہے / میرا ترا رشتہ تو بس واسطۂ دل ہے
آنکھ غافل ہے کرشمۂ دیدار ہنوز / دل ہے آگاہ کہ تو خود ہے، تری یاد نہیں

اسی زمانے میں انھوں نے حقیقت و معرفت کی تلاش میں نیم صوفیانہ اشعار بھی کہنے شروع کیے مثلاً ؎

پیراہنِ جنوں سے تنِ عشق ڈھک لیا / یہ اک طریقِ خاص ہے اخفائے راز کا
صحرائے جستجو سے نہ آگے بڑھے قدم / گم اسکی وسعتوں میں ہر اک کارواں ہوا
تو خود اگر نہیں تو بتا، اے نگاہِ شوخ! / پھر کون ہے؟ یہ سلسلہ جنبانِ اضطراب
وحدتِ خاص عشق میں ذکر ہی غیریت کا کیا؟ / اپنے ہی جلوے دیکھئے اپنے ہی بزمِ ناز میں
خود ضیا بار، جو اک جلوۂ مستور نہ ہو / آئینہ خانۂ عالم میں کہیں نور نہ ہو
نکاتِ عشق، حل کرتی ہے ہر جنبش نگاہوں کی / زبان آگہی سمجھو سکوتِ اہلِ عرفاں کو

بعض اوقات وہ اپنے گوشِ مشتاق کی بدولت ایسے نغمے بھی سن لیتے ہیں جو ساز ہی میں رہتے ہیں ؎

گوشِ مشتاق کی کیا بات ہے اللہ اللہ / سُن رہا ہوں میں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے
یہ حسنِ طلب ہی کا اک جلوۂ رعنا ہے / کس نے اسے دیکھا ہے کس نے اسے پایا ہے

کبھی راہِ الفت میں فنا ہو کر ہر سانس میں ایک نغمۂ منصوری پیدا کرنا چاہتے ہیں ؎

یوں محوِ فنا ہو جا اے دل رہِ الفت میں / ہر سانس سے پیدا ہو، اک نغمۂ منصوری
سمجھا گیا اک جلوۂ بیتاب کسی کا / جو راز کہ محجوب تھا، فہمِ بشری کا
کوئی نہ یہاں عدم نہ ہستی / اوّل، آخر، جو کچھ ہے تو ہے
غفلتوں میں قید کب فطرت کے کاروبار ہیں / روح کہتی ہے کہ سوئیں آپ ہم بیدار ہیں
یہ سب جو حسنِ حقیقت یہ ہیں حجاب اٹھا / نظر کو ہے جو اٹھانا تو کامیاب اٹھا

کبھی حسنِ حقیقی کے جلوؤں میں گم ہو کر سراپا نظر ہو جانا چاہتے ہیں تو کبھی شرح و تفصیلات پر نظر کم کرنے کو اور عشق میں مقصودِ اصلی کو مقدم کرنے کو، کہتے ہیں اور کبھی دیدار کی ہوس کو بے ادبی سے تعبیر کرتے ہیں ؎

ترے جلوؤں میں گم ہو کر خودی سے بیخبر ہو کر / تمنا ہے کہ رہ جاؤں سراپا نظر ہو کر
دور ہے منزلِ عرفانِ خودی اور یہاں / بیخودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں

عشق میں مقصودِ اصلی کو مقدم سب سے کیجئے
شرح و تفصیلات پر یعنی نظر کم سے کیجئے

یہ حاصلِ سرمایۂ عرفاں طلبی ہے
یعنی ہوسِ دید خود اک بے ادبی ہے

میں ترا عکس ہوں کہ تو میرا
اس سوال و جواب نے مارا

خدایا اس مرض کی ہے دوا کیا
کہ "ہم کیا ہیں ہمارا مدعا کیا"

گو سراپا حجاب ہیں پھر بھی.
تیرے رخ کی نقاب ہیں ہم لوگ

کہیں تو کہتے ہیں کہ میں اسی حسن میں حل ہوا جا رہا ہوں جسکے یہ سب (کائنات) مظاہر ہیں اور کہیں کہتے ہیں کہ میں حسنِ حقیقی کی ہستی کا پردہ دار ہوں بعض اوقات وہ خود اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے جگر اپنے آپ کو اشکِ ندامت سے پاک رکھ کیونکہ انھیں آنکھوں سے خدا کا نقشہ بھی دیکھنا ہے۔

وہی حسن جسکے ہیں یہ سب مظاہر
اسی حسن میں حل ہوا جا رہا ہوں

میری ہستی کا واہ کیا کہنا
تیری ہستی کا پردہ دار ہوں میں

پاک رکھ، اشکِ ندامت سے بہرحال جگر
دیکھنا ہے انھیں آنکھوں سے خدا کا نقشہ

چھپ کے رہتا ہے کہیں رازِ گلستاں کوئی
غنچے غنچے کی زباں سے ہے گل افشاں کوئی

کچھ اسطرح وہ پسِ پردۂ مجاز رہے
حجابِ ساز میں جیسے نوائے ناز رہے

وہ کون ہے آ پھر تری شکل دکھا دے
احسان ہے اسکا جو مجھے مجھ سے ملا دے

مئے ظاہر تو بہت پھر پی لی
مے مستور پلا دے ساقی

اسکی اک موجِ تبسم جو نمایاں ہو جائے
دل کا ہر ذرّہ بکیف انجمستاں ہو جائے

ان اشعار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جگر کے ابتدائی دور کے کلام ہی میں نیم صوفیانہ اشعار ملنے لگتے ہیں جو "شعلۂ طور" تک پہنچتے پہنچتے اپنی واضح شکل میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔

۳۔ **عشق کے گہرے ذاتی تجربات:** جگر کو بالکل ابتدائی زمانے سے عشق سے واسطہ پڑا اور وہ عشق کے تجربات تا حیات کرتے رہے وہ اس اصول کے قائل تھے کہ ع

اپنی ہی طرف دیکھ ادھر جا نہ ادھر جا

اور درحقیقت وہ تمام عمر اپنی ہی طرف دیکھتے رہے اور جو کچھ خود محسوس کیا وہی نظم بھی کیا انھوں نے دوسروں کے احساسات و جذبات کی ترجمانی کرنے کے بجائے خود اپنے احساسات و جذبات کی ترجمانی کی۔ دوسروں کے احساسات بیان کرنے والے کو وہ شاعر کے بجائے ناظم کہتے تھے اور فطری شاعر اسی کو مانتے تھے جو اپنے دلی جذبات و کیفیات کی ترجمانی کرے اسی لئے انھوں نے اپنے دلی کیفیات و احساسات کو بیان کرنے کے لئے تمام اصنافِ سخن میں "غزل" کا انتخاب کیا اور تا حیات اسی کے گیسو سنوارتے رہے۔

انھوں نے اپنی غزلوں میں اپنے تمام فطری جذبات و واردات کا اظہار کیا ہے جنسے ہر دردمند دل کی عکاسی ہوتی ہے انکی غزلوں کی پورے برصغیر میں ہر زبان زدِ عام ہونے کی یہی ایک وجہ تھی کیونکہ انکے اشعار کی بنیاد دلی جذبات

اللہ رے اثر نگہِ مست ناز کا — ہر بہر دہ ارتعاش میں ہے دل کے ساز کا
تو نے ہی جگر اسکو مٹی میں ملایا ہے — ورنہ یہ ترا دل تھا اک آئینۂ نوری
سینے سے دل اچھلتے ہی رفعت نشاں ہوا — یہ ذرہ جب بلند ہوا آسماں ہوا
روح جب تڑپی نگاہِ شوق عاشق بن گئی — دل جب اچھلا جلوہ گاہِ حسنِ جاناں ہو گیا
کونین کا غم دل نے سب لے لیا اپنے سر — آغاز کا دیوانہ انجام سے غافل تھا
کیا چیز ہے کل عالم کیا چیز مرا دل ہے — حیرت کا اک آئینہ حیرت کے مقابل ہے
حیراں ہوں کہ یہ آخر کیوں بیچ میں حائل ہے — میرا ترا رشتہ تو بے واسطۂ دل ہے
آنکھ غافل ہے کہ تشنۂ دیدار ہنوز. — دل ہے آگاہ کہ تو خود ہے، تری یاد نہیں

اسی زمانے میں انھوں نے حقیقت و معرفت کی تلاش میں نیم صوفیانہ اشعار بھی کہنے شروع کیے مثلاً ؎

پیراہنِ جنوں سے تنِ عشق ڈھک لیا — یہ اک طریقِ خاص ہے اخفائے راز کا
صحرائے جستجو سے نہ آگے بڑھے قدم — گم اسکی وسعتوں میں ہر اک کارواں ہوا
تو خود اگر نہیں تو بتا، اے نگاہِ شوخ! — پھر کون ہے؟ یہ سلسلہ جنبانِ اضطراب
وحدت خاص عشق میں ذکر ہی غیریت کا کیا؟ — اپنے ہی جلوے دیکھئے اپنے ہی بزمِ ناز میں.
خود ضیا بار، جو اک جلوۂ مستور نہ ہو — آئینہ خانۂ عالم میں کہیں نور نہ ہو
نکاتِ عشق، حل کرتی ہے ہر جنبش نگاہوں کی. — زبان آگہی سمجھو، سکوتِ اہلِ عرفاں کو

بعض اوقات وہ اپنے گوشِ مشتاق کی بدولت ایسے نغمے بھی سن لیتے ہیں جو سازہی میں رہتے ہیں ؎

گوشِ مشتاق کی کیا بات ہے اللہ اللہ — سُن رہا ہوں میں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے
یہ حسنِ طلب ہی کا اک جلوۂ رعنا ہے — کہنے اسے دیکھا ہے کہنے اسے پایا ہے

کبھی راہِ الفت میں فنا ہوکر ہر سانس میں ایک نغمۂ منصوری پیدا کرنا چاہتے ہیں ؎

یوں محوِ فنا ہو جا اے دل رہِ الفت میں — ہر سانس سے پیدا ہو، اک نغمۂ منصوری
سمجھا گیا اک جلوۂ بیتاب کسی کا — جو راز کہ محجوب تھا، فہم بشری کا
کوئی نہ یہاں عدم نہ ہستی — اوّل، آخر، جو کچھ ہے تو ہے
غفلتوں میں قید کب فطرت کے کاروبار ہیں — روح کہتی ہے کہ سوئیں آپ ہم بیدار ہیں
یہ سب جو حسنِ حقیقت یہ ہیں حجاب اٹھا — نظر کو ہے جو اٹھانا تو کامیاب اٹھا

کبھی حسنِ حقیقی کے جلوؤں میں گم ہو کر سراپا نظر ہو جانا چاہتے ہیں تو کبھی شرح و تفصیلات پر نظر کم کرنے کو اور عشق میں مقصودِ اصلی کو مقدم کرنے کو، کہتے ہیں اور کبھی دیدار کی ہوس کو بے ادبی سے تعبیر کرتے ہیں ؎

ترے جلوؤں میں گم ہو کر خودی سے بیخبر ہو کر — تمنا ہے کہ رہ جاؤں سراپا نظر ہو کر
دور ہے منزلِ عرفانِ خودی اور یہاں — بیخودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں

احساسِ عاشقی سے بیگانہ کر دیا ہے
دل بھی کسی نے اکثر دیوانہ کر دیا ہے

ایک ایسا راز بھی دل کے نہاں خانے میں ہے
لطف جسکا کچھ سمجھنے میں نہ سمجھانے میں ہے

عشق کے ہر سکونِ آخر کو
حسن کے اضطراب نے مارا

محبت اثر کرتی ہے چپکے چپکے
محبت کی خاموش چنگاریاں ہیں

ہائے یہ مجبوریاں، محرومیاں، ناکامیاں
عشق آخر عشق ہے تم کیا کرو؟ ہم کیا کریں؟

اگر تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

دل کو جب دل سے راہ ہوتی ہے
آہ ہوتی ہے واہ ہوتی ہے

ہم سے پوچھو تو عشق کی بھی نگاہ
سخت کافر نگاہ ہوتی ہے

اتنے ہی مجھ سے وہ قریب ہوئے
میں نے جتنی ہی آرزو کم کی

جگر نے کچھ مختلف قسم کے مزید عشقیہ ذاتی تجربات اپنے مختلف اشعار میں بیان کئے ہیں وہ بھی ملاحظہ ہوں ؂

نگاہ و دل بھی، یکایک جسے سمجھ نہ سکی
وہ ہر کرم جو پسِ پردۂ عتاب ہوا

آنکھ کہہ دے جسے وہ عشق کی روداد نہیں
دل سے آ جائے جو لب تک مری فریاد نہیں

سب کچھ ہوا، مگر نہ کھلا آج تک یہ راز
تم جانِ آرزو ہو کہ ہم جانِ آرزو

اب کیا امید رکھوں، اے حسنِ یار تجھ سے
تو نے تو مسکرا کر دیوانہ کر دیا ہے

خوشا وہ دور جب آغازِ دردِ عشق کا دل تھا
مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں سرتا بہ پا دل تھا

آؤ دل جاؤ مسکرا کے گلے
ہو چکا جو عتاب ہونا تھا

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا
دل، کچھ اس صورت سے تڑپا انکو پیار آ ہی گیا

ہائے یہ حسنِ تصور کا فریبِ رنگ و بو
میں یہ سمجھا جیسے وہ جانِ بہار آ ہی گیا

انکے جاتے ہی یہ حیرت چھا گئی
جس طرف دیکھا کیا دیکھا کیا

جب یاد آ گیا ہے، پہروں رلا گیا ہے
دل کا وہ مجھ سے کہنا "مجھ کو جدا نہ کرنا"

انکے یہ ذاتی تجربات کس قدر حقیقت سے قریب ہیں ؂

نظر ملا کے مرے پاس آ کے لوٹ لیا
نظر ہٹی تھی، کہ پھر مسکرا کے لوٹ لیا

شکستِ حسن کا جلوہ دکھا کے لوٹ لیا
نگاہ نیچی کئے سر جھکا کے لوٹ لیا

نہ لٹتے ہم، مگر ان مست انکھڑیوں نے جگر
نظر بچاتے ہوئے ڈبڈبا کے لوٹ لیا

ہم سے پوچھ اے ناصح دل گرفتگی انکی
ہم نے چھپ کے دیکھا ہے عالمِ پُرآب انکا

کبھی کبھی وہ محبوب کو تنگ، رلانے والی باتیں کہہ جاتے ہیں اور کبھی غمِ یار پر فریفتہ ہو جاتے ہیں ؂

تم سے میں اگر کہدوں کیا ہی تم کو رشک آئے
رات جو نظر مجھکو اک حسین خواب آیا

میں رہین درد بھی مگر مجھے اور چاہیئے کیا جگر؟
غم یار ہے مرا شیفتہ، میں فریفتۂ غم یار ہوں

راہ محبت کی ابتداء کی کیا خوب عکاسی کی ہے ؎

شروع راہ محبت ارے معاذ اللہ
یہ حال ہے کہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

یہ ناز حسن تو دیکھو کہ دل کو تڑپا کر
نظر ملاتے نہیں مسکرائے جاتے ہیں

محبوب کی محبت کو اسطرح بیان کرتے ہیں ؎

الٰہی آگ ہی لگ جائے تاثیر محبت کو
وہ آج اپنا بھی غم بادیدۂ پرآب کہتے ہیں

محبت اصل حقیقت ہے اسکو کیا کرتے؟
ہم التجا جو نہ کرتے، وہ التجا کرتے

جب محبوب کی یاد زیادہ ستاتی ہے تو کہتے ہیں ؎

یاد ظالم کو تم اپنی روک لو
لوٹے لیتی ہیں، مری تنہائیاں

یاد ہے ابتک جگر آغاز عشق
شب ہمہ شب وہ خیال آرائیاں

میری خاطر اب وہ تکلیف تجلی کیوں کریں
اپنی گرد شوق میں خود ہی چھپا جاتا ہوں میں

ہائے ری مجبوریاں ترک محبت کے لئے
مجھکو سمجھاتے ہیں وہ اور انکو سمجھاتا ہوں میں

برملا سخت رنجشیں باہم
غائبانہ صفائیاں توبہ

پھر وہ اک بے خودی کے عالم میں
مل کے باہم جدائیاں توبہ

طے منزلیں ہوئی ہیں یوں عشق و آرزو کی
کچھ میں نے جستجو کی، کچھ اسنے جستجو کی

کرتے جاتے ہیں صاف عذر کرم
اور پھر پرسش ملال بھی ہے

انھوں نے اپنے ہی عشق ذاتی تجربات بیان کیے ہیں اسلئے انکے اشعار کا اثر دل براہ راست قبول کرتا ہے خلا انکے یہ اشعار کسقدر متاثر کرنے والے ہیں ؎

قطعہ

کیا خبر تھی کہ عشق کے ہاتھوں
ایسی دنیا تباہ ہوتی ہے

سانس لیتا ہوں دم الجھتا ہے
بات کرتا ہوں آہ ہوتی ہے

حاصل حسن و عشق اسے سمجھو
وہ جو پہلی نگاہ ہوتی ہے

خوب رو لے فراق میں اے دل!
کچھ طبیعت سنبھل ہی جاتی ہے

عشق کی چوٹ چل ہی جاتی ہے
آہ دل سے نکل ہی جاتی ہے

فطرت عشق لاکھ چھپ کر ہو
اک نہ اک دن بگھل ہی جاتی ہے

آنکھوں میں بھی سی چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں
نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے

جگر کی خوش نصیبی یہ ہے کہ انکے محبوب نے بھی ان سے محبت کی اور انکی محبت کو خوب سراہا جسکا اظہار انھوں نے

اپنے کلام میں بار بار کیا ہے ؎

کیا گھڑی ہے کیا سماں ہے کس غضب کا جوش ہے | عشق کی بیتابیاں ہیں حسن کا آغوش ہے
جذبِ جنوں نے آج تو گل ہی نیا کھلا دیا | خود وہ گلے لپٹ گئے عشق کا واسطہ دیا
میرے ہجومِ شوق پر منہ سے تو کچھ نہ کہہ سکے | چہرے پہ رنگ آگیا ہاتھ مرا دبا دیا
ہم نے تو دکھلا دیا خود بنکے محرومِ وصال | آپ سے ممکن ہو جو اتنا کام ہجر اللہ کیجئے

انھوں نے روئے جاناں پر جان و دل اور دین و ایمان سب کچھ تصدق کر دیا تھا کہتے ہیں ؎

جاں و دل صدقے تصدق دین و ایمان کر دیا | ہم نے جو کچھ تھا نثارِ روئے جاناں کر دیا

مندرجہ بالا اشعار سے انکے عشق کے گہرے ذاتی تجربات کا پتہ چلتا ہے انھوں نے اپنی عشقیہ زندگی میں جو کچھ محسوس کیا اسے الفاظ کا جامہ پہنا کر شعر کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کر دیا یہی وجہ ہے کہ ہم ان کے کلام سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں کیونکہ ان کے اشعار حقیقت سے قریب تر ہیں

۳۔ آتشِ گل

اشاعت:۔ محمود علی خاں جامعی نے "آتشِ گل" کی اشاعت کے متعلق صحیح لکھا ہے کہ ۔

"۱۹۵۳ء میں آپ نے (جگر نے) اسکی اشاعت کی اجازت این ۔ ایم خان صاحب ..... کی معرفت پاکستان کو آپریٹو ڈھاکہ کو دی جس نے "آتشِ گل" کے نام سے بڑے سائز پر غالباً ۱۹۵۴ء میں شائع کر دیا" مہ۱

لیکن آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ "۱۹۵۵ء میں تیسرا اور آخری مجموعہ "آتشِ گل" لاہور سے شائع ہوا" مہ۲ جو صحیح نہیں ہے البتہ پاکستانی ایڈیشن کے بعد دلی کے ایک پبلشر نے "آتشِ گل" کا جعلی ایڈیشن شائع کر لیا تھا جسکی قانونی چارہ جوئی کے لئے جگر اور انکے مخلصین نے بڑی تگ و دو کی لیکن اس پبلشر کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہ کی جا سکی ۔

"آتشِ گل" کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۸ء میں تنویر پریس لکھنؤ سے شائع ہوا جسمیں جگر نے کچھ اضافہ کیا ہے اور اس پر نظرِ ثانی بھی کی ہے

اس مجموعہ پر جگر کو ۱۹۵۹ء میں ہندوستان کی ساہتیہ اکیڈیمی کی طرف سے پانچ ہزار روپیے کا انعام ۱۹۵۵ء ، ۱۹۵۶ء ، ۱۹۵۷ء کی بہترین اردو کتاب ہونے کیوجہ سے ملا ۔

"آتشِ گل" کے ۱۹۵۶ء کی اشاعت کے بعد بھی جگر نے کچھ غزلیں کہی تھیں جنھیں راقم نے حاصل کر کے "یادگارِ جگر" کے نام سے الگ شائع کر دیا ہے ۔

اس مجموعہ میں "داغِ جگر" اور "شعلۂ طور" کے مقابلے میں جگر کے تصورات حسن و عشق واضح ہونے لگتے ہیں اور ان میں "خمارِ چشمِ ساقی" کی صریح آمیزش نظر آنے لگتی ہے اور وہ ابھی شاعری سے بلند ہونے لگتے ہیں ۔

مہ۱۔ "تذکرۂ جگر" ص ۱۲۴ مہ۲۔ "نظام جدید" ۱۹، ۲۳ ستمبر ۱۹۶۲ء ص ۲۵

آتش گل میں محبوب کا تصور۔ جگرؔ نے اپنے محبوب کو ایک گوشت پوست کا اور اسی دنیا کا انسان بنا کر پیش کیا ہے وہ ہمیشہ تیر و تفنگ لئے عاشق کو قتل کرنے کو تیار نہیں رہتا بلکہ وہ بھی اپنے سینے میں دل رکھتا ہے اسکا دل بھی محبت کی آگ میں جلتا ہے اگر وہ چاہا جاتا ہے تو وہ اپنے عاشق کو چاہتا بھی ہے اس سے پیار و محبت بھی کرتا ہے اور جب وہ اپنے چاہنے والے سے کسی مجبوری کے تحت نہیں مل پاتا ہے تو وہ تنہائی محسوس کرتا ہے اور اپنی بے بسی پر کڑھتا ہے۔ جگرؔ نے اپنے محبوب کے جذبات و احساسات کی بڑی کامیاب ترجمانی کی ہے مثلاً وہ کہتے ہیں ؎

ادھر سے بھی ہے سوا کچھ ادھر کی مجبوری
کہ ہم نے آہ تو کی ان سے آہ بھی نہ ہوئی

ہائے رے مجبوریاں محرومیاں ناکامیاں
عشق آخر عشق ہے تم کیا کرو ہم کیا کریں

کسقدر حسن بھی مجبور کشاکش ہے کہ آہ
نہ چھپائے نہ بنے سامنے آئے نہ بنے

جگرؔ کا محبوب عشق کی گرمی سے متاثر ہوتا اور بعض اوقات اپنی بے نیازی اور سنگدلی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے عشق کے آگے سر تسلیم خم کرتا نظر آتا ہے ؎

اللہ اللہ عشق کی رعنائیاں
حسن خود لینے لگا انگڑائیاں

عشق کی بے نیازیاں بن کر
حسن کو بیقرار کرتا ہوں

محبت کے جلوے نہیں حسن سے کم
انھیں بھی مرے ساتھ حیرانیاں ہیں

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا
دل کچھ اس صورت سے تڑپا انکو پیار آ ہی گیا

عالم تجھے دیوانہ جگرؔ حسن کی خاطر
تو اپنے لئے حسن کو دیوانہ بنا دے

جگرؔ کے کلام میں حسن کی تنہائی اور بے بسی وغیرہ کا ذکر "شعلۂ طور" کے آخری حصہ سے ملنے لگتا ہے مثلاً مندرجہ ذیل اشعار "شعلۂ طور" ہی میں پائے جاتے ہیں۔ ؎

آنکھوں میں نمی سی ہے چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں
نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے

کچھ جو پشیمانِ جفا ہو گئے
اور وہ کچھ اور خفا ہو گئے

میں تو ہر حالت میں خوش ہوں لیکن اسکا کیا علاج
ڈبڈبائی ہیں آنکھیں وہ جگرؔ میرے لئے

ہر چند ضبطِ حد سے سوا کیجئے مگر آپ
آنسو نہ تھم سکیں گے تو کیا کیجئے گا آپ

چھپ چھپ کے جب نہ رو بھی سکیں گے بقدرِ ظرف
گھٹ گھٹ کے دل ہی دل میں رہا کیجئے گا آپ

لیکن حسن کی تنہائی اور بے بسی وغیرہ کا اظہار "آتش گل" میں زیادہ پایا جاتا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

حسن کو تھک بھی گیا لیکن یہ عشق
کارِ معشوقانہ کرتا ہی رہا

دل کے معاملات میں ناصح شکست کیا
سو بار حسن پر بھی یہ الزام آ گیا

عشق کو تھا کب سے اپنی خشک دامانی کا رنج
ناگہاں آنکھوں کو اشکوں کا سلام آ ہی گیا

اس بزم سے دل لے کر گیا آج اثر آیا
ظالم جسے سمجھے تھے مظلوم نظر آیا

وہ بھی رسوائے جاتے ہیں طرفدارِ محبت
اچھے نظر آتے نہیں آثارِ محبت

میں اور یہ تمکینِ غمِ عشق ارے توبہ
تو اور یہ احساس گرانبارِ محبت

تنہا نہیں ہے عشق ہی رسوائے جستجو
خود حسن کو بھی گرمِ سفر دیکھتا ہوں میں

یہ شرمگیں نگاہ، یہ انکار مضمحل
پھر کیا ہے، اعترافِ محبت اگر نہیں

کیا خبر تھی خود وہ نکلیں گے برابر کے شریک
دل کی ہر دھڑکن کو اپنی داستاں سمجھا تھا میں

یاں ہر نگہ سوال، وہاں ہر ادا جواب
اپنا معاملہ تو کچھ اسکے سوا نہیں

حسن رہتا، نہ اسقدر دلکش
خیر گذری کہ پائیدار نہیں

حسن دب جائیگا، حسن !!! ابھی توبہ
میں تو مر جاؤں جو یوں عشق کی بن آئی ہو

جگر تیرے سکوتِ غم نے یہ کیا کہہ دیا اُنسے
جھکی پڑتی ہیں نظریں آنکھ پرنم ہوتی جاتی ہے

یہ ہے مشہدِ عشق یعنی۔ یہاں پہ
حسینوں کے سر ٹھوکریں کھا رہے ہیں

جگر وہ بھی ز سرتاپا محبت ہی محبت ہیں
مگر انکی محبت صاف پہچانی نہیں جاتی

اُس گنہگارِ محبت کو خدا ہی سمجھے
جسنے اس مدبھری آنکھوں کی ندامت دیکھی

جگر اب تو وہ بھی یہ کہتے ہیں مجھ سے !
تیرے ناز اٹھانے کو جی چاہتا ہے

چھپ کے پردوں سے اسے دیکھنے والے برتا
مجھ میں کیا بات نہیں، جو مری تصویر میں ہے

زندگی میں آگیا جب کوئی وقتِ امتحاں
اسنے دیکھا ہے جگر بے اختیارانہ مجھے

ان اشعار سے جگر کے "آتش گل" کے تصورِ محبوب کا پتا چلتا ہے۔ جن میں انھوں نے حسن کی تنہائی اور بے بسی کے احساس وغیرہ کو بیان کیا ہے ان کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ان کا محبوب بھی جو ایک گوشت پوست کا انسان ہے ان سے محبت کرتا ہے لیکن وہ اپنی مجبوریوں، پابندیوں اور شرم و حیا کی وجہ سے کھل کر اپنی محبت کا اظہار نہیں کر پاتا ہے پھر بھی وہ اشاروں کنایوں سے اپنی محبت کا اظہار کر دیتا ہے محبوب کے ان ہی حالات و واقعات کو جگر نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے جس کی وجہ سے ان کے اشعار میں کشش پیدا ہو گئی ہے۔

عشق کا اعلیٰ تصور: جگر بنیادی طور پر محبت کے شاعر تھے، تغزل انکی شاعری کی جان ہے انکے تغزل کی تشکیل حسن اور احساسِ حسن، جمال اور ذوقِ جمال، شوق اور کاروبارِ شوق سے ہوئی ہے۔

اردو غزل گو شعراء میں جگر نے عشق کو حسن سے زیادہ اہم قرار دیا جس کی وجہ یہ ہے کہ محبوب کو محبوب بنانے والا دراصل عشق ہی ہوتا ہے اسی لئے وہ محبوب سے زیادہ عشق کو اہمیت دیتے ہیں اور اسقدر اہمیت دیتے ہیں کہ عشق انکے یہاں محبوب کا روپ اختیار کر لیتا ہے

ملہ جگر کی بیاضی نمبر ۳۔ گوشۂ جگر، ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ دہلی۔

جگر نے مرد اور عورت کے صحت مند جنسی اور عشقیہ رشتے کو بھی اپنی شاعری میں بیان کیا اور عشق کی تقدیس و تعظیم، بزرگی اور ماورائیت کو بھی برقرار رکھا ہے ؎

کہاں تھی یہ روح میں لطافت کہاں تھی کونین میں یہ وسعت
حیات ہی جیسے سو رہی تھی کسی کی پہلی نظر سے پہلے

اک حقیقت خیال سے برتر
اک جہاں چشمِ روزگار سے دور

عشق ہے اس مقام پر کہ جہاں
حسن ہے نقصِ اعتبار سے دور

ترے عشق کی کرامت یہ اگر نہیں تو کیا ہے
کبھی بے ادب نہ گزرا مرے پاس سے زمانہ

میں جہاں ہوں ترے خیال میں ہوں
تو جہاں ہے مری نگاہ میں ہے

زندگی آج بھی دلکش ہے انھیں کے دم سے
حسن اک خواب سہی عشق اک افسانہ سہی

کہاں کا حسن کہ خود عشق کو خبر نہ ہوئی
رہِ طلب میں کچھ ایسے بھی امتحاں گزرے

یہ سچ ہے کہ جگر کا عشق گناہ نہیں عبادت سکھاتا ہے اور ان کے یہاں حسن معصیت کی دعوت دینے کے بجائے پرستش سکھاتا ہے

جگر کا عشق زندگی، کائنات اور انسانیت سے محبت سکھاتا ہے اور زندگی کے لئے خیر و برکت اور رحمت بن کر سامنے آتا ہے

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے صحیح لکھا ہے

"آتشِ گل کی اشاعت و ترتیب کے دوران میں یہ معلوم ہو گیا کہ اب جگر وہ ایک اور ہی ہستی اور کیف کے عالم میں پہنچ چکے ہیں۔ تصوف و عرفان کا نشہ شراب اور افیون کے نشے سے کم نہیں ہوتا جگر اب اسی میں سرشار تھے اور اسی کی وجہ سے انکے کلام میں مومن و داغ کا سا تغزل باقی نہیں رہا بلکہ خواجہ میر درد کا سوز اور اقبال کی بلند نظری نمایاں ہو گئی۔"[1]

اس کے ساتھ ساتھ وحید اختر کا یہ قول بھی صحیح ہے کہ:

"آتشِ گل کا شاعر عشق میں زیادہ شائستہ، لہجہ میں زیادہ گمبھیر اور انداز میں زیادہ گہرا اور پختہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے عشقیہ تجربات اور زندگی کے کالاہ و حلاوت، مسرتوں اور خوشیوں، ماحول کی تلخیوں اور تبدیلیوں کو محسوس کرنے کے بعد انکو شاعری میں بیان کرنے تک کئی منزلیں طے کی ہیں۔ اس نے انھیں اپنے مزاج میں رچایا بسایا گیا ہے اور جذبات کی آگ سے تپایا ہے۔ اسنے زمانے کے تجربات، ماحول کے اثرات، محبت کی ناشادکامیوں اور محرومیوں کو خالص شخصی انداز میں محسوس کرنے کے بعد انپر ایک دوسرے شخص کی حیثیت سے بھی نظر ڈالی ہے۔ ۔ ۔ محبت تو انسان کے دل و دماغ، اعصاب اور رگ و پوست کو پگھلا کر آتش سیال بنا دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ مجبور و نامراد محبت ہی ادب و شاعری میں اپنی پوری شدت اور بھرپور تاثر کے ساتھ ظاہر ہو کر ادبِ عالیہ بن سکتی ہے۔"[2]

جگر کے یہاں یہ مجبوری و نامرادی اپنی پوری شدت اور بھرپور تاثر کے ساتھ ظاہر ہو کر ادبِ عالیہ بن گئی ہے مثلاً

۱۔ "سب رس" ستمبر سنہ ۶۰ء ص ۴۳
۲۔ "قومی آواز" ۱۹ ستمبر سنہ ۶۷ء ص ۲

تری خوشی سے اگر غم میں بھی خوشی نہ ہوئی — وہ زندگی تو محبت کی زندگی نہ ہوئی

یہ کیا مقام عشق ہے ظالم کہ ان دنوں — اکثر ترے بغیر بھی آرام آگیا

تو محبت کو لازوال بنا — زندگی کو اگر نہیں ہے ثبات

وہ ہزار دشمن جاں سہی مجھے غیر پھر بھی عزیز ہے — جسے خاک پا تری چھو گئی وہ برا بھی ہو تو برا نہیں

حسن کو سمجھا ہے کیا اے بوالہوس — حسن معنی بھی ہے صورت ہی نہیں

بے ربط حسن و عشق یہ کیف و اثر کہاں — بھی زندگی عزیز مگر اس قدر کہاں

اللہ رے بے کسی کہ غم روزگار بھی — بیٹھا ہوں تیرے غم کے برابر لئے ہوئے

رہ گیا کیا اگر محبت میں — سر فروشانہ زندگی نہ رہی

لوٹ لے دولت فراق جگر — فرصت غم رہی رہی نہ رہی

میں اسیر درد سہی مگر مجھے اور چاہیے کیا جگر — غم یار ہے مرا شیفتہ میں فریفتہ غم یار پر

بے فائدہ الم نہیں بیکار غم نہیں — توفیق دے خدا تو یہ نعمت بھی کم نہیں

جگر نے اپنے کلام میں عشق کا جو اعلیٰ تصور پیش کیا ہے اس کے پیش نظر مندرجہ ذیل اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں ؎

جب عشق اپنے مرکز اصلی پہ آگیا — خود بن گیا حسین دو عالم پہ چھا گیا

ترک طلب اور اطمینان — دیکھ تو میرا حسن طلب

جو عرش کی رفعت کو بھی اس در پہ جھکا دے — ایسا بھی کوئی سجدۂ سرشار محبت

میں اور ترے ہجر مسلسل کی شکایت — تیرا ہی تو عالم ہے اتری یاد کا عالم

یارب نگاہ شوق کو دے اور وسعتیں — گھبرا اٹھے جمال جہت آشنا سے ہم

یہ نرم و ناتواں موجیں خودی کا راز کیا جانیں — قدم لیتے ہیں طوفان عظمت ساحل سمجھتے ہیں

پیش نظر ہے حسن دوست حسن کے ماسوا نہیں — عشق میں مبتلا ہوں میں فکر کہیں مبتلا نہیں

بیٹھے ہیں بزم دوست میں گم شدگان حسن دوست — عشق ہے اور طلب نہیں نغمہ ہے اور صدا نہیں

جگر نے عشق کی عظمت کو چار چاند لگا کر حسن کو گواہ مقرر کیا ؎

مجھ سے لگے ہیں عشق کی عظمت کو چار چاند — خود حسن کو گواہ کئے جا رہا ہوں میں

کبھی کبھار انھوں نے حسن پر تنقید بھی کی ہے ؎

تنقید حسن مصلحت خاص عشق ہے — یہ جرم گاہ گاہ کئے جا رہا ہوں میں

انکا عشق فنا ہونے والا نہیں ہے ؎

✝ یہ دونوں اشعار جگر کی ایک غیر مطبوعہ غزل کے ہیں جو "آتش گل" کے بعد کی ہے۔ راقم کو یہ غزل تسکین قریشی نے ۱۴ مئی ۱۹۵۹ء کو دوران سفر میرٹھ عنایت فرمائی جسے راقم نے یادگار جگر میں الگ شائع کر دیا ہے

میرا مقامِ عشق مقامِ فنا نہیں
دنیائے زندگی ہے جدھر دیکھتا ہوں میں

بعض اوقات وہ لفظ و بیان ختم کرکے عشق کو خود عشق ہی کا پیغام بتلاتے ہیں اور بعض اوقات ایک شاہدِ معنی و صورت کے نہ ملنے پر فدا ہوتے ہیں کبھی کبھی اسی شاہدِ معنی و صورت سے ترکِ تعلقات کر لیتے ہیں لیکن اسکے خیال سے انکو مفر نہیں مل پاتی ہے ؎

اب لفظ و بیاں سب ختم ہوئے
اب دیدہ و دل کا کام نہیں
اب عشق ہے خود پیغام اپنا
اب عشق کا کچھ پیغام نہیں
اک شاہدِ معنی و صورت کے ملنے کی تمنا کب ہو
ہم اسی کے نہ ملنے پر ہیں فدا لیکن یہ مذاقِ عام نہیں

ترکِ تعلقات کو مدت گزر چکی
ظالم ترے خیال سے پھر بھی مفر کہاں

عشق کی بربادیوں کو رائیگاں سمجھا تھا میں
بستیاں نکلیں جنہیں ویرانیاں سمجھا تھا میں

شاد باش و زندہ باش اے عشقِ خوش سودائے من
تجھ سے پہلے اپنی عظمت بھی کہاں سمجھا تھا میں

آتشِ عشق وہ جہنم ہے
جس میں فردوس کے نظارے ہیں

اب عشق اس مقام پہ ہے جستجو نورد
سایہ نہیں جہاں، کوئی نقشِ قدم نہیں

جگر کبھی عشقِ لامحدود کو اپنا رہنما بناکر زندگی سے زندگی کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں ؎

عشقِ لامحدود جب تک رہنما ہوتا نہیں
زندگی سے زندگی کا حق ادا ہوتا نہیں

اس مقامِ قرب تک، اب عشق پہنچا ہے جہاں
دیدہ و دل کا بھی اکثر واسطہ ہوتا نہیں

وقت آتا ہے اک ایسا بھی سرِ بزمِ جمال
سامنے ہوتے ہیں وہ اور سامنا ہوتا نہیں

مندرجہ ذیل اشعار بھی۔ جنہیں انھوں نے مدعائے دوست کے سوا اپنا کوئی مدعا نہیں بتایا ہے محبوب کو اپنا تمنائی، عشق کو توہین سے بچانے کے لئے دل کا خون کر لینا اور آنکھ تر نہ ہونے دینا، ہجر سے شاد اور وصل سے ناشاد رہنا، تنہائیوں میں ایک آوازِ بے صدا سے لطف لینا، سرکارِ حسن سے خفا جانے پر ہر نقشِ آرزو کو مٹا ڈالنا، عشق کے اعلیٰ تصور کی بہترین مثالیں ہیں ؎

جز مدعائے دوست کوئی مدعا نہیں
یعنی مزاجِ عشق غرض آشنا نہیں

یوں بھی ہو کاش غمِ عشق کی تاثیر جگر
میں تمنا نہ کروں اور وہ تمنائی ہو

توہینِ عشق، دیکھ نہ ہو اے جگر نہ ہو
ہو جائے دل کا خون مگر آنکھ تر نہ ہو

وہیں وہیں سے اٹھے ہیں ہزارہا فتنے
جہاں جہاں سے میں گزرا ہوں بے نیازانہ

عشق ہے اس مقام پر کہ جہاں
زندگی نے شکست کھائی ہے

ہجر سے شاد وصل سے ناشاد
کیا طبیعت جگر نے پائی ہے

یوں تو ہونے کو گلستاں بھی ہے ویرانہ بھی ہے
دیکھنا یہ ہے کہ ہم میں کوئی دیوانہ بھی ہے

ہر اک مقامِ محبت بہت ہی دلکش تھا
مگر ہم اہلِ محبت کشاں کشاں گذرے

یہ مہر و ماہ مرے ہم سفر رہے برسوں
پھر اسکے بعد مری گرد کو بھی پا نہ سکے

ہٹو رستے سے اے شیخ و برہمن
مرے دل نے مجھے آواز دی ہے

ہمنے تنہائیوں میں کیا کیا لطف
ایک آوازِ بے صدا کے لئے

عشق کی وسعتیں خدا کی پناہ
حوصلہ چاہیئے وفا کے لئے

مجھے راہبر کی ضرورت نہیں ہے
سلامت مری لغزشوں کے سہارے

اب حسن سے کچھ کام نہ جلوؤں سے سروکار
اب عشق ہی خود عشق کا معیار ہوا ہے

وہ جب آگئی ہے ضد مجھے سرکارِ حسن سے
ہر نقشِ آرزو کو مٹا کر رہا ہوں میں" [1]

ان اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جگر نے حسن کے ساتھ ساتھ عشق کا بھی کتنا اعلیٰ و ارفع تصور پیش کیا ہے انھوں نے حسن و عشق کے صحت مند عشقیہ رشتے کے ساتھ عشق کی تقدیس و تنظیم کو بھی برقرار رکھا ہے

۳۔ **گہری داخلیت** | "آتشِ گل" میں گہری داخلیت کے متعلق محمود علی خاں جامعی نے اپنی گراں قدر رائے دیتے ہوئے لکھا ہے

"یہ صحیح ہے کہ جگر کے یہاں آخری میں خالص روحانی عنصر کی اور نظریاتی و نفسیاتی عنصر زیادہ ہو گیا تھا اور یہ انکی عمر کا صحیح تقاضا تھا جوانی ختم ہونے کے ساتھ انسان میں فطرتاً امنگ اور ولولہ کم ہو جاتا ہے جذبات میں وہ ہیجان باقی نہیں رہتا جو شباب کے زمانے میں ہوتا ہے اور شاعری کا تعلق جذبات ہی سے ہے چنانچہ بڑھاپے میں ولولے اور سرخوشی میں کمی آنا لازمی ہے پھر جگر تو صداقتِ کلام کے قائل تھے اور کلام کو زندگی کی عین تصویر سمجھتے تھے وہ کہتے تھے کہ دل میں کوئی جذبہ نہ ہو اور کاریگری سے اسے خوبصورت الفاظ میں بیان کر دیا جائے اسے میں شعر نہیں کہتا بلکہ دل میں جو جذبہ ہو وہی زبان پر آنا چاہیئے وہ ان بوڑھے بوڑھے استادوں کا تنہائی میں اکثر مذاق اڑاتے تھے جنکے بال سفید ہو گئے ہیں ہاتھوں میں رعشہ آگیا ہے گردن ہل رہی ہے مگر اسے وصل اور جوبن کے اشعار بے محابا پڑھ رہے ہیں اور داد کے ڈونگرے بٹور رہے ہیں۔

ہاں تو بڑھاپے میں رومانیت کی کمی ہو جاتی ہے اسکے مقابلہ میں خیالات میں تفکر زیادہ ہو جاتا ہے اور کلام میں پختگی اور گہرائی زیادہ پیدا ہو جاتی ہے یہی چیز جگر کے "آتشِ گل" کے کلام میں بھی موجود ہے اب انکے یہاں تفکر میں جو گہرائی اور خیالات میں جو پختگی پائی جاتی ہے اسے محسوس کرنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں لیکن اس گہرائی اور پختگی کے باوجود انکے اظہار میں تلخی تو نہیں لیکن رنگینی ضرور پائی جاتی ہے جو انکی انفرادیت ہے" [2]

مندرجہ ذیل اشعار انھیں خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں ؎

دل بن گیا نگاہ نگہ بن گئی زباں
آج اک سکوتِ شوق قیامت ہی ڈھا گیا

زہے وہ شوق جو پابندِ این و آں نہ رہا
خوشا وہ سجدہ جو محدودِ آستاں نہ رہا

جنونِ سجدہ کی معراج ہے یہی شاید
کہ تیرے در کے سوا کوئی آستاں نہ رہا -

---

(۱) مسودہ "آتشِ گل"، نمبر ۱۷، گوشۂ جگر لائبریری جامعہ ملیہ دہلی (یہ شعر غیر مطبوعہ ہے) (۲) [illegible] اگست ۱۹۶۰ء صفحہ ۲۳

یہ کون تصور میں ہنگام سحر آیا — محسوس ہوا جیسے خود عرش اتر آیا

باتیں ہیں دو مقصود ہے ایک — تیری طلب یا اپنی طلب

بیت گئی جو دل پہ نہ پوچھ — ہجر کی شب اور اخیر شب

کبھی کبھار انکو تاریک فضاؤں میں برستے ہوئے انوار بھی دکھائی پڑ جاتے تھے ؎

میں نے انھیں تاریک فضاؤں میں بھی اکثر — دیکھے ہیں برستے ہوئے انوار محبت

حُسن ہی حسن جلوہ ہی جلوہ — اللہ اللہ ہجوم کیفیات

معرفتِ جمال میں کام نہ آئے بال و پر — عقل کہیں پہ گر پڑی چھوٹ گئی کہیں نظر

محبت میں جگر گزرے ہیں ایسے بھی مقام اکثر — کہ خود لینا پڑا ہے اپنے دل سے انتقام اکثر

نگاہوں میں کچھ ایسے بس گئے ہیں حسن کے جلوے — کوئی محفل ہو لیکن ہم تری محفل سمجھتے ہیں

پینے سے کام ہے ہمیں میکدۂ حیات میں — ظرف جدا جدا سہی اصل جدا جدا نہیں

یہیں تک نہیں عشق کی سیرگاہیں — مہ و انجم کہکشاں اور بھی ہیں

مرے درد میں یہ خلش کہاں، مرے سوز میں یہ تپش کہاں — کسی اور ہی کی پکار ہے، میری زندگی کی صدا نہیں

شاید انھیں بھی اسکی خبر ہو نہ اے جگر — در پردہ نظر جو نظر دیکھتا ہوں میں

جو ہر نفس کے ساتھ نہ لائے پیام دوست — ہرگز وہ میری شام، وہ میری سحر نہیں

کبھی کبھی وہ ایسے مقام عشق پر پہنچ جاتے ہیں جہاں انکے دیدہ و دل تو کامیاب ہو جاتے ہیں پھر بھی ان کو تسکین و آرام نہیں مل پاتا ہے —

یارب یہ مقام عشق ہے کیا؟ گو دیدہ و دل ناکام نہیں — تسکین ہے اور تسکین نہیں، آرام ہے اور آرام نہیں

میری ہی روداد ہستی تھی مرے ہی سامنے — آج تک جسکو حدیثِ دیگراں سمجھا تھا میں

وہ محبوب کی یاد سے ایک خاص قسم کی نسبت قائم کر لیتے ہیں اور اسی نسبت سے وہ ہمیشہ لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں اور کبھی تنہائی محسوس نہیں کرتے ؎

ہو گئی دل کو تری یاد سے اک نسبت خاص — اب تو شاید ہی میسر کبھی تنہائی ہو

میں یہاں ہوں ترے خیال میں ہوں — تو جہاں ہے مری نگاہ میں ہے

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ — حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے — کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

اسنے اپنا بنا کے چھوڑ دیا — کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

۱؎ ڈاکٹر اقبال نے کہا ہے ؎ بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل تھی محو تماشائے لب بام ابھی ۔

ہوش میں رہتا تو کیا جانے کہاں رکھتا قدم
یہ غنیمت ہے، مزاج عشق دیوانہ بھی ہے

کبھی کبھی وہ محبوب کو ایسی خلوت میں پاس بلاتے ہیں جہاں دل کے دھڑکنے کی آواز بھی نہیں سنائی دیتی ہے

آ جاؤ کہ اب خلوتِ غم خلوتِ غم ہے
اب دل کے دھڑکنے کی بھی آواز نہیں ہے

بجھ گئی سوزِ غم سے روح کی پیاس
اسی شعلہ کو بن جانا ہے شبنم!

رہِ عرفاں میں اک ایسا بھی مقام آتا ہے
ہر یقیں بڑھ کے جہاں وہم و گماں تک پہنچے

بعض اوقات وہ ایسے دشتِ غم کے سناٹے میں پہنچ جاتے ہیں جہاں دور دور تک کوئی آواز سنائی نہیں دیتی ہے

میں ہوں اور دشتِ غم کا سناٹا
کوئی آواز دور دور نہیں

مندرجہ ذیل دو اشعار انکی گہری داخلیت کے اعلیٰ نمونے ہیں

جو اب کسی شے میں دلکشی نہ رہی
رہ گیا سایہ روشنی نہ رہی

کہنے سننے کا جب مقام آیا
کہنے سننے کی تاب ہی نہ رہی[1]

ان اشعار کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جگر کے کلام میں کسقدر گہری داخلیت پائی جاتی ہے ان اشعار میں انکی فکر کی گہرائی اور خیالات میں پختگی ملتی ہے

داغ مومن اور دوسرے اساتذہ کا اثر

محمد احمد صدیقی ردولوی نے صحیح لکھا ہے کہ

"عشق سخن کے ابتدائی دور میں ہر شاعر اپنے ہم مزاج اساتذہ کا تتبع کرتا ہے لیکن جگر کا معاملہ کچھ منفرد سا معلوم ہوتا ہے کیونکہ شعرائے دہلی کے بعض اشعار کا کچھ ہلکا سا عکس ان کے یہاں نظر آتا ہے مگر کہیں چوری یا سرقہ کی نوبت نہیں آئی ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زیر مطالعہ انکا کلام رہتا تھا جب جگر خود شعر کہتے تھے تو انھیں جو چیز پسند آتی تھی قبول کر لیا کرتے تھے کیونکہ یہ شاعر کے صغر سنی کا زمانہ ہے اسلئے تقابل کا سوال تو پیدا نہیں ہوتا ہاں اس سے حضرت جگر کے مزاج شاعری کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے"[2]

جگر نے اپنے کلام میں دوسرے اساتذہ کے اثر کے متعلق خود بھی فرمایا ہے کہ

"ہو سکتا ہے میرے کلام میں کہیں کہیں مومن کا اثر غیر شعوری طور پر موجود ہو لیکن واضح رہے کہ میں تقلید کا قائل نہیں البتہ اس کا اعتراف ہے کہ میرے ابتدائی کلام پر داغ کا نمایاں اثر موجود ہے غالب کی عظمت و محبت میرے دل میں ہے لیکن مقلد ان کا بھی نہیں"[3]

جگر کے اس بیان سے یہ تو واضح ہی ہو جاتا ہے کہ جگر نے اپنے کسی پیشرو یا ہمعصر استاد کی تقلید نہیں کی لیکن انسے متاثر ضرور ہوئے

جس وقت جگر کی شاعری کی ابتدا ہوئی اسوقت دہلی میں داغ اور لکھنؤ میں جلال و امیر مینائی کا

---

1. یہ دونوں اشعار بھی جگر کی ایک غیر مطبوعہ غزل کے ہیں جو آتش گل کے بعد کہی گئی تھی، راقم کو یہ غزل تمکین قریشی نے دوران سفر بمقام ... مئی ۱۹۶۳ء کو عنایت فرمائی جو ... تھی 2. یادگار جگر ص ... 3. ... جام نو، جنوری ۱۹۶۱ء ص ... اردو جولائی ۱۹۵۹ء ص ...

طوطی بول رہا تھا اس دور کے قریب قریب ہر شاعر نے ان اساتذہ کا اثر قبول کیا جگر بھی اس سے بچ نہ سکے انھوں نے ابتدا میں داغ کا اثر قبول کیا لیکن اس میں بھی انکا فطری رنگ نمایاں نظر آتا ہے جسمیں ایک خاص قسم کی ترنگ اور امنگ پائی جاتی ہے۔

اگر جگر کے کلام کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو ڈاکٹر زور کا یہ قول صحیح معلوم ہوگا کہ وہ میر۔ درد۔ غالب، مومن۔ داغ اور اقبال سے وہ رفتہ رفتہ متاثر ہوتے رہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ انکے کلام میں اردو کے ان اساتذہ سخن کی نہ صرف جھلکیاں نمایاں ہیں بلکہ بعض مقامات پر تو وہ انسے بھی آگے نکل گئے ہیں"[1]

انکے کلام میں میر کا سوز و گداز و البانہ پن، درد کا تصوف، غالب کی جدت طرازی، مومن کی نزاکت شعری و حقیقت نگاری، داغ کا چٹخارہ اور شوخی، اقبال کا پیغام، حسرت کی محبوب پرستی فانی کی یاسیت و الم پرستی اصغر کی صوفیانہ اور رائیت کا اثر نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے۔

جگر کے کلام میں میر کا سوز و گداز اور والہانہ پن ملاحظہ ہو جگر کی ایک غزل کا مطلع ہے ؎

کیا بتاؤں عشق ظالم کیا قیامت ڈھائے ہے
یہ سمجھ لو جیسے دل سینے سے نکلا جائے ہے

پوری غزل میر کے رنگ میں کہی گئی ہے اسکے علاوہ مندرجہ ذیل اشعار میں بھی میر کا اثر معلوم ہوتا ہے ؎

وہ ہنس رہے ہیں مرے حال پر ہنسا کرتے
یہ بہ رہے ہیں جو آنسو یونہی بہا کرتے[2]

سر میں پھر لہر جنوں کی صفت تیر چلی
اے فلک روک مرے پاؤں سے زنجیر چلی

کچھ داغ دل سے تھی مجھے امید عشق میں
سو رفتہ رفتہ وہ بھی چراغ سحر ہوا

حسرت اس ایک طائر بے کس پر اے جگر
جو فصل گل کے آتے ہی بے بال و پر ہوا

بغور دیکھ لو انداز میرے مٹنے کا
یہ سانحہ نہ کبھی پھر نظر سے گذرے گا

سوز غم ہجر بجھ نہ جائے
دھندلا سا چراغ ہے کسی کا

غم کیا ملا کہ دولت کونین مل گئی
ہٹتے ہیں اب یہ ہاتھ دل ناتواں سے کیا

مٹا مٹا سہی ظالم وہ دل تھا میرا دل
بجھا بجھا سہی، پھر بھی چراغ خانہ تھا[3]

دل کو نہ پوچھ معرکہ حسن و عشق میں
کیا جانئے غریب کہاں کام آگیا

جگر کے کلام میں درد کا تصوف بھی پایا جاتا ہے کیونکہ تصوف کے معاملہ میں وہ درد ہی کو شاعر تصوف مانتے تھے اور اپنے احباب کو بھی تصوف کے سلسلے میں درد کے کلام کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دیتے تھے[4] مندرجہ ذیل اشعار میں درد ہی کا اثر معلوم پڑتا ہے ؎

ان دنوں دل کے رنگ ڈھنگ نہ پوچھ
کچھ عجب آن بان ہے پیارے

گوش مشتاق کی کیا بات ہے اللہ اللہ
سن رہا ہوں میں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے

---

[1] نیرنگ، ستمبر ۱۹۳۸ء ص ۲۵ [2] میر نے کہا ہے ؎ مجھ کو روتا دیکھ اس نے ہنس دیا۔ برق چمکی ابر باراں تھم رہا [3] میر نے کہا ہے ؎
شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
[4] یہ بات راقم سے سراج لکھنوی نے ستمبر ۱۹۶۳ء کی ایک ملاقات میں بتائی تھی۔

یہ محفلِ ہستی بھی کیا محفل ہستی ہے — جب کوئی اٹھا پردہ میں خود ہی نظر آیا

اللہ رے کمالِ خودی کی یہ وسعتیں — میرا ہی سامنا ہے جدھر دیکھتا ہوں میں

کیسا مجاز اور کیسی حقیقت — اپنے ہی جلوے اپنے ہی سائے

میں عشق ہوں مکمل، میں شوق ہوں مسلسل — گویا تمام عالم میری ہی داستاں ہے

وہی حسن جسکے ہیں یہ سب مظاہر — اسی حسن میں حل ہوا جا رہا ہوں

یہ سب نمود و نمائش ہے تیرے چھپنے سے — جو تو نہ پردے میں ہوتا تو میں کہاں ہوتا

اگر نہیں پسِ پردہ کوئی حقیقت میں — یہ کون بول رہا ہے طلسمِ صورت میں

جب دیکھ نہ سکتے تھے تو قطرہ بھی تھا دریا — جب آنکھ کھلی قطرہ بھی دریا نظر آیا۔

بعض اوقات جگر کے یہاں غالب کی جدّت طرازی بھی مل جاتی ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں جنمیں جگر نے غالب کے بعض اشعار کا مفہوم اپنے اشعار میں بیان کیا ہے مثلاً غالب کا ایک شعر ہے ؎

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم — قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں۔

جگر نے اسی مفہوم کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

سلسلہ فتنۂ قیامت کا — تیری خوش قامتی سے ملتا ہے

دوسرے اشعار بھی غالب کے انداز میں ملاحظہ فرمائیے:۔

غالب: گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر

جگر:۔ جسکا جتنا ظرف ہے اُس سے سوا ملتا نہیں — جلوۂ ساقی بقدرِ ہمت مردانہ ہے

غالب:۔ حسن اور اس پہ حسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم — اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیا

جگر:۔ عشق کو مطمئن نہ رکھ حسن کے اعتماد پر — وہ تجھے آزما چکا تو اسے آزمائے جا

غالب:۔ وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے — کبھی ہم انکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

جگر:۔ تو کہاں یہ غریب خانہ کہاں — وہم ہے یا گمان ہے پیارے

غالب:۔ آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالب — کسکے گھر جائیگا سیلابِ بلا میرے بعد

جگر:۔ موت سے ڈر نہیں مگر ہے یہ وہم — عشقِ بے خانماں نہ ہو جائے

" جب حسن و عشق دونوں رویا کرینگے مجھکو — وہ بھی جگر زمانہ نزدیک آرہا ہے

غالب:۔ کچھ نہ تھا تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

جگر:- یہ سب نمود و نمائش ہے تیرے چھپنے سے ۔ — جو تو نہ پردے میں ہوتا تو میں کہاں ہوتا

غالب: غالب زبسکہ سوکھ گئی چشم میں سرشک — آنسو کی بوند گوہر نایاب ہو گئی

جگر: اس عشق کی تلافی مافات دیکھنا — رونے کی حسرتیں ہیں جب آنسو نہیں رہا[1]

غالب: خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیا — ہیں گرفتار بلا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

جگر: مطمئن ہو کے کریں سیر چمن کیا وحشی — اک قدم باغ میں اک خانۂ زنجیر میں ہے

غالب: پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے — کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

جگر: اس تبسم کے تصدق اس تجاہل کے نثار — خود مجھی سے پوچھتے ہیں کون یہ دیوانہ ہے

غالب: اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسد — اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

جگر: سر رکھ ہی دیا سنگ در یار پہ میں نے — اب حشر بھی اٹھے تو مجھے کچھ نہ خبر ہو

غالب: ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی

جگر: میں وہاں ہوں نہیں جہاں میں بھی — عالم ماورائے عالم کیسا

غالب: دوستی کا پردہ ہے بیگانگی — منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

جگر: جذبۂ شوق کامیاب ہوا — آج مجھ سے انھیں حجاب ہوا

غالب: جان تم پر نثار کرتا ہوں — میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

جگر: جان اپنی نثار کرتا ہوں — پیار کی طرح پیار کرتا ہوں

غالب: جی چاہتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن — بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

جگر: پھر جی یہ چاہتا ہے کہ بیٹھے رہیں جگر — ان کی نظر سے بھی انھیں پنہاں کیے ہوئے

جگر کے چند متفرق اشعار بھی ملاحظہ فرمائیے جنھوں نے غالب کے بعض متفرق اشعار کے مفہوم کی نقل کی ہے

لے کے خط ان کا کیا ضبط بہت کچھ لیکن — تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں نے بھرم کھول دیا

ورنہ کیا تھا صرف ترتیب عناصر کے سوا — خاص کچھ بیتابیوں کا نام انساں ہو گیا

مٹایا جسقدر ہستی کو تصویریں ہوئیں پیدا — ہوئے ہم جسقدر آزاد زنجیریں ہوئیں پیدا

محال تھا کہ میں آزاد دو جہاں ہوتا — بقید جسم نہ ہوتا، بقید جاں ہوتا

ہستی غم کا ہے ادراک، جسے کہتے ہیں درد — ہستی دل کا ہے احساس، تری یاد نہیں

پھر لکھئے خط شوق میں بیتابی فراق — پھر خون دل کو زینت عنواں بنایئے

دل کی ہستی بیش از یک شیشۂ ساعت نہیں — اس میں جو کچھ دیکھئے تقویم دوراں دیکھئے

میں ترک رہ و رسم جنوں کر ہی چکا تھا — کیوں آ گئی ایسے میں تری لغزش پا یاد

---

[1] داغ نے بھی اسی مضمون کو اس طرح نظم کیا ہے ؎ جب پاؤں تھکے تو جستجو کی — جب دل نہ رہا تو آرزو کی۔

یہ محفلِ ہستی بھی کیا محفلِ ہستی ہے — جب کوئی اٹھا پردہ میں خود ہی نظر آیا
اللہ رے کمالِ خودی کی یہ وسعتیں — میرا ہی سامنا ہے جدھر دیکھتا ہوں میں
کیسا مجاز اور کیسی حقیقت — اپنے ہی جلوے اپنے ہی سائے
میں عشق ہوں مکمل، میں شوق ہوں مسلسل — گویا تمام عالم میری ہی داستاں ہے
وہی حسن جسکے ہیں یہ سب مظاہر — اسی حسن میں حل ہوا جا رہا ہوں
یہ سب نمود و نمائش ہے تیرے چھپنے سے — جو تو نہ پردے میں ہوتا تو میں کہاں ہوتا
اگر نہیں پسِ پردہ کوئی حقیقت میں — یہ کون بول رہا ہے طلسمِ صورت میں
جب دیکھ نہ سکتے تھے تو قطرہ بھی تھا دریا — جب آنکھ کھلی قطرہ بھی دریا نظر آیا

بعض اوقات جگرؔ کے یہاں غالبؔ کی جدّت طرازی بھی مل جاتی ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں جنمیں جگرؔ نے غالبؔ کے بعض اشعار کا مفہوم اپنے اشعار میں بیان کیا ہے مثلاً غالبؔ کا ایک شعر ہے ؎

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم — قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

جگرؔ نے اسی مفہوم کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

سلسلۂ فتنۂ قیامت کا — تیری خوش قامتی سے ملتا ہے

دوسرے اشعار بھی غالبؔ کے انداز میں ملاحظہ فرمائیے:۔

غالبؔ: گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر
جگرؔ:۔ جسکا جتنا ظرف ہے اُس سے سوا ملتا نہیں — جلوۂ ساقی بقدرِ ہمت مردانہ ہے
غالبؔ:۔ حسن اور اس پہ حسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم — اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیا
جگرؔ:۔ عشق کو مطمئن نہ رکھ حسن کے اعتماد پر — وہ تجھے آزما چکا تو اسے آزمائے جا
غالبؔ:۔ وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے — کبھی ہم انکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
جگرؔ:۔ تو کہاں یہ غریب خانہ کہاں — وہم ہے یا گمان ہے پیارے
غالبؔ:۔ آئے ہے بے کسئ عشق پہ رونا غالبؔ — کسکے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد
جگرؔ:۔ موت سے ڈر نہیں مگر ہے یہ وہم — عشقِ بے خانماں نہ ہو جائے
〃 جب حسن و عشق دونوں رویا کرینگے مجھکو — وہ بھی جگرؔ زمانہ نزدیک آ رہا ہے
غالبؔ:۔ کچھ نہ تھا تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

بڑی چیز ہے طرزِ بیگانگی
یہ ترکیب اگر کارگر ہو گئی

آنکھوں میں نور جسم میں بن کر وہ جاں رہے
یعنی ہمیں میں رہ کے وہ ہم سے نہاں رہے

یوں آ رہے ہیں آج ہم اک بزم ناز سے
چہرہ پہ نور جلوۂ جاناں نظر میں ہے

کہاں ممکن تھا اس چشم عنایت کا ادھر ہونا
مگر کام آگیا، میری فغاں کا بے اثر ہونا

وہ حالِ دل، لب خاموش سے بھی سنتے ہیں
یہ جانتا تو وہ شرمندۂ فغاں ہوتا

جز تمہارے کچھ نظر نہیں آتا
آرزو بن گئی مجسم کیا

تمہیں بھی خبر ہے؟ جو تم کھو گئے ہو
خود اپنی اداؤں سے مسحور ہو کر

خبر بھی ہے؟ تم کیا سے کیا ہو گئے ہو
از سر تا قدم حسنِ مجبور ہو کر

سامنے انکے ہیں یہ اسکی ظالم شوخیاں
وہ نہیں ہنستے تو کیا نادان بن جاتا ہے دل

وہ کیا دیکھ سکتے ہیں اپنی ادائیں
ہمیں دیکھتے ہیں جو ہم دیکھتے ہیں

خبر اسکی نہیں اہلِ خام کارانِ محبت کو
اسی کو دکھ بھی دیتے ہیں جسے اپنا سمجھتے ہیں

دعائے مرگ تو مانگی ہے آج گھبرا کر
میں کیا کرونگا جو یہ بھی اسے قبول نہ ہو

یوں چشم شوق دیکھ ہی لیتی ہے کچھ نہ کچھ
پردے کا ہے خیال تو پردا نہ سمجھیے

تشنگانِ دیدِ جلوہ میں نہیں سمجھا ہے کیا؟
تم اگر صورت دکھاتے جاؤ دیکھ دیکھتے

تجلی جس سے ہونا تھے دل ہی دل میں
وہ کچھ اور ہے مہربانی نہیں ہے

ہائے وہ دردِ دل کہ جگر
کچھ نہیں کھلتا آج کا سبب

ناصح کو ہے کیوں میری محبت سے سروکار
چہرے سے تو کھلتے نہیں آثارِ محبت

شکوہ تو ایک چھیڑ ہے لیکن حقیقتاً
تیرا ستم بھی تیری عنایت سے کم نہیں

سراپا محبت بنے جا رہے ہیں
سلامت رہیں انکو بہکانے والے

شبِ فراق ہے اور نیند آئی جاتی ہے
کچھ اس میں انکی توجہ بھی پائی جاتی ہے

دل بھی وہی ہے، غم بھی وہی پھر یہ کیا ہے آج
ہر اشک ہے تبسم پنہاں لئے ہوئے

انکے کلام میں داغ کا چٹخارہ اور شوخی بھی ملتی ہے انھوں نے خود بھی اسکا اعتراف کیا ہے کہ وہ داغ سے متاثر ہوئے ہیں انکے بعض اشعار میں داغ کے اشعار کی ترجمانی ملتی ہے مثلاً ؎

داغ :- پڑا فلک کو کبھی دل جلوں سے کام نہیں
جلا کے خاک نہ کردوں تو داغ نام نہیں

جگر :- اے فلک اب تجھے تو دکھلا دوں
زور بازوئے بیکسی کیا ہے

داغ :- جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

جگر :- نگاہوں سے چھپ کر کہاں جائیگا
جہاں جائیگا ہمیں پائیگا

داغ کا ایک مصرع ہے ع

تسلیاں مجھے دے دے کے بیقرار کیا

جگر کہتے ہیں ؎

ہجوم یاس میں گو تشفی نہ کوئی کام آئی
تسلیوں نے کیا اور بیقرار مجھے

داغ: یہ جو بچکر اُسکی نگہِ ناز سے جینا ہوگا
زہر دے اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا۔

جگر: چھپائے جاتے ہیں درد دل بن کر
اُس پہ تاکید ضبط حال بھی ہے

داغ: عشق منہ پر مرے لکھا ہو تو کیا اسکا علاج
جان پہچان نہ تھی اور وہ پہچان گئے

جگر: لاکھوں میں جگر اسنے پہچان لیا تم کو
یہ چھپتی ہے چھپائے سے کب آنکھ محبت کی

جگر کے چند متفرق اشعار بھی جن میں داغ کی شوخی اور چٹخارہ پایا جاتا ہے ملاحظہ فرمائیے ؎

مانا کہ ہم پہ جور و جفا کیجئے گا آپ
لیکن ہمیں نہ ہونگے تو کیا کیجئے گا آپ

آستینوں کا وہ چڑھا لینا
گوری گوری کلائیاں توبہ

مژدہ اے شوق شہادت اوج پر تقدیر ہے
آج دست ناز میں نازک سی اک شمشیر ہے

وہ اُدھر محو تماشا ہیں اِدھر مرعوب حسن
وصل کی شب دونوں جانب عالم تصویر ہے

ستم کا عدو مستحق ہو گیا
مرا دل سراپا قلق ہو گیا

مری موت سن کر کیا اُس نے ضبط
مگر رنگ چہرے کا فق ہو گیا

صدقے ان ہاتھوں کے مجھکو بھی خبر تک نہ ہوئی
اس نزاکت سے گلے پر مرے شمشیر چلی

اب مری لاش پہ کیوں سوگ لیے بیٹھے ہو
تم نے شمشیر چلائی تھی تو شمشیر چلی

بیکسی سارے بدن میں زرد چہرہ رنگ اُڑا اس
تپ کے ٹکڑے ہیں دو رسیری خاک تربت دیکھ کر

کوئی نہ بچ سکا تری قاتل نگاہ سے
ذرے بھی صدقے ہو گئے اُٹھ اُٹھ کے راہ سے

کس قیامت کی کشش اس جذبۂ کامل میں ہے
تیر ان کے ہاتھ میں پیکاں ہمارے دل میں ہے

پریشاں ہوکے زلفوں کا وہ اس رخ پر بکھر جانا
وہ سوتے سوتے چونک اُٹھنا وہ لیٹے لیٹے ڈر جانا

پایا جاتا ہے تری شوخیٔ رفتار کا رنگ
کاش پہلو میں دھڑکتا ہی رہے دل میرا

پہلے کہاں یہ ناز تھا یہ عشوہ و ادا
دل کو دعائیں دو تمھیں قاتل بنا دیا

جس دل کو تم نے لطف سے اپنا بنا لیا
اس دل میں اک چھپا ہوا نشتر ضرور تھا

رات جو مرنے کی تھی آہ اسکا ہے کچھ ملال سا
کہتے ہیں آج صبح سے جی ہے مرا نڈھال سا

خبر آگئے بچا گئے دامن چھڑا گئے
اے عشق مرحبا وہ یہاں تک تو آ گئے

محبت نے اسے آغوش میں بھی پا لیا آخر
تصور ہی میں رہتا تھا جو اک محشر خرام اکثر

چھپ کے پھر دل اسے اپنے نشیمن لے لیتا
مجھ میں کیا بات نہیں جو مری تصویر میں ہے

فرشتے ہیں کسی بانکے نازک کے بوسے
بڑے کام کی میری خود رفتگی ہے

جسے چاہو منظور کرلو مری جاں؟
یہ حسرت ہے یہ دل ہے یہ بیکسی ہے

جگرؔ دل کو کب تک بتوں سے بچاتا ۔ فرشتہ تو آخر نہیں آدمی ہے" [1]

"بادِ عیادت اٹھ دُ سکا اف رے نازکی ۔ تکلیف چند گام وہ فرما کے رہ گئے" [2]

"یوں بزرۂ بیگانہ کو روندا نہ کریں آپ ۔ جی بیٹھ جائے نہ تلوؤں میں کوئی خارِ محبت" [2]

جگرؔ کے آخری ایام کے کلام میں علامہ اقبال کے کلام کی بازگشت سنائی پڑنے لگتی ہے اس سلسلہ میں جگن ناتھ آزاد کی یہ رائے قابل قبول ہے کہ۔

"جگرؔ کی یہ غزل ؎

جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ

صرف موضوع کے اعتبار ہی سے "نغمۂ اقبال کی بازگشت نہیں بلکہ اس میں الفاظ اور ترکیبیں بھی قریب قریب وہی ہیں جنھیں اقبال بہت پہلے سے استعمال کر رہے ہیں" [3]

خدا اور خودی علامہ اقبال کی شاعری کے خاص موضوعات رہے ہیں جگرؔ خدا اور خودی کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

یہی حسن و عشق کا راز ہے، کوئی راز اسکے سوا نہیں ۔ کہ خدا نہیں تو خودی نہیں جو خودی نہیں تو خدا نہیں

محبت کسکو کہتے ہیں، محبت کی بقا کیا ہے ۔ خدائی کسکو کہتے ہیں' خودی کیا ہے خدا کیا ہے

خودی کا اک تصور دار داتی اور لامحدود ۔ نشاطی اور حیاتی اور ذاتی اور لامحدود

تو چھپاتا کیوں ہے ؟ اپنی حسنِ عریانی کا راز ۔ بوئے گل کی طرح پھیلا دے پریشانی کا راز

غم سے وابستہ ہے ہر عنوانِ بابِ زندگی ۔ ہے یہی بسم اللہ اُمّ الکتاب زندگی

جگرؔ اپنی نظم "نغمۂ اسلام" میں تو بالکل علامہ اقبال کے ہم آہنگ دکھائی دینے لگتے ہیں اس نظم کے چند بند ملاحظہ فرمائیے ؎

باہمہ رندی و سرمستی و عشرت طلبی ۔ ہوں درِ احمد مرسل کا غلام نسبی

مرحبا سید مکی مدنی العربی ۔ دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

کیوں نہ پھر رحمت باری کا طلبگار رہوں میں

ہاں مجھے فخر ہے اسپر کہ گنہگار رہوں میں

وہ رسولِ عربی، فخرِ رسولانِ سلف ۔ ذاتِ اقدس سے ملا جسکے زمانے کو شرف

جسپہ نازل ہوا قرآن سا کامل مصحف ۔ جسکے تابع جن و انساں بھی ملائک کی صف بھی

اک وہی شمع نبوت جو ضیا بار ہوئی ۔ ساری تاریک فضا مطلع انوار ہوئی

ہر زمانے میں پیمبر بھی نبی بھی آئے ۔ مصلح ملی و ملکی بھی، رشی بھی آئے

---

[1] "نقاد" مارچ ۱۹۱۴ء صفحہ ۲۳ ۔ یہ اشعار ملعت شدہ ہیں اور ان کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہیں راقم نے انھیں یادگار جگرؔ میں شائع کرا دیا ہے۔ [2] جگرؔ کی بیاض نمبر ا گوشۂ جگرؔ لائبریری جامعہ ملیہ دہلی، یہ شعر غیر مطبوعہ ہے

[3] اقبال اور اسکا عہد ص ۱۱۰

حق کے جوئندہ بھی اور حق کے ولی بھی آئے۔ — واقفِ محرمِ تیرا نہ لی بھی آئے
آئے دنیا میں بہت پاک مکرّم بن کر — کوئی آیا نہ مگر رحمتِ عالم بن کر
غم نہ کر مسلم حیرت زدہ دہر بلب — آشنا زنگِ فنا سے نہیں تیرا مذہب
یہ حوادث ہیں ترے تیری ترقی کے سبب۔ — تیرے حامی ہیں نبیؐ تیرا نگہبان ہے رب
فتنے اکثر بہت اس طرح کے اٹھوائے گئے — ایسے دجّال زمانے میں بہت آئے گئے

جگرؔ کے کلام میں حسرتؔ کی محبوب پرستی ملاحظہ فرمائیے۔

حسرتؔ:۔ دل کو خیالِ یار نے مخمور کر دیا۔ — ساغر کو رنگِ بادہ نے پرنور کر دیا۔
جگرؔ:۔ اس چشمِ مست نے مجھے مخمور کر دیا — میں نے نظر ملا کے اسے چور کر دیا
حسرتؔ:۔ اہلِ نظر کو بھی نظر آیا نہ روئے یار۔ — یاں تک حجابِ نور نے مستور کر دیا
جگرؔ:۔ حسنِ ازل تو آج بھی بے پردہ ہے مگر — نظارہ کے ہجوم نے مستور کر دیا
حسرتؔ:۔ گستاخ دستیوں کا نہ تھا مجھ میں حوصلہ — لیکن ہجومِ شوق نے مجبور کر دیا
جگرؔ:۔ وہ اور نازِ عشق گوارا کریں مگر — اتنے کھنچے ہم ان سے کہ مجبور کر دیا
یہ عشق وہ بلا ہے کہ حسنِ ازل کو بھی — تخلیقِ کائنات پر مجبور کر دیا

جگرؔ کے مندرجہ ذیل متفرق اشعار میں حسرتؔ کی محبوب پرستی ملتی ہے ؎

کیا کہہ دیا کسی نے کہ ملتے ہی چشمِ شوق۔۔ — دونوں طرف سے دستِ تمنا دراز تھا
تابِ دیدار رخِ یار کہاں سے لاؤں۔ — گر پڑی جا کے نظر گوشۂ داماں کے قریب
بس اک نگاہِ محبت سے دیکھ لینا ہے۔ — مگر جو خاطرِ نازک پہ یہ بھی بار نہ ہو
چمن دور آشیاں برباد یہ ٹوٹے ہوئے بازو — مرا کیا حال ہو صیاد اگر مجھ کو رہا کر دے
حدود کوچۂ محبوب ہیں یہیں سے شروع — جہاں سے پڑنے لگیں پاؤں ڈگمگا کے ہوئے
سبکو ہم بھول گئے جوشِ جنوں میں لیکن — اک تری یاد تھی ایسی جو بھلائی نہ گئی
ہر اک لرزش پہ چیخ اٹھنا ہر اک جنبش پہ ڈر جانا — قفس تک ہائے میرا اس طرح بے بال و پر جانا
توجہ بے نہایت اور نظر کم تر — خوشا یہ التفاتِ حسن باہم
دیر تک اختلاطِ ناز و نیاز — یک بہ یک اجتناب کا عالم
وہ مری عرضِ شوقِ بے حد پر — کچھ حیا کچھ حجاب کا عالم
کیا قصۂ جورِ فلک؟ کیا داستانِ عاشقی! — سب جانتی ہے وہ نظر، دردِ نہانِ عاشقی
یہ مصرع حسرتؔ جگرؔ، نشتر سے بھی ہے تیز تر — سیراب غم کردے کہیں، پیرِ مغانِ عاشقی

جگرؔ نے فانیؔ کی یاسیت والم پرستی کو بھی بعض اشعار میں اپنانے کی کوشش کی ہے مثلاً فانیؔ کا ایک شعر ہے ؎

مآلِ سوزِ غمہائے نہانی دیکھتے جاؤ — بھڑک اٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ

اسی مفہوم کو جگرؔ نے اس طرح بیان کیا ہے ؎

مری سمت سے اسے اے صبا یہ پیامِ آخرِ غم سنا — ابھی دیکھنا ہو تو دیکھ جا کہ خزاں ہے اپنی بہار پر

جگرؔ کا ایک شعر اور اسی مفہوم کا ہے ؎

بغور دیکھ تو انداز میرے مٹنے کا — یہ سانحہ نہ کبھی پھر نظر سے گزرے گا

جگرؔ کے مندرجہ ذیل اشعار میں فانیؔ کی سی یاسیت محسوس ہوتی ہے ؎

ہر شاخ پر ہے، باغ میں صیاد کی نگاہ — مطلب یہ ہے، کہیں نہ مرا آشیاں رہے

اب کہاں دل کی تمناؤں کی بزم آرائیاں۔ — آنکھ جھپکی تھی کہ سب خواب پریشاں ہوگئیں

بن رہی تھیں میرے ان کے درمیاں کیا کیا حجاب۔ — موت نے سب مشکلوں کو آخر آساں کر دیا

ایک اک سانس ہے اسکے لئے پیغامِ حیات — آدمی اپنی حقیقت سے اگر دور نہ ہو

آدمی نشۂ غفلت میں بھلا دیتا ہے۔ — ورنہ جو سانس ہے تعلیمِ فنا دیتا ہے

یہ دورِ مستعارِ خزاں و بہار کے — دو سلسلے ہیں، اک نگہِ فتنہ کار کے

موت کیا ایک لفظِ بے معنی۔ — جس کو مارا حیات نے مارا

فانیؔ کا ایک شعر ہے ؎

ہر نفس عمرِ گذشتہ کی ہے میت فانیؔ۔ — زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

جگرؔ اسی مفہوم کو اس طرح ادا کرتے ہیں

اللہ کے علم و حکمت کے حدود اگر اکرام نہیں — ہر سانس کے آنے جانے میں کیا کوئی نیا پیغام نہیں۔

قیدِ ہستی سے کب نجات جگرؔ۔ — موت آئی اگر حیات گئی

دل کو سکون روح کو آرام آگیا — موت آگئی کہ دوست کا پیغام آگیا

صیاد شادماں ہے، مگر یہ تو سوچ لے — میں آگیا کہ سایہ تہِ دام آگیا

جگرؔ کے کلام میں بعض اشعار صوفیانہ واردات کے مل جاتے ہیں جس میں اصغرؔ گونڈوی کا یہ خاص رنگ جھلکتا نظر آتا ہے مثلاً ؎

اللہ ری مجبوریِ آدابِ محبت — گلشن میں رہے اور گلستاں نہیں دیکھا

کہیں میرا دل گم گشتہ ہو نہ خاک بسر — کہ دور تک نظر آتا ہے اک غبار مجھے

اللہ اللہ یہ وارفتگیِ عشق مری — اس جگہ ہوں کہ جہاں حسن بھی دیوانہ ہے

حشر کے دن وہ گنہگار نہ بخشا جائے — جس نے دیکھا تری آنکھوں کا پشیماں ہونا

مجھے عشق کی صداقت پہ بھی شک سا ہو چلا تھا — مرے دل میں کہہ گئی کیا وہ نگاہِ ناقدانہ

حسن کو بھی کہاں نصیب جگر ؔ — وہ جو اک شے مری نگاہ میں ہے

محمد علی جوہر کا ایک شعر ہے ؎

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے — اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اسی روایت و قافیہ میں جگر ؔ نے بعض اشعار عارفانہ رنگ میں کہے ہیں ؎

تیری خبر نہیں مگر اتنی تو ہے خبر — تو ابتدا سے پہلے ہے تو انتہا کے بعد

شاید اسی کا نام مقامِ فغاں نہ ہو — نازک سا ہوتا جاتا ہے دل ہر صدا کے بعد

غرضیکہ جگر ؔ نے اپنے کلام میں اپنے پیشرو اساتذہ اور اپنے دور کے اساتذہ کا بھی اثر قبول ہے لیکن اس سے غلط فہمی نہ ہونا چاہیئے کہ انھوں نے ان اساتذہ کی تقلید کی ہے تقلید کے متعلق انھوں نے خود بیان کر دیا ہے جیسا کہ ابتدا میں لکھا جا چکا ہے کہ ان کے دل میں مندرجہ بالا اساتذہ کی عزت و احترام تھا لیکن مقلد وہ کسی کے نہیں بنے البتہ انھوں نے اپنے پیشروؤں کے نظم کئے ہوئے مضامین کو اپنے انفرادی رنگ میں نظم کیا جس سے ان کی آواز ہزاروں میں پہچانی جا سکتی ہے ۔

بنیادی تصورات | جگر ؔ کے بنیادی تصورات کو معلوم کرنے کے لئے ان کے اساسِ طرزِ فکر کا معلوم ہونا بے حد ضروری ہے اور اس امر کی تحقیقات کے لئے ان کی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈال لینے سے ہمیں یہ اندازہ ہو جائیگا کہ ان کے تصورات کی بنیاد کیا تھی ۔

جگر ؔ کو ابتدا میں دینی و دنیوی تعلیم مراد آباد کے ایک مکتب میں اور اپنے والد سے ملی اسکے بعد نویں کلاس انگریزی کی تعلیم حاصل کی اور پھر وہ اغمِ جاناں و غمِ دوراں میں گھر گئے اسی زمانہ میں اصغر اور شاہ عبدالغنی منگلوری سے ملاقات ہوئی جسکی وجہ سے انمیں روحانی انقلاب ہوا ان حضرات کے انتقال کے بعد جگر ؔ پر انکا روحانی فیض جاری رہا اور اس زمانے میں جگر ؔ کی تابناک صلاحیتوں کو مکمل طور سے ابھرنے کا موقع ملا

جگر ؔ کی زندگی کا بیشتر حصہ تکالیف و مصائب میں بسر ہوا انکی زندگی غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں سے بھر پور تھی اور انکو کبھی غموں سے نجات نہ مل سکی یہی غم والم جگر ؔ کی ہمت کے امتحان کا باعث بنے انھوں نے ملک میں مستقل کا نپور پھر اونو اکھالی کا فسادیسی میں حکومت کے مظالم اور ملک کی تقسیم کے بعد ملک میں انسانوں کی درندگی کے واقعات ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں حساس شاعر کی زندگی غم والم کی زندگی بن کر رہ جاتی ہے اور اسی ماحول سے اسے اساس طرزِ فکر ملتی ہے انھیں واقعات و حالات نے جگر ؔ کو ایک بنیادی تصور عطا کیا اور انھوں نے ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے اپنے کلام میں اپنے عہد کی سماجی معاشرتی اور دیگر ضروری اقدار مروجہ کی عکاسی کی ۔

(جگر ؔ ایک غزل گو شاعر تھے اور ایک خالص غزل گو شاعر کی کچھ اپنی مجبوریاں اور دقتیں ہوتی ہیں جسکی وجہ سے اسکے کلام میں یکجا تصورِ حیات کے تلاش کرنے میں دشواری ہوتی ہے پھر بھی اگر جگر ؔ کی غزلوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس میں فلسفہ زندگی کے متعلق بھی کچھ نقوش مل جائیں گے ۔

جگر ؔ کی شاعری کی بنیاد احساسات، جذبات اور ان کے وجدان پر تھی کہ ان کے پاس "دل" کا ایک ایسا ساز تھا جس

"محبت" اور "خلوص" کے تار بندھے ہوئے تھے جنھیں جگر صاحب عالمِ مستی میں چھیڑ کر ان سے فردوسِ گوش نغمے پیدا کر دیتے تھے انکی یہی مدھر اور رسیلی راگنی فضا میں لہرا کر "غزل" کا روپ دھار لیتی تھی۔

جوش ملیح آبادی نے صحیح لکھا ہے کہ:-

"جگر کو قدرت نے میکدہ کے واسطے نہیں، خانقاہوں کے واسطے پیدا کیا تھا۔ اس زمانہ میں بھی جبکہ انکی رندی کے غلغلوں سے پورا ہندوستان گونج رہا تھا میں ایک تنہا آدمی تھا جو لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کرتا تھا کہ جگر رند نہیں، اندر سے کٹر مولوی ہے[1] چنانچہ وہی ہوا جو میرا خیال تھا جگر نے یکایک پلٹا کھایا اور آخر میں آ گئے مولویت کی جانب، پڑھنے لگے نمازیں اور رکھنے لگے ڈاڑھی مگر ان تمام لوگوں کو جو بادہ خوار و آزاد خیال واقع ہوئے ہیں، وہ بن بھی نہیں سکتے تھے آخر شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔"[2]

جگر کے بنیادی تصورات کا اندازہ ان کے اس بیان سے بھی لگایا جا سکتا ہے جسمیں انھوں نے شاعر کے بنیادی تصورات کے متعلق لکھا ہے کہ:-

"انسان میں دو استعدادیں ہوتی ہیں ایک مادی، اور دوسری روحانی، خوشبو، مستی، لذت، کیف و سرور اور فنونِ لطیفہ کا تعلق روحانیت سے ہے مادہ اور روح انسان میں مل گئے ہیں مادہ کا تعلق خشک زندگی سے ہے زوال آمادہ قومیں مادہ کی فکر کرتی ہیں اور اسی کو ترقی سمجھتی ہیں شعر سے انقلاب مادی نا ممکن ہے نثر کا مرتبہ کچھ اور ہے شعر میں افیونیت ہے اگر شخصیت صالح اور صادق نہیں ہے جب بھی شعر اثر نہیں کرتے بوڑھے سے اگر کوئی تلوار کا کام لینا چاہے تو بیوقوفی ہے شراب یا کوئی اور لذت انسان رفتہ رفتہ قوائے عمل پر اثر انداز ہونے لگتی ہیں، رقص، نغمہ اور اس طرح کے اور فنون قوائے عمل کو بیکار کر دیتے ہیں پاکوئی انقلاب کی امید نہیں رکھنی چاہیئے۔"[2]

جگر کے اس بیان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جگر نے اپنے اشعار سے مادی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی ہوگی کیونکہ انکے خیال میں شعر سے مادی انقلاب نہیں ہو سکتا بلکہ روحانی انقلاب ہو سکتا ہے لیکن شعر سے روحانی انقلاب پیدا کرنے کے لئے بھی انکے خیال میں شخصیت کا صالح اور صادق ہونا بھی لازمی ہے ورنہ شعر اثر نہیں کرتے۔

۱ـ یہ جگر کی تعلیم اور خاندانی ماحول کا اثر تھا کہ ان کے رؤئیں رؤئیں میں مولویت رچ بس گئی تھی جسے وہ انتہائی بے خودی میں بھی فراموش نہیں کر پاتے تھے اسی لئے جوش نے ان کو "اندر سے کٹر مولوی" کہا ہے یہی انکا بنیادی تصور تھا جو ان کے کلام میں اشعار کی شکل میں ظاہر ہوا۔

۲ـ "جگر مراد آبادی" از شوق مراد آبادی (غیر مطبوعہ کتاب) بحوالہ "نیا دور" لکھنؤ۔ نومبر ۱۹۶۰ء ص ۲۲

ز

جگرؔ صاحب ایک فطری شاعر تھے اور فطری شاعر ہونے کی حیثیت سے انھوں نے اپنے انھیں خیالات کو نظم کیا جنھیں انھوں نے خود محسوس کیا انھوں نے غمِ دوراں کو غمِ جاناں بنا لیا تھا اور رضا و تسلیم کی نظر سے دیکھ کر دنیوی حیات میں ایک خاص حسن پیدا کر دیا تھا انکی آواز جاندار ہے جس سے نہ صرف ہمت اور حوصلہ مندی بڑھتی ہے بلکہ جرأت و ہمت کے ساتھ بڑے بڑے طوفانوں سے ٹکر لینے میں مدد ملتی ہے جگرؔ صاحب فرماتے ہیں:۔

ہمت جو ہو بلند تو کچھ اس سے کام لے
ساقی کا انتظار نہ کر بڑھ کے جام لے

جنوں کی بے سر و سامانیوں پہ رنج نہ کر
اگر جنوں ہے سلامت ہزار ہا دامن

جنونِ عشق کی کارفرمائیاں توبہ
نگاہِ زہد بھی پڑنے لگی حریصانہ

زندگی فرشِ قدم بن کے بچھی جاتی ہے
اے جنوں اور بھی اک لغزشِ مستانہ سہی

جنوں کے سخت مراحل بھی تیری یاد کے ساتھ
حسین حسین نظر آئے جوان جوان گذرے

جرأت ہے تو ہر نیم صداقت سے گذر جا
ہمت ہے تو محدود محبت سے گذر جا

حق پر ہے اگر تو تو شہادت کا مزا چکھ
بچ کر نہ اس آشوبِ ہلاکت سے گذر جا

ہوا جاتا ہے دل پیماں فراموش
کہاں ہے اے جنونِ خانہ بر دوش

جگرؔ کے یہاں زندگی محض روحِ نشاط نہیں ہے خود نشاط ہے :۔

محوِ تسبیح تو سب ہیں مگر ادراک کہاں
زندگی خود ہی عبادت ہے مگر ہوش نہیں

زندگی سلسلۂ دام و قفس ہے ساقی
بندۂ عشق ہوں مجھکو یہی بس ہے ساقی

ہوشیار اے شکوہ سنجِ زندگی
بندگی انعام ہی انعام ہے

وجد میں روح بھی ہے رقص میں موسیقی بھی
آج کیسا تری آواز میں رس ہے ساقی

جگرؔ کے سامنے صحیح اقدارِ حیات تھا اس وجہ سے انکے کلام میں دل کا اضطراب اور اس میں ٹھہراؤ بھی ہے

حسن کی اک اک ادا پر جان و دل صدقے مگر
لطف کچھ دامن بچا کر ہی نکل جانے میں ہے

شوق نے بے خودی میں جب دستِ طلب بڑھا دیا
غیرتِ عشق نے وہیں پہلو مرا دبا دیا

پہلے ہونگے کبھی بیتابیٔ دل کے شکوے
اب تو راحت سی مجھے خانۂ زنجیر میں ہے

دائرۂ شوق کی حد سے نہ گذرنا
ٹھہرائے جہاں مصلحتِ عشق ٹھہر جا

رہِ جستجو میں تلاشِ خضر کیا
وہیں اپنی منزل جہاں دل پکارے

ترکِ طلب اور اطمینان
دیکھ تو میرا حسنِ طلب

دل گیا رونقِ حیات گئی
غم گیا ساری کائنات گئی

جگرؔ کی شخصیت موثرات خارجی کے ساتھ بدلتی اور ترقی کرتی رہی انھوں نے کوئی معین و منظم قسم کا

فلسفہ نہیں پیش کیا ہے بلکہ غزل میں تربیت اور روح کی نشوونما کے لئے بیش قیمت سامان فراہم کر دیا ہے جس سے ہم زندگی سنوار سکتے ہیں۔

جینے کو یوں تو ہم بھی جیئے جاتے ہیں مگر
یہ زندگی اسی کی ہے جو اس سے کام لے

عشق کیا ہے پرتوِ حسنِ تمام
شوق کیا ہے حسن کا عکس شباب

حسن سے عشق جدا ہے نہ جدا عشق سے حسن
کونسی شے ہے جو آغوش در آغوش نہیں

محبت اصل حقیقت محبت اصل مجاز
وہ کم نظر تھے جو بیگانۂ مجاز رہے

مجاز ہو کہ حقیقت یہاں تو حال ہے یہ
ترے حضور سے اٹھے ترے حضور آئے

یہ حسن ہے کیا یہ عشق ہے کیا کس کو ہے خبر اسکی لیکن
بے جام ظہورِ بادہ نہیں بے بادہ فروغِ جام نہیں

جگر نے عشق کو تہذیب میں داخل کیا انکا عشق نہایت مہذب مستغنی اور خوددار ہے ؎

خطا معاف کسی اور کا تو ذکر ہی کیا
نیاز مند ترے تجھ سے بے نیاز رہے

پھونک دے اے غیرتِ سوزِ محبت پھونک دے
اب سمجھتی ہیں وہ نظریں رحم کے قابل مجھے

میری ہستی شوقِ پیہم میری ہستی اضطراب
کوئی منزل ہو مگر گزرا چلا جاتا ہوں میں

دل کے معاملات میں ناصح شکست کیا
سو بار حسن پر بھی یہ الزام آگیا

خود جس میں آرزوئے شکستِ غرور ہے
ایسی بھی آج ایک نظر دیکھتا ہوں میں

ترے دل کے ٹوٹنے پہ ہے کسی کو ناز کیا کیا
تجھے اے جگر مبارک یہ شکستِ فاتحانہ

گزر گیا ہوں یوں ہی میں مناظرِ حیات سے
کہ جیسے کچھ غرض نہیں حیات سے ممات سے

وہ بھی ہوئے جاتے ہیں طرفدارِ محبت
اچھے نظر آتے نہیں آثارِ محبت

رکھتے ہیں خضر سے نہ غرض رہنما سے ہم
چلتے ہیں بچ کے دور ہر اک نقشِ پا سے ہم

خوشا درسِ غیرت زہے عشق تنہا
وہاں میں نہیں ہوں جہاں اور بھی ہیں

اک شاہدِ معنی و صورت کی نہ ملنے کی تمنا سب کو ہے
ہم اسکے نہ ملنے پر ہیں فدا لیکن یہ مذاق عام نہیں

مرا تو فرض چمن بندئ جہاں ہے فقط
مری بلا سے بہار آئے یا خزاں گذرے

انھوں نے حسن کے رتبہ کے ساتھ ساتھ زندگی اور عشق کا رتبہ بھی بڑھایا، خود اپنی عزت کی اور دوسروں کو انسان کی عزت کرنا سکھایا ان کی غیرت وخودداری اور تہذیبِ عشق اردو شاعری کا بہترین سرمایہ ہے انھوں نے جابجا "میں" کے بجائے "ہم" کا استعمال کرکے اس میں کہیں زیادہ جامعیت اور عالمگیریت پیدا کر دی ہے ؎

وہ ہمیں ہیں کہ حسن کے ہاتھوں سے
گیسوئے زندگی سنوارے ہیں

کیا حسن نے سمجھا ہے کیا عشق نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

ہم نے دیکھے ہیں جاگتے ہوئے دل
ہم سے پوچھو ستم کے احسانات

ہم تو اب ڈوب کر ہی ابھریں گے
وہ رہیں شاد جو کنارے ہیں

ہر اک مقام محبت بہت ہی دلکش تھا
مگر ہم اہلِ محبت کشاں کشاں گذرے

جگر صاحب پست و بلند کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے کیونکہ وہ پامال ہونے کے بعد ہموار ہوگئے تھے ان کے نزدیک کامیاب زندگی کے لئے صرف اچھے اعمال کی ضرورت تھی انھوں نے اپنی تمام عمر جگر کے اس شعر پر عمل کیا ؎

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

انھوں نے زندگی کی عمارت کو دردمندی کی بنیاد پر اٹھایا اور غرور کو سب سے بڑا گناہ سمجھا انھوں نے میر کی طرح سرفرازی کے لئے راہِ خلق میں پامال ہونا ضروری سمجھا ؎

ہے خدمتِ مخلوق ہی نعم البدل اپنا
کر خدمتِ مخلوق تجارت سے گذر جا

انھوں نے دنیا کو سیلِ حوادث کی رہ گزر سمجھا جس کو ان کے نزدیک آدمی عشق ہی کے سہارے پار کر سکتا ہے اور اس عشق کے لئے پاکی و پاک بازی، جذب و مستی، خلوص و احتیاط، مدارات و مساوات شرط ہے ؎

تو محبت کو لازوال بنا
زندگی کو اگر نہیں ہے ثبات

جھوٹی ہے ہر ایک مسرت
روح اگر تسکین نہ پائے
کوئی دھن ہو یہ گیت گاتا چلا جا
محبت محبت محبت محبت

یقین کرو کہ تمھاری جگہ جو ہم ہوتے
محبتوں کے خزانے لٹا دیا کرتے

عشق لامحدود جب تک رہنما ہوتا نہیں
زندگی سے زندگی کا حق ادا ہوتا نہیں

محبت رہ گئی بن کر مکمل زندگی اپنی
مبارک بیخودی اپنی سلامت باخودی اپنی

عرش تک ہو نہیں سکتی جو رسائی نہ سہی
یہی انساں کی ہے معراج کہ انساں ہو جائے

آدمی کو آدمی سے بعد وہ بھی کس قدر
زندگی کو زندگی کا رازداں سمجھا تھا میں

کیا قیامت ہے کہ اس دورِ ترقی میں جگر
آدمی سے آدمی کا حق ادا ہوتا نہیں

انساں کہاں کہ مدتوں سے
انسان کی تلاش میں ہے انسان

کیا غضب ہے کہ اک زمانے سے
آدمی کو ترس رہی ہے نگاہ

نہیں جاتی کہاں تک فکر انسانی نہیں جاتی
مگر اپنی حقیقت آپ پہچانی نہیں جاتی

انھیں ذرات میں خاموش سے ویرانوں کے
دل دھڑکتے نظر آئے مجھے انسانوں کے

خلوص جس میں ہو شامل وہ دورِ عشق و ہوس
نہ رائیگاں کبھی گذرا نہ رائیگاں گذرے

آپ پھولوں سے جھولیاں بھر لیں
ہم نے کانٹوں سے کر لیا ہے نباہ

جگر کے نزدیک زندگی موت پر ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ تو دم لینے کے لئے ایک لمحہ ہے ؎

قیدِ ہستی سے کب نجات جگرؔ
موت آئی اگر حیات گئی

موت کیا ایک لفظِ بے معنی
جس کو مارا حیات نے مارا

جیتے تک ہیں ہوش کے جلوے آگے ہوش کی مستی ہے
موت سے ڈرنا کیا معنی موت بھی جزوِ ہستی ہے

موت اک دامِ گرفتاری تازہ ہے جگرؔ
یہ نہ سمجھو کہ غمِ عشق نے آزاد کیا

آئی ہے موت حسن کا منظر لئے ہوئے
لیکن غمِ حیات مکرر لئے ہوئے

حیات درد سہی پھر بھی آہ کیا کرتے
فنا کی چیز جو ہوتی تو ہم فنا کرتے

زندگی اک حادثہ ہے اور کیسا حادثہ
موت سے بھی ختم جسکا سلسلہ ہوتا نہیں

اب یہ محسوس ہو چلا ہے جگرؔ
موت ہے زندگی کی تنہائی

جگرؔ کے نزدیک غم روحِ محبت ہے اور بے غمِ عشق کائنات بے جان چیز ہے ۔

غم ہے کیا آئینۂ صفات و ذات
غم نہیں ہے تو آرزو نہ حیات

غم کیا ملا کہ دولتِ کونین مل گئی
ہنستے ہیں اب یہ اہلِ دلِ ناتواں سے کب

کرلیا دل نے عیشِ وصل قبول
پا گیا کچھ شباہتِ غم کیا

پیہم جو آہ آہ کئے جا رہا ہوں میں
دولت ہے غم زکوٰۃ دیئے جا رہا ہوں میں

بے فائدہ الم نہیں بیکار غم نہیں
توفیق دے خدا تو یہ نعمت بھی کم نہیں

بے غمِ عشق و بے دلِ آگاہ
موت ہے جرم زندگی ہے گناہ

جگرؔ نے اپنے کلام میں وحدت الوجود کے عقیدہ کا بھی جگہ جگہ اظہار کیا ہے یہ بھی اُنکے خاندانی معتقدات نیز شاہ عبدالغنی اور اصغرؔ کے فیضانِ صحبت کا اثر ہے ۔

عشق کی یہ نمود یہ ہستی کیا
ہم نہیں تم اگر تو پھر ہم کیا

کل اپنی حقیقت تھی منصورِ انا الحق کی
ناچیز سا اک قطرہ دریا کے مقابل تھا

روح قالب سے نکل کر اصل میں گم ہو گئی
نَے سے ہوتے ہی جدا نغمہ پریشاں ہو گیا

عین ایماں ہے انا الحق کا ترانہ لیکن
ہے یہی کفر اگر دیدۂ منصور نہ ہو

غیر از دوست نہ تھا ہستیٔ عاشق کا وجود
کم نگاہی نے دیا طول اس افسانے کو

باتیں ہیں دو مقصود ہے ایک
تیری طلب یا اپنی طلب

پیشِ نظر ہے حسنِ دوست حسن کے ماسوا نہیں
عشق میں مبتلا ہوں میں غیر کسی میں مبتلا نہیں

جگرؔ اپنی انتہائی نرالی شخصیت کے باوجود اپنے زمانہ کی مخلوق ہیں اور انکا وجدان و فکر اپنے عہد کے حالات

نمبرا میرؔ کا شعر ہے ؎ موت ایک ماندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

بہت کچھ متاثر ہوا ہے ان کی شاعری میں انکے تجربات کا لہو ہے لیکن وہ صرف عشق و محبت کے دائرہ میں اسیر نہیں اس میں انفرادیت اور آفاقیت کی ہم آہنگی بھی ہے اسی لئے انکی قدروں اور خواہشوں میں بھی ایک گہرا رشتہ ہے۔

مشاعروں کے لئے غزلیں | جس طرح اردو شاعری کم و بیش تمام اصناف سخن فارسی شاعری سے مستعار ہیں اسی طرح مشاعرے بھی ہمارے ملک میں ایران کی تقلید میں شروع ہوئے محمد داؤد نے صحیح لکھا ہے کہ:-

"مشاعرے کے لفظی معنی باہم شعر کہنے یا پڑھنے کے ہیں۔ شعرا کے یکجا ہونے کی سب سے قدیم روایت ہمیں حافظ کے ہاں ملتی ہے وہ لکھتا ہے کہ نوروز اور مہرجان یعنی مہرگان کے جشن پر شہ نوشیروان کی مدح میں اس کے دربار میں قصیدے پڑھتے تھے جو خاص اس موقع کے لئے لکھے جاتے تھے"[1]

اور جب فارسی میں سعدی اور خسرو کے زمانے میں غزل گوئی کی ابتدا ہوئی تو بعض قصیدوں کی زمینوں کی پیروی غزل میں بھی کی گئی۔

پانچویں صدی ہجری کے آخر میں جب ابراہیم غزنوی کا عہد تھا رشیدی اور مسعود سعد سلمان کے ہی معرکے شروع ہوئے اس قسم کے معرکے نویں صدی کے آخر تک ہوتے رہے لیکن نویں صدی کے آخر اور دسویں صدی کی ابتدا میں مشاعروں کے لئے "طرحیں" دی جانے لگیں یہ سلسلہ جہانگیر کے عہد تک جاری رہا وہ خود شعر و شاعری کا دلدادہ اور سخن فہمی کا نہایت بلند معیار رکھتا تھا مشاعروں کے لئے طرحیں بھی وہ خود ہی مقرر کرتا تھا۔

دہلی میں مشاعروں کی باقاعدہ ابتدا میر و درد کے اوائل عمر میں ہوئی اور اس کے لئے باقاعدہ دستور مرتب کئے گئے مثلاً کسی استاد کا میر مشاعرہ ہونا، شمع کا گھومنا اور داد دینا وغیرہ وغیرہ۔ اس وقت یہ مراختے کہلاتے تھے اور جب دلی تباہ ہوئی تو نواب آصف الدولہ کی سخاوت نے دہلی کے اہل کمال کو لکھنؤ کھینچ لیا اس وقت تک لکھنؤ میں جگہ جگہ مشاعرے ہوا کرتے تھے اور سنہ ۱۱۹۸ھ میں مرزا جہاندار شاہ ولی عہد شاہ عالم نے لکھنؤ میں ان مشاعروں کو فروغ دیا۔

لیکن دہلی میں بھی بہادر شاہ ظفر کے عہد میں انکی بادشاہت قلعے تک محدود ہو جانے کے باوجود دہلی کے مشہور مشاعرے قلعے ہی میں ہوا کرتے تھے جنہیں شہر کے تمام استاد سخن مثلاً مومن، غالب، ذوق وغیرہ شریک ہوتے تھے اور بقول محمد داؤد ۱۸۴۳ء میں دہلی میں ایک مشاعرہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کا قائم کیا ہوا عروج کمال پر تھا۔

اب مشاعروں کے لئے خاص اہتمام ہونے لگے تھے مثلاً مشاعرہ ہونے سے چند روز قبل مصرع طرح کا اعلان بذریعہ منادی یا بذریعہ اشتہار کیا جاتا تھا بڑے بڑے شعراء کو منت سماجت کر کے مشاعرے میں شرکت کے لئے رضامند کیا جاتا اور جس جگہ یہ مشاعرہ ہوتا اسے جھاڑ فانوس سے سجایا جاتا تھا مہمانوں کے ضیافت کے لئے حقہ پان بھی ہوتا تھا بڑے بڑے امراء حسب توفیق حاضرین خاص کو اور شعراء کو کھانے پینے کی چیزیں بھی پیش کرتے تھے

محمد داؤد نے مومن کے متعلق آزاد کی ایک تحریر "آب حیات" ص ۳۴۲ کے حوالے سے نقل کی ہے کہ۔

"میں نے انہیں نواب اصغر علی خان اور مرزا خدا بخش قیصر کے مشاعروں میں غزل پڑھتے ہوئے

۱۔ "رسالہ اردو" اپریل ۳۵ء ص ۱۲۶-۱۲۷

۲۔ " " " " ص ۱۶۵

سناتھا ایسی دردناک آواز سے دل پزیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے کہ سارا مشاعرہ وجد کرتا تھا۔ ،، ۱ے

جب لکھنؤ میں مجالس عزا شروع ہوئی تو انھوں نے بھی باقاعدہ مشاعروں کی شکل اختیار کرلی اور جب واجد علی شاہ کلکتہ پہنچے تو وہ وہاں بھی میٹابرج میں مشاعرے کرتے رہے اس زمانے تک سندھ، مدراس اور کرناٹک میں بھی بکثرت مشاعرے ہونے لگے تھے ۱۸۶۷ء میں ایک انجمن "انجمن پنجاب،، کے نام سے پنجاب میں قائم ہوئی جس نے ۱۸۶۶ء سے باقاعدہ طرحی مشاعرے شروع کئے۔

یہ مشاعرے شاعری کو ترقی دینے کے لئے منعقد کئے جاتے تھے کیونکہ مشاعروں کا دارومدار سابقت اور مقابلے پر ہوتا ہے جو شعرا کو طرح یا کوئی موضوع دیکر کیا جاتا تھا کہ وہ اسی طرح پر اس موضوع پر اپنا زورِ تخیل دکھائیں جگر سکی شاعری کے دور تک مشاعرے نقطۂ عروج پر پہنچ چکے تھے اب شعرا کو بطور نذرانہ مشاعرے کے اختتام پر سفر خرچ اور مٹھائی کی ہانڈی پیش کی جانے لگی تھی مشاعروں میں اجرت لینے کی بنیاد بقول سراج لکھنوی ۲ے عزیز لکھنوی نے ڈالی تھی ایک دفعہ انھوں نے اخبار میں اعلان کرایا کہ جو شخص انکو مشاعرے میں مدعو کرنا چاہے وہ پہلے "معیار پارٹی،، لکھنؤ کو پچاس روپئے بھیج دے لیکن عزیز کی یہ شرط پوری نہ ہوسکی اور اس شرط کے ساتھ انکو مشاعرے میں کبھی کسی نے مدعو نہیں کیا۔ عزیز کے بعد جگر نے بھی اعلان کیا کہ جو شخص انکو مشاعرے میں مدعو کرنا چاہے وہ پچاس روپیہ "جامعہ ملیہ۔ دہلی،، کو بھیجدے کچھ دنوں تک تو جگر کا بھی یہ اصول کامیاب نہیں رہا لیکن رفتہ رفتہ جب انکی شہرت و مقبولیت بڑھی تو اراکین مشاعرہ نے "جامعہ ملیہ۔ دہلی،، کو پچاس روپیہ بھیجکر انکو مشاعرہ میں مدعو کرنا شروع کیا اور جب جگر نے ہر دلعزیزی حاصل کرلی تو انھوں نے مشاعروں میں شرکت کے لئے معاوضہ طلب کرنا شروع کیا اور لوگ اسقدر گرویدہ ہوتے گئے کہ انکو گرانقدر معاوضے بھی دیکر مشاعروں میں مدعو کرنے لگے انکے مشاعروں میں شرکت کے اصول کا پتا انکے کچھ خطوط سے بھی چلتا ہے مثلاً وہ اپنے ابتدائی شرائط یعنی "جامعہ ملیہ،، میں چندہ بھیجنے کی شرط کے متعلق نواب شمس الحسن کو ایک خط (جس پر تاریخ درج نہیں ہے) میں لکھتے ہیں ۔

"میرے اعلانِ شرکتِ مشاعرہ کی شرط کے مطابق پچاس روپیہ "جامعہ،، کو پیش کردیئے گئے اب کوئی عذر ہی باقی نہیں رہ گیا،، ۳ے

جب انکی مقبولیت اور بڑھی تو انھوں نے معاوضہ سختی کے ساتھ وصول کرنا شروع کیا اس سلسلے میں انکے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو جسے انھوں نے حمید صدیقی لکھنوی کو لکھا تھا اس خط پر تاریخ درج نہیں ہے۔ (اصل خط حمید صدیقی لکھنوی صاحب کے پاس محفوظ ہے) وہ لکھتے ہیں :-

"وار فنڈ،، یا وار کمیٹی کے مشاعروں میں میری شرکت خالص تمدنی نقطۂ نظر کے ماتحت ہوتی ہے ٹکٹ کے ذریعہ جن مشاعروں میں داخلہ ہوتا ہے وہ بجائے خود ایک تجارتی صورت ہے اسلئے تجارت کو تجارت ہی کی

۱ے "رسالہ اردو،، اپریل ۱۹۵۸ء صفحہ ۱۶۷ ۲ے یہ بات سراج لکھنوی نے راقم سے ستمبر ۱۹۶۳ء کی ایک ملاقات میں بتائی تھی۔ ۳ے یہ خط نواب شمس الحسن صاحب (کراچی) کے پاس محفوظ ہے۔

طرح ہونا چاہئے میرے اوقات فرصت اسقدر ارزاں نہیں ہیں کہ سکنڈ کلاس کا کرایہ آمد و رفت کے علاوہ پچاس روپیہ کے لئے کوشش کا وعدہ فرمایا جائے۔

ایسی صورت میں کہ دعوت نامہ براہِ راست مجھے ملتا میں انکا جواب حسب ذیل سطور میں دیتا اور بس۔

سکنڈ کلاس کا کرایہ آمد و رفت و دیگر مصارف کے علاوہ سو روپیہ سے کم کی رقم ہرگز نہیں قبول کی جاسکتی اور یہ پوری رقم ذریعہ منی آرڈر پہلے مل جانی چاہیئے آپ کے پہلے خط کے مطالعے سے میں نے سمجھا تھا سکنڈ کلاس کرایہ آمد و رفت کے علاوہ سو روپیہ دیئے جائیں گے میں نے اس رقم کو محض اس لئے گوارا کرلیا تھا کہ اس اجتماع میں اکثر خاص الخاص احباب سے ملاقاتیں ہو جایا کرتی ہیں پھر مسوری کی سیر ہی سہی۔ اور سب سے بڑی چیز یہ کہ جناب خاں صاحب اور آپ جیسے مخلصین کی معیت لیکن جو صورت حال اسوقت ہے (اور اس لئے ؟) میں عجیب الجھن میں پڑا ہوں آپ اس معاملے کو سلجھائیے مجھے یقین ہے کہ اگر میری پیش کردہ گذارش جناب خاں صاحب تک پہنچ گئی تو وہ برخوشی مجھے میری آزاد رائے پر چھوڑ دینگے لیکن جس خلوص اور جس محبت سے مجھے یاد فرمایا گیا ہے انشاء اللہ تعالیٰ اسی خلوص اور محبت کے ساتھ میں حاضر ہو جاؤنگا لیکن بعد مشاعرہ"[1]

جب انکی مقبولیت اور بڑھی تو انھوں نے اپنا معاوضہ بھی اور بڑھا دیا اس سلسلے میں انکے ایک خط بنام شاکی مورخہ ۴ مارچ ۱۹۳۰ء کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے لکھتے ہیں۔

"آپ جانتے ہیں کہ میں اپنے احباب کو کسقدر عزیز رکھتا ہوں "تجارت" کی گفتگو نہ مجھے زیب دیتی ہے اور نہ میرے احباب کے لئے مناسب۔ اگر حقیقتاً آپ کی ذاتی خدمت ہوتی تو یقین کیجئے کہ میری جانب سے ادنیٰ سا عذر بھی پیش نہیں کیا جاسکتا تھا چونکہ بانیانِ مشاعرہ دوسرے ہیں اس لئے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ آپ کے ذریعہ ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں یعنی اگر وہ براہِ راست مجھ سے معاملت کرتے تو میں ہرگز ہرگز چار پانچ سو سے کم قبول نہیں کرتا اور یہ بھی یقین جانئے کہ وہ مطالبہ ادا کر دیتے لیکن اس طرح انھوں نے معاملات کو میرے لئے بہت زیادہ نازک و ناخوشگوار بنا دیا ہے آپ کے سامنے ہی کا معاملہ ہے کہ امرتسر سے چار سو روپئے لئے تھے حالانکہ امرتسر سے بمبئی بہت کم فاصلے پر ہے شاکی صاحب! آپ تو میرے بھی دوست ہیں، پھر کیا معنی کہ دوسروں کی "تجارتی" یا ذہنی عیاشیوں کی معاونت تو آپ فرمائیں لیکن جگر کی دوستی کو نظر انداز کر دیا جائے۔

محمود کو معلوم ہے کہ جب مشاعروں کے متعلق تجارتی گفتگو ہوتی ہے مجھ پر کیا عالم گذر جاتا ہے یہاں تک کہ خود کو مٹا کر کسی دوست کو سامنے کر دیتا ہوں بہر حال آپ جلسا حکم دیں میں حاضر ہوں"[2]

---

[1] یہ خط رازؔ مرحوم حمید صدیقی لکھنوی کے پاس محفوظ ہے، راقم نے اسے "جگرؔ کے خطوط" میں شائع کرا دیا ہے [2] یہ خط راقم کو نواب سید رشید الحسن صاحب (کراچی) سے ملا اصل خط نواب صاحب کے پاس محفوظ ہے۔

اس کے بعد جب ان کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوا یہاں تک کہ ان کے بغیر مشاعرے ناکام سمجھے جانے لگے تو انکے معاوضہ میں بھی خاصہ اضافہ ہو گیا انکے ایک خط مورخہ ۶ مئی ۳۸ء بنام بخشی غلام محمد سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے تاکہ جگر کے مشاعروں میں شرکت کے معاوضہ میں اضافہ کا پتا چل سکے کہ دن بدن انکا معاوضہ کسقدر بڑھتا گیا اس خط میں وہ لکھتے ہیں :۔

دہلی بمبئی وغیرہ کے مقامات کے مشاعروں سے ۱۰۰۰ اذیہ کے طور پر علاوہ فرسٹ کلاس کرایہ آمد و رفت مصارف سفر مجھے ایک ہزار سے کم رقم نہیں پیش کی جاتی ''۔[1]

ان اقتباسات کے پیش کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ قارئین جگر کے مشاعرے کے تدریجی ارتقاء کو بھی بہ آسانی سمجھ سکیں لیکن جگر مشاعروں سے اتنی گراں قدر رقم حاصل کرنے کے بعد بھی ان بڑھتے ہوئے مشاعروں کے رواج کو اچھا نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ ایک حد تک اس سے متنفر تھے جسکا اظہار انھوں نے ایک خط مورخہ ۱۲ دسمبر ۴۵ء بنام میکش اکبرآبادی ان الفاظ میں کیا ہے :۔

''متعلقین و متحقین'' کی جماعت کم نہیں بجز اسکے چارہ کار نہیں کہ ''مشاعرہ پیشگی'' اختیار کروں اگرچہ میرے تمام احباب جانتے ہیں کہ مشاعروں سے مجھے سخت نفرت ہے لیکن کیا کیا جائے درانحالیکہ مشاعروں سے نجات کسی طرح ممکن نہیں ''معاوضہ یا نذرانہ'' جو کچھ کہئے پوری سختی کے ساتھ وصول کرتا ہوں لیکن پھر بھی احباب خاص کے لئے ہر طرح کا ایثار کرتا ہوں اور کر سکتا ہوں '' [2]

لیکن جگر کے اس قول میں کہ وہ فرمائش پر یا فی البدیہہ تو شعر کہہ ہی نہیں سکتے اور وہ اکھاڑے میں نہیں کود سکتے یا وہ ''مشاعرہ طرحی'' کے لئے فکر و توجہ ضرور صرف کرتے ہیں لیکن ارادۃً شعر نہیں کہتے اور نہ کہہ سکتے تھے صداقت کا فقدان ہے کیونکہ انھوں نے فرمائش پر بھی تکیہ، سہرا، عید وغیرہ جیسی نظمیں کہی ہیں جنکا تذکرہ اگلے صفحات میں آئیگا اور ''مشاعرہ طرحی'' کے لئے بھی فکر و توجہ کی ہے جبھی تو ان کے کلام میں مشاعروں کی طرح پر ''کافی'' تعداد میں غزلیں پائی جاتی ہیں ۔

انکے پہلے دیوان ''داغ جگر'' میں صرف ایک غزل ملتی ہے جسکے متعلق محمد اسلم نے لکھا ہے کہ :۔

''جگر صاحب اعظم گڑھ غلام محمد آغا صاحب عینک فروش کے ذریعہ 1919ء میں پہونچے اور تعارف کے بعد ایک غزل سنائی پھر ایک طرحی مشاعرہ انکے دوران قیام ہی میں ہوا جسمیں جگر صاحب نے بہادر شاہ ظفر کی مشہور غزل کے مصرع طرح کی بحر و قوافی میں اپنی غزل پڑھی جسکا ایک شعر یہ ہے ؂

محشر میں عرض شوق کی امید کیا کرو ں　　دل ہی تو ہے رہا نہ رہا اختیار میں '' [3]

اس کے بعد ''شعلۂ طور'' میں بہت سی غزلیں ہیں جو ''طرحی مشاعروں'' کے لئے کہی گئی ہیں جن کے لئے

---

[1] یہ خط ''گوشۂ جگر'' لائبریری جامعہ ملیہ دہلی میں محفوظ ہے [2] اصل خط میکش اکبرآبادی کے پاس محفوظ ہے راقم نے سے جگر کے خطوط میں شائع کر دیا ہے [3] شبلی کالج میگزین ۱۹۶۲ء صفحہ ۵۰

جگرؔ نے خود متعلقہ غزل کے نیچے مقام مشاعرہ لکھ دیا ہے راقم کے پیش نظر جگرؔ کے دوسرے دیوان کے دو نسخے ایک "شعلۂ طور" مطبوعہ سنہ ۲۶ء (لاہور) ہے اور دوسرا "شعلۂ طور" مطبوعہ سنہ ۳۶ء (مکتبہ جامعہ دہلی) ہے جن میں انھوں نے مندرجہ ذیل غزلوں کے متعلق لکھا ہے کہ وہ غزلیں کہاں کے مشاعرے میں پڑھی گئیں ان غزلوں کے مطلعے اور مقام مشاعرہ بالترتیب درج ذیل ہیں:-

یہ فصلِ گل، سماں یہ شب ماہتاب کا
لا ساقیا! شراب مزا ہے شراب کا
(مشاعرہ بدایوں)

آہ یہ عالمِ کثرت تری رعنائی کا
ایک مرکز نہ رہا چشمِ تماشائی کا
(مشاعرہ الہ آباد)

دہر کی رنگینیوں کا خوب عرفاں ہو گیا
لا، شرابِ کہنہ ساقی دل پریشاں ہو گیا
(مشاعرہ بدایوں)

ندرت پسند کتنے، عشاق خوش نظر ہیں
سینے تمام ویراں، آنکھیں تمام تر ہیں
(مشاعرہ بنارس) غالباً سنہ ۱۹۲۱

سمجھائے کون بلبلِ غفلت شعار کو
محدود کر لیا ہے چمن تک بہار کو
(مشاعرہ الہ آباد)

بیخودی کا نہ ہوا اشناس، کسی بیگانے کو
فطرتِ عشق، سنبھالے رہی دیوانے کو
(مشاعرہ کانپور)

نگراں کوئی بجز دیدۂ مسحور نہ ہو
جلوہ اس طرح دکھا برق نہ ہو طور نہ ہو
(مشاعرہ کانپور)

ابھی کچھ روز بھی گذرے نہ تھے تخلیقِ انساں کو
ابھارا خود کسی کی مصلحت نے ذوقِ عصیاں کو
(مشاعرہ جوبلی علی گڑھ) غالباً سنہ ۲۵ء

ہنسی پھر اڑنے لگی عشق کے فسانے کی
نقاب اٹھاؤ، بدل دو فضا زمانے کی
(مشاعرہ کانپور)

جدھر کو جھوم کے مستِ شراب دیکھیں گے
تمام زہدِ ریائی خراب دیکھیں گے
(مشاعرہ آگرہ) غالباً سنہ ۲۱ء سے قبل

سوز میں بھی وہی اک نغمہ ہے جو ساز میں ہے
فرق نزدیک کی اور دور کی آواز میں ہے
(مشاعرہ مین پوری) تقریباً سنہ ۳۱ء

دلِ حزیں کی تمنا دلِ حزیں میں رہی
یہ جس زمیں کی تھی دنیا اسی زمیں میں رہی
(مشاعرہ بدایوں)

رندہ ہوں کہ غزل بھی مری رندانہ رہے — معنی و لفظ نہیں، بادہ و پیمانہ رہے

(مشاعرہ کانپور)

بے نقاب آج تو یوں جلوۂ جاناں ہو جائے — جو جہاں پر ہو وہیں بیخود و حیراں ہو جائے

(مشاعرہ مین پوری)

خود اپنے عکس کو اپنے مقابل دیکھنے والے — ذرا آنکھیں تو کھول او نقشِ باطل دیکھنے والے

(مشاعرہ مسلم ہوسٹل الہ آباد، غالباً ۳۸ء)

ہم سے رندوں کا زمانے سے جدا میخانہ ہے — آسماں خم ہے، فضائے آسماں پیمانہ ہے

(مشاعرہ اٹاوہ)

جو جہنم میں بھی فردوس بداماں ہوں گے — دیکھ لینا! وہ ہمیں سوختہ ساماں ہوں گے

(مشاعرہ الہ آباد)

(تبسم نظامی کی تحریر جگر کی کہانی غیر مطبوعہ) کے مطابق ۲۸ء

جمالِ رنگ و بو تک حسن کی دنیا سمجھتے ہیں — جو صرف اتنا سمجھتے ہیں وہ آخر کیا سمجھتے ہیں

(مشاعرہ الہ آباد)

رند جو مجھکو سمجھتے ہیں انھیں ہوش نہیں — میکدہ ساز ہوں میں میکدہ بردوش نہیں

(مشاعرہ الہ آباد)

جمع نہ کعبے میں ہے محدود نہ بتخانے میں — ہائے وہ اور اک اجڑے ہوئے کاشانے میں

(مشاعرہ ایٹہ)

اک رند ہے اور مدحتِ سلطانِ مدینہ — ہاں کوئی نظر، رحمتِ سلطانِ مدینہ

(مشاعرہ اجمیر شریف)

اسے حال و قال سے واسطہ، نہ غرض مقام و قیام سے — جسے کوئی نسبتِ خاص ہو ترے حسنِ برق خرام سے

(مشاعرہ سندیلہ۔ لکھنؤ)

اب مرے سامنے ٹھہرے تو گلستاں کوئی — ہو چلا ہے مری صورت سے نمایاں کوئی[۱]

(مشاعرہ بہرائچ)

نظر فروز رہے سامعہ نواز رہے — زہے مجاز کہ وہ زینتِ مجاز رہے

(مشاعرہ مین پوری)

کچھ اس طرح وہ پسِ پردۂ مجاز رہے — حجابِ ساز میں جیسے نوائے ساز رہے

(مشاعرہ مین پوری)

آوارہ ہر نگاہ ز جرمِ نگاہ کیست؟ — دیدن گناہ نیست نہ دیدن گناہ کیست

(مشاعرہ علی گڑھ)

۱؎ اس مشاعرہ کے لئے صرف "شعلۂ طور" مطبوعہ ۱۹۳۲ء میں مقام مشاعرہ بہرائچ لکھا ہے لیکن شعلۂ طور مطبوعہ ... میں مقام مشاعرہ نہیں لکھا ہے۔

جگرؔ نے اپنی بعض بیاضوں میں بھی غزلوں کے نیچے مقام مشاعرہ لکھدیا ہے مثلاً انھوں نے اپنی بیاض نمبر ۲ (گوشۂ جگرؔ۔ جامعہ ملیہ دہلی) میں اس غزل پر جس کا مطلع ہے ؎

واعظ نے اور نہ زاہد شب زندہ دار نے
مجھکو جگا دیا مرے دل کی پکار نے

لکھا ہے "بھوپال۔ برائے مشاعرہ ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ" اور بیاض نمبر ۳ میں اس غزل پر جسکا مطلع ہے ؎

رکھتے ہیں خضر سے نہ غرض رہنما سے ہم
چلتے ہیں بچ کے دور ہر اک نقش پا سے ہم

لکھا ہے "مشاعرہ سہارنپور"

اسی بیاض میں دوسری غزل پر جسکا مطلع ہے ؎

زندگی ہے مگر پرائی ہے
مرگ غیرت تری دہائی ہے

لکھا ہے "مشاعرہ کانپور جسمیں شریک نہیں ہو سکا غالباً ۱۹۴۲ء"

اسی بیاض میں ایک اور غزل دو مسلسل غزلوں کے لئے جس کا مطلع ہے ؎

آتے ہیں پھر وہ عزم دل و جاں لئے ہوئے
پلکوں کی اوٹ حشر کا ساماں کئے ہوئے

لکھتے ہیں "مراد آباد، طرحی دو غزلہ"

ان کے بعد انکی (جگرؔ کی) کوئی تحریر راقم کو نہیں مل سکی جس سے یہ پتا چلتا کہ دوسری بعض باقی طرحی غزلیں کن مشاعروں کے لئے کہی گئیں۔ اس لئے اب سوائے اسکے کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا کہ چند معتبر حضرات کی تحریر کردہ بیان کردہ طرحی غزلوں کو بھی قلمبند کر دیا جائے تاکہ قارئین یہ اندازہ لگا سکیں کہ جگرؔ نے مشاعروں کے لئے کس قدر غزلیں کہی ہیں۔ انکی بقیہ دوسری طرحی غزلیں ملاحظہ فرمائیے:۔

تبسم نظامی نے اپنی کتاب "جگرؔ کی کہانی" (غیر مطبوعہ) میں جگرؔ کی کچھ طرحی غزلوں کے لئے مقام مشاعرہ تحریر فرما دیا ہے اور انکی یہ تحریر مستند ہے کیونکہ انکے بیان کے مطابق وہ خود جگرؔ کے ساتھ بہت سے مشاعروں میں شریک رہے ہیں اور انھیں نے جگرؔ کی حیات پر سب سے پہلی کتاب ۱۹۴۶ء میں "جگرؔ مرادآبادی" کے عنوان سے بھی لکھی تھی ان سے پہلے کسی نے بھی جگرؔ کی زندگی میں ان کی حیات پر کوئی کتاب لکھنے کے لئے کوئی توجہ نہیں کی تھی مشاعروں کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر لکھا ہے۔

وہ "جگرؔ کی کہانی" (غیر مطبوعہ) میں لکھتے ہیں:۔

"دسمبر ۱۹۲۵ء میں ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کی پچاس سالہ جبلی جسمیں ایک آل انڈیا مشاعرہ و مناظرہ منعقد ہوا تھا جگرؔ صاحب نے اس مشاعرے میں ایک طرحی غزل پڑھی ؎

ابھی میں مست مدہوش نغموں سے بھر دوں بزم امکاں کو
ذرا چھیڑے تو مضراب جنوں ساز رگ جاں کو

ایک مشاعرہ ۱۹۲۶ء میں پروفیسر عبدالمجید قریشی کی صدارت میں ہوا اسمیں جگرؔ نے یہ طرحی غزل پڑھی جو بے حد مقبول ہوئی ؎

نالۂ پابند نفس اے دل ناشاد نہیں
یہ تو فریاد کی توہین ہے فریاد نہیں

۱۹۲۶ء کے مین پوری کے سالانہ مشاعرہ میں یہ غزل جھوم جھوم کر پڑھی تھی ؎

نظر کو مست بے حسن کر حجاب اٹھا
جگرؔ شراب نہ پی تہمتِ شراب اٹھا

۱۹۲۶ء میں مین پوری کے ایک مشاعرہ میں جو ٹاؤن ہال میں منعقد ہوا تھا جگرؔ صاحب نے یہ طرحی غزل درد انگیز ترنم سے پڑھی ؎

یہ کرم بھی اے نگاہِ فتنہ ساماں چاہیئے
دل کی خاطر ایک دل سا دشمنِ جاں چاہیئے

۱۹۲۸ء کے مین پوری کے مشاعرے میں جگرؔ صاحب نے یہ غزل پڑھی ؎

نہ فکرِ منزل ہے نہ ہوشِ جادۂ منزل سبھے
جا رہا ہوں جس طرف لے جا رہا ہے دل مجھے

آگرہ کے مشاعرے میں غالباً ۱۹۳۰ء میں جگرؔ صاحب نے یہ غزل پڑھی ؎

نظر ہے وقفِ غمِ انتظار کیا کہنا
کھنچی ہے سامنے تصویرِ یار کیا کہنا

اسی زمانہ میں اٹاوہ میں ماسٹر الطاف حسین کے مکان پر ایک مخصوص نشست میں جگرؔ صاحب نے یہ طرحی غزل پڑھی ؎

ہم سے رندوں کا زمانے سے جدا میخانہ ہے
آسماں خم ہے فضائے آسماں پیمانہ ہے

۱۹۳۴ء ۔ ۔ ۔ میں جگرؔ نے "دلشیر لاج" کانپور میں یہ طرحی غزل پڑھی ؎

دل ہے تجلیات کا طوفاں لئے ہوئے
لیکن حجاب دیدۂ حیراں لئے ہوئے

۲۰ اپریل ۱۹۳۹ء کو جگرؔ نے آل انڈیا مشاعرہ جے پور کے البرٹ ہال میں ۔ ۔ ۔ مندرجہ ذیل غزل پڑھی ؎

نظر سے حسنِ دو عالم گرا دیا تو نے
نہ جانے کون سا عالم دکھا دیا تو نے"

تبسم نظامی اپنی دوسری کتاب "جگرؔ مراد آبادی" میں لکھتے ہیں کہ "جگرؔ صاحب نے "بھوپال میلس" بھوپال میں بعد مشاعرہ کی طرح پر دو غزلیں کہیں ایک غزل کا مطلع مجھے یاد ہے ؎

دل نے کچھ ایسی دھن میں آج نغمۂ شوق گا دیا
عشق بھی جھوم جھوم اٹھا حسن بھی مسکرا دیا"[۱]

مارہرہ ضلع ایٹہ میں جگرؔ صاحب نے یہ طرحی غزل پڑھی ؎

شبِ فراق ہے اور نیند آئی جاتی ہے
کچھ اس میں انکی توجہ بھی پائی جاتی ہے"[۲]

حمید صدیقی لکھتے ہیں کہ ۱۹۳۶ء میں جگرؔ نے انکے یہاں جا کے بیٹنے کے بعد ان سے فرمایا کہ "سندیلہ کے مشاعرے کے لئے تازہ غزل ہو رہی ہے چند شعر ہوئے ہیں آپ کو خاص طور سے سنانے کو جی چاہتا ہے وہ ترنم ریز ہوئے ؎

---

[۱] "جگرؔ مراد آبادی" از تبسم نظامی ص ۳۳۶
[۲] ص ۸۲

نہ غرض کسی سے نہ واسطہ، مجھے کام اپنے ہی کام سے ، ترے ذکر سے، تری فکر سے، تری یاد سے ترے نام سے

قیسی الفاروقی نے جگرؔ کی حیات ہی میں "حیاتِ جگرؔ" جگرؔ کے انتقال سے غالباً دو سال قبل لکھ لی تھی اسلئے انکی تحریر بھی مستند مانی جاسکتی ہے وہ لکھتے ہیں:-

"جون سنہ ۵۸ء میں کرشن چند رپرشرت صاحب کے یہاں طرحی مشاعرہ تھا حضرت جگرؔ نے چھ اشعار کہے تھے جس کا مطلع تھا سہ

کم نہیں ظلمت بھی کچھ اہلِ نظر کے لئے کون رہے شب نشیں نورِ سحر کے لئے

... جولائی سنہ ۵۸ء میں ذوالنورین صاحب کے بنگلے پر طرحی مشاعرہ ہوا حضرت جگرؔ نے ۸ اشعار کی غزل کہی تھی غزل کا مطلع یہ تھا سہ

محبت کا بالآخر رقصِ بیتابانہ کام آیا نگاہ شرمگیں اٹھی سلام آیا پیام آیا

... اگست سنہ ۵۸ء کے طرحی مشاعرہ میں بھی حضرتِ والا نے ۱۹ اشعار کہے تھے یہ مشاعرہ رام لال گپتا ایڈوکیٹ کے مکان پر ہوا تھا اس غزل کا مطلع تھا سہ

مدت میں جو اس شوخ کا دیدار ہوا ہے تا دیر سنبھلنا مجھے دشوار ہوا ہے" [۲]

اس کے بعد قیسی الفاروقی لکھتے ہیں:-

"اپریل سنہ ۵۹ء میں "جشنِ میر" بمبئی کے طرحی مشاعرہ کے لئے بھی حضرت والا نے غزل کہی تھی جسکا مطلع ہے سہ

کیا چیز غمِ عشق کی دیوانہ دشتی ہے رونا ہو تو رونا ہے ہنسی ہے تو ہنسی ہے

"کوئی یہ کہدے گلشن گلشن"

یہ غزل گونڈہ کے ایک طرحی مشاعرے کی ہے" [۳]

امید ڈبائیوی نے جو جگرؔ کے ایک خاص عقیدتمند ہیں مندرجہ ذیل غزلیں جن کے ایک ایک شعر دیئے ہوئے ہیں طرحی لکھا ہے اور لکھا ہے کہ یہ غزلیں آخری ایام میں دورانِ علالت کہی گئی تھیں سہ

۱- اٹھا تعظیم کو ساقی جھکے شیشے بڑھے ساغر نہ جانے آخر شب کون رند تشنہ کام آیا

۲- یہ نشہ بھی کیا نشہ ہے کہتے ہیں جسے حسن جب دیکھئے کچھ نیند سی آنکھوں میں بھری ہے" [۴]

میکش اکبرآبادی نے ۶۔ نومبر سنہ ۶۲ء کی ایک ملاقات میں راقم سے بتایا کہ جگرؔ نے سنہ ۱۹۴۵ء کے آگرہ کے ایک عظیم الشان مشاعرے میں جو طرحی تھا اپنی طرحی غزل پڑھی تھی جسکا مطلع ہے سہ

---

[۱] "آجکل" جنوری سنہ ۶۱ء ص ۴۹ [۲] "فروغ اردو" لکھنؤ فروری مارچ سنہ ۶۱ء ص ۱۷۰ [۳] "فروغ اردو" لکھنؤ فروری و مارچ سنہ ۶۱ء ص ۲۴۳-۲۴۴ [۴] "انجام" کراچی ۲۱ر اکتوبر سنہ ۶۳ء ص ۶

اللہ اگر توفیق نہ دے انساں کے بس کا کام نہیں — فیضان محبت عام سہی عرفان محبت عام نہیں[1]

۱۱۔ دسمبر ۱۹۶۳ء کی ملاقات میں نواب سید شمس الحسن صاحب نے راقم سے بتایا کہ جگر صاحب نے سندیلہ کے طرحی مشاعرے کے لئے ایک غزل کہی تھی جسکا مطلع ہے ؎

دور جا کر دیکھتے نزدیک آکر دیکھتے — ہم سے ہو سکتا تو ہم انکو برابر دیکھتے

اور "سنتا ہوں کہ ہر حال میں وہ دل کے قریں ہے" والی غزل بریلی کے طرحی مشاعرے کے لئے کہی تھی۔

مندرجہ بالا حوالوں سے یہ صاف ظاہر ہے کہ جگر نے مشاعروں کے لئے اکثر و بیشتر عمداً غزلیں کہی ہیں حالانکہ انکا بیان اس کے برعکس ہے۔

(س) جگر کا فارسی کلام | مشہور اردو شعرا میں شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہو جس نے فارسی میں کچھ نہ کہا ہو اور چونکہ اردو شاعری کے بیشتر موضوعات فارسی شاعری کی نقل ہیں اس لئے اردو شعراء نے فارسی میں بھی ایرانی شعرا کی تقلید کی ہے جگر بھی اس سے مبرا نہیں ہیں بلکہ فارسی کلام کا زیادہ تر حصہ تقلیدی ہے اگرچہ وہ بہت ہی مختصر ہے یعنی انکے دونوں مجموعوں "شعلۂ طور" اور "آتش گل" میں کل ۲۱ مکمل غزلیں ۹ غزل پارے ۳ متفرد اشعار، ۵ نظمیں اور ۳ قطعے ہیں اور ان سب اشعار کی مجموعی تعداد ۳۰۶ ہے۔ جگر کے فارسی کلام کے اسقدر مختصر ہونے کی وجہ بتاتے ہوئے محمود علی خاں جامعی نے صحیح لکھا ہے کہ "جگر صاحب۔۔۔ اپنے دوسرے دور یعنی مین پوری کے قیام تک وہ اکثر فارسی میں بھی کہا کرتے تھے لیکن جیسے جیسے ان کا اردو رنگ نکھر کر قائم ہو تا گیا انھوں نے فارسی میں کہنا کم کر دیا"[2]

جگر فارسی میں بھی کہتے تھے کیونکہ انھیں فارسی ادب سے خصوصیت سے شغف تھا جسکا انھوں نے خود اعتراف کیا ہے خسرو اور حافظ کا کلام اکثر انکے زیر مطالعہ رہا کرتا تھا ان دونوں بزرگوں سے انکو گہری عقیدت تھی اور ان کا قول ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے احترام کا صحیح جذبہ قیام اعظم گڑھ ہی کی پیداوار ہے۔ خسرو کی عقیدت سے متعلق ایک واقعہ انھوں نے احمد حسین خاں احمر رفاعی سے بیان کیا تھا کہ ایک موقع پر دیوان خسرو انکے زیر مطالعہ تھا کہ آنکھ لگ گئی جسوقت بیدار ہوئے تو از خود ایک کیفیت سی پیدا ہوئی اور

---

[1] اس سلسلے میں اپنا ایک واقعہ لکھ دوں کہ جب میں (راقم الحروف) ۱۹۵۲ء میں انٹرمیڈیٹ میں کرسچین کالج لکھنؤ میں پڑھتا تھا میرے کمرے سے ملے ہوئے کمرے میں مراد آباد کے قاضی خاندان کے قاضی تصدیق حسین۔ (جواب ڈاکٹر تصدیق حسین ہیں) رہتے تھے جنھوں نے مجھے یہ شعر سنایا مجھے یہ شعر اسقدر پسند آیا کہ کبھی کبھی میں بھی جگر کا یہ شعر گنگناتا رہتا میری دلچسپی جگر سے بڑھانے کا سبب یہی شعر ہوا اور جب پی ایچ۔ ڈی کے لئے مقالہ کے عنوان کی تلاش ہوئی تو میں نے جگر ہی کو منتخب کیا۔ [2] "تذکرہ جگر" ص ۵۳

بے ساختہ خسرو کے انداز پر یہ غزل ہو گئی۔

فارغ ز خزانی و ہم از باغ و بہارے — مائیم و خیالِ رخِ خورشید نگارے

اسی طرح کا ایک واقعہ دیوانِ حافظ کے مطالعہ کے وقت پیش آیا وہ ایک دفعہ دیوانِ حافظ کا مطالعہ کر رہے تھے کہ ان پر یکایک غنودگی سی طاری ہونے لگی اور چند ہی لمحے بعد وہ دیوان کو سینے پر رکھ کر بےخبر ہو گئے جب بیدار ہوئے تو انکے فرمانے کے مطابق ان پر بالکل الہامی طور پر ایک غزل نازل ہوئی جسکا مطلع ہے ؎

گویند کہ ہم زاہد در دیدہ بصر دارد — دارد بصرے اما تعیین نظر دارد

اس غزل میں تصوف کا غلبہ اور دروں بینی کا ملکہ اپنے کمال پر نظر آتا ہے۔

ان دونوں شعرا سے عقیدت اور ان سے فیض اٹھانے کا اقرار جگر نے اپنے اشعار میں بھی کیا ہے خسرو کے لئے کہتے ہیں۔

اے خسرو خوباں نظرے کن زِ سرِ مہر — افتادہ بہ کویت جگرِ سینہ فگارے

اور حافظ کے لئے کہتے ہیں ؎

ہر روز فیض گیرم از روحِ قدسِ حافظ — بر من جگر گواہ است ایں جوش و ایں معانی

تا کے جگر ایں مستی بشنو سخن حافظ — رندی و خراباتی در عہدِ شباب اولیٰ

جگر کا یہ اعتراف رسمی نہیں ہے بلکہ انھوں نے حافظ کی زمینوں میں غزلیں کہی ہیں اور انکے رنگ میں سر تا پا سرشار رہے ہیں وہ حافظ سے مزاج، لب و لہجہ افکار و احساسات، زبان و بیان ہر طرح سے متاثر ہوئے ہیں اور انھوں نے حقیقت کی مطلق پردہ پوشی نہیں کی انکے مندرجہ ذیل اشعار میں حافظ ہی کے آثار ہیں انکے تیور انہی کا جوش و خروش اور انہی کی گونج سنائی دیتی ہے ؎

سحرم آمد ایں ندا از سر دوش — سینہ بخراش و بہ بادہ بخروش

بےخبر زد اکہ ہوش در مستی است — ہوشیار آ کہ بیخودی است بہوش

توبہ کردم ز مے بہ مستی لیک — ابر و باد و بہار را چہ کنم

چوں در بہشت رفتم دیدم ہمیں تماشا — زہادِ خشک و حوراں سادہ سادہ

ہمت اگر تو داری کو در عشق کوش اے دل — ایں جان تازہ برگیر از بارگاہِ جانی

از خرقہ و عمامہ، من ہیچ نمی دانم — گہ گہ نگر ایں ساماں در عہدِ شباب اولیٰ

من عاشقِ شیدائیم، از غیر نہ دارم کار — کز مہر فلک از تو صد چشم عتاب اولیٰ

من ساغر مے در کف، مطرب تو بخواں بر دف — صد توبہ و صد طاعت غرقِ مے ناب اولیٰ

جگر صرف یہ نہیں کہ حافظ کے رنگِ کلام، انکی زبان انکے اندازِ بیان سے متاثر تھے بلکہ انکا ماحول

انکار بھی حافظ ہی کی طرح رہا۔ اسکے متعلق پروفیسر سید حسن کی گراں قدر رائے بڑے اہمیت کی حامل ہے وہ لکھتے ہیں!

"حافظ اور جگر دونوں کے مزاج اور ماحول و افکار میں کئی اعتبار سے مشابہت ہے دونوں نظر باز، حسن پرست، عشق پیشہ، عارف، قناعت پسند، شادمانی وخوشی کے طرفدار، زاہد ساو س، ومنافقت کے مخالف، مجذوب محبت اور سالک طریقت ہیں، دونوں مجلۂ خاصان میخانہ اور رند بے ریا ہیں، دونوں نے حسن مجازی کے تصور کو شراب کی حرارت میں پگھلا کر اسے تمام مادی کثافتوں سے منزہ کر کے ایک پیکر نورانی اور شعلۂ طور میں تبدیل کر دیا ہے اور اس طرح اپنے رنگین رومان کا رشتہ روحانی حقیقت سے وابستہ کر کے اسے عارفانہ مشاہدات کا وسیلہ اور نازک وعمیق احساسات و باریک تخیلات کا سرچشمہ بنا دیا ہے دونوں ایسے زمانوں میں پیدا ہوئے جب تمام دنیا شور و شر سے پُر اور سارا عالم رزمگاہ و مقتل بنا ہوا تھا دونوں انقلابات نو بہ نو کے آغوش میں پلے تھے زندگی ہر قدم پر معرکۂ کرب و بلا اور ہر نفس میں سانحۂ مرگ جواں لئے ہوئے تھی، ہرج و مرج، فتنہ و فساد اور جنگ وجدل نے دونوں کے ذہن و قالب کو متاثر کیا ہے انکے سینے سوگوار، دل دردمند، آنکھیں اشکبار ہیں، انکے جذبات میں غم و الم کی تلخی گھلی ہوئی ہے، دونوں ارباب ستم اور اہل سیاست سے بیزار اور زوال آدمیت و پستی اخلاق کے نوحہ سرا ہیں، لیکن دونوں کو محبت کی فاتحانہ طاقت پر اعتماد ہے اور اسی کے ذریعہ نوع انسان کی نجات اور اصلاح کے آرزومند ہیں۔" [۱]

مندرجہ بالا باتوں میں یکسانیت و مشابہت کے باوجود جگر حافظ کی حسن ادا، رعنائی اور طرز سخن کی سادگی و شیرینی لانے میں ناکام رہے ہیں کیونکہ انھوں نے حافظ کی نقل کرنے کی کوشش کی اور نقل میں اصلیت پیدا نہیں ہو سکتی ہے مثلاً حافظ کے ان اشعار:-

خیز و در کاسہ زر آب طربناک انداز	پیشتر زانکہ شود کاسۂ سر خاک انداز
بیا کہ قصر امل سخت سست بنیاد است	بیار بادہ کہ بنیاد عمر بر باد است
اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقاں ریزد	من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

میں جو جوش و ولولہ ہے جگر نے بھی اپنے مندرجہ ذیل اشعار میں اسی انداز سے جوش و ولولہ کا اظہار کیا ہے ؎

بیا، بنوش جام مے، چہ جام مے؟ تمام مے	کہ ما و اذن عام مے، خوش است ارمغان ما
خب مراست ولب جوئے و فتنہ ہا خاموش	بگیر جام بگیر و بنوش بادہ بنوش
دل عطا کن تا در دلش درد ہا پیدا کنم	دیدۂ دہ تا بر دلش دل ہا پیدا کنم

اس کے علاوہ جگر کے یہاں، غالب اور اقبال کے طرز سخن کی جھلکیاں بھی مل جاتی ہیں لیکن انکے کلام میں معانی و بیان کی کمزوریاں ہیں حسن کی وجہ ان کی فارسی کلام میں کم مشقی ہے وہ بیان میں حسن اور زبان میں

---

[۱] "صبح نو" اپریل ومئی سنہ ۹۱ء ص ۱۷-۱۸

رنگینی بھی نہیں پیدا کر سکے ہیں کہیں کہیں عام سادے مضامین کو سیدھے سپاٹ انداز میں بیان کر گئے ہیں ان کے بعض اشعار میں محاورے کے استعمال میں ناپختگی اور بندش میں سستی بھی ملتی ہے۔

اسی وجہ سے محمد مسلم کی تحریر کے مطابق جب انھوں نے ایک دفعہ اقبال سہیل کو اعظم گڑھ میں اپنا فارسی کلام سنانا چاہا تو اقبال سہیل نے کہا کہ "میں ابھی کھانا کھا کر آیا ہوں"، ۱؎ اس جملے کو سن کر جگر صاحب ہنس پڑے سہیل کا مطلب تھا کہ انکے فارسی کلام سننے سے ابکائی نہ آجائے۔ مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمایئے اور دیکھئے کہ کسقدر سیدھا اور سپاٹ انداز بیان ہے اور محاورے کے استعمال میں کسقدر ناپختگی ہے ؎

جنونِ عشق، اے دل! مستند نیست | اگر ہر آبلہ خارے ندارد
گویند کہ ہم زاہد در دیدہ بصر دارد | دارد بصرے امّا تعیین نظر دارد
تو اے، گو نرگسِ مستانہ داری | بیک ساغر عجب میخانہ داری

جگر نے بعض غزلوں میں ایک ہی لفظ کے تکرار سے اپنے وسیلۂ اظہار میں کمی کا احساس دلایا ہے انھوں نے بعض غزلوں میں غالب کی نہ صرف پیروی کی ہے بلکہ نظم "سراپا" بھی غالب ہی کی پیروی میں لکھی ہے اور اپنے معشوق کے ظاہری حسن کو تشبیہوں و استعاروں سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے انھوں نے اپنی نظم "یادِ ایام" میں بھی غالب کی مندرجہ ذیل غزل کی پیروی کی ہے ؎

یادِ باد آں روزگاراں کا عتابے داشتم | آہ آتشناک و چشمِ اشکبارے داشتم

اور جگر کی نظم کا پہلا شعر ہے ؎

ذوقِ صورت ساز و شوقِ جلوہ ساماں داشتم | یاد ایامے کہ منزل منزلِ جاں داشتم

ان سب باتوں کے باوجود جگر کا فارسی کلام یک لخت لائقِ گردن زدنی نہیں ہے بلکہ انکے فارسی کلام میں بھی بعض پر لطف و دلچسپ باتیں اور بامعنی و صوفیانہ خیالات کے پر اثر و پر درد اشعار مل جاتے ہیں جنکا اندازِ بیان بھی دلکش ہے اور چونکہ وہ فطرتاً گداز طبع واقع ہوئے تھے اس لئے انکی شعری تخلیقات فطری پیرائے میں ہوئی ہے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں۔

آں کیست نہاں در غم آں کیست نہاں در دل | دل رقص کناں در غم اغم رقص کناں در دل
جاں از دل و دل از جاں بیگانہ و مستغنی | گاہے بہ جہاں در جاں گاہے بہ جہاں در دل
آوارہ ہر نگاہ زجرمِ نگاہ کیست | دیدن گناہ ماست نہ دیدن گناہ کیست
بے کیفی در عشق، صد کیف ندا تر دارد | زیں سر نہاں لیکن، ہر کس نہ خبر دارد
بلبل ہمہ تن خوں شدہ گلہا ہمہ تن چاک | اے وائے بہارے اگر این است بہارے
اغیار بدل خندہ زن و دل بہ تو مشغول | خلقے بسی دیوانہ و دیوانہ بکارے

۱؎ "شبلی کالج میگزین"، اگست ۱۹۶۰ء صفحہ ۵۴۔

شب میکدہ چوں رفتم، دیدم عجب بہارے ساقی ست مست و بیخود، رند است ہوشیارے
آں مے کہ بسے خوردم، زیں بیش ہمیں بوید اے واعظِ خوش نیت، برخیز زکوثر ہم
تنہا نہ منِ بے دل، در ہجر تو رنجورم صد خوں بہ فلک دیدم از دیدۂ اختر ہم
ایں غم دنیا و دیں تا بکجا روز و شب خیز اکہ بادِ بہار، بادۂ مینا رسید
خبرے بہیچ، ز منزلِ جاناں نہ رسید عمر آخر شد و افسانہ بپایاں نہ رسید
چہ خوش است ذوقِ محبتم! چہ بلاست لذتِ فرقتم کہ بیادِ زلفِ سیاہ تو، بہ ہجومِ تیرہ شبی خوشم
نہ بسم نہ جسم نہ اینم نہ آنم چہ رازِ عیانم! چہ سرِّ نہانم

ان کی بعض نظموں کے بعض اشعار نہایت سلیس و سادہ اور سلجھے ہوتے ہیں۔

ان کے "سراپا" کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے اور ان کے اندازِ بیان کی داد دیجئے دیکھئے اپنے محبوب کی تشبیہ و استعاروں سے کیسی مرقع نگاری کرتے ہیں ؎

عارض چہ عارض گیسو چہ گیسو صبحے، چہ صبحے، شامے چہ شامے
از جسم لرزاں، لرزاں دو عالم در زلف برہم، برہم نظامے
از بارِ مینا لرزش بدستے وز کیفِ صہبا لغزش بگامے
گفتم چہ جوئی؟ گفتا دل و جاں گفتم، چہ خواہی؟ گفتا غلامے

"خطاب بہ مسلم" میں انھوں نے کانپور کے ۱۹۳۱ء کے فساد اور اس میں مسلمانوں کی شہادت کا تذکرہ بڑے پُر درد انداز میں کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

چشم کشا و جانبِ رزم گہِ وطن نگر مقتلِ کانپور بیں، لاشۂ بے کفن نگر
خونِ حیات سو بسو، خاک بسرشتہ مو بمو خلق بُریدہ کو بکو، بچہ و مرد و زن نگر
ہائے ازیں گزندگاں، وائے ازیں درندگاں ہندو بہارِ ہند را بسمل و خستہ تن نگر
شانِ امارتے ببیں، طرزِ سیاستے ببیں ایں ہمہ نعمتے ببیں، واں ہمہ بر وطن نگر
نغمۂ سرمدی کجا؟ جلوۂ احمدی کجا؟ سایۂ ایزدی کجا؟ عصبۂ اہرمن نگر
ہمتِ دل بکوش آر، جاں ہمہ در خروش آر پیروی صحابہ کن، اسوۂ پنجتن نگر
ساغرِ جہد نوش کن، طاعتے فروش کن باز روش روش خرام بازہ چمن چمن نگر

اور "نعت شریف" کا "قطعہ و مقطع" دیکھئے کیسی اپنے جذبات و تاثرات کی عکاسی کی ہے ؎

استادہ بہ پیشِ بارگاہ است پیرے بہ رُخ آستیں کشیدہ
شاید جگرِ حزیں ہمیں است از بارِ گنہ کمر خمیدہ

مندرجہ بالا کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جگر کے فارسی کلام میں کچھ خوبیاں بھی ہیں

اور کچھ خامیاں بھی ۔ جگر کے فارسی کلام کے مطالعہ کے بعد محمود علی خاں جامعی کا یہ کلیہ قائم کر دینا کہ "ان کے فارسی کلام میں بڑی دلآویزی اور جاذبیت ہے اور خیالات کے لحاظ سے اس میں بھی انہی خیالات کا عکس پایا جاتا ہے جو انھوں نے اردو میں ظاہر کئے ہیں" م۱

صحیح نہیں ہے کیونکہ ان کے سارے فارسی کلام میں نہ تو زیادہ دلآویزی اور جاذبیت ہے اور نہ ان میں اردو خیالات کا عکس ہی پایا جاتا ہے اس سلسلہ میں پروفیسر سید حسن کی رائے البتہ سب سے زیادہ مستند اور قابل قبول ہے کہ :۔

"جگر کی فارسی شاعری تقلید و تجربہ کی حد سے آگے بڑھنے نہیں پائی اور انکے فارسی کلام کو اس سے بہتر کوئی مقام حاصل نہیں ہو سکتا" م۲

م۱ "تذکرہ جگر" ص ۱۵۳ م۲ "صبح نو" اپریل و مئی سنہ ۶۱ء ص ۲۳

نوٹ :- کاتبوں کی بد معاملگی و لاپروائی کی وجہ سے اس کتاب کو کئی کاتبوں سے لکھوانا پڑا جس کی وجہ سے اس میں جو یکسانیت ہونی چاہیے تھی نہیں رہی جسکے لئے راقم الحروف معذرت خواہ ہے

باب پنجم

(ا) جگرؔ کی شاعری کے بعض اہم موضوعات

خمریات جگرؔ، تصوّر حسن و عشق، تصوّف، انسانی عظمت کا تصوّر

بعض اخلاقی پہلو، جگرؔ کی نظم گوئی

(ب) سماجی و سیاسی محرکات

قومی تحریک کے اثرات، قومی اور وطنی نظمیں اور ان کا تجزیہ

تقسیم ہند کے بعد کے اثرات کا رمزی اور علامتی بیان،

سیاست میں محبت کا پیغام

ترتیب

جگر کی شاعری کے بعض اہم موضوعات

خمریات جگر شراب اور متعلقات شراب کے تذکرہ سے دنیا کی کوئی زبان خالی نہیں ہے چنانچہ اردو شاعری میں بھی اس کا ذکر تقریباً ہر شاعر کے یہاں ملتا ہے اردو شاعری میں شراب اور متعلقات شراب کی تقلید فارسی شاعری سے کی گئی ہے اور فارسی شعراء (ایرانی شعراء) میں سے بعض نے تو شراب کو منہ بھی نہیں لگایا اور شراب کے متعلق مضامین نظم کئے ہیں مثلاً حافظ شیرازی جن کے متعلق عام طور سے یہ خیال رائج ہے کہ وہ شراب نہیں پیتے تھے لیکن انھوں نے شراب اور اصطلاحاتِ شراب کا تذکرہ شرابِ معرفت کے مفہوم میں کیا ہے۔

ہندوستان میں بھی حافظؔ شیرازی کی سی مثال ریاضؔ خیرآبادی کی دی جاسکتی ہے جن کا ضخیم دیوان مضامینِ شراب سے بھرا پڑا ہے لیکن کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ انھوں نے کبھی شراب کو منہ سے بھی لگایا ہو جبکہ اسی زمانے کے مشاہیر شعراء مجازؔ مرحوم اور جوشؔ و فراقؔ ہیں، جنھوں نے شراب سے عملاً واسطہ رکھا اور اسکے متعلق جو کچھ بھی بیان کیا اس میں ان کے ذاتی تجربات و جذبات ہیں یہی حال جگرؔ کا بھی ہے۔

جگرؔ کا نام زبان پر آتے ہی ذہن فوراً اُن کی شرابی زندگی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کیونکہ شراب نوشی کے معاملہ میں اُن کا کوئی ضابطہ مقرر نہ تھا جس کے متعلق انجم انصاری[1] نے صحیح لکھا ہے کہ:

"وہ پینا شروع کرتے تو پیتے چلے جاتے اچھی بری شراب سے کوئی مطلب نہیں اس میں پانی کا سوڈا یا برف کی آمیزش بھی نہیں کرتے اس کو وہ شرک سمجھتے تھے خالص شراب پیتے اور بوتل سے منہ لگا کر براہ راست پیتے کر پیتے پیتے بالکل مدہوش ہو جاتے ذرا سا ہوش آتا تو پھر پیتے جتنی شراب سامنے ہوتی وہ سب پیٹ میں ڈال لینے کی کوشش کرتے کیونکہ حکیم قسم کے احباب سے ڈرتے تھے کہ کہیں نگاہ بچا کر پھینک نہ دیں یہ سلسلہ کئی دن تک چلتا رہتا تھا اس عرصہ میں کھانے پینے کا ہوش نہ رہتا احباب نے اصرار کر کے کچھ کھلا دیا تو الٹا سیدھا پیٹ میں ڈال لیا اور وہ بھی اس بُرے انداز میں کہ دیکھنے والے کو مذاق گراں گذرتا ورنہ جگرؔ اور شراب اور شراب اور جگرؔ آخر کئی کئی دن بعد یہ سلسلہ ختم ہوتا تھا اور چند روز جگرؔ ہوش میں رہتے تھے پھر وہی شراب تھی اور وہی جگرؔ" [2]

---

[1] ایک مضمون بہ عنوان "حضرت جگرؔ اور شراب" اردو ٹائمز ۹ ستمبر سنہ ۶۲ء میں شائع ہوا ہے جس میں مضمون نگار کا نام نہیں دیا ہے اس لئے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایڈیٹوریل انجم انصاری کا ہوگا لیکن انجم انصاری کا مضمون بھی اسی صفحہ پر "وہ جگرؔ جو موت پر غالب رہا" کے عنوان سے شائع ہوا ہے اس لئے اس کا صحیح پتا نہ چل سکا کہ مضمون نگار کون ہے۔

[2] "اردو ٹائمز" ۹ ستمبر سنہ ۶۲ء (اخبار پر صفحہ درج نہیں ہے اس کا تراشہ راقم کے پاس محفوظ ہے)

یہ تھا جگرؔ کا دورِ رندی۔ اسی وجہ سے جگرؔ کے یہاں شراب کے مضامین اصل ہیں نقل یا تقلیدی نہیں، کیونکہ عملاً انھوں نے اسے برتا ہے اور اپنے ذاتی تجربات و جذبات کو خلوص کے ساتھ نظم کر دیا ہے شراب اور شاعری نے انھیں جی کھول کر بے نقاب کیا ہے لیکن وہ ازلی نسبت کے تحت کبھی برہنہ نہ ہو سکے بلکہ ایک وقت ایسا بھی آ گیا جب اس دردِ آشام اور دن رات شراب میں غرق رہنے والے شرابی نے توبہ کر لی۔

شراب سے متعلق انھوں نے بہت سے اشعار کہے ہیں شراب کے مضامین کے سلسلے میں ہمیں ان کے کلام کا جائزہ لیتے وقت ان کے تینوں مجموعوں ۱۔"داغِ جگر" ۲۔"شعلۂ طور" اور ۳۔"آتشِ گل" کو پیشِ نظر رکھنا پڑے گا۔ "داغِ جگر" میں انھوں نے شراب کا سرسری تذکرہ کیا ہے اور اس کی ایک عام حالت بیان کی ہے یہ زمانہ انکی مے نوشی اور عنفوانِ شباب کا ابتدائی زمانہ ہے شاعری میں ان کو کوئی خاص کمال حاصل نہیں ہوا تھا لیکن شاعرانہ فطرت کی وجہ سے جو انھیں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی تھی وہ جو کچھ محسوس کرتے تھے اسے نظم کر دیتے تھے اس زمانے میں انھوں نے شراب کا تجربہ کرنا شروع کیا تھا لہٰذا ان کے یہاں وہی ابتدائی تجربات کے نقوش ملتے ہیں شراب کا بیان رسمی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ ایک نئے شرابی شاعر کے یہاں ہونا چاہئے اندازِ بیان میں بھی کوئی خاص دلکشی نہیں ہے لیکن یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے جو کچھ کہا ہے وہ آپ بیتی ہے جگ بیتی نہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے اس ابتدائی دور کے کلام میں بھی حقیقت اور سچائی پائی جاتی ہے اس دعوے کے ثبوت میں ان کے مندرجہ ذیل اشعار "داغِ جگر" سے سامنے پیش کئے جا سکتے ہیں ؎

ہر وقت اک خمار تھا ہر دم سرور تھا
بوتل بغل میں تھی کہ دلِ ناصبور تھا

دیکھا تھا کل جگرؔ کو سرِ راہِ میکدہ
اس درجہ پی گیا تھا کہ نشے میں چور تھا

جب تو کچھ ظرف ہے اے دل ترے پیمانے کا
راز میخانے سے باہر نہ ہو میخانے کا

کام آخر کر گئی، وہ نرگسِ مستانہ آج
بھر گیا بے منتِ ساقی، مرا پیمانہ آج

کہاں کا میخانہ، کس کا ساقی، کچھ اور بڑھنے دو بیخودی کو
یہی بنائے گی جام و ساغر یہی کرے گی شراب پیدا

برس رہا ہے یہ رنگ مستی، کہ ہوش باقی نہیں کسی کو
نگاہیں ان کی جھکی ہوئی ہیں، پلا رہا ہے شراب عارض

بے دلی کا زور ہے ساقی کے ہجر میں
جی چاہتا ہے پھینک دیں ساغر اٹھا کے ہم

آج رگ رگ میں مری اک شورشِ مستانہ ہے
کیا نگاہِ مست ساقی شاملِ پیمانہ ہے

"شعلۂ طور" میں شراب کا جو بیان ہے وہ جگرؔ کی زندگی کے تجربات کا بیان ہے اس دور میں انھوں نے شراب پی نہیں بلکہ ہمہ وقت غرقِ مئے ناب رہے اس زمانے میں وہ بالکل بے خود و مدہوش رہے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا تھا بس انکی زندگی سمٹ کر شراب کی بوتل میں پہنچ گئی تھی

وہ اور شراب، شراب اور وہ دن رات ایک ساتھ رہتے تیسری کوئی چیز درمیان میں حارج نہیں ہو پاتی تھی وہ کئی کئی دن تک مسلسل شراب پیتے رہتے تھے اور کھانے وغیرہ کو ہاتھ تک نہ لگاتے تھے۔

اسی دور میں انھوں نے شراب سے متعلق جتنے بھی اشعار کہے ہیں سب میں انھوں نے شراب سے متعلق اپنے ذاتی تجربات بیان کئے ہیں اب ان کی شاعری اپنے عروج پر تھی زبان و بیان پر بھی قدرت حاصل کر چکے تھے اسلئے اب ان کے اندازِ بیان میں زور اور دلکشی پیدا ہو گئی ہے انھوں نے اپنے دورِ رندی کے سارے تجربات بڑے خلوص اور سچائی کیساتھ بیان کئے ہیں تکلف اور تصنع کہیں نام کو نہیں ملتا وہ خود ہی اپنی رندی اور رندانہ زندگی کے متعلق کہتے ہیں ؎

جگرؔ کی بادہ کشی ان دنوں معاذ اللہ — جب آپ دیکھیں گے غرقِ شراب دیکھیں گے
کیا جگرؔ سے آپ ابھی واقف نہیں — ایک ہی تو رندِ آشام ہے
ایک جگہ بیٹھ کے پی لوں مرا دستور نہیں — میکدہ تنگ بنا دوں مجھے منظور نہیں
رند جو مجھ کو سمجھتے ہیں انھیں ہوش نہیں — میکدہ ساز ہوں میں، میکدہ بردوش نہیں

اس دور میں وہ شراب کے اس قدر رسیا تھے کہ شراب سے عشق کی حد تک محبت کرتے تھے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے کوئی جتن اٹھا نہ رکھتے تھے انھیں کا بیان ملاحظہ فرمائیے وہ خود وفورِ شوق میں کہتے ہیں ؎

درِ میکدہ اور سجدوں پہ سجدے — جگرؔ! واہ کیا کفر سامانیاں ہیں
پوچھنا کیا؟ کتنی وسعت میرے پیمانے میں ہے — سب الٹ دے ساقیا! جتنی بھی میخانے میں ہے
جتنی بھی آج پی سکوں، عذر نہ کر پلائے جا — مست نظر کا واسطہ مستِ نظر بنائے جا
اک جام آخری تو پینا ہے اور ساقی! — اب دستِ شوق کانپے، یا پاؤں لڑکھڑائیں
اے رحمتِ تمام مری ہر خطا معاف — میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا

ساون کی گھٹاؤں کو دیکھ کر وہ کہتے ہیں ؎

اللہ یہ ساون کی گھٹائیں، یہ ہوائیں — کیا آج بھی شغلِ مے و مینا نہ رہے گا

اُن کو شیشے میں خلد اور پیمانے میں فردوس نظر آتا ہے ؎

سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے میخانے میں — خلد شیشے میں ہے فردوس ہے پیمانے میں
یہ مے کشی ہے تو پھر شان میکشی کیا ہے — بہک نہ جائے جو پی کر وہ رند ہی کیا ہے
اسی کے واسطے مے بھی ہے میکشی بھی جگرؔ — خبر نہیں جسے، مے کیا ہے؟ مے کشی کیا ہے

ایک جگہ کہتے ہیں ؎

بجُئیں وہ شوق سے تنہا مگر یہ کیا ممکن — ہمیں سرور نہ آئے انھیں سرور آئے

محتسب کے احتساب کرنے پر وہ فرماتے ہیں ؎

کس لئے جان دیتے ہیں رند شراب ناب پر — پوچھ نہ روز محتسب تھوڑی سی آج پی کے دیکھ
اے محتسب نہ پھینک مرے محتسب نہ پھینک — ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے

دہر کی رنگینیوں سے پریشان ہو کر کہتے ہیں ؎

دہر کی رنگینیوں کا خوب عرفاں ہو گیا — لا شراب کہنہ ساقی میں پریشاں ہو گیا
غرق موجِ بادہ کردے ساقیا — تا کجا بیم؟ اور دنیائے خراب

اور جب بزم ساقی میں جاتے ہیں تو اس طرح جاتے ہیں ؎

بزم ساقی میں نہیں کچھ کام عقل و ہوش کا — مست جانا چاہیئے مدہوش آنا چاہیے
بہار، توبہ شکن چشمِ مستِ یار مُصِر — میں آج پی جو نہ لیتا وہ بدگماں ہوتا

جگر تو ایک مست قلندر قسم کے انسان تھے اس لئے جب کبھی ان کو کہیں سے کچھ پیسے مل جاتے وہ اسے فوراً پیمانے میں گھول دیتے کبھی کبھار ان کی حالت ایسی بھی رہی کہ ان کے پاس جیب میں پیسے نہیں ہے اور مجبوراً وہ اپنا محبوب مشغلہ نہ کر سکے تو کہا ؎

چاندنی ہے ہوا ہے کیا کہیئے — مفلسی کیا بلا ہے کیا کہیئے

وہ اپنی شرابی زندگی سے خوش نہ تھے بلکہ ان کو اپنی اس حرکت پر ہمیشہ افسوس رہا کرتا تھا اور جب یہ احساس شدید ہو جاتا تو وہ اسے ترک بھی کر دیتے تھے چنانچہ انھوں نے اپنے دورِ رندی میں کئی دفعہ شراب سے توبہ کی اور اسے توڑی بھی۔ ایک زمانے میں جب انھوں نے کچھ عرصہ تک شراب نہیں پی اس وقت کے ان کے احساسات ملاحظہ فرمائیے ؎

ترکِ مے کو مدتیں گذریں مگر اب تک جگرؔ — دیکھ کر جام تہی کچھ اشک بھر لاتا ہوں میں

آخر کار صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا اور وہ اپنی توبہ کو توڑ تاڑ کے تھرا کے پی جاتے اس سلسلے میں انھوں نے "شکستِ توبہ" کے عنوان سے باقاعدہ ایک نظم کہی تھی اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

ساقی کی ہر نگاہ پہ بل کھا کے پی گیا — لہروں سے کھیلتا ہوا لہرا کے پی گیا
بے کیفیوں کے کیف سے گھبرا کے پی گیا — توبہ کو توڑ تاڑ کے تھرا کے پی گیا
سرمستیٔ ازل مجھے جب یاد آ گئی — دنیائے اعتبار کو ٹھکرا کے پی گیا
اس جانِ میکدہ کی قسم بارہا جگرؔ — کل عالمِ بسیط پہ میں چھا کے پی گیا
توبہ کردم زمے پرستی لیک — ابر و بادِ بہار را چہ کنم

توبہ کو توڑ تاڑ کر پینے اور شراب سے اس قدر شوق رکھنے کے باوجود انھوں نے اپنے احباب یا کسی

بھی ملاقاتی کو بغیر یہ جانے ہوئے کہ وہ شراب پیتا ہے کبھی شراب پیش نہیں کی اور نہ کبھی اس کی حوصلہ افزائی کی اسی لئے راز مرادآبادی نے کسی جگہ کہا ہے کہ اگر میں جگر سے زیادہ قریب نہ ہوتا تو شراب ضرور پیتا، جگر صاحب خود بھی کہتے ہیں سہ

کہاں پھر یہ ہستی؟ کہاں ایسی مستی؟ — جگر کی جگر تک بھی میخواریاں ہیں

جگر کی اس قدر مخدود مے پرستی اور اس پر شرمندگی اور اصغر کی صحبت کے اثر سے انکی شراب کا رخ معرفت کی طرف ہو گیا اور وہ رفتہ رفتہ شرابِ معرفت کا بھی تذکرہ کرنے لگے اپنی نظم "نرگس مستانہ" میں کہتے ہیں سہ

تو ساقیِ میخانہ ہے میں رِندِ بلانوش — میرے لئے میخانے کو پیمانہ بنادے
اللہ نے تجھکو مے و میخانہ بنایا — تو ساری فضا کو مے و میخانہ بنادے

اس کے لعد وہ کہتے ہیں سہ

بلندی ہی باقی رہی اب نہ پستی — فدا تجھ پہ میں، اور مری مے پرستی
یہی ہے بس اب حاصلِ حسنِ ہستی — خوشا ذوق و مستی، کہ ہم ذوق و مستی
سرت گردم دبے خبر می فروشم

"آتشِ گل" تک پہنچتے پہنچتے ان کا مسلک بدلنے لگتا ہے شراب ترک کر دیتے ہیں اور اب وہ بحرِ معرفت میں غوطہ لگانا شروع کرتے ہیں اس دور کے کلام میں انھوں نے شراب کو بعض جگہ شرابِ معرفت کے مفہوم میں صوفیانہ انداز میں بیان کیا ہے اب ان کے کلام میں بالیدگی آ گئی تھی ان کی شاعری عروج کی منزل میں پہنچ گئی تھی — اس دور میں ان کے بیان میں بہت پختگی اور دلچسپی پائی جاتی ہے موضوع میں بھی گہرائی و گیرائی پیدا ہو گئی ہے ان کے مندرجہ ذیل اشعار میں صوفیانہ رنگ جھلکتا ہے سہ

بے کیف دل ہے اور جئے جا رہا ہوں میں — خالی ہے شیشہ اور پئے جا رہا ہوں میں
پہلے شراب زیست تھی، اب زیست ہے شراب — کوئی پلا رہا ہے پئے جا رہا ہوں میں
حدیثِ حسن نہ شغلِ شراب و پیمانہ — یہ کس نے چھیڑ دیا زندگی کا افسانہ
میں نہ زاہد سے ہوں شرمندہ نہ صوفی سے جگر — مسلکِ عشق مرا، مسلکِ رندانہ سہی

قطعہ

مجھکو شکوہ ہے چشمِ ساقی سے — پی رہا ہوں مگر سرور نہیں
لالہ و گل بھی اجڑے اجڑے سے — شبِ مہتاب میں بھی نور نہیں
پینے کو تو سب پیتے ہیں جگر میخانۂ فطرت میں لیکن
محرومِ نگاہِ ساقی ہے وہ رند جو دُردآشام نہیں

کچھ رات رہے ساقی جو اٹھا کہتا ہوا میخوار اٹھا　　کیا بات ترے میخانے کی جو رند اٹھا ہشیار اٹھا

انھوں نے اپنی بیاض نمبر ۸ (گوشۂ جگر۔ لائبریری جامعۂ ملیہ دہلی) میں نظم "ساقی سے خطاب" کے لیے نوٹ لکھا ہے۔

"بلند تر تصورِ انسانیت کے ماتحت ایک نظم منجانب روحانیت کے ایک اصلاح یافتہ رند کا ساقی سے خطاب" جس کے دو شعر یہ ہیں ؎

رگ رپے میں کبھی صہبا ہی صہبا رقص کرتی تھی　　مگر اب زندگی ہی زندگی ہے موجزن ساقی
کبھی میں بھی تھا شاہد در بغل، توبہ شکن مے کش　　مگر بنتا ہے اب خنجر بکف، ساغر شکن ساقی

یہاں تک پہنچتے پہنچتے جگر روحانیت کے اصلاح یافتہ رند ہو گئے ہیں اور شراب ترک کر کے شراب کی آڑ لے کر اخلاقیات کا درس دینے لگے، لیکن بعض جگہ انھوں نے شراب کو شراب ہی کے مفہوم میں بیان کیا ہے مثلاً ان کے یہ اشعار "آتش گل" ہی کے دور کے ہیں جنمیں شراب کا تذکرہ یوں کیا گیا ہے ؎

بے جگر سونا پڑا تھا مدتوں سے میکدہ　　پھر وہ دریا نوش رندِ تشنہ کام آ ہی گیا
خود وہ اُٹھے ہیں جام لئے　　اب وہ ہے کافر جو نہ پئے

اب جگر کے مجموعوں کی ترتیب سے قطعہ نظر کر کے انکے کچھ اشعار شراب ہی سے متعلق مختلف عنوانات کے تحت بھی ملاحظہ فرمائیے۔

ان کی مے نوشی کا تعلق بھی ان کے تصورِ حسن و شباب سے تھا اس لئے انھوں نے حسن و شباب سے متعلق بھی کچھ اشعار کہے ہیں جن میں بادہ و جام کا ذکر بار بار آتا ہے۔ مثلاً ؎

شیشہ مست و بادہ مست و حسن مست و عشق مست　　آج پینے کا مزا پی کر بہک جانے میں ہے
میرے جام و بادہ کی رنگینیاں　　جانتا ہے حسن کا ظالم شباب
میں بنوں کس لئے نہ مست شراب　　کیوں مجسم کوئی شباب ہوا
فروغ بادہ ترے حسن کا جواب ہوا　　سنبھالنا مجھے ساقی میں بے نقاب ہوا
ٹکرا دیا شیشوں کو لڑوا دیا رندوں کو　　نچلی نہ کبھی بیٹھی وہ نرگس مستانہ

زاہدوں، واعظوں اور شیخوں پر ان کی ریاکاری کی وجہ سے اردو کے تمام شعرا نے طنز کیا ہے جگر نے بھی ان حضرات کو نہیں بخشا وہ کہتے ہیں ؎

یہ بہار آئی ہوئی ایسی گھٹا چھائی ہوئی　　ہجو مے کرتا ہے زاہد کیا کوئی دیوانہ ہے
ہجو مے نے تیرا اے شیخ بھرم کھول دیا　　تو تو مسجد میں ہے نیت تری میخانے میں
مسجد میں معتکف ہیں ہیکار ہی تو زاہد　　دور دورہ زندگی ہے آئیں پئیں پلائیں

پی بھی جا زاہد خدا کا نام لے کر پی بھی جا — بادۂ کوثر کی بھی اک موج پیمانے میں ہے

ہو گیا کیا مر بلا سے زاہدا! — اب تو چہرے پہ نور رہتا ہے

جگر شراب کے مزے کے ساتھ ساتھ اس کی حقیقت سے بھی واقف تھے اسی لئے کہا تھا

مئے و مینا کے پردے ان کو دھوکا دے نہیں سکتے — ازل کے دن سے جو رازِ مئے و مینا سمجھتے ہوں

جگر یہ مئے ارغوانی نہیں ہے — ارے آگ ہے آگ پانی نہیں ہے

جگر شراب کی اس حقیقت کو سمجھتے تھے اسی وجہ سے وہ اپنی مے نوشی پر افسوس کرتے رہتے تھے انکے دل میں ایک ازلی کھٹک کا لگا رہتا تھا اسی وجہ سے وہ کبھی کبھی اسے ترک بھی کر دیتے تھے لیکن وہ اپنے دل و دماغ کے آلام و مصائب کو دبانے اور اسے بھلانے کے لئے شراب کو ایک بہترین مرہم سمجھ کر پھر استعمال کرنے لگتے تھے اور جب دل میں ازلی کھٹک ہوتی تو وہ یہ بھی کہتے ؎

اٹھ اور جگر اب تو ذرا ہوش میں آجا — تنگ آگئے احباب تری بے خبری سے

آخرکار وہ خود بھی اپنی اس بے خبری سے تنگ آگئے اور ۱۹۳۹ء کے آخر میں اپنے اس محبوب ترین مشغلہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔

تصورِ حسن و عشق

فن کے دو محرکات ہوتے ہیں ایک حسن ہے اور دوسرا عشق یعنی حسین نظر آنے والی شے کی بنیادی قدریں تصورِ حسن اور سوزِ عشق سے وابستہ رہتی ہیں اور احساس میں حسن سے حاصل ہونے والا لطف و نشاط عشق ہی کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔

جگر کے یہاں بھی حسن و عشق ہی انکی شاعری کے دو بنیادی پہلو ہیں بہ الفاظ دیگر وہ بنیادی طور پر تغزل کے شاعر ہیں جس کی زلفیں سنوارنے اور اسکی مانگوں میں سیندور بھرنے میں انھوں نے اپنی تمام عمر عزیز صرف کر دی انھوں نے ساری عمر سوائے صنفِ غزل کے کسی دوسرے میدان میں قدم ہی نہیں رکھا

حسن و عشق کا بیان اردو شاعری میں کچھ نیا نہیں ہے اردو کے تمام متقدمین و متاخرین شعراء نے اس میدان میں زور آزمائی کی ہے لیکن ستارہ اسی کا چمکا ہے جس نے اپنے سوزِ عشق کے تاثرات و واردات کو خلوص کے ساتھ بیان کرتے ہیں معجز بیانی سے کام لیا ہے ویسے تو میر اور غالب نے جو اپنے زمانے کے استاد فن سمجھے جاتے ہیں اپنی معجز بیانی سے اسمیں جادو کا سا اثر پیدا کیا ہے۔ میر و غالب ہی کی طرح جگر بھی اپنے زمانے کے یکتا شاعر ہیں انھوں نے بھی اردو غزل کو اپنا ایک مخصوص اور منفرد نظریہ حسن و عشق عطا کیا انھوں نے عشق کو خودداری سکھائی اور حسن کی عظمت و احترام کا بھی پورا پورا خیال کیا لیکن انھوں نے حسن کے بجائے عشق کو مرکزی حیثیت دی وہ ابتدا میں تو حسن کی کرشمہ سازیوں اور رعنائیوں سے متاثر ہوتے رہے لیکن بعد کو وہ اپنے ہی سوزِ ناتمام، کسک اور جستجو کو حاصل حیات سمجھنے لگے اور اپنے عشق کو جامِ جہاں نما بنا دیا جسمیں ساری کائنات کا عکس دکھائی دینے لگا اور حسن و عشق

میں کوئی فرق باقی نہیں رہ گیا ؂

حسن سے عشق جدا ہے نہ جدا عشق سے حسن
کون سی شئے ہے جو آغوش در آغوش نہیں

ان کی شاعری محبت کی کیفیات و واردات کی بہترین ترجمان ہے ان کے یہاں وہ تمام خیالات موجود ہیں جن سے ذہن عشق کی حقیقتوں کا آماجگاہ، تصورات کا مسکن اور نازک احساسات کا مترجم بنتا ہے انھوں نے خود بھی حسن و عشق سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

"میں نے اوّل کلام کا کچھ زمانہ چھوڑ کر، حسن کو نصائی ہندی یا ایرانی عاشق کی طرح عشق کو ذلیل اور رسوا صورت میں ہرگز پیش نہیں کیا بلکہ حسن ہو یا عشق انکے حقیقی تاثرات و واردات کو تاامکان صحیح صحیح شاعرانہ انداز بیان کے ساتھ نمایاں کر دیا ہے،،[۱]

جگرؔ کا یہ قول کتنا ہی مختصر سہی لیکن انکے کلام پر انکی خود بہترین تنقید ہے انھوں نے خود ہی اس کا اعتراف کر لیا ہے کہ انکے اوّل کلام کے کچھ زمانے میں حسن و عشق کا تذکرہ اسی طرح ہے جسطرح ایرانی عاشق کا لیکن اس کے بعد انھوں نے سنبھالا لیا اور حسن و عشق کے تاثرات و واردات کو صحیح صحیح شاعرانہ انداز میں پیش کیا چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؂

جس سے کہ مطمئن ہو مری فطرت بلند
شاید وہ حسن و عشق کی دنیا ہی اور ہے

عشق کیا چیز ہے اک حشر در آغوش خیال
حسن کیا، خواب ہے اک چشم تماشائی کا

جدا ہرگز نہ حسن و عشق کی تصویر دیکھیں گے
وہ جب دیکھیں گے میری خاک دامن گیر دیکھیں گے

پھر یہ جدائیاں ہیں کیوں پھر یہ دہائیاں ہیں کیا
عشق سے تو الگ نہیں حسن سے میں جدا نہیں

بندگی جنوں ادا، بیخودی ادب سرشت
حسن کی اصطلاح میں عشق اسی کا نام ہے

عشق اگر حسن کے جلووں کا ہے مرہون کرم
حسن بھی عشق کے احساں سے سبکدوش نہیں

عشق کیا ہے؟ یہ تو حسن جمال
شوق کیا ہے؟ حسن کا عکس شباب

کس قدر جامع ہے، میرا عالم تصویر بھی
حسن کی تشریح بھی ہے عشق کی تفسیر بھی

یہ حسن ہے کیا؟ یہ عشق ہے کیا؟ کسکو ہے خبر اسکی لیکن
بے جام ظہیر بادہ نہیں ہے بادہ فروغ جام نہیں

حسن جتنا ہے جستجو طالم
عشق اتنا ہی بے پروا ہے کیا کہئے

زندگی کیا ہے؟ نمود عاشقی
عشق کیا ہے؟ حسن کا آغاز ہے

تفسیر حسن و عشق جگر مصلحت نہیں
افشائے راز قطرہ و دریا نہ کیجئے

عشق کی حد سے گذرتے پھر یہ منظر دیکھتے
کاش حسن یار کو ہم حسن بن کر دیکھتے

---

[۱] "شعلۂ طور،، ایڈیشن غالباً ۱۹۳۲ء صفحہ ۱۹۰

انھوں نے اپنی ضعیف العمری میں جبکہ ان کی شاعری کا آفتاب نقطۂ عروج پر پہنچ چکا تھا حسن کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

"۱۔ حسن نام ہے مناسبت اور صحت کا ؎

اے آنکہ امتزاجِ کامل   در جملہ صفات برگزیدہ

۲۔ حسن ایک حقیقت کاملہ ہے جس کا احاطہ ممکن نہیں لیکن کائنات مظاہر حسن کا مجموعہ ہے نسبت اگر حسنِ کامل ہے تو ظاہر ہے کہ مظاہر حسن اسکے لئے بہت کچھ ہیں لیکن وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کا متلاشی رہتا ہے اور اس کی ترقی کی رفتار آگے ہی کی جانب بڑھتی جاتی ہے اور اس کے آرٹ میں پاکیزگی و لطافت بدرجۂ اتم ہوگی۔

۳۔ حسن تفصیلات میں بھی ہوا کرتا ہے لیکن اس کی نوعیت صفاتی ہوتی ہے ذاتی نہیں۔ ذاتی حسن دراصل اجمال میں ہے جو غزل کا بنیادی خاصہ ہے اسی بنا پر میں غزل کو موجودہ سائنس کی اصطلاح میں ایٹم کہا کرتا ہوں ایک عالم طبیعیات حسن کا کوئی واضح تصور نہیں کر سکتا بجز اس کے کہ کسی شئے کی حقیقت و ماہیت کا سراغ لگانے کی خاطر وہ اسے لاتعداد اجزاء میں منتشر کر دے اس طرح وہ گویا غیر شعوری طور پر تفصیلات میں الجھ کر رہ جاتا ہے لیکن ایک شاعر کا منصب اس سے مختلف ہے شاعر و ناظم ہماری پرانی تقسیم ہے لیکن اس تقسیم سے مراد دونوں میں سے کسی کو، کسی پر ترجیح دینا نہیں بلکہ صرف ایک امتیازِ مقام مقصود ہے،، عـ۱

حسن سے متعلق جگرؔ کے یہ خیالات اس وقت کے ہیں جب ان کی شاعری کا آفتاب نقطۂ عروج پر پہنچ چکا تھا ابتدائی کلام سے ان کے اس نظریے کی تصدیق نہیں ہوتی اس کی تفصیل آگے چل کر بیان کی جائیگی فی الحال حسن کی تعریف کے ساتھ ساتھ عشق کی تعریف بھی ملاحظہ فرمائیے جس کے متعلق ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے اپنی گراں قدر رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"عشق کا تعلق سماج سے بہت گہرا ہے نفسیات کی تعمیر میں خارجی حالات کو بڑا دخل ہے سماجی روایتوں کا اثر ہمارے جذبات و احساسات پر پڑتا ہے اور اسی آب و ہوا میں وہ مخصوص ذہنی کلچر بنتا ہے جس کی مدد سے ہم حسن کا احساس اور عشق کی گرمی محسوس کرتے ہیں،، عـ۲

جگرؔ کے کلام کا جائزہ اگر مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں لیا جائے تو ہمیں ان کے کلام کے ہر دور

عـ۱ احمد رفاعی کا ایک غیر مطبوعہ مضمون بہ عنوان "نظریاتِ جگرؔ"، جسے راقم کو عبداللطیف اعظمی صاحب مدیر ماہنامہ "جامعہ"، دہلی نے دسمبر ۱۹۶۳ء میں دہلی میں عنایت فرمایا تھا۔

عـ۲ "میر تقی میرؔ۔ حیات اور شاعری"، صـ۳۵۔

کا گہرا مطالعہ کرنا ہوگا کیونکہ ان کے نفسیات کی تعمیر میں خارجی حالات کو بڑا دخل ہے ان کے دور کے سماجی روایتوں کا اثر انکے جذبات واحساسات پر پڑا اور اسی آب وہوا میں ان کا ایک مخصوص ذہنی کلچر بنا انکی مدد سے ہم انکے حسن کے احساس اور عشق کی گرمی کو محسوس کر سکتے ہیں ان کے ابتدائی دور کے کلام میں بشریت وارضیت کا اثر اور انکے ذاتی تجربات و ناکام لمحات کی ترجمانی ملتی ہے مثلاً

جسنے بنا دیا مجھے وحشی و خستہ حال سا — ہائے وہ شکل چاند سی ہائے وہ قد نہال سا
ادھر دامن کسی کا جھاڑ کر محفل سے اٹھ جانا — ادھر نظروں میں ہر ہر چیز کا بیکار ہو جانا
داغِ فرقت کے دہکتے ہوئے انگارے ہیں — ہاتھ لانا نہ مرے سینۂ سوزاں کے قریب
جوانی آتے ہی ان پر قیامت کی بہار آئی — نظر بیگانہ وار اٹھی حیا مستانہ وار آئی
کپکپی سارے بدن میں زرد چہرہ دل اداس — چپ کھڑے ہیں وہ میری خاکِ تربت دیکھ کر

اس دور کے کلام میں انھوں نے وصل و ہجر دونوں کا تذکرہ اس طرح کیا ہے ؎

شبِ وصل کیا مختصر ہو گئی — ذرا آنکھ جھپکی سحر ہو گئی
امیدِ وصل و دیدۂ حسرت اثر میں ہے — یعنی ہماری روح ہماری نظر میں ہے
وہ گھر برباد ہی ہو جائے تو بہتر ہے جس گھر میں — نہ صبحِ وصل آئی اور نہ شامِ انتظار آئی
مجھکو وصال و ہجر سے کیا واسطہ جگرؔ — عاشق ہوں اک تبسمِ دیوانہ ساز کا

جگرؔ ہی کی تقسیم کے مطابق انکے دورِ دوم کے کلام میں ان کا شدتِ احساس، تخیّلِ حسنِ تمام کی طرف مائل ہوتا نظر آتا ہے ؎

چشمِ نظر پرست میں حسن کا جہان نام ہے — حسنِ تمام یار کا جلوۂ ناتمام ہے
ابتدا عشق کی ہے فطرتِ انساں کی نمود — انتہا عشق کی تکمیل ہے انسانوں کی

لیکن اسی دور کے کلام میں انکے عشق و محبت کی سطحی اور شخصی و معاملہ بندی کے اشعار بھی ملتے ہیں مثلاً

محبت کی پرپیچ راہوں نے مارا — تری آڑی ترچھی نگاہوں نے مارا
کہاں تک عذابِ محبت اٹھائیں — بس اب وہ نہیں ہم انھیں بھول جائیں

جگرؔ ہی کی ترتیب کے لحاظ سے ان کے دورِ سوم کے کلام میں آفاقیت و بشریت۔ ماورائیت و سطحیت عرفانیت وارضیت ہر قسم کے ملے جلے اشعار ملتے ہیں جیسے ؎

اللہ رے مجبوری آدابِ محبت — گلشن میں رہے اور گلستاں نہیں دیکھا
لہو کی اک بوند دل بن گئی — خوشا لذتِ کامیابِ محبت
ہر ذرہ ہے اک پیکرِ صد حسنِ حقیقت — ہستی کو جگرؔ ہستیِ باطل نہ سمجھنا

یہاں تک جذب کروں کاش تیرے حسن کامل کو
تجھی کو سب پکار اٹھیں گذر جاؤں جدھر ہوکر

عشق کا پیغام ہستی شوق کی روداد ہوں
زندگی جس سے برستی ہے میں وہ فریاد ہوں

ہر نفس سرمایہ دارِ عشق کامل ہے مرا
مرحبا درد کہ حسنِ دوست کی روداد ہوں

تو رازِ محبت کو سمجھا ہی نہیں ورنہ
پابندیٔ انساں ہی آزادیٔ انساں ہے

حسن ہی جب تک کہ یہ شانِ خود آرائی نہ تھی
عشق ہی مستی تھی لیکن خوئے رسوائی نہ تھی

جگر کی ترتیب کے لحاظ سے دور چہارم میں انکی خالص محبت اور انبساط کی شاعری ملتی ہے ؎

ایک رنگیں نقاب نے مارا
حسن بنکر حجاب نے مارا

پرتوِ حسنِ ذات نے مارا
مجھکو میری صفات نے مارا

نگاہوں سے چھپ کر کہاں جائیے گا
جہاں جائیے گا ہمیں پائیے گا

عشق کو بے نقاب ہونا تھا
آپ اپنا جواب ہونا تھا

کام آخر جذبۂ بے اختیار آہی گیا
دل کچھ اس صورت سے تڑپا انکو پیار آہی گیا

مندرجہ بالا تمام ادوار کی تقسیم جگر کی "شعلۂ طور" کی تھی "آتش گل" کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انکے آخری دور کے کلام میں پختگی و بصیرت آموزی، حسن وعشق کی تعریف اور عرفانِ محبت کی تشریح ہے ؎

مرا کفرِ محبت اللہ اللہ
شعاعیں پھوٹ نکلیں بتکدے سے

ہو جو ذوقِ جمال بے پایاں
کیا نہیں چشم آشنا کے لئے

کیا کشش حسنِ بے پناہ میں ہے
جو قدم ہے اسی کی راہ میں ہے

جب تجھے دیکھ کے کونین کی وسعت دیکھی
حسن ہی حسن محبت ہی محبت دیکھی

بے غمِ عشق و بے دلِ آگاہ
موت بھی جرم زندگی بھی گناہ

عشق لا محدود جب تک رہنما ہوتا نہیں
زندگی سے زندگی کا حق ادا ہوتا نہیں

عشق کی بربادیوں کو رائیگاں سمجھا تھا میں
بستیاں نکلیں جنھیں ویرانیاں سمجھا تھا میں

بیدار عزائم ہوتے ہیں اسرار نمایاں ہوتے ہیں
جتنے وہ ستم فرماتے ہیں سب عشق پہ احساں ہوتے ہیں

جگر کے حسن وعشق کے اس تدریجی ارتقا کا جائزہ لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جگر کی دلچسپی کا خاص مرکز حسن وعشق ہی رہا انھوں نے اپنے ماحول میں ہر طرف حسن کی تلاش کی اور ان کا دل حسن وعشق کی لطافت و نزاکت اور اس کے رنگ و آہنگ سے مسرور اور لطف اندوز ہوتا رہا ان کی شاعری میں محبوب کے تصور پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ ان کا محبوب غزل کے روایتی محبوب سے بہت مختلف ہے وہ معمولی زندگی سے قریب بھی ہے اور صحت مند بھی اسمیں شک نہیں کہ جگر کی

نظر عورت کے حسن و شباب پر پڑی ہے اور انھوں نے اس کے جسمانی حسن کو کبھی کبھی خراجِ تحسین بھی ادا کیا ہے لیکن زیادہ تر انھوں نے عورت میں حسن باطن کی تلاش کی ہے ان کی محبوبہ سادہ فطرت، حیادار اور جوان عورت ہے۔ جس کے سینے میں دل ہے اور دل میں محبت کی خلش۔ اس کے دل میں بھی محبت کی آگ روشن رہتی ہے لیکن اس کا اظہار کرنے سے وہ اپنی نسوانی فطرت کیوجہ سے مجبور ہے پھر بھی اس کی محبت کا اظہار کسی نہ کسی طرح اس کی شوخی و شرارت، دزدیدہ نگاہی، برہمی، ظاہری بے نیازی اور اس کی پشیمانی پُرنم آنکھوں وغیرہ سے ہو ہی جاتا ہے۔

اسی طرح جگرؔ کا تصورِ عشق بھی عام عشقیہ کیفیات و واردات کا مجموعہ ہے ان کے دل میں محبت کی کسک اور چبھن ہے لیکن اسمیں گریہ و زاری اور آہ و فغاں نہیں ہے بلکہ انھوں نے اپنی خودداری وضعداری اور شرافتِ نفس سے عشق کے جذبات کے اظہار کے لئے حدود کا تعین کر دیا ہے انھوں نے اپنی محبت میں پاکیزہ جذبے کا اظہار کیا وہ سوقیانہ پن سے بچتے رہے انھوں نے محبت میں ضبط و تحمل سے کام لیا اور محبت کو نہ تو کبھی عذاب سمجھا، نہ فرقت کا ماتم کیا، نہ محبوب کی بے توجہی اور اغیار کی منافقت کا گلہ شکوہ کیا بلکہ صرف محبوب کو بلایا، اس سے عرض تمنا کی اور اسے سمجھایا، ورمنایا بھی انھوں نے جسطرح محبوب سے اس کی جلوت میں مزہ لیا اسی طرح خلوت میں بھی اس کے تصور سے لطف اندوز ہوئے اور خلوتِ غم کو بزم طرب بنائے رہے۔ لیکن کہیں کہیں وہ وفورِ شوق میں منزل سے آگے بڑھ گئے ہیں اور محبت کے قیود توڑ کر درِ جاناں کے قریب بھی پہنچ گئے ہیں مندرجہ ذیل اشعار اُن کے شوقِ منزل ہی کی نشاندہی کرتے ہیں ؎

ہجومِ یاس ایسا! کچھ نظر آتا نہیں مجھکو
وفورِ شوق یہ! آگے بڑھا جاتا ہوں منزل سے

لے ہی پہنچی، بیخودیِ شوق، بزمِ یار تک
گو مجھے اک اک قدم ایک ایک منزل ہو گیا

جذبۂ شوق نے دم لینے کا موقع نہ دیا
شمع منہ دیکھتی ہی رہ گئی پروانے کا

شوق نے توڑ ہی ڈالے بخشے محبت کے قیود
ہوش آیا ہے پہنچ کر درِ جاناں کے قریب

اللہ ری نازنینگیِ شوق کا عالم
میرا ابھی پتا اب سرِ منزل نہیں چلتا

نگاہوں میں منزل کوئی پھر رہی ہے
یونہی گرتا پڑتا چلا جا رہا ہوں

نہیں جانتے کچھ کہ جانا کہاں ہے
چلے جا رہے ہیں مگر جانے والے

جگرؔ کے یہاں چاہنے اور چاہے جانے کی کیفیت پائی جاتی ہے محبت میں انھوں نے اپنے محبوب سے سچا عشق کیا اسے شدت سے چاہا اور ان کے محبوب نے بھی ان کے پیار و محبت کا جواب پیار و محبت ہی سے دیا ان کا عشق یک طرفہ نہیں ہے بلکہ ان کو الفت کا مزا جب ملا ہے جب محبت میں محبوب اور عاشق دونوں بیقرار رہے ہیں اور دونوں طرف برابر کی آگ لگی رہی ہے ان کے چاہنے اور چاہے جانے کے

ذیل میں بھی چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

محبت کے جلوے نہیں حسن سے کم
انھیں بھی مرے ساتھ حیرانیاں ہیں

حسن ہے اس طرح سرگرمِ خرام
عشق کو احساسِ پامالی نہیں

اب تو تا شبِ غمِ عشق یہاں تک پہنچی
کہ ادھر ہوش اگر ہے تو ادھر ہوش نہیں

عشق ہی تنہا نہیں شوریدہ سر میرے لئے
حسن بھی بیتاب ہے اور کس قدر میرے لئے

اُف وہ روئے تابناک و چشمِ تر میرے لئے
ہائے رے زلفِ پریشاں تا کمر میرے لئے

ہائے وہ حسن کا انداز کہ جس وقت جگرؔ
عشق کے بھیس میں ہوتا ہے نمایاں کوئی

ہائے رے مجبوریاں محرومیاں ناکامیاں
عشق آخر عشق ہے تم کیا کرو ہم کیا کریں

حسن آیا تھا خود منانے کو
سو تو جب ہی عشق نے کم کی

عرضِ نیازِ عشق کا چاہیئے اور کیا صلہ
میں نے کہا بہ چشمِ نم، اُس نے سنا بہ چشمِ تر

تنہا نہیں ہے عشق ہی رسوائے جستجو
خود حسن کو بھی گرمِ سفر دیکھتا ہوں میں

جہاں وہ ہیں وہیں میرا تصور
جہاں میں ہوں خیالِ یار بھی ہے

ملتا جلتا ہے مزاجِ حسن ہی سے رنگِ عشق
شمع گر بیباک ہے، گستاخ پروانہ بھی ہے

زندگی آج بھی دلکش ہے انھیں کے دم سے
حسن اک خواب سہی عشق اک افسانہ سہی

جگرؔ نے عشاق کے احساسات و تاثرات کے ساتھ ساتھ محبوب کے عظمت و احترام کا بھی پورا خیال رکھا ہے ان کے کلام کے ابتدائی حصہ کو چھوڑ کر باقی میں حسن و عشق دونوں کا برابر احترام موجود ہے انھوں نے اگر عشق کو خودداری بخشی تو حسن کو بھی ذلیل و رسوا نہیں ہونے دیا رکاکت و جنسی خواہش ان کے یہاں کہیں نہیں ملتی وہ سستی جذباتیت کے قائل ہی نہ تھے بلکہ ہجر میں بھی انکو وصل ہی جیسا لطف ملتا تھا یہ ان کے عشق کا اعلیٰ تصور تھا وہ حسن کے پرستار اور ادا شناس تھے ان کے کلام میں عشق و محبت کا پاکیزہ سلیقہ رسم عاشقی کی تہذیب کی بلندی اور جذب و مستی اور خواب و حقیقت کی ایک حسین آمیزش ہے اس قول کے ثبوت میں جگرؔ کے مندرجہ ذیل اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں

حسن کی بارگاہ میں رکھئے سنبھال کر قدم
یہ وہ مقام ہے جہاں خواہشِ دل حرام ہے

حسن کے احترام نے مارا
عشق بے ننگ و نام نے مارا

حسن بیتاب تجلی خود ہے، لیکن اے جگرؔ
ایک ہلکا سا حجابِ چشمِ حیراں چاہیئے

نالہ بیقرار کون کرے؟
حسن کو شرمسار کون کرے؟

وقت آئے تو ہمیں جان بھی کر دینگے فدا
کیا یہ ممکن ہے ترے نام کی عزت نہ کریں

ہمیں بھی نہ اب چین آئے گا جب تک
ان آنکھوں میں آنسو نہ بھر لائیے گا

وہ اور نازِ عشق گوارا کریں مگر   اتنے کھنچے ہم ان سے کہ مجبور کر دیا

دردِ دل غیرت تری کیا ہو گئی   ان لبوں پر، اور ہائے دردِ دل

اٹھیں بھی دست بہ دل، بے قرار دکھلایا   سنا تھا، عشق کی آنکھیں تو ہیں نگاہ نہیں

ہم ان کا عشق کیا، انکے غم کے بھی نہیں قابل   یہ ان کی مہربانی ہے کہ وہ اپنا سمجھتے ہیں

ہماؤں عشق کی خودداریاں جگر میں بھی   جو ایک بات پہ قائم غرورِ ناز رہے

رعنائی خیال کو رسوا نہ کیجئے   ممکن بھی ہو تو عرضِ تمنا نہ کیجئے

ہاں جذبِ غمِ عشق کی تاثیر دکھا دے   مجبور نہ بن حسن کو مجبور بنا دے

وہ بھی ہے اک مقامِ عشق جہاں   ہر تمنا گناہ ہوتی ہے

جان جائے کہ رہے دیکھ، مری جانِ جگر   عشق کی شان تری آن نہ جانے پائے

عاشقی امتیاز کیا جانے   فرقِ ناز و نیاز کیا جانے

حسن کے نغمے بھی خاموش فغاں تک پہنچے   اب ترے حوصلے اے عشق یہاں تک پہنچے

یہ ہے مشہدِ عشق یعنی یہاں پر   حسینوں کے سر ٹھوکریں کھا رہے ہیں

یہ آگ عشق کی ہے یوں ہی رہنے دے ہمدم   کہ ہر ادا میرے دل میں سمائی جاتی ہے

جگر کی یہ عاشقانہ سیرت اور حسن کا احترام ان کو اپنے خاندان کی تہذیب، معاشرتی روایات سے ملا کیونکہ ان کے خاندان میں (جو شاہی خاندان کا اتالیق رہ چکا تھا) انسان کے دکھ درد کا احساس اور اپنے اور دوسروں کی عزت کا احترام تھا اس سے انھوں نے عشق کی غیرت اور حسن کے احترام کو سیکھا تھا جو بعد کو ان کی فطرت بن گیا یہی غیرت و احترام ان کی زندگی اور شاعری دونوں میں تا عمر قائم رہا۔

جگر کا تصوّف | ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے صحیح لکھا ہے کہ :۔

"تصوف کا اصلی مایۂ خمیر عشق حقیقی ہے"[1]

اور احمدِ رفاعی نے حسن کے مسئلہ کی وضاحت افلاطونی فلسفہ کے تحت کی ہے۔

"حقیقت حسن ہے اور مجاز عکسِ حقیقت"[2]

حُسن کی تعریف میں مشہور چینی حامی سریت لادتسے (Lao Tse) اپنے مخصوص عارفانہ مگر نہایت دلچسپ انداز میں کہتا ہے :۔

"ہم تاؤ (حق) کی طرف دیکھتے ہیں اور ہمیں کچھ نظر نہیں آتا، اس کا کوئی رنگ نہیں، ہم تاؤ کو

---

[1] "میر تقی میر، حیات اور شاعری" ص ۴۰۱

[2] "جامِ نو" جنوری ۶۱ء ص ۲۹

کان لگا کر سنتے ہیں اس کی کوئی آواز نہیں، ہم تاؤ کو ٹٹولتے ہیں لیکن وہ ہمیں کہیں ہاتھ نہیں آتا اس کا کوئی جسم نہیں ہمیشہ ا ہاں ہمیشہ ! تاؤ بے نام و نشان رہتا ہے، اور بار بار عدم ہی کی جانب لپی آتا ہے،،ع۱

عشق بھی ایک طرح کا غیر معمولی اندرونی تجربہ ہے جس کی تعریف کرنے کی کوشش بہتوں نے کی ہے جگرؔ نے خوب کی ہے ؎

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

صوفیہ نے اپنے وجدان سے حسن و عشق دونوں پر مشتمل کچھ نظریات قائم کئے ہیں جن کو مولانا سہیل اعظم گڑھی نے بالترتیب چار نظریوں میں تقسیم کیا ہے۔

"پہلا نظریہ :- عشق خالق حسن ہے۔

دوسرا نظریہ :- اصل حقیقت محض حسن ہے اور حسن کا تقاضہ ہے ظہور و خود نمائی اور یہ تقاضائے عشق کا محرک اور خالق ہے اور مذہب کی اصطلاح میں اسی کو توفیق کہتے ہیں

تیسرا نظریہ :- حسن و عشق دونوں اپنی اپنی جگہ مستقل ہستیاں ہیں، مگر ہر شخص کا معیار حسن فطری طور پر مختلف ہوتا ہے اور فطرت اپنے معیار بلند کی جستجو میں رہتی ہے اور جب اتفاق سے وہی چیز سامنے آجاتی ہے تو دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھتی ہیں اور اسی تطابق حسن و عشق سے دونوں کا فطری رنگ نکھر آتا ہے۔

چوتھا نظریہ :- تمام کائناتِ عالم چونکہ محض ایک حسنِ ازل کا پرتو ہے لہٰذا حسن و عشق کی حقیقت ایک اور شانیں مختلف ہیں،،ع۲

اور جگرؔ نے حسن کی تعریف میں کہا ہے کہ:

"حسن نام ہے مناسبت اور صحت کا۔

اسے آن کہ امتزاجِ کامل
در جملہ صفاتِ برگزیدہ

خدا حسن تمام کا مجموعہ ہے

لفظ و معنی جس کو چھو سکتے نہیں
وہ مرا اک نقطۂ آغاز ہے

حقیقت کاملہ کی دراصل کوئی تعریف ہو ہی نہیں سکتی وہ مقام وسطی ہے جہاں تمام حقائق ایک نقطہ پر سمٹ آتے ہیں۔

ع۱ "انواع فلسفہ،، مطبوعہ ۵۲ء ص ۳۷

ع۲ "جامِ نو،، جنوری ۶۱ء ص ۲۳۳

حُسنِ حقیقی سے نسبت ہو جانے پر انسان کی ظاہری و باطنی کیفیات میں سائنٹفک تغیرات ہونے لگتے ہیں چونکہ نسبت کے بھی مدارج ہیں لہٰذا مدارج کی مناسبت ہی سے ان تغیرات کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔

حُسن ایک حقیقتِ کاملہ ہے جس کا احاطہ ممکن نہیں لیکن کائنات مظاہرِ حسن کا مجموعہ ہے نسبت اگر حسنِ کامل سے ہے تو ظاہر ہے کہ مظاہرِ حسن اس کے لئے بہت کچھ ہیں لیکن وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کا متلاشی رہتا ہے اور اس کی ترقی کی رفتار آگے ہی کی جانب بڑھتی جاتی ہے اور اس کے آرٹ میں پاکیزگی و لطافت بدرجہ اتم ہوگی۔" ع۱

تصوف کے بارے میں جگرؔ نے اپنی رائیں اپنے بعض اشعار میں بھی نظم کر دی ہیں جس سے ان کے صوفیانہ خیالات پر روشنی پڑتی ہے ملاحظہ فرمائیے ؎

یہ حسن طلب ہی کا ایک جلوۂ رعنا ہے — کس نے اسے دیکھا ہے کس نے اسے پایا ہے
اگر نہیں پسِ پردہ کوئی حقیقت میں — یہ کون بول رہا ہے طلسمِ صورت میں
مجرم بنا ہوا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں — میں وہ ہوں تو نے ظالم! خود جس کی آرزو کی
مجھی میں رہے مجھ سے مستور ہو کر — بہت پاس نکلے بہت دور ہو کر
وہی حسن جس کے ہیں یہ سب مظاہر — اسی حسن میں حل ہوا جا رہا ہوں
پردہ جب اُٹھ گیا ہے دیکھا یہی ہے اکثر — اپنی ہی آرزو میں اپنی ہی جستجو کی
ہر حقیقت کو باندازِ تماشا دیکھا — خوب دیکھا ترے جلوؤں کو مگر کیا دیکھا
ہم نے ایسا نہ کوئی دیکھنے والا دیکھا — جو یہ کہدے کہ ترا حسن سراپا دیکھا
نقابِ حسن دو عالم اُٹھائی جاتی ہے — مجھی کو میری تجلی دکھائی جاتی ہے
یہ سب لالہ و گل، یہ سب چاند تارے — ترے اک تبسم کے چند استعارے
ہر ذرۂ عالم پہ حاوی ہیں صفات اس کے — سب کہنے کی باتیں ہیں مختاری و مجبوری

اردو شاعری کے بیشتر موضوعات فارسی شاعری کی تقلید ہیں اردو شاعری کا تصوف بھی فارسی شاعری سے متاثر ہے فارسی میں حافظؔ، خیامؔ، عطارؔ اور رومؔ سب کے سب صوفیانہ رنگ کے شاعر تھے اس لئے ان کی شاعری ان کے تاثراتِ قلبی کا مظہر ہے۔ بقول نرنجن تسنیم ان کا عقیدہ ہے کہ:

ع۱ احمر رفاعی کا مضمون بعنوان "نظریاتِ جگر" (غیر مطبوعہ)، جسے عبداللطیف اعظمی صاحب ایڈیٹر "جامعہ" نے راقم الحروف کو عنایت فرمایا۔ اب یہ مضمون "نگارشاتِ جگر" میں شائع کر دیا گیا ہے۔

"یہ کائنات ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہمیں حسنِ مطلق (Absolute beauty) کی جھلک ملتی ہے انسان چونکہ اس کائنات کا ایک اہم جزو ہے اس لئے اس میں بھی حسنِ مطلق کی خو موجود ہے یہ خو اسمیں اضطراب پیدا کرتی ہے اس بات کا کہ وہ حسنِ مطلق کو اپنے حلقۂ فہم میں لے آئے مگر یہ ممکن نہیں کیونکہ حسن بیکراں (Infinite) ہے اور انسان محدود (finite) اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ عمر بھر اس حسنِ بیکراں کا عاشق بنا رہتا ہے مگر وصل نصیب نہیں ہوتا۔[1]

اردو شعرا میں میر درد کا کلام تصوف میں ڈوبا ہوا ہے ان کے بعد غالب کے یہاں بھی تصوف کا کچھ عنصر مل جاتا ہے اور بیسویں صدی کے شعرا میں اصغر نے حسن کو چشم تماشا سے بھی دیکھا اور وہ قوتِ شامہ اور قوتِ سامعہ کو بھی بروئے کار لائے۔

جگر اگرچہ صوفی شاعر نہیں ہیں ان کو خود بھی اس کا اعتراف ہے ؎

میں نہ زاہد سے ہوں شرمندہ نہ صوفی سے جگر
مسلکِ عشق مرا مسلکِ رندانہ سہی

پھر بھی ان کو ماحول ہر اعتبار سے صوفیانہ ملا۔ ان کا گھریلو ماحول مذہبی تھا ان کے والد ایک صوفی منش اور اللہ والے انسان تھے اور بزرگانِ دین اور اولیائے کرام سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے انھیں کا اثر جگر پر بھی پڑا بالکل ابتدائی زمانے میں والد کی تربیت کیں رہے اور پھر جب شعر و شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو حضور احمد مرحوم مرادآبادی وغیرہ جیسے صوفی شعرا کا ساتھ ہو گیا جن کے انتقال کے بعد انھوں نے ایک دفعہ ان کو مدہوشی کے عالم میں خواب میں دیکھا اور ان سے رسولِ مقبولؐ کی خدمت میں سلام کہلایا (اس کا تذکرہ پچھلے صفحات میں آچکا ہے)

دراصل یہ جگر کے ماحول اور تربیت کا اثر تھا کہ عالمِ سرشاری میں بھی خواب میں انکو رسولِ مقبولؐ سے اس قدر عقیدت تھی کہ اس عالم میں بھی انھوں نے اپنے ایک مرحوم دوست سے انکی ملاقات کے متعلق دریافت کیا اور انھیں سلام کہلایا رفتہ رفتہ یہی عقیدت مندیاں ان کی فطرت بن گئیں اور ان کو بزرگانِ دین اور اولیائے کرام سے بے پناہ عقیدت سی ہو گئی

اس کے بعد ان کو اصغر گونڈوی کی صحبت سے فیض اٹھانے کا موقع ملا اور پھر وہ شاہ عبدالغنی منگلوری سے بیعت ہو گئے جن کا روحانی فیض ان پر ہمیشہ جاری رہا اسی طرف انھوں نے اپنے اس شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

تجھ سے وحشی ترے غافل نہیں ہونے پاتے
روز آکر کوئی زنجیر ہلا دیتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ جگر ابتدا سے آخری عمر تک حسن کی تعریف و توصیف میں محو رہے لیکن بعد کو وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں انھیں حسن کی پس پردہ حقیقت یا حسن کی اصل ماہیت

---

[1] "نظامِ جدید" ۲۳؍ستمبر ۱۹۶۲ء ص ۱۷

محسوس ہونے لگی حسن کے مظاہر کو پوجتے پوجتے وہ ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں پر انکو یہ ظواہر کمتر نظر آنے لگے اور انکو انکی بنیادی حقیقت کی اہمیت کا احساس ہونے لگا وہ رنگ و بو کی بھول بھلیوں سے نکل کر اسکے پس پردہ کارفرما حقیقت تک پہنچ گئے یہ ان کا ربط باطن تھا جسکے لئے انھوں نے خود کہا ہے ؎

ربط باطن اس کو کہتے ہیں کہ روز اولیں روح مضطر ہی رہی جبتک نہ پیدا غم ہوا

اس لئے یہ خیال کہ جگرؔ کے کلام میں تصوف کا رنگ اصغرؔ کی ملاقات کے بعد آیا یا وہ اصغرؔ اور ان کے کلام سے متاثر ہو کر تصوف کی طرف راغب ہوئے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ان کے تصوف کی بنیاد تو ان کے خاندان اور ابتدائی دورِ شاعری کی صحبت ہی میں پڑ چکی تھی لیکن جب اصغرؔ سے ان کی ملاقات ہوئی اور وہ شاہ عبدالغنی منگلوری سے بیعت ہوئے تو ان کا یہ جوہر اور نکھر آیا جگرؔ کے بالکل ابتدائی زمانے میں ایسے اشعار ملتے ہیں جنھیں خالص صوفیانہ کہا جا سکتا ہے مثلاً ؎

دیدۂ حق بیں میں کیسا فرق کیسا امتیاز ایک ہی جلوہ کہیں مجنوں کہیں لیلیٰ ہوا
کیا کروں گا اب بہارِ گل بداماں دیکھ کر محو حیرت ہوں خود اپنا حسن پنہاں دیکھ کر
وہی گل ہے وہی بلبل وہی پروانہ ہے شان ہے ایک مگر رنگ جداگانہ ہے

اس کے بعد ان کے یہاں ایک سنبھلی ہوئی کیفیت ملنے لگتی ہے ؎

اللہ اللہ یہ مری ترکِ و طلب کی وسعتیں رفتہ رفتہ سامنے حسن تمام آ ہی گیا
اوّل اوّل ہر قدم پر تھیں ہزاروں منزلیں آخر آخر اک مقام بے مقام آ ہی گیا

اس کے بعد جب وہ شاہ عبدالغنی منگلوری کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے تو ان کے اس صوفیانہ رنگ میں اور نکھار پیدا ہوا ؎

ہمہ تن محو دل اک نغمۂ بے ساز میں ہے اب نہ مطرب میں کوئی فرق نہ آواز میں ہے
گوشِ مشتاق کی کیا بات ہے اللہ اللہ سن رہا ہوں میں وہ نغمہ جو ابھی ساز میں ہے

جگرؔ نے حسنِ حقیقی کی تلاش حسنِ مجازی کے ذریعہ کی اور اس تلاش میں انھوں نے حسنِ حقیقی کو حسنِ مجازی کے حلقہ سے ملا دیا ؎

صوفی نے جسکو شاہد مطلق سمجھ لیا اک پرتوِ لطیف تھا حسنِ مجاز کا

ان کا خیال تھا کہ مشاہدہ صرف اپنی ہی ذات کا ہوا کرتا ہے اپنی ذات سے ہٹ کر کسی چیز کا مشاہدہ لایعنی ہے ؂

یہ محفلِ ہستی بھی کیا محفلِ ہستی ہے — جب کوئی اُٹھا پردہ میں خود ہی نظر آیا
اللہ رے کمالِ خودی کی یہ وسعتیں — میرا ہی سامنا ہے جدھر دیکھتا ہوں میں
آئینہ خانۂ عالم میں کہیں کیا دیکھا — تیرے دھوکے میں خود اپنا ہی تماشا دیکھا
کیسا مجاز اور کیسی حقیقت — اپنے ہی جلوے اپنے ہی سائے
باتیں ہیں دو مقصود ہے ایک — تیری طلب یا اپنی طلب
ہزار جان گرامی فدا بہ ایں نسبت — کہ میری ذات سے اپنا پتا دیا تو نے
میں عشق ہوں مکمل، میں شوق ہوں مسلسل — گویا تمام عالم میری ہی داستاں ہے

جگرؔ نے عشق کو کہیں خالقِ حسن مانا ہے اور کہیں اصل حقیقت محض حسن کو بتایا ہے کہیں حسن و عشق کو مستقل ہستیاں سمجھا ہے تو کہیں حسن و عشق کی حقیقت کو ایک اور ان کی شانوں کو مختلف بتایا ہے مثلاً ؂

نگہِ یار خود تڑپ اٹھی — شرطِ اوّل خراب ہونا تھا
حسن بیتاب تجلی خود ہے لیکن اے جگرؔ — ایک ہلکا سا حجابِ چشمِ حیراں چاہیے
حسن میں جبتک کہ یہ شانِ خود آرائی نہ تھی — عشق میں مستی تھی لیکن جوئے رسوائی نہ تھی
عشق کیا ہے، پرتوِ حُسنِ تمام — شوق کیا ہے حسن کا عکسِ شباب
حسن بے قید سہی عشق بھی محدود نہیں — مجھکو پائینگے جہاں تک وہ نمایاں ہونگے
جس رنگ میں دیکھو اسے وہ پردہ نشیں ہے — اور اس پہ یہ پردہ ہے کہ پردہ ہی نہیں ہے
وہی ہے عشق، وہی حسن ہے وہی سب کچھ — مگر کسی سے کسی کا جواب ہو نہ سکا
جب عشق اپنے مرکزِ اصلی پہ آگیا — خود بن گیا حسین دو عالم پہ چھا گیا
یہ حسن ہے کیا؟ یہ عشق ہے کیا؟ کسکو ہے خبر اسکی لیکن — بے جامِ ظہورِ بادہ نہیں، بے بادہ فروغِ جام نہیں
جز عشق معتبر یہ کسی کو خبر نہیں — ایسا بھی حسن ہے جو بقیدِ نظر نہیں

جگرؔ اپنے بعض اشعار میں اپنی اجتہادی اپچ کی بدولت حسن و عشق دونوں کو الگ الگ ہستیاں تسلیم کرنے کے بجائے دونوں کو ایک ہی محور پر لے آئے ہیں مثلاً

حسن سے عشق جدا ہے نہ جدا عشق سے حسن — کونسی شئے ہے جو آغوش در آغوش نہیں
عشق کا سحر کامیاب ہوا — میں ترا تو مرا جواب ہوا
تو ہی کمالِ عشق ہے تو ہی کمالِ حسن ہے — اپنے سوا کسی طرف آنکھ اُٹھا کے بھی نہ دیکھ
اس طرح نہ ہوگا کوئی عاشق بھی تو پابند — آزادِ جہاں دورا ہے وہ تو خود ہی ہے

جگرؔ کے صوفیانہ کلام میں وجدان کی سرمستی ذہانت کی کارفرمائی ملتی ہے مثلاً

چیر کے دیکھوں اگر سینۂ مستیٔ عشق
توڑ کے رکھ دوں ابھی آئینۂ مہر و ماہ

ہر ذرۂ ہستی میں جب تو متشکل ہے
حیران ہوں میں جلوہ پھر کونسا باطل ہے

کیا چیز ہے کل عالم کیا چیز مرا دل ہے
حیرت کا اک آئینہ حیرت کے مقابل ہے

وہ بزم تماشا بھی کیا بزم تماشا ہے
جو جلوہ ہے پردا ہے جو پردہ ہے جلوا ہے

جگرؔ کے یہاں تصوریت کا عنصر بھی ملتا ہے ؎

گذر سکے تو گذر جا بطرزِ بے خبری
یہ کل جہاں ہے فریب تجلّی نظری

صحرا ہے نہ بستی ہے دریا ہے نہ ساحل ہے
جو کچھ نظر آتا ہے یہ شعبدۂ دل ہے

جگرؔ نے مندرجہ ذیل اشعار میں انکشاف حقائق کے ساتھ ساتھ اپنے فکر و وجدان سے انہیں گہرائی اور معنویت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ؎

یہ سب نمود و نمائش ہے تیرے چھپنے سے
جو تو نہ پردے میں ہوتا تو میں کہاں ہوتا

ذرّے ذرّے سے نمایاں شانِ قدرت دیکھ کر
کھل گئیں آنکھیں طلسم حسنِ فطرت دیکھ کر

ہر چیز پہ پڑتی ہیں تحیّر کی نگاہیں
چھوٹا ہوں جو اب سلسلہ بے خبری سے

اُن کے یہاں موضوعی تصوریت کا داخلی معیار بھی پایا جاتا ہے ؎

چشمِ نظر پرست میں جس کا جہان نام ہے
حسن تمام یار کا جلوۂ ناتمام ہے

خود ضیا بار جو اک جلوۂ مستور نہ ہو
آئینہ خانۂ عالم میں کہیں نور نہ ہو

سریت کے معاملہ میں وجدان ہماری رہنمائی کرنے سے قاصر ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

کام نہ آئیں عقل کی عقدہ کشائیاں جگرؔ
اور اضافہ ہو گیا سلسلہ ہائے راز میں

اس جلوۂ تمام کی ہم کو خبر ہی کیا
اک ناتواں سا رشتۂ تارِ نظر ہی کیا

جگرؔ کے عملی اور نظری سریت بھی بالترتیب ملاحظہ فرمائیے!

اب اس صورت سے کیا آئیں ترے آئینہ خانے میں
تری تصویر ہی بنکر تری تصویر دیکھیں گے

تیری ہر ایک شان کے شایاں بنا دیا
انساں کو دردِ عشق نے انساں بنا دیا

ہم سے پوچھو وہ کہاں ہے اور کس مسکن میں ہے
درد کی بیتابیوں میں قلب کی دھڑکن میں ہے

سراپا دید ہو کر غرق موجِ نور ہو جانا
ترا ملنا ہے خود ہستی سے اپنی دور ہو جانا

اک شاہد بے ثانی اک پیکرِ محبوبی
ہر درد میں شامل ہے ہر سانس میں پنہاں ہے

ایک ذرّے کا اگر حسن نمایاں ہو جائے
آدمی شدت انوار سے حیراں ہو جائے

اگر نہیں پس پردہ کوئی حقیقت ہیں
یہ کون بول رہا ہے طلسم صورت میں

ان کے صوفیانہ تجربات بھی ملاحظہ فرمائیے!

تفسیر حسن و عشق جگرؔ مصلحت نہیں
انشائے راز قطرہ و دریا نہ کیجیے

لفظ و معنی میں نہیں جلوۂ صورت میں نہیں
عشق اک چیز ہے جو حرف و حکایت میں نہیں

جگرؔ کے کچھ خالص وجدانی اشعار بھی دیکھیے۔

یہ کیا کیا کہ عطا کر کے عشق لامحدود
مجھے حریفِ مقابل بنا دیا تو نے

کچھ اس طرح وہ پس پردۂ مجاز رہے
حجاب ساز میں جیسے نوائے ساز رہے

اس بزم حقیقت کی حقیقت میں کہوں کیا
نغموں کا تلاطم تو ہے آواز نہیں ہے

اب تصوف سے متعلق مختلف موضوعات پر جگرؔ کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے جس سے ان کے بقیہ مختلف نظریات کا پتہ چلتا ہے ؎

کثرت میں بھی وحدت کا تماشا نظر آیا
جس رنگ میں دیکھا تجھے یکتا نظر آیا

جب دیکھ نہ سکتے تھے تو قطرہ بھی تھا دریا
جب آنکھ کھلی قطرہ بھی دریا نظر آیا

واماندگیٔ شوق کا اللہ رے کمال
جو بے خبر ہوا وہ بڑا باخبر ہوا

کون تجھے پا سکے کس کی ہے یہ دسترس گاہ
عشق سو گم کردہ ہوش عقل سو گم کردہ راہ

سنتا ہوں کہ ہر حال میں وہ دل کے قریں ہے
جس حال میں ہوں اب مجھے افسوس نہیں ہے

مجھ سے کوئی پوچھے ترے ملنے کی ادائیں
دنیا تو یہ کہتی ہے کہ ممکن ہی نہیں ہے

مٹا کے دل سے ہر اک نقشِ دل نشیں میں نے
تجھے بھی دیکھ لیا پا لیا یہیں میں نے

اسی تلاش و تجسس میں کھو گیا ہوں میں
اگر نہیں ہوں تو کیونکر؟ جو ہوں تو کیا ہوں میں

من بہ پنہاں جگرؔ تلاش کنم
او مگر آشکار می آید

اعتبار بدل خندہ زن و دل تو مشغول
خلقے پس دیوانہ و دیوانہ بکارے

کوئی مانے نہ مانے اسکو، لیکن یہ حقیقت ہے
ہم اپنی زندگی میں غیب کو شامل سمجھتے ہیں

فضائے کعبہ ہو یا سرزمین بتخانہ
ترے سوا نہ حقیقت نہ کوئی افسانہ

جب تجھے دیکھ کے کونین کی وسعت دیکھی
حسن ہی حسن محبت ہی محبت دیکھی

تسکین روح جب نہ کسی طرح ہو سکی
سب اپنی اپنی دھن میں لگے کچھ پکارنے

اپنا ہی عکس پیش نظر دیکھتے رہے
آئینہ روبرو تھا جدھر دیکھتے رہے

میں نے دیکھا ہے اسے روپ میں فطرت کے جگرؔ
میں نے پایا ہے اسے بھیس میں انسانوں کے

عالم ہمہ پُر ز جلوۂ دوست
اے وائے نگاہ نارسیدہ

زندگی ہے ترے فراق کا نام
اور تو زندگی سے دور نہیں

عین ایماں ہے انا الحق کا ترانہ لیکن ہے یہی کفر، اگر بندہ منصور نہ ہو

ان اشعار کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ جگرؔ پر تصوف کا اچھا خاصہ اثر تھا وہ اپنی زندگی میں غیب کو شاہد سمجھتے تھے اور فضائے کعبہ اور سرزمین بتخانہ دونوں میں انکو حسن حقیقی ہی کی جھلک دکھائی پڑتی تھی کبھی تو انھوں نے اسے (حسن حقیقی کو) فطرت کے روپ میں دیکھا تھا اور کبھی انسانوں کے بھیس میں پایا تھا۔ یہ دراصل جگرؔ کی حسن حقیقی کی تلاش اور انکے تجربات و احساسات کے نتائج تھے جو انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کر دیئے ہیں۔

انسانی عظمت کا تصور

اسمیں شک نہیں کہ جگرؔ ایک آزاد منش آدمی اور غزل گو شاعر تھے اور انکو سیاست سے عملی طور پر کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا لیکن ان کے دور میں جو بہیمانہ حرکات ہوئے ان سے انھوں نے چشم پوشی بھی نہیں کی انکو ان بہیمانہ حرکات پر جسمیں تقریباً ہر فرقہ کے لوگ ملوث تھے انتہائی افسوس رہا اور ان انسانیت سوز حرکات کا اثر اُن کی شاعری اور زندگی دونوں پر پڑا انھوں نے اس جہل خرد کے دور میں "انسان اور انسانیت" کی تلاش کی لیکن کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہ ملا جسے وہ اپنے معیار پر انسان کہتے اسی لئے انھوں نے کہا ہے ؎

اب کہاں انساں جسے انساں کہیں چلتی پھرتی دیکھ لو پرچھائیاں

انسانی عظمت کا تصور ان کے ذہن میں اسقدر بلند تھا کہ وہ مناظر فطرت تک کو چاہتے تھے کہ وہ خود انسان کے پاس آئیں چنانچہ ایک موقع پر انھوں نے کہا کہ

"یہ آدمی کی توہین ہے کہ وہ مناظر کی تلاش میں پھرا کرے مناظر کو ضرورت ہو تو وہ آدمی کے پاس آئیں"[1]

جگرؔ کے اس بیان میں بے انتہا مبالغہ آرائی شہی، کیونکہ مناظر خود نہ تو کبھی کسی انسان کے پاس آئے اور نہ آتے ہیں یہ محض ایک تصوری بات ہے پھر بھی اس سے اُن کے انسانی عظمت کے تصور کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنا عظیم انسانی تصور رکھتے تھے۔

اُنکے خیال میں انسان کی عظمت اس میں تھی کہ وہ اپنے روشن دل و دماغ سے "انسان اور انسانیت" کے متعلق کھلی ہوئی فضا میں غور و فکر کرے ان کے نزدیک انسان کا انسان ہونا ہی اسکی معراج ہے اور اگر انسان اپنے دل کو شائستہ اسرار بنائے تو فطرت کے خاموش لب بھی بولنے لگیں اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ

گھٹے اگر تو بس اک مشتِ خاک ہے انساں بڑھے تو وسعتِ کونین میں سما نہ سکے

جگرؔ انسان کو مخلوقات کا سرتاج، اس کو اپنی حقیقت کے پہچاننے اسکی بیداری اور اسکے اسرار

---

[1] "صبح امید"، جولائی ۱۹۵۱ء صفحہ ۳۰

فکر و نظر ہی کو بلند و برتر تصور کرتے تھے اُن کا خیال تھا کہ انسان کے دل میں سب کچھ یہاں تک کہ کونین بھی پوشیدہ ہے اور اگر وہ چاہے تو یہ سارے اسرار اس پر کھل جائیں لیکن یہ کام بے حد دشوار ہے اور ہر شخص کے بس کا نہیں ہے وہ انسان کی عظمت کا تصور صرف محبت سے کرتے تھے اور کہتے تھے کہ

رندی کے لئے ہے نہ عبادت کے لئے ہے
انسان محبت ہے محبت کے لئے ہے

انسانی عظمت کے تصور سے متعلق انکے چند اشعار ملاحظہ فرما کر دیکھئے کہ انکے ذہن میں انسان کی عظمت کا تصور کس قدر بلند و بالا ہے ؎

عرش تک ہو نہیں سکتی جو رسائی نہ سہی
یہی انساں کی ہے معراج کہ انساں ہو جائے

دلِ انساں اگر شائستۂ اسرار ہو جائے
لبِ خاموشِ فطرت ہی لبِ گفتار ہو جائے

اس انسان میں سب کچھ ہے پنہاں
مگر یہ معرفت دشوار بھی ہے

وہی انساں جسے سرتاجِ مخلوقات ہونا تھا
وہی اب سی رہا ہے اپنی عظمت کا کفن ساقی

بس ایک دل اور کیف و لذت، بس ایک ہم اور جمالِ فطرت
یہ زندگی کس قدر حسیں تھی شعور و فکر و نظر سے پہلے

وہ اگر دل میں روشنی نہ ہو تو مہر و ماہ کی تسخیر کو بھی بے کار سمجھتے تھے اس لئے کہا ہے ؎

تسخیرِ مہر و ماہ مبارک تجھے مگر
دل میں اگر نہیں تو کہیں روشنی نہیں

بلندی چاہیئے انسان کی عظمت میں پوشیدہ
کوئی ہو بھیس لیکن شانِ سلطانی نہیں جاتی

کونین کی ہوس میں ہے انساں ذلیل و خوار
کونین اپنے سینے کے اندر لئے ہوئے

سخت خونریز جب آشوبِ جہاں ہوتا ہے
نہیں معلوم یہ انسان کہاں ہوتا ہے

شرح و تفصیل سے بیگانہ گذر جائے دوست
عقل بڑھتی ہے مگر دل کا زیاں ہوتا ہے

ان کا خیال تھا کہ جب تک انسان پاک طینت نہ بن جائے علم و حکمت کی کوئی اہمیت نہیں ؎

جب تک انسان پاک طینت ہی نہیں
علم و حکمت علم و حکمت ہی نہیں

وہ یہیں ہیں کہ جن کے ہاتھوں نے
گیسوئے زندگی سنوارے ہیں

شیطاں نہیں فرشتہ نہیں یا خدا نہیں
انساں ہے مشتِ خاک مگر اس میں کیا نہیں

انکو آدمی کے پاس انسانیت کے علاوہ ہر چیز کے ہونے، زندگی میں سچائی کی کمی، انسان کا عالمِ انسانیت پر بار ہونے، آدمی سے آدمی کے حق کے نہ ادا ہونے اور آدمی سے آدمی کے بعد پر سخت افسوس رہا جس کا اظہار انھوں نے اپنے آخری دور کے کلام میں جگہ جگہ کیا ہے مثلاً

باہمہ ذوقِ آگہی ہائے رے پستیٔ بشر
سارے جہاں کا جائزہ اپنے جہاں سے بے خبر

کیا قیامت ہے کہ اس دورِ ترقی میں جگر
آدمی سے آدمی کا حق ادا ہوتا نہیں

آدمی کے پاس سب کچھ ہے مگر
ایک تنہا آدمیت ہی نہیں

خدا کرے کہ حقیقت میں زندگی بن جائے
وہ زندگی جو زباں تک ہی پائی جاتی ہے

حسن صورت کے نہ حسرت کے نہ ارمانوں کے
اُف کہ انسان ہیں مارے ہوئے انسانوں کے

کہاں کہاں اڑ کے پہنچے شعلے یہ ہوش کسکو یہ کون جانے
ہمیں بس اتنا ہے یاد اتبک لگی تھی آگ اپنے گھر سے پہلے

آدمی کو آدمی سے بعد وہ بھی کسقدر
زندگی کو زندگی کا راز داں سمجھا تھا میں

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ جگر اپنے زمانے کے انسان اور انسانیت سے کس قدر مایوس تھے سب کچھ تھا لیکن انسانیت نہیں تھی جس کا انھیں افسوس تھا کہ انکو ایسے انسان ہی نہیں ملے جنکو وہ اپنے معیار کے مطابق انسان کہہ سکتے انکی نگاہ ایک زمانے تک ایسے آدمی دیکھنے کو ترس گئی جسے وہ درحقیقت آدمی کہہ سکتے ہے

کیا غضب ہے کہ اک زمانے سے
آدمی کو ترس رہی ہے نگاہ

بعض اخلاقی پہلو

بے شک جگرؔ صرف غزل گو شاعر ہیں درسِ اخلاق سے ان کا کوئی واسطہ نہیں رہا انھوں نے نہ تو کبھی حکیم و واعظ بننے کی کوشش کی اور نہ معلمِ اخلاق بلکہ وہ اپنی تمام عمر اپنی غزلوں میں صرف اپنے جذبات کی مصوری کرتے رہے اس لئے ان کی ابتدائی شاعری میں اخلاق کا حصّہ بہت کم ہے لیکن جوں جوں اُن کی شاعری پروان چڑھتی گئی شاعری اور زندگی کے گہرے تجربات ہوتے گئے درس اخلاق بھی انکے یہاں بڑھتا گیا ابتدا میں تو وہ شدید ترین انفعالی کیفیات سے دوچار تھے اس لئے اس وقت وہ کسی اور کو کیا تلقین کرتے جبکہ ان کا خود یہ حال تھا ع

اپنی ہی طرف دیکھ ادھر جا نہ ادھر جا

لیکن رفتہ رفتہ انکے تجربات میں اضافہ ہوتا گیا کلام میں بھی پختگی آتی گئی زندگی کے تجربات بھی بڑھے تو انکی نظر اپنی طرف سے ہٹی اور اب وہ دنیا کی طرف بھی دیکھنے لگے انھوں نے اپنے تجربات کی عکاسی کرنا شروع کی اور جب دنیا کی دوسری جنگِ عظیم ہوئی ہندوستان تقسیم ہوا یہاں کے سیاسی حالات بدلے اور امن سوز واقعات پیش آئے تو انکا دل ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اس دور کی شاعری میں انھوں نے سیاستدانوں کا اور عوام کو بھی ایک طرح کا درس اخلاق دیا ہے کیونکہ وہ ایک حقیقی شاعر تھے اور حقیقی شاعر ہونے کی وجہ سے ان واقعات و حالات سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے انھیں حالات و واقعات نے انکے اشعار میں آگ بھر دی ہے

میرے اشعار میں جو آگ بھری ہے اے کاش
تجھکو راس آئے ترے عزم جواں تک پہنچے

انکے ابتدائی دور کے کلام میں اخلاقیات پر مبہم سے اشارے ضرور مل جاتے ہیں مثلاً

دی تھی میرے سر کو جو شوریدگیٔ عشق — پھر کیوں خیالِ حفظِ مراتب دیا مجھے
جذبۂ دل صرف جتنا بے محل ہوتا گیا — اس قدر ذوقِ نظر میں تبدل ہوتا گیا

اس کے بعد انکے یہاں کچھ اخلاقی مضامین پر اشعار ملنے لگتے ہیں جو ان کے خالص تجرباتی اشعار معلوم ہوتے ہیں جیسے:

جلد سکونِ عیش سے ہاتھ اٹھا کہ بےخبر — تیری بقا کا راز ہے شورشِ جاں گداز میں
سمجھائے کون بلبلِ غفلت شعار کو — محدود کر لیا ہے چمن تک بہار کو
پروردۂ طوفاں کو کشتی کی نہیں حاجت — موجوں کے تلاطم میں ساحل نظر آتا ہے
مجھے آغوشِ طوفاں ہی جگرؔ آغوشِ مادر ہے — وہ کوئی اور ہوں گے امن و ساحل دیکھنے والے
عرش تک جا نہیں سکتی جو رسائی نہ سہی — یہی انساں کی ہے معراج کہ انساں ہو جائے

اور اس کے بعد کے کلام میں انکا خطیبانہ انداز ملنے لگتا ہے جس میں انکا جذبۂ خود آگہی کارفرما معلوم ہوتا ہے انکے اس دور کے کلام میں زیادہ تر انھیں کے تجربات کا عکس جمیل نظر آتا ہے:

ہے یہی عین دوستی اپنی طرف سے اے جگرؔ — دستِ کرم بڑھائے جا غیر کی دشمنی نہ دیکھ

اور پھر جب دنیا کی دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی تو وہ اس سانحے سے متاثر ہو کر کہنے لگے ؎

ہر چند کائناتِ دو عالم ہیں اے جگرؔ — انساں ہی ایک چیز ہے انساں مگر کہاں

اور اس جنگِ عظیم کے بعد جب ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات ہونے لگے قتل و غارت کا بازار گرم ہونے لگا اور ہندوستانی سیاست دانوں کا انداز بدلنے لگا تو وہ ان بدلتے ہوئے حالات کو بھانپ کر کہنے لگے ؎

یہ مصرع کاش نقشِ ہر در و دیوار ہو جائے — جسے جینا ہو مرنے کے لئے تیار ہو جائے
اک ایسی شان پیدا کر کہ باطل تھرتھرا اٹھے — نظر تلوار بن جائے نفس جھنکار ہو جائے

۱۹۴۷ء میں ہندوستان تقسیم ہوا تو یہاں کے حالات ناگفتہ بہ ہو گئے نفسی نفسی کا عالم چھا گیا جگرؔ بھی اپنے شدتِ احساس کو دبا نہ سکے اور انکے منہ سے ایسے کلمات نکل پڑے۔

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آجکل — شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آجکل
اس سے تو خودکشی ہی غنیمت ہے اے جگرؔ — وہ مصلحت جو پیشۂ مرداں ہے آجکل

اب جگرؔ ہندوستان کی سیاست اور سیاستدانوں کی چالوں کو بخوبی سمجھ گئے تھے انھیں چالوں پر تنقید کرتے ہوئے انھوں نے ۱۹۴۸ء میں دورانِ قیام بمبئی میں ایک نظم کہی اس کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے جس میں انھوں نے سیاستدانوں کی چالوں پر طعن و تشنیع کی ہے ؎

ہندوستاں میں خیر سے انکی کمی نہیں — لب پر جو ہیں خلوص کا دفتر لئے ہوئے

دیتے ہیں بات بات پہ انسانیت کا درس   دل میں ہزار دشنہ و خنجر لئے ہوئے
ظاہر میں اک مجسمہ امن و آشتی   باطن میں لاکھ فتنۂ محشر لئے ہوئے

جگرؔ اس قسم کی چالوں کو سخت ناپسند کرتے تھے وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانیوں میں اختلافات کے بجائے اعتماد و خلوص پیدا ہو ان کی شاعری کا مقدس مشن بھی خالص انسانی نوعیت کا تھا۔

تو اپنے ہی سوز باطن سے نکال اک شمع غیر فانی   چراغ دیر و حرم تو اے دل جلا کریں گے بجھا کریں گے
مرے ہمصفیر بلبل ترا میرا ساتھ ہی کیا   میں ضمیر دشت و دریا تو اسیر آشیانہ
میں وہ صاف ہی نہ کہدوں جو ہے فرق مجھ میں تجھ میں   ترا درد درد تنہا مرا غم غم زمانہ

مندرجہ بالا امثال سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اگرچہ جگرؔ اخلاق نگار شاعر نہیں ہیں پھر بھی انھوں نے اخلاقیات پر کچھ نہ کچھ ضرور کہا ہے اور جو کچھ کہا ہے خوب کہا ہے۔

جگرؔ کی اخلاقی شاعری کے متعلق مولف "جدید اردو شاعری"، کا یہ خیال کہ

"جگر اخلاق نگار شاعر نہیں لیکن انکی شاعری کا اخلاقی معیار بہت بلند ہے تغزل کے پردے میں وہ انسانی خام کاریوں پر ضرب لگاکر گذر جاتے ہیں" ع۱

بالکل صحیح ہے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

تجھے حادثاتِ پیہم سے کیا ملے گا ناداں   ترا دل اگر ہو زندہ تو نفس بھی تازیانہ
اے سہاروں کی زندگی والو   کتنے انسان بے سہارے ہیں
وہ ہمیں ہیں کہ جنکے ہاتھوں نے   گیسوے زندگی سنوارے ہیں
آگے قدم بڑھائیں جنھیں سوجھتا نہیں   روشن چراغ راہ کئے جا رہا ہوں میں
زیست ہے زیست جو رگ رگ میں رواں ہے عشق   موت ہے موت اگر رقص نہیں جوش نہیں
یہ تو نے کہا کیا اے ناداں، فیاضی قدرت عام نہیں   تو فکر و نظر تو پیدا کر، کیا چیز ہے جو انعام نہیں
رندوں نے جو چھیڑا زاہد کو ساقی نے کہا کس طنز سے آج   اوروں کی وہ عظمت کیا جانیں کم ظرف جو انساں ہوتے ہیں
ہر ایک قطرے میں دریائے معرفت ہے رواں   مگر نصیب ہو کیونکر کہ پیاس ہی کم ہے
جھوٹی ہے ہر ایک مسرت   روح اگر تسکین نہ پائے
تو فنا آمادہ ہے تجھکو نظر آتی ہے موت   زندگی، تابندگی، پابندگی پاتا ہوں میں

جگرؔ نے اپنے بعض اشعار میں رہِ طلب میں لغزشِ پا سے خوف نہ کرنا، اپنی تشنگی سے بحرِ اعظم

ع۱ "نگارش"، جگر نمبر ص ۱۵۷ (اس پرچہ پر سنہ طباعت درج نہیں ہے غالباً سنہ ۶۱ء کا پرچہ ہے) حوالہ مضمون "جگر کی شاعری کا اخلاقی معیار"، از احمد رفائی۔

پیدا کرنا، پرائی آگ میں جلنے کو کارِ مردانہ، قدم قدم پر ایسی شمع راہ پیدا کرنا جسے ہوائے زمانہ کبھی بجھا سکے، زیست کو بغیر سہارے کے بسر کرنا، انسان کو ریا سے دور رہنا، زندگی کو ناکامیوں کا نام، اسی زمین سے مہر و ماہ پیدا کرنا، دنیا کو دیدہ روشن نگاہ سے دیکھنا، مفلس ذہن میں ہر سود کو زیاں، اپنا مقام سرِ عرش بریں پیدا کرنا، خود سے شناسا ہونا، ہر کام انسان کے بس میں ہونا بتایا ہے اور اسی کی زندگی کو زندگی تسلیم کیا ہے جسنے اپنے آپ پر فتح پائی ہو مثلاً یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے جنسے ان کے مندرجہ بالا خیالات کی وضاحت ہوتی ہے ؎

رہِ طلب میں نہ کر خوفِ لغزشِ پا سے — یہاں جو گر کے اٹھا بس وہ کامیاب اٹھا
ہر طرف بے فائدہ کیوں سعئ پیہم کیجیے — تشنگی سے اپنی پیدا بحرِ اعظم کیجیے
خود اپنی آگ میں جلتی ہے شمع جلنے دو — پرائی آگ میں جلنا ہے کارِ مردانہ
جسے ہوائے زمانہ کبھی بجھا نہ سکے — قدم قدم پہ وہ اک شمع راہ پیدا کر
جان فدا اس پہ کہ جسنے جگر — زیست بسر کی نہ سہاروں کے ساتھ

وہ انسان کو ریا سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں کیونکہ ریاکاری انکے خیال میں بندے کو خدا سے جدا کر دیتی ہے کہتے ہیں ؎

انسان کو لازم ہے رہے دور ریا سے — یہ چیز جدا کرتی ہے بندے کو خدا سے
ہوشیار اے کامیابِ زندگی — زندگی ناکامیوں کا نام ہے
نورِ مطلق کی ضیا، اس عرش کے تارے میں دیکھ — اپنی خوابیدہ حقیقت دل کے گہوارے میں دیکھ
یہی زمیں ترا مسکن یہی ترا مدفن — اسی زمین سے تو مہر و ماہ پیدا کر
دنیا کو دیکھ دیدۂ روشن نگاہ سے — فردوس زندگی ہے وبالِ نظر نہیں
تجھے حادثاتِ پیہم سے کیا ملے گا نادان — ترا دل اگر ہو زندہ تو نفس بھی تازیانہ
بے غمِ عشق و بے دلِ آگاہ — موت بھی جرم زندگی بھی گناہ
زندگی ہے نام جہد و جنگ کا — موت کیا ہے؟ بھول جانا چاہیے

ان کے خیال میں لذتیں اوجِ کمال کی دشمن ہوتی ہیں اس لئے انسان کو کلفتوں سے جی لگانا چاہیے ؎

لذتیں ہیں دشمنِ اوجِ کمال — کلفتوں سے جی لگانا چاہیے
دل غنی ہو تو ہر اک رنج بھی دل کی راحت — ذہن مفلس ہو تو ہر سود زیاں ہوتا ہے

قطعہ

کارگاہِ حیات میں اے دوست — یہ حقیقت مجھے نظر آئی
ہر اجالے میں تیرگی دیکھی — ہر اندھیرے میں روشنی پائی

پہلے تو حسنِ عمل حسنِ یقیں پیدا کر　　پھر اسی خاک سے فردوسِ ادب پیدا کر
پستیٔ خاک پہ کب تک تری بے بال و پری　　پھر مقام اپنا سرِ عرشِ ادب پیدا کر

ان کا خیال تھا کہ اگر انسان میں حوصلہ ہو تو موج، تلاطم، طوفان اور دھارے سب اس کی کامیابی کے لئے سہارا بن سکتے ہیں ؎

یہ موج و تلاطم یہ طوفاں یہ دھارے　　اگر حوصلہ ہو، تو یہ بھی سہارے
کوئی اپنا نہیں عرفاں نہ اگر ہو اپنا　　سب شناسا ہیں اگر خود سے شناسائی ہو
جو زمانے کو برا کہتے ہیں خود ہیں وہ برے　　کاش یہ بات ترے گوش گراں تک پہنچے

وہ اس نفع و ضرر کی دنیا میں اپنا زیاں کر لینا تسلیم کر لیتے ہیں مگر دوسروں کو زیاں پہنچانا قبول نہیں کرتے ؎

اس نفع و ضرر کی دنیا سے میں نے یہ لیا ہے درسِ جنوں　　خود اپنا زیاں تسلیم مگر اوروں کا زیاں منظور نہیں
"دہر کا پھر وجود کیا کوئی جو دہر یا نہیں　　پھر یہ خودی ہے کیا بلا کوئی اگر خدا نہیں" ع[1]
"کتابوں میں دھرا ہی کیا ہے واعظ　　سبق لے زندگی کا زندگی سے
نہ جانے کیوں محبت کانپ اٹھی　　اٹھا جب کوئی پردہ زندگی سے" ع[2]
"ہر انقلاب ایک پیامِ سحر سہی　　ہر روشنی دلیلِ طلوعِ سحر نہیں
طوفاں کو موج موج کو طوفاں نہ کر سکے　　وہ کون سا ہے کام کہ انساں نہ کر سکے" ع[3]
"بس اسی کی ہے زندگی جس نے　　آپ اپنے پہ فتح پائی ہے" ع[4]

ان اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ جگر اخلاق نگار شاعر اور معلمِ اخلاق نہ ہونے کے باوجود اخلاقیات سے متعلق اپنا ایک مخصوص نظریہ رکھتے تھے اور اسے عام کرنا چاہتے تھے وہ واعظ یا ناصح نہیں بنے اور اس سلسلے میں اپنی شخصیت کو بروئے کار کہیں نہیں لائے لیکن وہ سب کچھ کہہ گئے جو انھوں نے محسوس کیا اور جس کی ضرورت سمجھی۔

جگر کی نظم گوئی

یہ خیال صحیح ہے کہ غزل کا ہر شعر ایک مکمل نظم کا درجہ رکھتا ہے لیکن بعض موضوعات کا تنوع اور وسعت تفصیل کی متقاضی ہوتی ہے ایسی باتوں

ع۱ جگر کی بیاض نمبر ۱ گوشۂ جگر لائبریری جامعۂ ملیہ دہلی - یہ شعر غیر مطبوعہ تھا راقم نے اسے یادگارِ جگر میں شائع کرا دیا۔
ع۲ " " " نمبر ۲ - " " " " اشعار " " تھے " "
ع۳ " " " نمبر ۳ - " " " " شعر غیر مطبوعہ تھا " "
ع۴ - جگر کا مسودہ "آتش گل" نمبر ۱۱۶ " " " " شعر " " "

کے اظہار کے لئے شاعر کو نظم کا سہارا لینا پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ جگرؔ نے بنیادی طور پر غزل گو ہونے کے باوجود نظمیں بھی کہی ہیں لیکن غزلوں اور نظموں سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے غزل گو شاعر ہی کو نظم گو شاعر سے بہتر مانا ہے اس سلسلے میں ایک دفعہ قیسی الفاروقی سے ایک ملاقات میں انھوں نے کہا کہ:

"میرے نزدیک رباعی، قصیدہ اور نظمیں کہنے والا ناظم ہی ہے شاعر میں غزل گو کو سمجھتا ہوں کئی بندوں اور اشعار میں جو بات کہی جاتی ہے غزل گو اسے ایک شعر میں کہہ دیتا ہے میں غزل کے اشعار کو ایٹم بم سمجھتا ہوں اور مجھے فضلی صاحب کا یہ قول پسند ہے نظم ہے اپنی جگہ خوب مگر ہائے غزل، اس سے اور کسی اصنافِ سخن کی منقصت مقصود نہیں ہے"[1]

غزل کے عشق میں وہ نظم نگاروں کو شاعر کے بجائے ناظم کہتے تھے اور اسمیں ڈاکٹر اقبالؔ تک کا بھی استثنا نہیں تھا لیکن وہ اپنی صداقت پسندی کیوجہ سے آہستہ آہستہ نظم نگاری کے بھی معترف ہو گئے اور انھوں نے خود بھی چند اچھی نظمیں کہیں۔

انکی بعض نظمیں عصرِ حاضر کی آئینہ دار ہیں جو حالات و حادثات سے متاثر ہو کر کہی گئی ہیں لیکن چونکہ انکی شاعری کا فارم غزل کا تھا اس لئے انکی نظموں میں بھی غزل ہی کا فارم موجود ہے اس طرح انھوں نے غزل اور نظم کا درمیانی راستہ اختیار کر کے غزل مسلسل کو رائج کیا لیکن جن حالات میں انھوں نے نظمیں کہی ہیں انھیں نظم ہی تسلیم کرنا پڑے گا کیونکہ اپنی نظموں میں انھوں نے زمانۂ حال کے روح کش حالات، ابنی نوعِ انسان کے درد، ابنائے وطن کی مصیبتیں، دستِ غیر کے تنظیم مفسدہ پرداز مصلحین کے فریب اور اپنے گرد و پیش کے حالات کا نقشہ بڑے خوبصورت صحیح اور دردناک الفاظ میں کھینچا ہے اور غزل کی ہیئت کے ساتھ ساتھ انھوں نے نظم کے اسلوب اور ہیئت میں بھی کوئی فرق نہیں آنے دیا اور بڑی کامیابی کے ساتھ اپنے احساسات کو مربوط طریقے پر پیش کر دیا ہے وہ اپنے اسی فن کی بدولت دوسرے شعراء سے علیٰحدہ ہیں انکے "شعلۂ طور" اور "آتشِ گل" دونوں مجموعوں کی نظموں میں خلوص اور جذبہ کا اظہار والہانہ طور پر ملتا ہے

انکے ابتدائی دور کی نظموں میں ایک مطبوعہ نظم "ہلالِ عید" ہے جسے جگرؔ نے "ناتمام نقشِ دورِ ابتدائی" کا عنوان دیا ہے جو انکی پہلی بیوی "وحیدن بیگم" سے متعلق ہے اس نظم کا پس منظر جگرؔ کے حقیقی بھائی علی مظفر سے ۲۷ رمئی ۱۹۶۳ء کی ایک ملاقات میں معلوم ہوا

---

[1] قیسی الفاروقی اور جگر مرادآبادی کی ایک ادبی ملاقات جو ۵ رجولائی ۱۹۵۹ء کو گونڈہ میں ریکارڈ کی گئی اور ۸ رجولائی ۱۹۵۹ء کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر کی گئی۔

کہ جب جگرؔ اپنی اہلیہ کے ساتھ آگرہ میں رہتے تھے ایک دن اصغرؔ سے اور انکی اہلیہ سے لڑائی ہوئی اور وہ اپنے میکے چلی گئیں جگرؔ صاحب انکی اس جدائی سے بہت متاثر ہوئے اور اسی سے متاثر ہو کر یہ نظم کہی جو نہایت درد انگیز اور انکی دلی کیفیات کا آئینہ دار ہے۔

لیکن اس نظم کے متعلق جگرؔ کا بیان زیادہ مستند ہے کیونکہ یہ واقعہ انھیں کیساتھ پیش آیا تھا انکا کہنا ہے کہ:

"نظم ہلالِ عید" آغاز محبت کے زمانے میں لکھی تھی وہ فراق کا نتیجہ تھی میں آگرہ میں تھا وہ پنجابی کہلاتی تھیں مگر شاید بجنور کی رہنے والی تھیں پہلے وہ مجھ سے ملتفت نہ تھیں جب عید آئی تو مجھے کوئی مسرت نہ ہوئی یہ نظم اسی کیفیت کی آئینہ دار ہے" ع۱

اس نظم کے تین بند ملاحظہ فرمائیے تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ اس نظم میں جگرؔ نے اپنے کن کیفیات و واردات کو بیان کیا ہے ؎

حال میرا پوچھتا ہے مجھ سے تو، اے بےخبر　　ہو چکی تاریک، چشمِ یاس میں شام و سحر
آہ وہ غم کی کہانی بڑھ گئی ہے کس قدر　　جسکو میں سمجھے ہوئے تھا داستانِ مختصر
سال بھر پیچھے عیادت کو مری آیا ہے تو
لا دوائے اضطراب درد کیا لایا ہے تو

اک زمانہ تھا کہ تھی میری طبیعت بھی گداز　　اب تو ہوں اک ہستی موہوم کا خاموش ساز
جتنے سجدے تھے جبیں میں کر چکا صرف نیاز　　ہو چکی مہمانی غم، اٹھ چکے اب دل کے ساز
بدر تھا پہلے، مگر اب میں ہلالی ہو گیا
ہجر میں اتنا گھلا، نقشِ خیالی ہو گیا

آ کہ رخصت تجھ سے ہو لوں تیری رخصت دیکھ لوں　　آ کہ دم بھر اور اپنا نقشِ حسرت دیکھ لوں
آ کہ تیرے آئینے میں خط قسمت دیکھ لوں　　آ کہ اپنے دیکھنے والے کی صورت دیکھ لوں
دیکھ کر صورت تری، جاں اپنی دے دوں گا تجھے
اب کے دیکھا ہے تجھے اب کے نہ دیکھوں گا تجھے

جگرؔ نے اعظم گڑھ کے دورانِ قیام "سوراج" "گاندھی جی" "تلک" "مولانا محمد علی مرحوم" اور "اسٹرائک" پر نظمیں کہی تھیں مگر اس دورِ سرمستی کی زیادہ تر نظمیں ضائع ہو گئیں لیکن جب ۳۰ جنوری ۱۹۵۹ء کو قیسی الفاروقی نے انسے نظموں کے متعلق ذکر چھیڑا تو انھوں نے اپنی یادداشت سے مندرجہ ذیل اشعار۔

ع۱ "قومی آواز" ۱۹ ستمبر ۱۹۶۰ء ص۴

سنائے سہ

"اے قوم کے نونہال بچو — اے قوم کے خوش خصال بچو
اے نقش و نگارِ گلشنِ ہند — اے تازہ بہارِ گلشنِ ہند
ماں باپ کے آنکھ کے نور ہو تم — ماشاءاللہ چشم بد دور ہو تم
ماں باپ کے آنکھ کا نور ہو تم ع۱ — اللہ تمھیں اماں میں رکھے
بنگال تمھارا ہم سفر ہے — پنجاب تمھاری پشت پر ہے
ڈائر کی وہ فوج آ رہی ہے ع۲ — وہ تیز قدم بڑھا رہی ہے
ڈائر کی وہ فوج آ رہی ہے — اب ہند نہیں ہے فرشِ محمل

پھر فرمایا کہ "تلک" نے مکمل آزادی کا نعرہ لگایا تھا انھیں نے ڈرامائی انداز میں ایک نظم لکھی تھی جس میں ایک بہادر رہبر کی طرح ان کی روح مسلمانوں اور ہندوؤں سے مخاطب ہوتی ہے سہ

تلک کا اگر یاد ہو نام تم کو — جتانا انھیں کا ہے اکرام تم کو
سنانا انھیں کا ہے پیغام تم کو — دکھانا ہے اس صبح کی شام تم کو
تلک وہ کہ ہر موئے تن اس کا گاندھی — تلک وہ کہ سارا چمن اس کا گاندھی

روح مسلمانوں کو ان کے اعمال صالح کی یاد دلاتی ہے اور انکے زوال کے اسباب بتاتی ہے

محبت تمھاری خدا کے لئے تھی — عداوت تمھاری خدا کیلئے تھی
عدالت تمھاری خدا کے لئے تھی — حکومت تمھاری خدا کے لئے تھی
نہ تھا فقر سے اور نہ مطلب غنا سے — خدا تم سے راضی تھا تم تھے خدا سے

روح پھر ہندوؤں سے مخاطب ہوتی ہے پھر حکومت برطانیہ کے مظالم گناتی ہے اور آخر میں پیغام آزادی دیتی ہے۔

"سوراج" کے عنوان سے جو نظم لکھی تھی اس کے شعر یہ ہیں۔

سوئے سوراج قدم اپنا بڑھاتے جاؤ — جس طرف جاؤ ادھر آگ لگاتے جاؤ
خوں ابھی اور بہانا ہے زمینوں پہ ہمیں — گولیاں اور بھی کھانی ہیں سینوں پہ ہمیں

"گاندھی جی" پر جو نظم لکھی تھی اس کا ایک مصرع ہے

اب ہوئے میکدۂ ہند کے گاندھی ساقی

ع۱ یہ مصرعہ دو بار لکھا گیا ہے۔

ع۲ " " "

شام کی نشست میں فرمایا کہ بھوپال میں میں نے ایک سہرا ابھی کہا تھا آپ رشید الظفر کو لکھ کر منگوا لیجئے گا۔

خوشی سے نہ کیونکر ہو معمور سہرا — کہ ہے زینت روئے منصور سہرا[1]

---

[1] یہ مکمل سہرا "مجلہ سیفیہ" سیفیہ کالج بھوپال اردو میگزین جلد چہارم ۶۵-۱۹۶۴ء میں۔ ص ۲۸۸ پر عبدالقوی دسنوی کے مضمون میں اس طرح شائع ہوا ہے۔ شعر نمبر ۸ دسنوی صاحب نے راقم الحروف کو ۲۲ نومبر ۱۹۶۵ء میں لکھ کر بھیجا تھا جو "مجلہ سیفیہ" میں شائع ہونے سے رہ گیا تھا۔

خوشی سے نہ کیونکر ہو معمور سہرا — کہ ہے زینتِ روے منصور سہرا
یہ سہرا نہیں حسب دستور سہرا — یہ سہرا ہے نورٌ علیٰ نور سہرا
یہ مکھڑا ہے کیا جانِ احباب مکھڑا — یہ سہرا ہے کیا چشم بددور سہرا
مکمّل ہے یا پیکرِ حسنِ فطرت — مسلسل ہے یا دیدۂ حور سہرا
ادھر اپنے ماں باپ کے دل کی ٹھنڈک — ادھر چشم احباب کا نور سہرا
خبر ہے اسے کیا ہجوم نظر کی — جوانی کے نشہ میں ہے چور سہرا
سر بزم لیتا ہے گرخ کی بلائیں — بہت شوخ و گستاخ مغرور سہرا
ان آنکھوں لگا اک جام تازہ ادھر بھی — جن آنکھوں کی ہیکر ہے مخمور سہرا
مرادوں کے پھولوں سے رنگین محفل — محبت کی خوشبو سے معمور سہرا
بیاں کس سے کیجئے دلوں کی مسرت — کہ نوشاہ ہے سرشار، مخمور سہرا
مبارک مظفرؔ میاں کو مبارک — یہ جان برادر کا یہ نور سہرا
دلہن کے بھی سہرے کی خوشبو ہے شامل — سر بزم گرچہ ہے مستور سہرا
مبارک سلامت، مبارک سلامت — بر زرتار سہرا یہ یہ نور سہرا

جگرؔ سے فصیح البیاں نے لکھا ہے
زمانے میں کیوں ہو نہ مشہور سہرا

رشید الظفر کے لئے جگرؔ نے ایک سہرا اور کہا تھا جو راقم الحروف کو جامعہ ملیہ دہلی کی لائبریری "گوشہ جگرؔ" میں جگرؔ کی بیاض نمبر ۲ میں دیکھنے کو ملا جس کے اشعار کی زمین اس زمین سے مختلف ہے اس "سہرا" کو جگرؔ نے اپنی بیاض میں کئی جگہ لکھا ہے راقم نے ان کے آخری صفحے پر لکھے ہوئے اشعار بالترتیب پہلے لکھ لئے ہیں اس کے بعد پہلے صفحے سے وہ اشعار نقل کر لیے جو آخری صفحے پر درج نہیں ہیں یہ "سہرا" ملاحظہ فرمائیے: (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ کیجیے)

یہ سہرا نہیں حسب دستور سہرا — یہ سہرا ہے نورٌ علیٰ نور سہرا
ادھر اپنے ماں باپ کے دل کی دھڑکن — ادھر چشم احباب کا نور سہرا
خبر ہے اسے کیا ہجوم نظر کی — جوانی کے نشے میں ہے چور سہرا
سرِ بزم لیتا ہے رُخ کی بلائیں — بہت شوخ و گستاخ مغرور سہرا
مرادوں کے پھولوں سے رنگین محفل — محبت کی خوشبو سے معمور سہرا

حیدرآباد میں ایک نظم "تکیہ" پر لکھی تھی فرمائش ہوئی تھی ـ

عکس روئے نگار ہے تکیہ — واہ کیا پُر بہار ہے تکیہ
جب اسے دیکھئے کسی کے لئے — ہمہ تن انتظار ہے تکیہ
دردمندانِ شام فرقت کا — مونس و غمگسار ہے تکیہ
موجِ راحت ہے تار تار اسکا — اور کبھی خار خار ہے تکیہ
راز اسکے کوئی کیا جانے — آپ اپنی پکار ہے تکیہ

بقیہ پچھلے صفحہ کا: "ہر جگہ رشید الظفر میاں کو رہے نہ کیوں ساز گار سہرا — لکھا ہے پڑھ کر درودِ پیہم بنام پروردگار سہرا
سنائے جا مطربِ محبت اسی طرح بار بار سہرا — تمام حسن و شباب نوشہ، تمام باغ و بہار سہرا
نشاط اندر نشاط محفل، جمال اندر جمال منظر — قطار اندر قطار خوشبو بہار اندر بہار سہرا
جواب اس حسن کا کہاں ہے عجیب عالم عجب سماں ہے — تجلیاں رخ پہ ہیں تصدق تجلیوں پر نثار سہرا
یہ دو دلوں کی محبتوں کی کشاکشیں بھی ہیں کیا قیامت — ادھر بھی ہے بیقرار سہرا، اُدھر بھی ہے بیقرار سہرا
بنا ہے نوشہ کے رخ سے ملکر کچھ اس طرح شاندار سہرا — کہ جیسے خود باغبانِ فطرت کے ہاتھ کا شاہکار سہرا
ترے سراپا کا میں نے لکھا عجیب سراپا بہار سہرا — کہ تو ہے دریائے حسن و خوبی تو اسکا ہے آبشار سہرا
اگر ہو منظور دل لگی کچھ جناب نقی سے کوئی کہدے — بلائیں لے لے کے چشم و عارض کی بن گیا میگسار سہرا
جو مادرِ مہرباں کی آنکھوں میں ہیں یہ اشک صبح کی سی — تو ہے سعید الظفر میاں کے لئے بھی وجہ قرار سہرا
الٰہی تا دور ماہ و انجم رہے مبارک بہ صد تبسم — یہ مست جام شراب الفت، یہ رند شب زندہ دار سہرا
جگر سب احباب کی نگاہیں اگر نہ بروقت کام آئیں — تو کیا یہ شک ہے کہ بن نہ جائے لطافتِ رخ پہ بار سہرا

نوٹ: اس "سہرا" میں دسویں شعر کی ترتیب بیاض میں دوسرا مصرع پہلے اور پہلا مصرع بعد کو لکھا ہے لیکن راقم نے اس کو موزوں کرنے کی خاطر بیاض کے دوسرے مصرعہ کو پہلا اور پہلے مصرع کو دوسرا بنا کر شعر کو ترتیب سے لکھ دیا ہے۔

شعر ۸ میں "نقی" کے بجائے "نقوی" لکھنے سے شعر موزوں ہوتا ہے۔

اس کی توصیف سب بجا لیکن　　　کاہلی کا شکار ہے تکیہ

اور بہت سے اشعار تھے"، ع۱

یہ پوری نظم راقم کو دوران سفر میرٹھ تسکین قریشی میرٹھی سے ۱۴ مئی ۱۹۶۴ء کو ملی جسے نیاز (جگر کی اہلیہ کے بھتیجے) نے مندرجہ ذیل نوٹ کے ساتھ بھیجی تھی:۔

نوٹ: "یہ نظم میں نے "آتش گل" کے پرانے مسودے میں پائی تھی
نیاز

مکمل نظم یہ ہے:۔

"تکیہ"

عکسِ روئے نگار ہے تکیہ　　　واہ کیا پُر بہار ہے تکیہ
ہم سے پوچھو تو دستِ صنعت کا　　　طرفہ اک شاہکار ہے تکیہ
روح پرور کبھی خواب آور کبھی　　　جیسے آغوشِ یار ہے تکیہ
جب اسے دیکھئے کسی کے لئے　　　ہمہ تن انتظار ہے تکیہ
راحتِ جان ہر امیر و فقیر　　　رحمتِ کردگار ہے تکیہ
جس جگہ دیکھئے طلب اس کی　　　شاہدِ روزگار ہے تکیہ
مذہب و ملک و قوم سے آزاد　　　کیا وسیع انشعار ہے تکیہ
اک جہاں کو پیامِ خواب مگر　　　آپ شب زندہ دار ہے تکیہ
شاہدِ خوابِ ناز کے رخ کا　　　کیا ہی سادہ سنگھار ہے تکیہ
دردمندانِ شامِ فرقت کا　　　مونس و غمگسار ہے تکیہ
شب کی بینائیاں ہیں محو اسمیں　　　درد کا پردہ دار ہے تکیہ
موجِ راحت کے تار تار اس کا　　　اور کبھی خار خار ہے تکیہ
عہدِ رنگیں و دورِ غمگیں کا　　　زندہ اک یادگار ہے تکیہ
داستانیں ہیں اسمیں لاکھوں دفن　　　اک جہانِ مزار ہے تکیہ
دیکھ لو حسن و عشق کے جلوے　　　ان کا آئینہ دار ہے تکیہ
اسکی ہر سطر مستقل تاریخ　　　کیا حقیقت نگار ہے تکیہ
راز جو چاہئے بیاں کیجئے　　　لائقِ اعتبار ہے تکیہ

ع۱ "مادرِ وطن" ۱۶ دسمبر ۱۹۶۱ء ص۷

شب کی تنہائیوں کے عالم میں — مونس جان زار ہے تکیہ
درد کو اس کے کوئی کیا جانے — آپ اپنی پکار ہے تکیہ
اس کی توصیف سب بجا لیکن — کاہلی کا شکار ہے تکیہ
طیبہ نے اسے بنایا ہے — قابل افتخار ہے تکیہ

قیسی الفاروقی نے انکی بعض غیر مطبوعہ نظموں کے متعلق جگرؔ کی ایک پرانی بیاض کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا ہے کہ

"غیر مطبوعہ نظموں میں "ایک ناظم مغرب زدہ کے نام" "عید" "مبارک باد"، "سہرا" اور "تکیہ" کا میں یہ نظمیں فرمائش پر لکھی گئی ہیں اور وقتی تاثرات کی حامل ہیں اسی لئے مطبوعہ کلام میں شامل نہیں کی گئی ہیں" ع۱

یہ نظمیں تاثراتی ہی سہی پھر بھی چونکہ ان نظموں سے جگرؔ کی نظم گوئی اور انکی فنکارانہ صلاحیت پر روشنی پڑتی ہے اس لئے ان غیر مطبوعہ نظموں کو بھی یہاں درج کیا جاتا ہے تاکہ جگرؔ کی نظم گوئی کی بھی صحیح تصویر پیش نظر ہو جائے اور جگر کی اس صنف میں فنکاری کے متعلق بھی کوئی رائے قائم کی جا سکے مندرجہ بالا نظموں میں سے "سہرا" اور "تکیہ" سے متعلق اشعار پچھلے صفحات میں لکھے جا چکے ہیں اب جگرؔ کی بقیہ غیر مطبوعہ نظمیں بھی ملاحظہ فرمائیے جنھیں راقم نے "گوشۂ جگرؔ" لائبریری جامعہ ملیہ دہلی سے انکی بیاضوں سے حاصل کی ہیں سہولت کے لئے جگرؔ کی ترتیب وار بیاضوں سے غیر مطبوعہ نظمیں پیش کی جا رہی ہیں انھیں نظموں میں "ایک ناظم مغرب زدہ کے نام"، "عید"، اور "مبارکباد" بھی شامل ہیں ملاحظہ ہوں

جگرؔ کی بیاض نمبر ۱ میں جس پر قیسی الفاروقی کے ۱۰ رجولائی ۱۹۵۹ء کے دستخط ہیں اور نوٹ میں یہ بھی لکھا ہے کہ گونڈہ میں ایک الماری میں ملی تھیں اور بیاض پر لکھا ہے "غزلیات "شعلہ طور"، "آتش گل" اور غیر مطبوعہ نظمیں"

اسی بیاض میں "مبارکباد صحتیابی" والی نظم بھی ہے جو درج ذیل ہے۔

بفضل خدا جشن صحت مبارک — مبارک یہ جشن مسرت مبارک
افق سے وہ پھوٹی کرن زندگی کی — یہ آثار صبح سعادت مبارک
یہ ہنسی یہ شملہ یہ رونق سلامت — یہ شوکت، یہ سطوت یہ عظمت مبارک
یہ حسن و جوانی، یہ علم و معانی — یہ تائید و فیضان رحمت مبارک

ع۱ "فروغِ اردو" فروری و مارچ ۱۹۶۱ء ص ۷۴-۷۵

سعیدالظفر خاں بہادر تمھیں بھی
رشیدالظفر خاں کی صحت مبارک

بہ ایں سادگی و بہ ایں پاک فطرت
یہ آرائش زیب و زینت مبارک

جو ہیں انکے شیدا تو وہ انکے عاشق
ہم بھائی بھائی کی الفت مبارک

الٰہی رہے تا ابد یہ بھرا گھر
بھرے گھر کو بھرپور عشرت مبارک

دعا ہے کہ ملکر کہیں سب یہ اک دن
تمھیں خدمت ملک و ملت مبارک

سبھی کچھ مبارک تمھیں اور مجھکو
خود اپنی یہ نذرِ عقیدت مبارک

یہ خلق و مروت یہ لطف و محبت
دل غیر پر بھی حکومت مبارک

جگر پر عنایت تری روز افزوں
اسے مفت خوری کی عادت مبارک

جگر کی بیاض نمبر ۲ (گوشہ جگر لائبریری جامعہ ملیہ دہلی) میں جگر نے ابتدائی صفحہ میں اپنی ادبی کاوشوں کو اپنی رفیقۂ حیات نسیم خاتون کے نام سے معنون کیا ہے اور نیچے اپنے دستخط (جگر مرادآبادی) کر کے ۱۱ جولائی سنہ ۴۸ء کی تاریخ لکھدی ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس بیاض میں سنہ ۴۸ء کے بعد کا کلام ہوگا اور یہ نظم 'ایک شاعر کا پیام۔ ایک مغرب زدہ ناظم کے نام'' (جو غیر مطبوعہ ہے) بھی سنہ ۴۸ء کے بعد ہی کہی گئی ہوگی نظم ملاحظہ فرمائیے

"ایک شاعر کا پیام"
"ایک مغرب زدہ ناظم کے نام"

قوم و وطن کے مدعی، کون و مکان پہ چھائے جا
فکر و عمل کی وسعتیں تنگ نہ کر بڑھائے جا

تو کہ ہے ننگ زندگی، درس ترا درندگی
زندگی و درندگی، یوں نہ بہم، ملائے جا

اے کہ رہے تیری ذہنیت، ساختۂ فرنگیاں
خوب فریب کھا چکا، اب نہ فریب کھائے جا

تیری تمام خلوتیں، شاہد و مطرب و شراب
بزم میں انقلاب کا شور مگر مچائے جا

تیرے فریب کے لئے کم نہیں لپت ذوقیاں
بھر کے ہر ایک تازہ روپ شعبدے تو دکھائے جا

تجھکو خدا سے کیا غرض چھوڑ کر؟ خدا کا تذکرہ
مارکس کا تو غلام ہے، مارکس کے گیت گائے جا

جہل ترا تری سرشت، علم ترا متاعِ غیر
حکمت و شعر کہہ کے تو سب کو یقیں دلائے جا

تیری نگاہ و فکر میں عصمتِ حسن کچھ نہیں
اپنی یہ بزدلی مگر مصلحتاً چھپائے جا

لوٹ کے دوسروں کا مال نوحۂ مفلسی سنا
کھا کے پلاؤ قورمہ بھوک کے گیت گائے جا

اہلِ دول کے سامنے دستِ ہوس ترا دراز
ہٹ کے وہاں سے گالیاں انکو مگر سنائے جا

جب تری مضحکات پر بزم کی بزم ہنس پڑے
داد سمجھ کے اپنا سر ناز سے تو ہلائے جا[۱]

(حاشیہ نمبر ۱ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

جگرؔ کی بیاض نمبر ۳ (گوشۂ جگر لائبریری، جامعۂ ملیہ دہلی) میں ایک نامکمل نظم ہے جو غالباً نواب سعید الملک مرحوم کے انتقال سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے یہ نظم دو صفحوں پر مشتمل ہے راقم نے دوسرے صفحے سے وہ اشعار لکھ لئے ہیں جو نئے سرے سے دوبارہ اس صفحے پر لکھے گئے ہیں اور پہلے صفحے کے دو مکمل اشعار بعد کو انھیں اشعار کے ساتھ شامل کر لیا ہے نظم دوسرے صفحہ پر اس طرح شروع ہوتی ہے:۔

یہ غم ہے ماورائے نوحہ خوانی
جوانی اور مرگِ ناگہانی

بہت کچھ حسرتِ ماتم ہے لیکن
حقیقت میں یہ غم ہے جاودانی

اٹھی ہے آہ دنیا سے وہ ہستی
جو تھی ہر بات میں آپ اپنی ثانی

سعید الملک نواب ابنِ نواب
بہارِ گلشن شاہِ جہانی[۱]

صفحہ اوّل

وہ جس کے دید سے ہوتا تھا حاصل
فراغِ دل فروغِ زندگانی

جگرؔ موت ایسے کامل قدرداں کی
حقیقت میں ہے مرگِ قدردانی

اسی بیاض میں "سہرا" بھی ہے جسے پہلے ہی نقل کیا جا چکا ہے اس کے بعد "عید" پر ایک نظم ہے ملاحظہ فرمائیے!

ہر قوم کی ہے عید ہر اک انس و جاں کی عید
لیکن نہیں تو مسلم حسرت نشاں کی عید

جھوٹی مسرتوں کا اگر نام عید ہے
بیشک ہے پھر تو ملتِ اسلامیاں کی عید

ہمسایہ کے گھر میں جو ہے فاقہ ہوا کرے[۲]
اپنی تو ہو ہی جاتی ہے نام و نشاں کی عید

خود غرضیوں کی آڑ میں ملت فروشیاں
کہتے ہیں اس کو مسلم ہندوستاں کی عید

احساس ننگ ہے وحدت قومی کا محو خواب
یہ حال ہو تو کیسی مسرت کہاں کی عید

اپنی بلا سے کوئی جئے یا کوئی مرے
اپنی تو ہو ہی جاتی ہے نام و نشاں کی عید

جگرؔ کی بیاض نمبر ۲ (گوشۂ جگر لائبریری جامعہ ملیہ دہلی) میں ایک رباعی اور ایک نظم

پچھلے صفحہ کا باقی حاشیہ نمبر ۱ راقم الحروف کے خیال میں یہ نظم جوشؔ یا مجازؔ لکھنوی کے نام لکھی گئی ہو گی بہت ممکن ہے کہ جوشؔ کے نام لکھی گئی ہو کیونکہ اس نظم میں جگرؔ نے لکھا ہے کہ "انقلاب کا شور مچائے جا" اور انقلابی نظمیں جوشؔ ہی نے کہی ہیں وہی "شاعر انقلاب" بھی کہلاتے ہیں اسی لئے گمان غالب ہے کہ یہ نظم جوشؔ ہی کے نام ہو گی کیونکہ وہی مغرب زدہ بھی ہیں

ع[۱] دوسرے صفحات کے بالکل نامکمل اشعار راقم الحروف نے حذف کر دیئے ہیں

ع[۲] یہ مصرع اس طرح ہونا چاہیے تھا
ہمسایہ کے جو گھر میں ہے فاقہ ہوا کرے

گاندھی جی پر ہے جگرؔ نے اس نظم کا کوئی عنوان قائم کرنے کے بجائے صرف "ناتمام" لکھدیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نظم ناتمام ہے اس نظم میں گاندھی جی ہی کی تمام خوبیاں بیان کی گئی ہیں اور آخری بند میں گاندھی جی کے پیغام کا بھی ذکر آگیا ہے اس لئے اس خیال کی مزید تصدیق ہوجاتی ہے کہ یہ نظم گاندھی جی ہی کے متعلق ہے رباعی اور نظم ملاحظہ فرمائیے:-

رباعی

مریض قوم کے درماں مہاتما گاندھی — دلوں کی شمع فروزاں مہاتما گاندھی
تمام درد و خلوص و محبت و ایثار — حقیقۃً تھے اک انساں مہاتما گاندھی

"ناتمام"

گاندھی جی وہ ذات مکرم — گاندھی جی وہ خُلق مجسم
گاندھی (جی؟) وہ محسن اعظم — سوگ ہے جن کا عالم عالم
آنکھیں انکے سوگ میں گریاں — سینے ان کے غم میں ویراں
ہندو ہو یا کوئی مسلماں — جسکو دیکھو حیراں حیراں
ذرہ ذرہ صحرا صحرا — قطرہ قطرہ دریا دریا
بستی بستی دنیا دنیا — ماتم ماتم، نوحا نوحا
انکا مذہب وحدانیت — انکا عقیدہ روحانیت
انکا مسلک انسانیت — انکی فضا روحانیت
انکے دل میں سبکی محبت — انکی نظر میں سب کی عزت
سب کی عزت سب کی عظمت — سب کی سیوا سبکی خدمت
انکا فیض عام مسلسل — انکا دور جام مسلسل
انکا ہر اقدام مسلسل — بات مکمل کام مسلسل
ان کی سیاست کی گہرائی — تھاہ کسی نے جسکی نہ پائی

راجندر اور آزاد ڈسائی — اک حد تک ان سب کی رسائی
آہ وہ انکی سادہ بیانی — شبنم شبنم پانی پانی
مدھم مدھم جسکی روانی — لیکن اک دریائے معانی
انسانوں کی مٹاکر ذاتیں — ایک بنادینے کی گھاتیں
کسکے دن اور کسکی راتیں — کون سنے یہ بہکی باتیں
جنگِ آزادی کے رہبر — پریم اہنسا انکا لشکر

ظاہر میں صرف ایک قلندر ۔۔۔ باطن میں دارا و سکندر
دامِ غلامی توڑ کے نکلے ۔۔۔ رزئے حوادث موڑ کے نکلے
نقشِ محبت جوڑ کے نکلے ۔۔۔ ٹوٹے دلوں کو جوڑ کے نکلے
عمر یونہی خدمت میں گزاری ۔۔۔ لاغر جسم اور گٹھری بھاری
بھارت ماتا خود یہ پکاری ۔۔۔ پریم کا داتا، پریم پجاری
کاش کہ ہم سب اتنا سمجھیں ۔۔۔ ہم پہ ہیں احساں کیا کیا سمجھیں
مل کر سوچیں تنہا سمجھیں ۔۔۔ فرضِ عقیدت اپنا سمجھیں
ڈوب کے بھرے ابھرنا سیکھیں ۔۔۔ تقلید انکی کرنا سیکھیں
مخلص بن کے گذرنا سیکھیں ۔۔۔ جینا سیکھیں مرنا سیکھیں
انسان ہے جو انسان کا دشمن ۔۔۔ عصمت اور ایمان کا دشمن
ننھی ننھی جان کا دشمن ۔۔۔ وہ ہے ہندوستان کا دشمن
ہندو مسلم مل کر گائیں ۔۔۔ گاندھی کا پیغام سنائیں
پھول محبت کے برسائیں ۔۔۔ جنت اس دنیا کو بنائیں

جگر اپنی ان نظموں میں زیادہ کامیاب نظر نہیں آتے انمیں نہ تو انکی کوئی فنکارانہ عظمت ہے اور نہ کوئی خاص اسلوب اور نہ انداز بیان ہی۔ انکے پڑھنے میں کوئی دلکشی و دلچسپی بھی نہیں ہے بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ نظمیں کسی نو مشق شاعر نے کہی ہیں غرضیکہ مجموعی طور پر ان نظموں میں شمار نہیں کیا جا سکتا ہے بس ایک بات انھوں نے کہنے کے لئے کہہ دی نہ طبیعت پر زور دیکر انپر غور و فکر کیا اور نہ اپنے شاعرانہ کمال کو بروئے کار لائے ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ جگر جیسا فطری شاعر ایسی معمولی نظمیں کہتا البتہ "ایک شاعر کا پیام، ایک مغرب زدہ ناظم کے نام،" میں وہ اپنے تاثرات کا اظہار کرنے میں ایک حد تک کامیاب نظر آتے ہیں لیکن یہ تمام نظمیں انکے ہیچ و پوچ ہیں اور چونکہ انمیں بعض فرمائشی نظمیں بھی ہیں جنھیں جگر نے اپنے ضمیر کے خلاف طبیعت پر جبر کر کے کہی ہونگی انکی طبیعت از خود اس طرف راغب نہ رہی ہوگی صرف اخلاقاً اور تاثراً انھوں نے فرمائش کرنے والے حضرات کا دل رکھنے کے لئے ایسی نظمیں کہی ہوں گی جو ان کی فطرت کے خلاف تھا بہت ممکن ہے کہ نظمیں اسی وجہ سے غیر دلچسپ اور ناکام ہوں اور اسی وجہ سے جگر نے انکو اپنے کسی مجموعے میں شامل نہ کیا ہو۔

ایک نظم جگر نے سنہ ۱۹۴۹ء میں گونڈہ میں کہی تھی جسکا عنوان ہے "یوم آزادی" (غیر مطبوعہ) جو راقم کو دورانِ سفر میرٹھ ۱۴ مئی سنہ ۱۹۶۱ء کو تسکین قریشی میرٹھی سے دستیاب ہوئی جسے نیاز گونڈوی

(جگرؔ کی اہلیہ کے بھتیجے) نے بھیجی تھی اسی کے ساتھ یہ نوٹ بھی لکھا تھا کہ :۔

"یہ نظم خود بھوپالنے کسی مصلحت کے تحت آتشِ گل سے خارج کر دی تھی یہ مجھے دولھا بھائی (محمد محسن صدیقی گونڈوی) نے بتایا ہے اور انھوں نے نظم بھی لکھائی ہے"

یہ نظم درج ذیل ہے :۔

"یوم آزادی"

زبانِ اہلِ ہوس پر کلامِ آزادی — ہے اک فریبِ مسلسل بنامِ آزادی
وہی سلاسل و زنداں وہی ہیں طوق و رسن — اسی کو کہتے ہیں کیا احترامِ آزادی
قدم قدم پہ نمائش ہے کچھ حقیقت کچھ — اسی کا نام مگر ہے اگر؟) ہے نظامِ آزادی
اقلیت کے لئے بند ہے در مقصود — یہ دو برس کا ہے حاصل بنامِ آزادی
خود اپنے نشّہ میں جھومنے والے — ابھی ہے دور بہت صبح و شامِ آزادی
وہی سیاستِ باطل وہی نظامِ کہن — بس اور کیا ہے یہ نقشِ دوامِ آزادی

جگرؔ نے اپنی اس نظم میں ہندستان کی نظامِ آزادی پر بھرپور تنقید کی ہے لیکن غالباً انھوں نے سیاسی مصلحت کے خلاف سمجھ کر اس نظم کو اپنے مجموعہ آتشِ گل میں شامل نہیں کیا۔

اب جگرؔ کی مطبوعہ نظمیں بالترتیب ملاحظہ ہوں جگرؔ کے مجموعہ "داغِ جگر" میں کوئی نظم نہیں ملتی ایک نظم "ہلال عید"، کو البتہ اس مجموعہ سے بجا طور پر نسبت دی جاسکتی ہے کیونکہ اس نظم کے لئے جو شعلۂ طور کی نظموں میں (لاہور ایڈیشن سنہ ۶ء میں) درمیانی حصہ میں صـ۳۱۲ پر شائع ہوئی ہے جگرؔ نے نظم کا عنوان "ہلالِ عید۔ ناتمام۔ نقشِ دورِ ابتدائی"، لکھدیا ہے اور اس نظم کے سلسلے میں انھوں نے خود فرمایا ہے کہ

"میری آگرہ کی شادی کی طویل داستان ہے ———— انکا نام وحیدن تھا وہ بہت خوبیوں کی آدمی تھیں، نظم "ہلالِ عید" آغازِ محبت کے زمانے میں لکھی تھی وہ فراق کا نتیجہ تھی"، ع۱

اس نظم کی تفصیل پچھلے صفحات میں بیان کی جاچکی ہے جگرؔ کے دوسرے مجموعۂ "شعلۂ طور" میں کل ۱۴ اور نظمیں ہیں جنمیں پہلی نظم "شکست توبہ" ہے اس میں انھوں نے اپنی بادہ نوشی کو بڑے فخریہ انداز میں بیان کیا ہے اس نظم کے چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ساقی کی ہر نگاہ پہ بل کھا کے پی گیا — لہروں سے کھیلتا ہوا لہرا کے پی گیا

ع۱ "قومی آواز" ۱۹ ستمبر سنہ ۶ء صـ۲

اے رحمتِ تمام مری ہر خطا معاف
میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا

اُس جانِ میکدہ کی قسم بارہا جگرؔ
کل عالم بسیط پہ میں چھا کے پی گیا

اس مجموعہ میں جگرؔ کی دوسری نظم "غمِ انتظار" ہے جسمیں انھوں نے اپنے ماضی کے تصورات کی تصویر کشی کی ہے اور وہ اپنے محبوب کے سراپا اور اسکی ایک ایک ادا کو یاد کر کے مسرور ہوئے ہیں اس نظم کے بھی چند اشعار ملاحظہ فرمائیے :-

یہ چشمِ مست، یہ ابرو، یہ زلف یہ خد و خال
یہ لب، یہ رخ، یہ جبیں، یہ عذار کیا کہنا

تمام شوق و شکایت، تمام مہر و وفا
فسانۂ دلِ بے اختیار کیا کہنا

شراب ریز نشیلی نگہ، ارے توبہ
پیالہ گیر کفِ رعشہ دار کیا کہنا

حریمِ حسن کے پردے اُٹھے ہوئے ہیں جگرؔ!
یہی اگر ہے غمِ انتظار کیا کہنا

تیسری نظم "تصویرِ تصور" ہے جس کے متعلق جگرؔ نے لکھا ہے کہ "یہ نظم حضرت مرشدی و مولائی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد لکھی گئی" ع۱

جگرؔ کو حضرت شاہ عبدالغنی منگلوری سے انتہائی خلوص و عقیدت تھی اور اس نظم میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ انھیں کی یاد سے متاثر ہیں اس نظم کے اس شعر میں وہ خود ہی کہتے ہیں ؎

ذرا جو دم بھر کو آنکھ جھپکی یہ دیکھتا ہوں نئی تجلی
طلسمِ صورت مٹا رہے ہیں، جمالِ معنی بنا رہے ہیں

اور آخری شعر میں کہتے ہیں ؎

خوشی سے لبریز شش جہت ہے، زبان پر شورِ تہنیت ہے
یہ وقت وہ ہے جگرؔ کے دل کو وہ اپنے دل سے ملا رہے ہیں

اِس نظم کی ابتدا اسطرح ہوئی ہے ؎ ع۲

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آ رہے ہیں، وہ جا رہے ہیں

اس نظم کے دو شعر اور ملاحظہ فرمائیے ؎

خرامِ رنگیں، نظامِ رنگیں، کلام رنگیں، پیام رنگیں
قدم قدم پر، روش روش پر نئے نئے گل کھلا رہے ہیں

یہ موج و دریا، یہ ریگ و صحرا، یہ غنچہ و گل یہ ماہ و انجم
ذرا جو وہ مسکرا دیئے ہیں یہ سب کے سب مسکرا رہے ہیں

چوتھی نظم "نرگسِ مستانہ" ہے جس کے متعلق جگرؔ نے شعلۂ طور مطبوعہ غالباً ۳۴ء (نامی پریس لکھنؤ) "نظمیاتِ اردو" میں صـ پر اس نظم کا عنوان "نرگسِ مستانہ" کہکر نیچے لکھا ہے "بخطاب بہ حضرت اصغر مدّ فیوضہ" ظاہر ہے اس نظم میں انھوں نے حضرتِ اصغرؔ گونڈوی ہی سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے ؎

ع۱ شعلۂ طور مطبوعہ غالباً ۳۴ء (نامی پریس لکھنؤ) نظمیاتِ اردو۔ صـ

ع۲ پچھلے صفحات میں اس شعر کو فرقت کاکوروی نے جگرؔ کے ایک معاشقہ کے سلسلہ کا شعر بتایا ہے جو یقیناً غلط ہے

اپنا ہو سا اے نرگسِ مستانہ بنادے میں جب تجھے جانوں مجھے دیوانہ بنادے

پانچویں نظم "یادِ ایام"، ہے جسکے متعلق محمود علیخاں جامعی نے صحیح لکھا ہے کہ یہ نظم مین پوری کی ایک طوائف سے عشق کا نتیجہ ہے جسکو وہ (جگرؔ) "سرکار"، کے نام سے یاد کرتے تھے اور اس کے بالاخانے کو "طور" کہا کرتے تھے انکی اس نظم میں مندرجہ ذیل اشعار میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

دست در دستِ نگار شوخ سیر کوہسار ع۱ بود حاصل ہر تمنائے کہ پنہاں داشتم

اس نظم کے چند اشعار اور ملاحظہ فرمائیے ؎

یاد ہیں ابتک جگرؔ! وہ بیقراری کے مزے درد پیہم کی لگاوٹ زخم کاری کے مزے
حسن کی سرشاریاں، خوابِ جوانی کی بہار عشق کی بیتابیاں شب زندہ داری کے مزے
آنکھوں آنکھوں میں تقاضا کچھ نگاہِ ناز کا دل ہی دل میں اُٹ وہ ذوقِ جاں نثاری کے مزے
تیری ہر موجِ تبسم، تیری ہر موجِ نظر ایک برق طور تھی، بالائے بام آرزو
چشم و دل پر وہ عنایت کا وہ کرم وہ مرحمت اللہ اللہ تو کرے یوں احترام آرزو
میں نہیں بھولا تجھے، تجھکو بھی شاید یاد ہو مجھ پہ وہ چھایا ہوا کیفِ تمام آرزو

چھٹی نظم "مجذوب کی صدا"، ہے جسمیں ان کا صوفیانہ رنگ واضح طور پر سامنے آگیا ہے اس نظم میں انھوں نے اصل و حقیقت، خدا اور مظہرِ خدا، راہ حقیقت اور تعینات کی دنیا وغیرہ کا تذکرہ صوفیانہ انداز میں کیا ہے مندرجہ ذیل اشعار میں انکا یہ رنگ ملاحظہ فرمائیے:۔

اسی تلاش و تجسس میں کھو گیا ہوں میں اگر نہیں ہوں، تو کیونکر؟ جو ہوں تو کیا ہوں میں؟
تمام اصل و حقیقت کا آئینہ ہوں میں خدا نہیں ہوں، مگر مظہرِ خدا ہوں میں؟
فنا دگی مرا شیوہ، شکستگی مری شان خود اپنی راہِ حقیقت کا نقشِ پا ہوں میں
مٹائے لاکھ زمانہ، مٹا نہیں سکتا اگر یہ سچ ہے کہ تیری ہی اک ادا ہوں میں
تصورات کی آئینہ بندیاں بے سود تعینات کی دنیا سے ماورا ہوں میں
جگرؔ! یہ ہرزہ سرائی مری، یہ بے ربطی یقیں ہوا کسی "مجذوب کی صدا" ہوں میں

ساتویں نظم "نغمہ اسلام"، ہے جسکے عنوان ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نغمہ کا تعلق "اسلام" سے ہے اسمیں انھوں نے رسولِ عربی کی تعریف و توصیف اور مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کی ہے اس نظم کے بھی کچھ بند ملاحظہ ہوں:۔

جانتا ہوں کہ ہوں در اصل میں ننگِ اسلام کچھ نہ اندیشۂ آغاز نہ خوفِ انجام

ع۱ "مشغلۂ طور"، کے قدیم ایڈیشن میں "کوہسار"، کے بجائے کوہ طور ہی چھپا ہے بعد کو جگرؔ صاحب نے مصلحتاً "کوہسار" کر دیا۔

میری آشفتہ مزاجی میں نہیں کوئی کلام — وہی میخانہ وہی ساقی وہی بادہ وہی جام
مجھ کو اپنی روشِ خاص سے انکار نہیں
میرے مشرب میں ریاکاری و پندار نہیں

وہ رسولِ عربی، فخرِ رسولانِ سلف — ذاتِ اقدس سے ملا جسکے زمانے کو شرف
جس پہ نازل ہوا قرآن سا کامل مصحف — جسکے تابع جن و انساں بھی ملائک کی بھی صف
اک وہی شمعِ نبوّت جو ضیا بار ہوئی
ساری تاریک فضا مطلع الانوار ہوئی

غم نہ کر مسلمِ حیرت زدہ و مہر بلب — آشنا رنگِ فنا سے نہیں تیرا مذہب
یہ حوادث ہیں تیرے تیری ترقی کے سبب — تیرے حامی ہیں نبیؐ تیرا نگہبان ہے رب
فتنے اکثر بہت اس طرح کے اٹھوائے گئے
ایسے دجّال زمانے میں بہت آئے گئے

آٹھویں نظم "ہلالِ عید" ہے جسکے متعلق پچھلے صفحات میں لکھا جا چکا ہے۔

نویں نظم "بر خویش نگاہے کن" ہے جسمیں جیسا کہ عنوان ہی سے ظاہر ہوتا ہے اخلاقیات کا درس دیا گیا ہوگا کہتے ہیں ؂

قعرِ پستی سے ابھر راز اپنی خود آواز بن — نغمہ بننا ہے اگر تو نغمۂ بے ساز بن
تو چھپاتا کیوں ہے؟ اپنے حسنِ عریاں کا راز — بوئے گل کی طرح پھیلا دے پریشانی کا راز
زندگی کا راز پنہاں انتشارِ غم میں ہے — اک پیامِ مستقل ہر نغمۂ برہم میں ہے

دسویں نظم مخمس "بر غزل اردو" ہے جسمیں مین پوری والی شیراز نامہ بیگم سے عشق کا واقعہ بیان کیا گیا ہے دو بند اس نظم کے بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

محبّت ہی ناظم، محبت ہی ناشر — محبت دکھاتی ہے کیا کیا مناظر
محبت ہی باطن، محبت ہی ظاہر — محبت ہی اوّل، محبت ہی آخر
محبت ہی میں ہوں محبت ہی تو ہے

وہ کہتے ہیں، سب دل کے انداز کہئے — محبت کا انجام و آغاز کہئے
ہر اک راز بے پردۂ راز کہئے — کہاں تک غمِ عشقِ شیراز کہئے
کہ ہر آرزو محشرِ آرزو ہے

گیارھویں نظم مخمس بر غزل فارسی ملا ہے جسکا ایک بند ہے:۔

تیرے ہاتھ سے ہوں شہادت کا خواہاں — نہ رکھ میری گردن پہ غیروں کا احساں

به تیغ اشارت فراز گر دال — بہ جاں تیرے صدقے یہ دل تیرے قرباں

بگرد سرائے تو سر می فروشم

بارھویں نظم "مثنوی عرفانِ خودی المعروف بہ سرودِ حقیقت" ہے جس کے اشعار ہیں ؎

تاقوس کہیں کہیں اذاں ہوں — نغمہ ہوں کہیں کہیں فغاں ہوں

ہر قلب میں ہے مقام میرا — فیضان ہے سب پہ عام میرا

لیکن بخدا خدا نہیں ہوں — اس کفر میں مبتلا نہیں ہوں

تیرھویں نظم "واسوخت در غزل" ہے جسمیں مومنؔ کے انداز پر واسوخت کہا ہے ؎

وہ دن بھی قریب ہیں کہ ظالم! — تو روئے گا مسکرائینگے ہم

روپوش تیری نظر سے ہو کر — پہروں تجھے یاد آئیں گے ہم

باطن میں ہو جو بھی دل کی حالت — ظاہر میں بہت ستائیں گے ہم

چودھویں نظم "میرے لئے" کے عنوان سے ہے جو راقم کے خیال میں شیرازن بیگم سے متعلق ہے جلیل قدوائی نے بھی "العلم" جولائی تا ستمبر ۱۹۶۳ء میں ص ۲۳ پر اسی خیال کا اظہار کیا ہے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے!

اُف وہ روئے تابناک و چشم تر میرے لئے — ہائے وہ زلف پریشاں تا کمر میرے لئے

حیف وہ لغزیدہ لغزیدہ قدم میری طرف — ہائے وہ دزدیدہ دزدیدہ نظر میرے لئے

اٹھ وہ کہنا اسکا پھر با ہوں میں باہیں ڈالکر — میں جگرؔ کے واسطے ہوں اور جگرؔ میرے لئے

شعلۂ طور میں دو فارسی نظمیں نذرِ عقیدت کے طور پر الحاج قاضی سید عبدالغنی شاہ صاحب کے حضور میں پیش کی گئی ہیں اور ایک نظم "خطاب بہ مسلم" ہے جسمیں مقتل کانپور کا تذکرہ ہے اور اسکے متعلق جگرؔ نے بیان کیا ہے کہ

"واقعہ کانپور کے متعلق جو نظم ہے وہ بے شک بالکل بے اختیارانہ طور پر لکھی گئی ہے" ع ۱

اس واقعہ کے متعلق ندرت کانپوری نے راقم سے ۷ ۲ مئی ۱۹۶۳ء کی ایک ملاقات میں بتایا کہ ۲۴ مارچ ۱۹۳۱ء کو کانپور میں فساد ہوا جسمیں بہت سی جانیں ضائع ہوئیں

جگرؔ اس حادثہ سے شدید طور پر متاثر ہوئے اور انھوں نے اس نظم میں جسمیں کانپور کے اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے مندرجہ ذیل الفاظ میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے

چشم کشاد جانبِ رزم گہہ وطن نگر — مقتل کانپور بیں، لاشۂ بے کفن نگر

ع ۱ "شعلۂ طور" مطبوعہ غالباً ۱۹۳۲ء ص ۱۸۸

خونِ حیات سو بہ سو، خاکِ سرشتہ مو بہ مو   حلقۂ بریدہ کو بکو، بچہ و مرد و زن نگر

جگرؔ کے تیسرے مجموعۂ آتشِ گل میں کل ۱۱۶ اردو نظمیں ہیں۔

اس مجموعہ میں پہلی نظم "تجدید ملاقات" ہے جو جگرؔ کے عقدِ ثانی کا نتیجہ ہے۔ اصغرؔ گونڈوی کے انتقال کے بعد جب جگرؔ کا نکاح نسیم خاتون سے ہو گیا تو انھوں نے اس واقعہ سے متاثر ہو کر ۱۹۴۲ء میں علی گڑھ میں یہ نظم کہی جس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے اور جگرؔ کی نغمگی و مصوری کی داد دیجئے

مدت میں وہ پھر تازہ ملاقات کا عالم   خاموش اداؤں میں وہ جذبات کا عالم
اللہ رے وہ شدتِ جذبات کا عالم   کچھ کہہ کے وہ بھولی ہوئی ہر بات کا عالم
عارض سے ڈھلکتے ہوئے شبنم کے وہ قطرے   آنکھوں سے جھلکتا ہوا برسات کا عالم
ایک ایک نظر شعر و شباب و مے و نغمہ   ایک ایک ادا حسنِ محاکات کا عالم
وہ نظروں ہی نظروں میں سوالات کی دنیا   وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں جوابات کا عالم
تھک جانے کے انداز میں وہ دعوتِ جرأت   کھو جانے کی صورت میں وہ جذبات کا عالم
دو بچھڑے دلوں کی وہ بہم صلح و صفائی   پُرکیف وہ تجدیدِ ملاقات کا عالم
وہ عرش سے تا فرش برستے ہوئے انوار   وہ تہنیتِ ارض و سماوات کا عالم
عالم مری نظروں میں جگرؔ اور ہی کچھ ہے   عالم ہے اگرچہ وہی دن رات کا عالم

دوسری نظم "یاد" ہے جس میں انھوں نے اپنے بچھڑے ہوئے محبوب کی یاد سے سرشار ہو کر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے (راقم کے خیال میں یہ نظم نسیم خاتون کی یاد میں کہی گئی ہے) کچھ شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

آئی جب ان کی یاد تو آتی چلی گئی   ہر نقشِ ماسوا کو مٹاتی چلی گئی
ویرانۂ حیات کے ایک ایک گوشہ میں   جوگن کوئی ستار بجاتی چلی گئی
میں تشنہ کامِ شوق بنا بنا چلا گیا   وہ مست انکھڑیوں سے پلاتی چلی گئی
پھر میں ہوں اور عشق کی بیتابیاں جگرؔ   اچھا ہوا وہ نیند کی ماتی چلی گئی

تیسری نظم "سراپا" ہے جس میں انھوں نے اپنے محبوب (راقم کے خیال میں نسیم خاتون) کے حسن کی تعریف کی ہے فرماتے ہیں:-

وہ حسنِ کافر، اللہ اکبر!   تخریبِ دوراں آشوبِ محشر
وہ مست نظریں جب اٹھ گئی ہیں   ٹکرا گئے ہیں ساغر سے ساغر
وہ حسنِ رقصاں وہ جسمِ لرزاں   وہ عشقِ حیراں وہ شوقِ مضطر
نغمہ ہی نغمہ، خوشبو ہی خوشبو   صہبا ہی صہبا، ساغر ہی ساغر

اس نظم کے بعد جگرؔ کی نظموں میں ایک نیا موڑ پیدا ہو گیا ہے اور وہ ایک باشعور فنکار

کی حیثیت سے داخلی کیفیات کے ساتھ ساتھ خارجی عوامل و محرکات سے متاثر ہوتے نظر آتے ہیں اور اپنے اس دور کی گوناگوں تبدیلیوں سے متاثر ہو کر ایک درد مند انسان بن جاتے ہیں اس دور کی نظموں میں ایک درد مند شاعر کے تاثرات ہیں

جگرؔ کی چوتھی نظم "قحط بنگال" ہے ۱۹۴۳ء میں بنگال میں قحط پڑا جس کے متعلق پنڈت نہرو نے لکھا ہے کہ :۔

"بنگال کے زرخیز صوبے میں روزانہ ہزاروں مرد، عورتیں بچے فاقوں سے مر رہے تھے وہ کلکتے کے اونچے محلوں کے سامنے دم توڑ رہے تھے ان کی لاشوں سے بنگال کے بے شمار گاؤں کے کچے جھونپڑے اور دیہات کی سڑکیں اور کھیت پٹے پڑے تھے" ع۱

بھلا ایسے دل سوز واقعات سے جگر جیسا حساس درد مند انسان کیسے نہ متاثر ہوتا ان حالات کو دیکھ کر ان کا بھی درد مند دل بھر آیا اور وہ اپنے شاعرانہ انداز میں پکار اٹھے :

بنگال کی میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں — ہر چند کہ ہوں دور مگر دیکھ رہا ہوں
بچوں کا تڑپنا، وہ بلکنا، وہ سسکنا — ماں باپ کی مایوس نظر دیکھ رہا ہوں
انسان کے ہوتے ہوئے انسان کا یہ حشر — دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں
صیاد نے لوٹا تھا عنادل کا نشیمن — صیاد کا لٹتے ہوئے گھر دیکھ رہا ہوں
رحمت کا چمکنے کو ہے پھر نیّر تاباں — ہونے کو ہے اس شب کی سحر دیکھ رہا ہوں

اس مجموعے کی پانچویں نظم "دبھرتے ہیں آستینوں میں خنجر لئے ہوئے" ہے جس کے متعلق جگر نے لکھا ہے "دوران قیام بمبئی ۱۹۴۱ء" ع۲

جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم دوران قیام بمبئی ۱۹۴۱ء میں کہی گئی ہوگی لیکن "آتش گل" مطبوعہ ۱۹۵۸ء میں انھوں نے اس نظم کے نیچے لکھا ہے دوران قیام بمبئی ۱۹۴۶ء جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نظم ۱۹۴۶ء میں کہی گئی راقم کے خیال میں یہ نظم ۱۹۴۶ء ہی کے ہیجانی دور میں کہی ہوگی

اس زمانے میں ہندوستان کی سیاسی لیڈروں کے قول و فعل میں تضاد پیدا ہونے لگا تھا جگر انکی سیاسی چالوں کو بھانپ گئے اور کہنے لگے ؎

ہندوستاں میں خیر سے انکی کمی نہیں — لب پر ہیں جو خلوص کا دفتر لئے ہوئے
ظاہر میں اک مجسمۂ امن و آشتی — باطن میں لاکھ فتنۂ محشر لئے ہوئے

ع۱ "تلاش ہند" (حصہ اول) مطبوعہ ۱۹۴۶ء ص ۱۹ ع۲ مسودہ "آتش گل" نمبر ۱۶ (گوشہ جگر۔ لائبریری جامعہ ملیہ — دہلی)

بکتے ہیں بھائی بھائی ہیں اہلِ وطن تمام
پھرتے ہیں آستینوں میں خنجر لئے ہوئے

انسان جس میں بستے ہوں اس طرح کے جگرؔ
بھاگ ایسی سرزمین سے بستر لئے ہوئے

چھٹی نظم "آجکل" ہے جس کے متعلق جگرؔ نے "۱۹۴۷ء"[1] لکھا ہے

۱۹۴۷ء میں ہندوستان میں جو درندگی پھیلی اور یہاں کا نظام فرقہ وارانہ فسادات سے جو درہم برہم ہوا تو جگرؔ بھی ان دلسوز و دلدوز حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اس زمانے میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ نظر آنے لگا تھا اور ہندوستان کے عوام و خواص اپنے اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر ایک نامعلوم منزل کی طرف چل پڑے تھے ان ترکِ وطن کرنے والوں میں وہ حضرات بھی شامل تھے جنھوں نے ہمیشہ کانگریس کے نام پر اپنا تن من دھن سب کچھ نچھاور کیا لیکن ۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فسادات اور یہاں کے انتشار و پراگندگی سے خوفزدہ ہو کر وہ بھی وطن چھوڑ کر چل دیئے ان حالات کو دیکھ کر جگرؔ جیسے غزلگو شاعر کی فکرِ جمیل پریشان ہو گئی اور وہ کہہ اٹھے ؎

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آجکل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزلخواں ہے آجکل

انکے خیال میں ان دلدوز و جانسوز حالات میں کوئی دردمند شاعر غزل کہہ ہی نہیں سکتا اس نظم میں انھوں نے اپنے دور کے حالات سازش، دغا، فریب، انسان کی درندگی جگہ جگہ پر فرقہ وارانہ فسادات اور اردو زبان کے ساتھ زیادتی وغیرہ وغیرہ کا ذکر بڑے موثر انداز میں کیا ہے اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:-

انسانیت کہ جس سے عبارت ہے زندگی
انسان کے سائے سے بھی گریزاں ہے آجکل

کیسا خلوص، کسکی محبت کہاں کا درد
خود زندگی متاعِ گریزاں ہے آجکل

سازش دغا، فریب، سخن پروری، دروغ
ہر درد کا یہ نسخۂ آساں ہے آجکل

شائستگی کے بھیس میں روحِ درندگی
انسان کے لباس میں شیطاں ہے آجکل

دہلی وہ شہرہ وطن، نواکھالی و بہار
انساں ہے اور ماتمِ انساں ہے آجکل

ہے زخمِ کائنات جو ہندو ہے ان دنوں
ہے داغِ زندگی جو مسلماں ہے آجکل

تعدادِ ایک فرقے کی جتنی بھی گھٹ سکے
کارِ ثواب و کارِ نمایاں ہے آجکل

ہونے کو یوں تو اردو زبانی ہیں عنایتیں
اردو زبان پہ خاص کرا احساں ہے آجکل

اس سے تو خودکشی ہی غنیمت ہے اے جگرؔ
وہ مصلحت کہ جو پئے مرداں ہے آجکل

ساتویں نظم "گاندھی جی کی یاد میں" ہے گاندھی جی ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو شہید کر دیئے گئے انکی شہادت سے متاثر ہو کر جگرؔ نے اس نظم میں انکے جملہ اوصاف بیان کئے ہیں۔ آٹھویں نظم "آواز" ہے جسکے متعلق جگرؔ نے لکھا ہے:-

---

[1] مسودہ "آتشِ گل" نمبر ۱۶ (گوشۂ جگرؔ لائبریری جامعہ ملیہ دہلی)

"یہ نظم ایڈیٹر اخبار "الجمیعۃ" دہلی کی تحریک پر کہی گئی لیکن طبیعت آمادہ پہلے سے تھی غالباً ۱۰؍ کو شروع ہوئی اور ۱۴؍ اگست ۴۸ء کو اختتام ہوا" ع۱

یہ نظم آزادی کے ایک سال بعد کہی گئی تھی اسمیں ہندوستان کے سیاستدانوں پر تنقید کی گئی ہے اور اُن کو جگرؔ نے اپنا پُرخلوص مشورہ دیا ہے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے اور دیکھیے کہ جگرؔ نے کیسی کیسی دکھتی رگیں پکڑی ہیں ؎

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن کی روٹھی بہار اب بھی

اگرچہ آزادیٔ وطن کو گذر چکا ایک سال کامل
مگر خود اہلِ وطن کے ہاتھوں فضا ہے ناسازگار اب بھی

کوئی یہ چپکے سے ان سے پوچھے کہاں گئے آپ کے وہ وعدے
نچوڑتا ہے لہو غریبوں کا، دستِ سرمایہ دار اب بھی

نہ وہ مروت، نہ وہ صداقت، نہ وہ محبت نہ وہ شرافت
رہینِ خوف و خطر ہیں یعنی، سکون و امن و قرار اب بھی

یہ رشوتوں کی، یہ سازشوں کی، یہ نفع اندوزیوں کی لعنت
وہ خود ہی انصاف سے یہ کہدیں نہیں وہ کچھ ذمہ دار اب بھی

کبھی کبھی غور کرتے رہیے، جگرؔ کا مصرع یہ پڑھتے رہیے
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن کی روٹھی بہار اب بھی

جگرؔ کی ہے زندگی محبت نہیں ہے اسکو کسی سے نفرت
جگرؔ کے دل میں ہے سب کی عزت جگرؔ ہے یاروں کا یار اب بھی

اس مجموعے کی نویں نظم "گذر جا" ہے جس کے متعلق جگرؔ نے لکھا ہے:۔

"یہ نظم جولائی کے آخری ہفتہ میں شروع ہوئی اور ۸؍ یا ۹؍ اگست تک خاتمہ پر پہنچی (دستخط جگرؔ مرادآبادی ۱۴ اگست ۴۸ء)" ع۲

اس نظم میں انھوں نے بازیچۂ اربابِ سیاست کو کارگہِ مکر و ضلالت بتایا ہے اور ایک طرح کا اخلاقی درس دیا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بازیچۂ اربابِ سیاست سے گذر جا
اس کارگہِ مکر و ضلالت سے گذر جا

جرأت ہے، تو ہر بزمِ صداقت سے گذر جا
ہمت ہے، تو محدود محبت سے گذر جا

کرنا ہے اگر کارِ نمایاں کوئی تجھکو
اُٹھ اور ہر آسانیِ لذت سے گذر جا

انسانیتِ عام کے مرکز کی بنا ڈال
ہر ناقص و محدود جماعت سے گذر جا

بیباک گذر رزمگہِ دہر سے لیکن
مقصد یہ نہیں فہم و فراست سے گذر جا

انسان بن انسان یہی ہے تری معراج
رنگ و وطن و قوم کی لعنت سے گذر جا

دسویں نظم "نوائے وقت" ہے جس کے عنوان ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں انھوں نے وقت

ع۱ جگرؔ کی بیاض نمبر۲ گوشۂ جگرؔ۔ لائبریری جامعۂ ملیہ۔ دہلی)
ع۲ جگرؔ کی بیاض نمبر۲ (گوشۂ جگرؔ۔ لائبریری۔ جامعۂ ملیہ دہلی)

کی پکار کا تذکرہ کیا ہوگا ؎

زمیں کو روندتے ہوئے صفوں کو چیرتے ہوئے
بڑھے چلو بڑھے چلو یہ وقت کی پکار ہے

گیارھویں نظم "زمانے کا آقا غلام زمانہ" میں بشر کی پستی پر لعن طعن کیا ہے اور کہا ہے ؎

شرافت کا معیار، افراطِ دولت
صداقت کی معراج لفظی ترانہ
بشر کی یہ پستی، ارے توبہ توبہ
زمانے کا آقا، غلامِ زمانہ

بارھویں نظم "دل حسیں ہے تو محبت بھی حسیں پیدا کر" ہے اس میں بھی درسِ اخلاقیات ہے کہتے ہیں ؎

پہلے تو حسنِ عمل حسنِ یقیں پیدا کر
پھر اسی خاک سے فردوسِ بریں پیدا کر
غم میسر ہے تو اسکو غمِ کونین بنا
دل حسیں ہے تو محبت بھی حسیں پیدا کر
عشق ہی زندہ و پائندہ حقیقت ہے جگر
عشق کو عام بنا، ذوقِ یقیں پیدا کر

تیرھویں نظم "اعلانِ جمہوریت" ہے جسپر تاریخ ۲۶ جنوری ۵۰ء لکھی ہوئی ہے اسمیں انھوں نے ہندوستان کے دستور کو سازگار آنے کی دعا کی ہے اور حال کے سیاسی لیڈروں کو خلوص و محبت کی دعوت دی ہے اور انکو تلقین بھی کی ہے اس نظم کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

خدا کرے کہ یہ دستور سازگار آئے
جو بیقرار ہیں ابتک انھیں قرار آئے
یہ میکدے کی سیاق گری کی ہے توہین
کوئی ہو جام بکف کوئی شرمسار آئے
دلوں کی کھوٹ ہو جسکے خمیر میں شامل
نہ آئی ہے وہ سیاست نہ سازگار آئے
نہ ہو جو عام مسرت محال ہے اے دوست
کہ زندگی کو کسی حال میں قرار آئے

چودھویں نظم "ساقی سے خطاب" ہے اس نظم کے متعلق جگر نے عنوان کے نیچے خود ہی لکھدیا ہے کہ

"اس نظم میں "معیارِ جنوں"، "تنظیمِ میخانہ"، "انسان" اور "انسانیت"، "وطن" اور "وطنیت" وغیرہ وغیرہ کے متعلق بھی رندانہ شاعر کے نظریات کی وضاحت ہوجاتی ہے"

جس سے صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے اس نظم میں اپنے مندرجہ بالا نظریات کی وضاحت کی ہے اس کے بھی چند اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

یہ سنتا ہوں کہ پیاسی ہے بہت خاکِ وطن ساقی
خدا حافظ چلا میں باندھکر سر سے کفن ساقی
ابھی ناقص ہے معیارِ جنوں، تنظیمِ میخانہ
ابھی نامعتبر ہے تیرے مستوں کا چلن ساقی
وہی انساں جسے سرتاجِ مخلوقات ہونا تھا
وہی اب سی رہا ہے اپنی عظمت کا کفن ساقی
عجب کیا ہے یہ بہکی بہکی باتیں رنگ لے آئیں
بہت باہوش رہتا ہے مرا دیوانہ پن ساقی
نمودِ صبحِ کاذب ہی دلیلِ صبحِ صادق ہے
افق سے زندگی کی دیکھ وہ ابھری کرن ساقی

پندرھویں نظم "نذرِ غالب" ہے جسمیں غالب کو نذرِ عقیدت پیش کی گئی ہے اور انکے کلام کی جملہ خوبیوں کو سراہا گیا ہے اس مجموعے کی سولھویں اور آخری اردو نظم "گیت" ہے جو ۱۹۵۰ء کی نظم ہوگی ع۱ جسمیں ایک آزاد ملک نے وطن کے ایک نووارد مسافر سے شاعر کا خطاب" ہے اس نظم میں انھوں نے اپنے وطن کی بدحالی و بدنظمی پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے ؎

بھاگ مسافر میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ — اوپر اوپر پھول کھلے ہیں بھیتر بھیتر آگ
بھاگ مسافر بھاگ .... !
گاندھی جی کا نام زباں پر من کے اندر روگ — کام نہیں ہے بھاشا ہی بات نہیں بے لاگ
بھاگ مسافر میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ
اوپر اوپر پھول کھلے ہیں بھیتر بھیتر آگ
جنتا جاہل ننگی بھوکی اور یہاں کچھ لوگ — اپنے اپنے رنگ محل میں بیٹھے اڑائیں کاگ
بھاگ مسافر بھاگ .... !
میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ مسافر بھاگ
کوچے کوچے، گوشے گوشے لوٹ مچی ہے لوٹ — جنگل جنگل، بستی بستی، آگ لگی ہے آگ
بھاگ مسافر بھاگ
ہولی آئی ہولی آئی اب ہے یہاں یہ ریت — دولت چھینیں عصمت لوٹیں خوں سے کھیلیں پھاگ
خون سے کھیلیں پھاگ مسافر خون سے کھیلیں پھاگ
بھاگ مسافر میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ
اوپر اوپر پھول کھلے ہیں بھیتر بھیتر آگ
آزادی کی بھیک سے ملتا آخر کیا انعام — ننگے بھاگے بھیروں ناچا موت نے چھیڑا راگ
موت نے چھیڑا راگ مسافر موت نے چھیڑا راگ
میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ مسافر بھاگ — اوپر اوپر پھول کھلے ہیں بھیتر بھیتر آگ

اس مجموعے میں جگرؔ کی ایک فارسی نعت ہے جسمیں انھوں نے "خصوصیاتِ محمدیہ" اور "عہدِ رسالت تا خلافتِ راشدہ"، "عہدِ حاضر تا معراج" اور "شمہ از حقیقتِ معراج" وغیرہ کو بیان کیا ہے اس نعت کے متعلق انھوں نے اپنے ایک خط مورخہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۵۲ء (حج بیت اللہ کے ایک سال کے بعد) تسکین قریشی کو لکھا ہے کہ

ع۱ "نیا دور" نومبر ۱۹۶۰ء ص ۳۶

"کامل ایک سال تک کے کرب و محرومی کا نتیجہ "نعت شریف" کی صورت میں بطور انعام مل گیا
زہے کرب محرومی مجھے پوری طرح یقین ہے کہ آپ بہت پسند کریں گے
اے از لب صادق شنیدہ ناز یادہ خدا خدا سے دیدہ[1]

دوسری فارسی نظم "حقیقت و مجاز" بھی اسی مجموعہ میں شامل ہے جسمیں حقیقت و مجاز کے متعلق جگر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کے بعد جگر کی نظمیں ختم ہو جاتی ہیں۔

مندرجہ بالا نظموں کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ جگر غزل گو شاعر ہونے کے باوجود کبھی کبھی نظمیں بھی کہتے تھے خواہ وہ فرمائشی ہوں یا ان کے جذبات و احساسات میں تحریک پیدا ہونے کا نتیجہ ہوں بہرحال جگر نے غزلوں کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی کہی ہیں جنکو غزلیہ نظم کہا جاسکتا ہے کیونکہ ان نظموں میں بھی انکے تغزل کی جھلک دکھائی پڑتی ہے ان نظموں میں مطبوعہ نظمیں زیادہ تر کامیاب ہیں لیکن غیر مطبوعہ نظموں میں وہ زیادہ کامیاب نہیں دکھائی دیتے جسکی وجہ یہ ہے کہ وہ زیادہ تر فرمائشی ہیں اور جو طبیعت پر جبر کرکے دوسروں کی خاطر مروتاً کہی گئی ہیں لیکن وہ نظمیں جو از خود کہی گئی ہیں کامیاب ہیں۔

(ب) سماجی و سیاسی محرکات

قومی تحریک کے اثرات ہندوستان کی آزادی سے پہلے جب گاندھی جی اور انکے ساتھی حصول آزادی کے لئے قومی تحریک چلا رہے تھے اور اس کے لئے عملی تدبیر کرنے پر سزائیں بھگت رہے تھے تو جگر بھی ان خارجی عوامل سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے انھوں نے دوران قیام اعظم گڑھ ملک کے بچوں کو خطاب کرتے ہوئے ایک نظم کہی جسمیں انھوں نے تلک کی مکمل آزادی کے نعرے کی یاد دلائی اس نظم میں انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو مخاطب کیا اور کہا

تلک کا اگر یاد ہو نام تمکو — جتانا انھیں کا ہے کہرام تم کو
سنانا انھیں کا ہے پیغام تم کو — دکھانا ہے اس صبح کی شام تمکو

اسکے بعد انھوں نے حکومت برطانیہ کے مظالم گنائے ہیں اور پھر پیغام آزادی بھی دیا ہے
قومی تحریک ہی سے متاثر ہو کر انھوں نے "سوراج" کے عنوان سے ایک نظم اعظم گڑھ ہی کے دوران قیام میں کہی جسکے چند شعر درج ذیل ہیں

سوئے سوراج قدم اپنا بڑھاتے جاؤ — جسطرف جاؤ ادھر آگ لگاتے جاؤ

---

[1] مکاتیب جگر ص ۱۰۶-۱۰۷

خوں ابھی اور بہانا ہے زمینوں پہ ابھیں — گولیاں اور بھی کچھ کھانی ہیں سینوں پہ ابھیں

اسی تحریک سے متاثر ہو کر انھوں نے گاندھی جی پر بھی ایک نظم کہی تھی جس کا ایک مصرع ہے سہ

اب ہوئے میکدۂ ہند کے گاندھی ساقی

گاندھی جی اور انکے ساتھیوں نے حصول آزادی کی عملی تدبیروں کے بدلے میں جو سزائیں بھگتیں اسکی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ اپنی ایک غزل میں کہتے ہیں سہ

صیاد کی نظر میں وہ نشتر سے کم نہیں — اک لرزشِ خفی جو مرے بال و پر میں ہے

اسی زمانے کے دو شعر اور ہیں جنہیں جگر کا پیغام ہے کہتے ہیں سہ

پرائے ہاتھوں جینے کی ہوس کیا — نشیمن ہی نہیں تو پھر قفس کیا

کرم صیاد کے صدہا ہیں پھر بھی — فراغِ خاطرِ اہلِ قفس کیا ؟

انگریزوں کے ظلم وستم سے جگر ہراساں و پریشاں قطعی نہیں ہوئے بلکہ انکے ظلم وستم کرنے سے ہندوستانیوں کی بیداری پر وہ انگریزوں کے احسان مند ہیں دراصل ہندوستانیوں میں جلیانوالہ باغ کے بہیمانہ سانحے ہی نے جذبہ آزادی کی تازہ روح پھونکی اور ملک آزاد ہو کر رہا اسی لئے جگر نے کہا ہے کہ سہ

میری زباں پہ شکوۂ اہل ستم نہیں — مجھکو جگا دیا یہی احسان کم نہیں

ہمنے دیکھے ہیں جاگتے ہوئے دل — ہم سے پوچھو ستم کے احسانات

جب جگر کو انقلاب کی آہٹ ملی تو انکے احساسات جاگ اٹھے اور انھوں نے کہا سہ

بہ ہوش باش کہ وہ انقلاب آپہنچا — میں سن رہا ہوں دل سنگ و خشت کی دھڑکن

جگر نے قومی تحریک ہی سے متاثر ہو کر ایسے اشعار کہنے شروع کئے سہ

ہے تو برقِ حوادث سے ہو گیا محفوظ — مری بلا سے اگر میرا آشیاں نہ رہا

وہ اپنے ہم وطنوں کو انگریزوں کی چالوں سے آگاہ کرتے ہوئے انکو زمانے پر قیامت بن کے چھا جانے کو کہتے ہیں سہ

زمانے پر قیامت بن کے چھا جا — بنا بیٹھا ہے طوفاں در نفس کیا

قفس سے ہے اگر بیزار بلبل — تو پھر یہ شغل تزئینِ قفس کیا

انگریزوں کے اس تحریک کے کچلنے اور انکے ظلم وستم کرنے پر وہ بغاوت کی دعوت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب وہ بزم طرب نہیں رہی اور نہ یہ عیش کا زمانہ ہے بلکہ اب یہ میدان کارزار ہے اس لئے اب ساغر اٹھانے کے بجائے تلوار اٹھا کر میدانِ کارزار میں آجانا چاہیئے وہ انگریزوں پر طنز کرتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں کہ انھوں نے ہندوستانیوں کو زنداں میں تو ڈال دیا ہے لیکن اگر وہ انکی

پرواز روک سکتے ہوں تو روک کر دیکھیں وہ واعظ کو بھی تقریر سے روکتے ہیں اور اسے بھی دستار اٹھا کر چلے جانے کو کہتے ہیں جگرؔ کے ان خیالات کی تصدیق مندرجہ ذیل اشعار سے ہوتی ہے ؎

مطرب وہ کہاں اب بزمِ طرب تکلیف نہ کر پرخار اٹھا
ساقی یہ زمانِ عیش نہیں، شیشہ نہ اٹھا تلوار اٹھا
شاعر کو تھا جسکا اندیشہ وہ فتنہ بھی آخر کار اٹھا
اک طیش میں ہر مظلوم بڑھا، اک غیظ میں ہر فنکار اٹھا
زنداں میں تو مجھکو ڈال دیا، اے حاکمِ زنداں تو نے مگر
پرواز مری جو روک سکے، ایسی بھی کوئی دیوار اٹھا
یہ عہدِ خرد ہے عہدِ خرد، یاں عشق و جنوں کا ذکر ہی کیا
اے واعظِ ناداں ہوش میں آ تقریر نہ کر دستار اٹھا

اور جب ملک کے لوگ بیدار ہو جاتے ہیں تو انگریزوں میں بےچینی پھیل جاتی ہے جگرؔ نے مندرجہ ذیل اشعار میں اسی طرف اشارہ کیا ہے ؎

اسی اک جرم پر اغیار میں برپا قیامت ہے
کہ ہم بیدار ہیں اور اپنا مستقبل سمجھتے ہیں
حکومت کے مظالم جب سے ان آنکھوں نے دیکھے ہیں
جگرؔ ہم "بمبئی" کو کوچۂ قاتل سمجھتے ہیں

بمبئی میں حکومت کے عبرتناک مظالم اس وقت رونما ہوئے جب ١٩٤٥ء میں بمبئی کے جہازیوں نے بغاوت کی اور منظم عوامی تحریکات نے اسکی حمایت کی تو برٹش سامراج نے اپنے ظلم و تشدد سے اس بغاوت کو کچل دینے کی کوشش کی یہی مظالم دیکھکر جگرؔ کو "بمبئی" "کوچۂ قاتل" دکھائی پڑنے لگا تھا

جگرؔ کا عقیدہ تھا کہ تخریب ہی سے تعمیر کے سامان پیدا ہو جاتے ہیں اور مظلوموں کا خون ضائع نہیں جاتا بلکہ مادرِ وطن کی آزادی کے لئے جن محبانِ وطن نے اپنے خون کی قربانیاں دی ہیں ان کی قربانیاں رنگ لا کر رہینگی وہ اپنی ایک غزل میں کہتے ہیں ؎

یہ صحنِ روش، یہ لالہ و گل، ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تخریبِ جنوں کے پردے میں تعمیر کے ساماں ہوتے ہیں
منڈلائے ہوئے جب ہر جانب طوفاں ہی طوفاں ہوتے ہیں
دیوانے کچھ آگے بڑھتے ہیں اور دست و گریباں ہوتے ہیں
بیدار عزائم ہوتے ہیں، اسرار نمایاں ہوتے ہیں
جتنے وہ ستم فرماتے ہیں سب عشق پہ احساں ہوتے ہیں
یہ خون جو ہے مظلوموں کا، ضائع تو نہ جائیگا، لیکن
کتنے وہ مبارک قطرے ہیں جو صرفِ بہاراں ہوتے ہیں
جو حق کی خاطر جیتے ہیں مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگرؔ
جب وقتِ شہادت آتا ہے، دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں

قومی تحریکات سے جگرؔ اسقدر متاثر ہوئے کہ وہ ایک شدید الحساس قومی شاعر بن گئے شدید الحساس اور درد مند انسان تو وہ پہلے بھی تھے لیکن ان تحریکات سے متاثر ہو کر انھوں نے بھی مندرجہ بالا قسم کے اشعار کہنے شروع کئے ورنہ یوں تو وہ در اصل عشق و محبت کے شاعر تھے اور غزل ہی کے میدان تک انکی شاعری کا دائرہ محدود تھا لیکن وہ اپنے دور کے خارجی عوامل سے بھی متاثر ہوئے اور انھوں نے ایک سچے اور اچھے شاعر کی طرح اپنے وقت کی عکاسی کی، اسی تحریک کا اثر تھا کہ جب بنگال میں ١٩٤٣ء میں قحط پڑا تو انھوں نے برٹش حکومت پر شدید حملہ کیا اور کہا ؎

بنگال کی میں شام سحر دیکھ رہا ہوں ۔۔۔ دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں
صیاد نے لوٹا تھا عنادل کا نشیمن ۔۔۔ صیاد کا لٹتے ہوئے گھر دیکھ رہا ہوں

رفتہ رفتہ قومی تحریک زور پکڑتی گئی اور اسی تحریک کی بدولت بالآخر ہندوستان ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو برٹش سامراج کی حکومت سے آزاد ہو گیا۔

قومی اور وطنی نظمیں اور انکا تجزیہ

جگر نے ہندوستان کے فسادات پر بھی نظمیں لکھی ہیں اور بنگال کے قحط پر بھی۔ انھوں نے "سوراج" "گاندھی جی" اور "تلک" پر بھی نظمیں لکھیں اور "اعلانِ جمہوریت" اور "رند اور ساقیٔ میخانہ روحانیت" پر بھی۔

انھوں نے اپنی قومی اور وطنی نظموں میں ابنائے وطن کو بے راہ روی سے روکا ہے اور جو کچھ کہا ہے دل سے اور درد و محبت سے کہا ہے انکو اپنا وطن عزیز تھا اسی لئے انھوں نے جو کچھ کہا ہے خلوص سے کہا ہے انکا مقصد اپنے وطن کو ایک بلند مقام پر دیکھنا تھا اسی لئے انھوں نے ابنائے وطن پر بھرپور تنقید کی ہے اس تنقید سے انکا مقصد وطن سے تمام برائیوں کو ختم کرنا تھا لیکن افسوس کہ انکا یہ مقصد ابھی تک پورا نہیں ہو سکا۔

جگر نے ابتداءً ابن دورانِ قیام اعظم گڑھ "سوراج" "گاندھی جی" اور "تلک" پر نظمیں کہی تھیں لیکن وہ سب کی سب انکے دورِ سرمستی کی نذر ہو گئیں ان نظموں کے کچھ اشعار انھوں نے قیسی الفاروقی کو سنائے تھے جسے قیسی نے قلمبند کر لیا تھا جنکی تفصیل پچھلے صفحات میں دی جا چکی ہے اس کے بعد ایک نظم انھوں نے "گاندھی جی" پر بھی کہی تھی جو انکی بیاض نمبر ۲ گوشۂ جگر۔ لائبریری جامعہ ملیہ دہلی) میں موجود ہے اسکی بھی تفصیل پچھلے صفحات میں آ چکی ہے۔

اس نظم کے بعد انکی ۸ مطبوعہ قومی اور وطنی نظمیں "آتشِ گل" میں ملتی ہیں جنکی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ "قحط بنگال" بنگال کے ۱۹۴۳ء کے قحط کے موقع پر کہی گئی۔

۲۔ "پھرتے ہیں آستینوں میں خنجر لئے ہوئے" دورانِ قیام بمبئی کہی گئی جسمیں ملک کے سیاستدانوں کی بے راہ روی پر تنقید کی گئی ہے۔

۳۔ "آجکل" ۱۹۴۷ء میں کہی گئی اس میں ملک کے فرقہ وارانہ فسادات اور یہاں کے انتشار و پراگندگی کا تذکرہ ہے۔

۴۔ "گاندھی جی کی یاد میں" غالباً ۱۹۴۸ء میں گاندھی جی کی شہادت سے متاثر ہو کر کہی گئی ہے اور اس نظم کے ذریعہ انکو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے

۵۔ "آوازیں" ۱۹۵۰ء میں کہی گئی اور اس نظم میں ملک کے رہنماؤں کو خلوص، محبت اور انسانیت سے پیش آنے کا پرخلوص مشورہ دیا گیا ہے۔

۶۔ "اعلان جمہوریت" میں ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو آئین جمہوریت کے موقع پر دستور کو سازگار آنے کی دعا کی ہے

۷۔ "ساقی سے خطاب" میں علم و فن کے بدرجۂ کمال ترقی کے باوجود انسان کے تن اور من کی تمام سود گی پر اظہارِ تاسف کیا گیا ہے

۸۔ "گیت" ۱۹۵۰ء میں کہی گئی اور اسمیں ملک کی ابتری اور پھیلی ہوئی بے چینی کا تذکرہ بڑے درد مندانہ انداز میں کیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا تمام نظموں پر تفصیلی بحث "جگر کی نظم گوئی" کے تحت کی جا چکی ہے اس لئے اس کا یہاں دہرانا لا حاصل ہے۔

تقسیم ہند کے بعد کے اثرات کا رمزی اور علامتی بیان

جگر مرادآبادی مرزا غالب کی طرح ایک ایسے دور سے گذرے جبکہ ملک ایک بار پھر خوں فشاں سیاسی انقلاب سے گذر رہا تھا اور بقول ڈاکٹر نذر

"وہ دو بولنے والے خونبار حادثوں اور ہولناک سانحوں میں گھر گئے تھے حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات نے جس طرح غالب کے کلام میں گہرے تاثرات نمایاں کر دیے تھے ۱۹۴۷ء کے انقلاب نے اسی طرح جگر کی غزلوں کو رنگین سے رنگین تر بنانے میں حصہ لیا ہے انھوں نے غزل ہی میں اپنے ماحول کی ترجمانی اسی اثر و گداز کے ساتھ کی ہے جس کے لئے دوسروں کو بڑی بڑی نظمیں لکھنی پڑیں"[1]

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا لیکن اس آزادی کے آتے ہی ہندوستان پر بربادی کے بادل چھا گئے۔ یہاں خون کی ہولی کھیلی جانے لگی پشاور سے چاٹگام تک ایک جنون کی لہر دوڑ گئی جسمیں ہندو، مسلمان اور سکھ سبھی نے پشتہا پشت کے پڑوس اور بھائی چارے کی روایت کو پس پشت ڈالکر اور انسانیت و شرافت کا احساس بھلا کر فرقہ پرستی اور تنگ نظری کے جال میں پھنس کر جاں سوز حرکات کا مظاہرہ کیا انسان ہوتے ہوئے درندوں سے بھی بدتر روپ اختیار کئے اسی فرقہ وارانہ فساد میں خدا معلوم کتنے گھر تباہ ہوئے کتنی بستیاں ویران ہوئیں کتنی عورتیں بیوہ ہوئیں کتنے بچے یتیم ہوئے معلوم نہیں کتنی ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کی عصمتیں لوٹی گئیں یہ سب کچھ

---

[1] "سب رس" ستمبر ۱۹۶۱ء ص ۲

دیکھ کر جگرؔ کی روح تڑپ اٹھی اور وہ کہہ اٹھے ؎

بھری بہار میں تاراجیٔ چمن مت پوچھ — خدا کرے! نہ پھر آنکھوں سے وہ سماں گزرے

نازجس خاک وطن پر تھا مجھے آہ جگرؔ — اسی جنت پہ جہنم کا گماں ہوتا ہے

یہ حادثات ہندوستان کے چند سیاسی لیڈروں کے اشاروں سے پیش آئے ان حادثات سے ہندوستان کا صدیوں کا پرانا ڈھانچہ تباہ و برباد ہو گیا جس سے ہمارے ادیب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے انھیں حالات و واقعات سے متاثر ہو کر فراقؔ، آزادؔ، جگرؔ اور سردارؔ نے بھی کہا ؎

جب جب اسے دیکھا ہے دل تھام لیا میں نے — انسان کے ہاتھوں سے انسان پہ جو گزری (فراقؔ)

بہار آتے ہی ٹکرانے لگے کیوں ساغر و مینا — بتا اے پیرِ میخانہ یہ میخانوں پہ کیا گزری (جگن ناتھ آزادؔ)

دل کی جراحتوں کے کھلے ہیں چمن چمن — اور اسکا نام فصلِ بہاراں ہے آجکل (جگرؔ)

اپنے نگار خانہ میں مستوں نے کیا کیا — دنیا پہ کیسے فاش کریں گھر کی بات ہے (سردارؔ)

تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں نفسی نفسی کا عالم چھا گیا مسلمانوں پر خاص طور سے عرصۂ حیات تنگ ہو گیا اس کے کچھ نقوش جگرؔ کے خطوط میں بھی مل جاتے ہیں اس لئے اگر انکے خطوط سے کچھ اقتباسات پیش کر دیئے جائیں تو بے محل نہ ہو گا کیونکہ ان خطوط سے ہندوستان کی آزادی کے بعد کے صحیح حالات کا پتہ چلتا ہے۔

جگرؔ، مارچ ۱۹۴۸ء کے ایک خط میں احباب کے پاکستان چلے جانے پر اپنی روحانی اذیت کا تذکرہ کرتے ہوئے تسکینؔ قریشی کو لکھتے ہیں!

"آجکل جسمانی تکالیف کم ہیں لیکن روحانی اذیتیں بڑھتی چلی جا رہی ہیں جس طرف دیکھئے احباب ہیں کہ "پاکستان" چلے جا رہے ہیں میں ہوں کہ شدید طور پر اس تصور ہی سے تنہائی محسوس کر رہا ہوں تنہائی "کسقدر اذیت آفریں ہو سکتی ہے یہ حقیقت اب کھلتی جاتی ہے دعا کیجئے کہ خدا، رحمٰن الرحیم صرف اپنی معیت شاملِ حال فرمائے میں آجکل شدید طور پر متاثر ہوں دماغ سے کہیں زیادہ دل اثر قبول کر رہا ہے" [۱]

اسی مضمون کا ایک خط حمیدؔ صدیقی کو بھی لکھا تھا جسمیں انھوں نے پاکستان جانے والے احباب کی جدائی کو بڑا اذیت آفریں بتایا ہے

اس خط کے بعد ۱۹۴۸ء کے وسط میں ایک دوسرے خط میں تسکینؔ قریشی کو گونڈہ کے مسلمانوں کے حالات سے آگاہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

---

[۱] "مکاتیب جگرؔ" ص ۶۵،

"یہاں کے سیاسی حالات نازک سے نازک تر ہوتے جارہے ہیں، مسلمان شہید کر دیے گئے برادران وطن کی گرفتاریاں برائے نام، لیکن مسلمان عام طور پر گرفتار کئے جارہے ہیں وہ بھی جن کا تعلق عوام سے ہے، وہ بھی جنکا عمائدین میں شمار ہے ایسی حالت میں غیرت گوارا نہیں کرتی کہ سب کو چھوڑ کر لکھنؤ چلا آؤں البتہ خود یہاں کے حالات ہی کے متعلق لکھنؤ پہنچنا یقیناً مفید ہوگا اس لئے ارادہ تو کر رہا ہوں، لیکن تین چار دن کے بعد، تاکہ یہاں کے تمام حالات معلوم ہو جائیں یعنی ابتک جو کچھ پس پردہ ہے تا امکان اس کا بھی علم ہو جائے عام طور پر مسلمانانِ گونڈہ سخت خوف زدہ اور گھبرائے ہوئے ہیں بہت سے حضرات گونڈہ چھوڑ چکے ہیں میں نے آج ڈپٹی کمشنر کو خط لکھا ہے شاید کل جواب مل سکے" دل ودماغ" پر جو عالم چھایا ہے آپ خود اس کا اندازہ کر سکتے ہیں،، ع ۱

اور جب انکو ڈپٹی کمشنر گونڈہ سے تسلی بخش جواب نہ مل سکا تو انھوں نے اس ڈپٹی کمشنر کو شیطان بصورت انسان بتاتے ہوئے تسکین قریشی کو ۱۹۴۹ء کے ایک خط میں لکھا کہ:

"گونڈہ کی فضا نہایت خراب ہو گئی ہے یہاں کا ڈپٹی کمشنر شیطان بصورت انسان ہے میں نے اس کے خلاف قدم اُٹھالیا ہے یہاں کا سیاسی جمود ختم ہو رہا ہے ایک ذمہ دار کے سلسلے میں رکن کی حیثیت سے یوپی کے (وزیر اعظم؟) وزیر اعلیٰ سے کل ہی مل لیا ہے،، ع ۲

جگر کے اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ملک کے فسادات میں عوام تو عوام حکام بھی ملوث تھے اور مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم کی بھی کوئی داد و فریاد سننے والا نہیں تھا۔

انھیں واقعات وحادثات سے متاثر ہو کر جگر کا حساس دل بالکل بجھ گیا اور وہ کہنے لگے ؎

بے کیف دل ہے اور جیے جا رہا ہوں میں
خالی ہے شیشہ اور پیے جا رہا ہوں میں

وہ دل کہاں ہے اب کہ جسے پیار کیجئے
مجبوریاں ہیں ساتھ دیئے جا رہا ہوں میں

اب انکے پیغام محبت کو بھی سننے کے لئے کوئی تیار نہ تھا جس پر وہ کڑھ کر کہنے لگے ؎

مرا نالہ ہوش ربا ہو گیا، مرا نغمہ روح فزا ہو کیوں
کہ چمن میں پھول تو ہیں وہی مگر انمیں بوئے وفا نہیں

اور جب انھیں اپنے وطن میں بے وطنی کا احساس ہونے لگا تو وہ پکار اٹھے ؎

معاذ اللہ اسکی واردات غم معاذ اللہ
چمن جس کا وطن ہو اور چمن بیزار ہو جائے

ہندوستان کی آزادی سے کوئی شاعر یا ادیب مطمئن نہیں تھے بلکہ آزادی کے بعد

ع ۱ "مکاتیب جگر،، ص ۶۵

ع ۲ "مکاتیب جگر،، ص ۶۹

حالات و واقعات سے ایک حد تک نالاں تھے اسی لئے انھوں نے کہا ہے ؎

"آپ کے سب اصول جمہوری — جیسے کاغذ کے پھول کچھ رنگیں
مختصر یہ کہ آپ خود کیا ہیں — آپ کی ذہنیت ہے کتنی حسین
آپ کہتے ہیں کچھ عمل کچھ ہے — اس کے شاہد ہیں آسمان و زمیں
میں بس اتنا ہی عرض کرتا ہوں — آپ جمہوریت کے اہل نہیں" ع۱

اس کے بعد ملک و مال کی خاطر ملک و قوم کی عظمت کو برباد کرنے والوں سے کہتے ہیں ؎

"اس غلامی پہ آپ ہیں آزاد — آج بھی خوش ہے روح استبداد
ہوسِ ملک و مال کی خاطر — عظمتِ ملک و قوم ہے برباد" ع۲

پھر وہ اس آزادی کو بربادی سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

"لوگ کہتے ہیں وطن آزاد ہے — میں سمجھتا ہوں وطن برباد ہے
وہ وطن وہ کشورِ ہندوستاں — وہ چمن وہ جنت روحانیاں
ہائے وہ گہوارۂ صدق و صفا — ہائے وہ سیارۂ مہر و وفا ع۳

انھوں نے آزادی کی شمع کو دھندلی دھندلی سی بتایا ہے ؎

کام اد ھورا اور آزادی — نام بڑے اور تھوڑے درشن
شمع ہے لیکن دھندلی دھندلی — سایہ ہے لیکن روشن روشن

ہندوستان میں آزادی کے بعد جو انسانیت سوز حالات ہوئے اس سے انسانی زندگی پشیماں نظر آنے لگی اور انسان کے تلاش کرنے پر بھی صحیح معنوں میں کوئی انسان نہیں مل سکا بلکہ سب ظلم و ستم ڈھانے والے ہی انسان ملے جگرؔ کہتے ہیں ؎

انسان ہے زندگی سے نالاں — انسان سے زندگی پشیماں
انسان کہاں کہ مدتوں سے — انسان کی تلاش میں ہے انساں
تکلیف ستم، ستم نہ بن جائے — اے نازکش نیاز مندان

ہندوستان میں پھیلی ہوئی ابتری پر جگرؔ نے گھٹن سی محسوس کی انکو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے زندگی سے زندگی کم ہوتی جارہی ہو انکے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

ع۱ جگرؔ کی بیاض نمبر ۷ گوشہ جگرؔ۔ لائبریری جامعہ ملیہ دہلی۔
ع۲ جگرؔ کی بیاض نمبر ۷ گوشہ جگرؔ۔ لائبریری جامعہ ملیہ دہلی
ع۳ " " " " " "

قیامت کیا یہ اے حسنِ دو عالم ہوتی جاتی ہے
کہ محفل تو وہی ہے، دلکشی کم ہوتی جاتی ہے

وہی ہیں شاہد و ساقی مگر دل بجھتا جاتا ہے
وہی ہے شمع لیکن روشنی کم ہوتی جاتی ہے

وہی ہے زندگی لیکن جگرؔ یہ حال ہے اپنا
کہ جیسے زندگی سے زندگی کم ہوتی جاتی ہے

اپنے وطن کی زمین پر بسنے والوں پر طنز کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

نہیں ہے جنکو مجال ہستی، سوائے اسکے وہ کیا کرینگے
کہ جس زمیں کے ہیں بسنے والے اُسے بھی رسوا کیا کرینگے

وہ انسان کے مارے ہوئے انسانوں کو دیکھتے ہیں انکو خاموش ویرانوں سے انسانوں کے دھڑکتے ہوئے دل نظر آتے ہیں اور انکو جوانانِ وطن نادان اور دیوانے سے دکھائی پڑتے ہیں ؎

حسن و صورت کے نہ حسرت کے نہ ارمانوں کے
اف کہ انسان ہیں مارے ہوئے انسانوں کے

انہی ذرات میں خاموش سے ویرانوں کے
دل دھڑکتے نظر آئے مجھے انسانوں کے

مرحبا! جذبۂ بیباک جوانانِ وطن
تیغ جسم خم ہے مگر ہاتھ میں نادانوں کے

ناز ہے شاہدِ فطرت کو بھی جنپر ہمدم
وہ چمن سب ہیں لگائے ہوئے دیوانوں کے

وہ ملک میں قتل و غارت کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں ؎

آنکھیں ابھی کچھ اور بھی ہیں منتظر جگرؔ
چھپتا کی قتل گاہ کا منظر لئے ہوئے

جگرؔ آزادی کے بعد کے زمانے کو گردشِ ایام سمجھتے ہیں کیونکہ انھیں ایام میں ایسے ایسے حادثات پیش آئے کہ زندگی، زندگی کے نام سے شرمانے لگی ان حادثات اور انکے اثرات کو وہ اسطرح بیان کرتے ہیں ؎

آپڑا کچھ وقت ایسا گردشِ ایام سے
زندگی شرما رہی ہے زندگی کے نام سے

انکی محفل کا تو کیا کہنا، مگر اے ہمنشیں
رنگِ محفل کہہ رہا ہے دل میں بے آرام سے

آجکل میخانے میں تقسیم ہوتے ہیں جگرؔ
زہر کے ساغر شراب زندگی کے نام سے

اور یہ سب حادثات جہل خردگی بدولت پیش آئے ؎

جہل خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

پھر وہ کہتے ہیں ؎

ترس رہی ہے زندگی برس رہی ہے زندگی
نفس نفس میں تشنگی کی داستاں لئے ہوئے

جگرؔ اس زمانے کے تفریقِ خاص و عام سے بھی متنفر معلوم ہوتے ہیں کہتے ہیں ؎

مجھکو نہیں قبول یہ تخصیص خاص و عام — ساقی یہ اپنا شیشہ اٹھا اپنا جام لے

لیکن جگر ان حادثات و واقعات سے بالکل نا امید نہیں ہوئے بلکہ بڑی جرأت و ہمت سے کام لیا اور ان حادثات و واقعات کو انھوں نے دلچسپیوں کا زمانہ بھی کہا ؎

جگر ان حوادث سے گھبرا نہ جانا — یہی تو ہے دلچسپیوں کا زمانہ

۱۹۴۷ء ہی کے حادثات و واقعات سے متاثر ہو کر جگر نے ایک نظم "آجکل" بڑے خلوص اور پُر درد لہجے میں کہی تھی اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

شائستگی کے بھیس میں روحِ درندگی — انسان کے لباس میں شیطاں ہے آجکل
وہ قومیت کہ جس سے ہے انسانیت ذلیل — ہندوستاں میں کسقدر ارزاں ہے آجکل
دہلی و دہرہ دون و نواکھالی و بہار — انسان ہے اور ماتمِ انساں ہے آجکل
سازِ حیات سازِ شکستہ ہے ان دنوں — بزمِ خیال حسرتِ ویراں ہے آجکل
دل کی جراحتوں کے کھلے ہیں چمن چمن — اور اس کا نام فصلِ بہاراں ہے آجکل

۱۹۴۸ء میں انھوں نے ایک نظم "آوازیں" بھی انھیں حادثات سے متاثر ہو کر کہی جسمیں ہندوستان کے سیاسی لیڈروں پر انھوں نے کھل کر تنقید کی ہے ؎

منافقت کی ہزار باتیں وہ سنتے رہتے ہیں اور خوش ہیں — مگر صداقت کی صاف و سادہ سی بات ہے ناگوار بھی
کہاں کی دلداری و محبت، تلافیوں کا تو ذکر ہی کیا — حقوق پامال کر رہے ہیں حقوق کے پہرہ دار ابھی

اس ضمن کے دو شعر اور ملاحظہ فرمائیے ؎

زبانوں پہ اصلاحِ قومی کے نعرے — مگر طینتیں بیشتر مفسدانہ
غریبوں پہ جو کچھ گزرتی ہے گزرے — سمٹ آئے جیبوں میں لیکن خزانہ

ایک نظم انکی گجبیت کے عنوان سے ہے جسمیں انھوں نے تقسیم کے بعد کے ملک کے نظم و نسق کی خرابیوں کو بڑے پُراثر پیرائے میں بیان کیا ہے جس کے متعلق سیفی گنوری نے صحیح لکھا ہے کہ اگر جگر کا نام چھپا لیا جائے تو اس کو جگر کا سرمایہ بتانا مشکل ہے اور جگر جیسے تغزل میں ڈوبے ہوئے شاعر کا ایسی سادہ اور صاف نظم کہنا انکی زبردست ذہنی صلاحیت کی دلیل ہے اس نظم کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے!

آزادی کی بھیک سے ملتا آخر کیسا انعام — فتنے جاگے بھیرو ناچا موت نے چھیڑا راگ
موت نے چھیڑا راگ مسافر موت نے چھیڑا راگ
میرے وطن سے میرے چمن سے بھاگ مسافر بھاگ — اندر اندر پھول کھلے ہیں بھیتر بھیتر آگ

یہ سب کچھ کہنے کے باوجود انھوں نے وطن کو کبھی خیر باد نہیں کیا بلکہ بڑے شاعرانہ انداز میں فرمایا کہ ؎

کانٹوں کا بھی حق ہے کچھ آخر — کون چھڑائے اپنا دامن
چلتی پھرتی چھاؤں ہے پیارے — کس کا صحرا کیسا گلشن

اور جب انکو وطن میں کچھ اطمینان و سکون دکھائی پڑا تو انھوں نے یہ بھی کہا ہے

خس و خاشاک جلتے جا رہے ہیں
نکھرتا آرہا ہے رنگ گلشن

غرضکہ جگرؔ نے ایک غزل گو شاعر ہونے کے باوجود ملک میں پھیلے ہوئے انتشار سے چشم پوشی نہیں کی بلکہ یہاں کے ابتر حالات دیکھکر ان کا دل کڑھتا اور ایسے زمانے میں غزل کہنے والے شاعر کو وہ شاعر ہی ماننے پر تیار نہیں ہوئے کیونکہ جب ملک میں افراتفری پھیلی ہو دل کو سکون میسر ہو اور شاعر جو حساس کا مجسمہ ہوتا ہے ایسے حالات میں کیسے پر سکون رہ سکتا ہے اور جب اسکو سکون میسر نہیں تو غزل کیسے کہہ سکتا ہے بہرحال وہ ملک کے حالات و حادثات سے متاثر ہوئے اور انکو ملک میں جو خامی نظر آئی اسے بے لاگ خلوص دل سے اپنے اشعار میں بیان کردیا اور ملک میں امن و امان پیدا کرنے اور اسکو ترقی کی راہ پر گامزن رہنے کی شدید خواہش ظاہر کی۔

سیاست میں محبت کا پیغام ڈاکٹر احسن فاروقی نے صحیح لکھا ہے کہ

"جگرؔ صاحب محبت کے بندہ تھے حافظؔ کا مصرع "بندہ عشقم واز ہر دو جہاں آزادم" اگر ہمارے دور کے کسی ادیب پر پورا اترتا ہے تو اُن ہی پر انکا عمل اگر کسی اصول کا پابند ہوا تو اسی اصول کا"[1]

سیاست سے انھیں کوئی لگاؤ نہیں تھا کیونکہ ان کے خیال میں سیاست شعوری یا غیر شعوری طور پر نفرت، سازش اور خوف سے بنتی ہے خواہ فرد سے فرد کا مقابلہ ہو خواہ قوم کا قوم سے اسی لئے وہ کہتے تھے ؎

انکا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

وہ حسن اور انسانیت کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ سیاست سے مجھے کوئی لگاؤ نہیں کیونکہ سیاست کی بنیاد نفرت و سازش، دغا اور فریب پر ہوتی ہے اور اگر اس نفرت سے کوئی محبت نبھانا چاہے تو نا ممکن ہے اور جگرؔ کا پیغام ہی محبت تھا اسی لئے انکو سیاست سے کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی اور بڑی حد تک وہ اس سے نفرت کرتے تھے اس خیال کی تصدیق امیڈ د بائیوی کی ایک تحریر سے ہوتی ہے جسمیں انھوں نے لکھا ہے کہ

"بات شعر و سخن کے تذکرے سے جگرؔ صاحب کے اس شعر تک پہنچی ؎

انکا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

---

[1] "جگرؔ مرادآبادی" از شوق مرادآبادی (غیر مطبوعہ)

جگرؔ صاحب کے تیور ہی کچھ اور ہو گئے گفتگو میں نرمی و حلاوت کے بجائے گرمی و تلخی جھلکنے لگی کہنے لگے جی ہاں! سیاست کی اہمیت سے انکار حقائق و مسلمات سے روگردانی کے مصداق ہے لیکن آجکل کے سیاست دانوں سے خدا پناہ میں رکھے بس جناب یہ حال ہے ؎

چہرے جنون حُبِّ وطن سے دھوئیں دھوئیں ــــ دل میں خباثتوں کا سمندر لئے ہوئے

اور آج کی سیاست تو خود غرضی دروغ، فریب و منافقت کے اجزائے ترکیبی کا مرکب بنکر رہ گئی ہے "؏۱

در اصل یہی وجہ تھی جگرؔ کی سیاست سے نفرت کی۔ اس نفرت کا اظہار انھوں نے مندرجہ ذیل اشعار میں بھی کیا ہے اور عام محبت کی دعوت دی ہے ؎

مجھے ڈر ہے کہ اس ناپاک تر دورِ ترقی میں ــــ بگڑ جائے نہ خود میرا مذاقِ شعر و فن ساقی

بازیچۂ اربابِ سیاست سے گذر جا ــــ اس کارگہِ مکر و ضلالت سے گذر جا
جرأت ہے تو ہر نیم صداقت سے گذر جا ــــ ہمت ہے تو محدود محبت سے گذر جا
انسانیت عام کے مرکز کی بنا ڈال ــــ ہر ناقص و محدود جماعت سے گذر جا
تو حسن کے اک دائرہ کل کی طرف آ ــــ ہر جزوی و محدود حقیقت سے گذر جا
انسان بن انسان یہی ہے تری معراج ــــ رنگ و وطن و قوم کی لعنت سے گذر جا

جگرؔ دنیا کے اس نظام کو جسمیں تفریق خاص و عام ہے پسند نہیں کرتے وہ چاہتے تھے غریب و امیر سبکو برابری کا درجہ ملے اسی لئے وہ ناز و نعمت سے پلنے والوں کو غیرت دلاکر کہتے ہیں کہ جب تک دوسروں کو بھی ناز و نعمت نصیب نہ ہو انکو ناز و نعمت کی زندگی زیب نہیں دیتی مندرجہ ذیل اشعار ان خیالات کی تصدیق کے لئے پیش کئے جا سکتے ہیں ؎

مجھکو نہیں قبول یہ تخصیص خاص و عام ــــ ساقی یہ اپنا شیشہ اٹھا اپنا جام لے
خبر لے اپنے میخانے کی ساقی ــــ اٹھے شعلے مرے جامِ تہی سے
اے سہاروں کی زندگی والو ــــ کتنے انسان بے سہارے ہیں
روحِ آدم نگراں کب سے ہے تیری جانب ــــ اٹھ اور اک جنّتِ جاوید یہیں پیدا کر

وہ ایک سچے گلشن پرست کی حیثیت سے پھولوں کے ساتھ ساتھ کانٹوں سے بھی نباہ کرنا جانتے تھے اور گلوں کی صحبتوں کو بہت حسین مانتے ہوئے بھی زندگی اسی کو سمجھتے تھے جو کانٹوں کے درمیان گذرے انکے خیال میں جو بات دور بہاریں تھی وہی دورِ خزاں میں بھی رہی لیکن

؏۱ "انجام"، ۲ر اکتوبر سنہ ۶۴ء صـ ۶

یہ نظروں کا فرق رہا کہ وہ عہدِ خزاں کو عہدِ بہار سے مختلف سمجھتے رہے اس خیال سے متعلق چند اشعار ملاحظہ فرمایئے

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

یاروں اغیار سے محبت ہے
گل تو گل خار سے محبت ہے

بہت حسین سہی صحبتیں گلوں کی مگر
وہ زندگی ہے جو کانٹوں کے درمیاں گذرے

پھول وہی چمن وہی فرق نظر نظر کا ہے
عہدِ بہار میں تھا کیا دورِ خزاں میں کیا نہیں

مجھے دیں نہ غیظ میں دھمکیاں، گریں لاکھ بار یہ بجلیاں
مری سلطنت یہی آشیاں، مری مملکت یہی چار پر

وہ اپنے پیغام محبت کو سارے عالم میں پھیلا دینا چاہتے تھے اسی لئے انھوں نے کہا ہے ؎

تیور حدودِ عالم سے آزاد ہو کر
حدودِ محبت بڑھاتا چلا جا

وہ دلوں کو فتح کر لینے والے ہی کو فاتح زمانہ سمجھتے تھے ؎

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

وہ اپنے غم اور دوسروں کے درد میں تفریق کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

میں وہ صاف ہی نہ کہدوں جو ہے فرق مجھ میں تجھ میں
ترا درد دردِ تنہا مرا غم غمِ زمانہ

وہ محبت میں ہمیشہ جیتے رہنا جانتے تھے اور جہاں کی چمن بندی کو اپنا فرض سمجھتے تھے انکی زندگی محبت تھی انکو کسی سے بھی نفرت نہیں تھی بلکہ انکے دل میں سب کی عزت تھی اور جب انکو یہ محسوس ہوا کہ لوگوں کے دلوں سے محبت ختم ہوئی جارہی ہے تو انھوں نے عشق کو زندہ و پائندہ حقیقت قرار دیکر اسکو عام بنانے کی دعوت دی اور کہا کہ محبت آج بھی مشعل فروز منزل ہے اور محبت ہی نے آگ کو بھی گلزار بنا دیا ہے لیکن انھیں اس کا افسوس رہا کہ اس زمانے کے انسان ان باتوں کا اعتبار نہیں کرتے تھے جگرؔ کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمایئے جنمیں انھوں نے مندرجہ بالا خیالات کا اظہار کیا ہے ؎

محبت میں ہم تو جئے ہیں، جئیں گے
وہ ہونگے کوئی اور مر جانے والے

میرا تو فرض چمن بندیٔ جہاں ہے فقط
مری بلا سے، بہار آئے یا خزاں گذرے

زہے خلوصِ محبت کہ حادثاتِ جہاں
مجھے تو کیا مرے نقشِ قدم کو پا نہ سکے

جگرؔ کی ہے زندگی محبت نہیں ہے اسکو کسی سے نفرت
جگرؔ کے دل میں ہے سب کی عزت جگرؔ ہے یاروں کا یار اب بھی

محبت اڑی جا رہی دلوں سے یہ
حقیقت بنی جا رہی ہے فسانہ

عشق ہی زندہ و پائندہ حقیقت ہے جگرؔ
عشق کو عام بنا ذوقِ یقیں پیدا کر

ضمیر صاف ہوا پنا تو غیر ممکن ہے
کسی کے آئینۂ قلب پر غبار آئے

محبت آج بھی مشعل فروزِ منزل ہے
اگر نہ کور نگاہی بروے کار آئے

بنا دیا ہے محبت نے آگ کو گلزار
مگر جو آج کے انساں کو اعتبار آئے

غرضیکہ سیاست اور سیاسی لوگوں سے دور بھاگتے رہنے کے باوجود انھوں نے ایسی سیاست بروئے کار لانے کی کوشش کی جسمیں عام طور پر محبت کارفرما ہو تاکہ زندگی کو قرار حاصل ہو جائے

نہ ہو جو عام محبت محال ہے ورنہ
کہ زندگی کو کسی حال میں قرار آئے

بابِ ششم

(ا) جگرؔ کا فن

جگرؔ کا نظریۂ شاعری، سادگی و پرکاری، سہل ممتنع، لطافتِ زبان و بیان، محاورے، تشبیہیں و استعارے، رمز و کنائے، ندرت، نشتریت، سوز و گداز، ترنم، فارسی ترکیبیں

(ب) جگرؔ کے نقاد

جگرؔ کے کلام میں بعض خامیاں اور نقائص

ترتیب

جگر کا فن

جگر کا نظریۂ شاعری :۔ راحت مولائی نے جگر کے نظریہ شاعری کے متعلق انھیں کا ایک قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے

"توجہ کی یک سوئی کے بغیر شعر کہہ لینا محض کاریگری تو ہو سکتا ہے، شاعری مطلق نہیں، اور میں اپنی خوش قسمتی یا بدقسمتی سے صرف شاعر واقع ہوا ہوں، نہ کہ کاریگر یا ایکٹر۔ میرے نظریات شعری معروف اور رائج الوقت نظریات سے بڑی حد تک متضاد متصادم و منفرد واقع ہوئے ہیں .....

میرے نزدیک شاعر کا صحیح مقام اور منصب جہاں غیر محدود ہے اور محبت و شرافت اس کی سرشت، جغرافیائی حدود اور رنگ و نسل کے اختلافات سے اسے دور کا بھی واسطہ نہیں ہونا چاہیئے، یعنی اس کی منزل بلند تر منزل انسانیت ہے وہ نفرت کے ذریعے نہیں بلکہ محبت کے ذریعہ انقلاب پیدا کرتا ہے، حقیقتاً یہی وہ نقطۂ انفصال ہے جو ایک شاعر اور ایک (سیاسی) لیڈر کے درمیان مابہ الامتیاز پیدا کرتا ہے میں اس کا بھی قائل نہیں کہ شاعر محض اپنی قدرت کلام کے بل بوتے پر جنرل مرچنٹ بن کر رہ جائے ......
شاعر کا ایک فرض اہم یہ بھی ہے کہ وہ بہر عنوان علمی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے تاثرات کو قطعاً غیر جانبدارانہ انداز اور وسیع تر فکر و نظر کے ماتحت پیش کرے"۔[1]

اور جگر نے خود بھی اپنے نظریۂ شاعری کی وضاحت کرتے ہوئے لکھدیا ہے کہ

"میری شاعری غزل ہی تک محدود ہے اور چونکہ حسن و عشق میں میری زندگی ہے اس لیے بعض مستثنیات کو چھوڑ کر کبھی دوسرے میدان میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کر سکا، ...... میری زندگی گوناگوں انقلابات و تغیرات کا مجموعہ ہے جسے پیہم مصائب و آلام کی آمیزش نے خدا جانے کیا بنا دیا ہے لیکن میں منہ بنا بنا کر رونے بسورنے کو بالطبع سخت ناپسند کرتا ہوں، خود میں نے کہا ہے۔

جاں ہمہ غم ساختم، رقصم بہ عشق   دل ہمہ خوں کردہ، خنداں می روم

بے شک جس طرح جذبات مسرت و انبساط فطری عطیات ہیں اسی طرح جذبات غم و الم بھی، لیکن سچے رونے والے کہاں؟ الفاظ بیشک رونے والے صرف کہے جاتے ہیں لیکن دل ٹٹولیے تو درد کا نام نہیں، مشاقی کی بدولت الفاظ پر قدرت حاصل ہے، یا جو چاہا کہہ دیا، زندگی کو شعر سے تعلق ہو یا نہ۔ لیکن اگر سچے رونے والے ہوں بھی تاہم اس قسم کا "شعر و ادب" اولاً تو حیات قومی کے لیے سم قاتل کا حکم رکھتا ہے دوسرے کامیاب رونا وہ رونا نہیں جس میں نسائیت و محرومیت پائی جاتی ہے"۔[2]

---

[1] "ماہنامہ جگر" سنبھل، مئی ۱۹۵۳ء ص ۵ [2] "تحریک" اکتوبر ۱۹۶۲ء ص ۲۱

(جگر پرخلوص شعر کہنے کے لیے پرخلوص شخصیت اور اس میں فکر و نظر کی وسعت، بلند کرداری، مشاہدات تجربات کا ہونا لازمی سمجھتے تھے) وہ ایسے شاعر کو جس کی زندگی کچھ ہو اور شعر کچھ، ایکٹر، مینا کار اور بھانڈ تک کہتے تھے، ان کو یقین تھا کہ ایسے شعرا کو شعر کا عرفان ہو ہی نہیں سکتا (وہ شاعر کی زندگی اور شاعری میں یکسانیت چاہتے تھے) اور اس کے لیے فطرت سے قربت، شریف و سریع الفکر ہونا ضروری سمجھتے تھے)

(ان کے خیال میں شاعری "اندر کی پاکیزگی اور خلوص" تھی اور یہ فن عشق کے بغیر ناممکن ہے کیونکہ جبتک کوئی لگن نہ ہو شعر نہیں ہو سکتا، اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:

"جس طرح جمال کے لیے پاکیزگی کا عنصر لازمی ہے بعینہٖ اسی طرح شاعر کے مزاج کو بھی پاکیزہ بلند اور حکیمانہ ہونا چاہیئے۔ اس طرح خود اس کا آرٹ صداقت و خلوص کا آئینہ دار ہوگا اور اسے اپنے آرٹ میں بے تکلف و بے تصنع مفید نظریات کو پیش کرنے کی استعداد کو براہ راست کائنات اور ماورائے کائنات سے مناسبت ضروری ہے۔"[۱]

ان کا یہ بھی ایمان تھا کہ شاعر کا خالق ہستی کو پہچاننا ضروری ہے اور اس کی ہستی کو اپنی شاعری میں شامل کیے بغیر فطری حسن اور شگفتگی نہیں پیدا کی جا سکتی۔

مندرجۂ ذیل اقتباسات بھی ان کے نظریۂ شاعری کی وضاحت کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ:-

"فلسفۂ و حکمت، شعر و ادب سے قوم اور ملک میں کوئی عملی انقلاب نہ کبھی پیدا ہوا اور نہ ہو سکتا ہے بلکہ شعر و ادب خود نتیجہ ہوتے ہیں حالات و واقعات کا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بعض حضرات شاعری کو آرٹ کہنے کے باوجود اس کو مفید صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں اور مفید و غیر مفید کا معیار انہی کی ایجاد و اختراع کا رہین منت ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ افادی پہلو کے پیش نظر کبھی شاعری نہیں کی جاتی شاعری صرف برائے شاعری ہوتی ہے اور کرنا چاہیئے یہ اور بات ہے کہ شاعری سے زندگی میں کوئی دوسرا کام بھی لے لیا جائے لیکن تخلیق کرنے والے کو شاعری افادیت کے خیال سے نہیں کرنا چاہیئے۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ شاعر تمام تاثرات اپنی غذائے روح کی حیثیت سے اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور بشکل شعر کی صورت میں خارج ہو جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب تک حقیقتیں مسائل کی صورت میں بیان کی جائیں گی ہمیشہ شاعری ناکام رہے گی لیکن ان کو حسن و عشق کی چاشنی دے کر پیش کیا جائے گا تو دلیں اتر جائیں گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بے جان الفاظ شاعر کے سرمدی نغموں میں روح بیداری پیدا کر سکتے بلکہ خود اُسکے الفاظ میں روح بھر دیتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ادنیٰ شاعر اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے لیکن ارفع

۱۔ "علی گڑھ میگزین" ۱۹۵۳ء فانی نمبر ص ۱۰۹-۱۱۰

شاعر اپنے ماحول کا خالق ہوتا ہے اس کی شاعری سے نیا ماحول پیدا ہوتا ہے ،، [۱]

"عام حیثیت سے تمام فنونِ لطیفہ اور خصوصیت کے ساتھ شعر و نغمہ اپنے اندر انتہائی قوتِ پرواز رکھتے ہیں اور دوسرے قلوب کو بھی اڑا لے جانے کی استعداد، یہ کافی دلیل ہے اس حقیقت و واقعیت کی کہ در اصل فنونِ لطیفہ کا بیش از بیش تعلق عالم روحانیت سے ہوتا ہے اور کم از کم دنیائے مادیات سے اس لیے فنونِ لطیفہ کو مادی فوائد کے لیے آلۂ کار بنا لینے کی کوشش ایسی ہی ہے جیسے کسی شاخِ گل سے تلوار یا کسی آوازِ رباب سے تیر و تفنگ کا کام لینا ،، [۲]

ایک اور موقع پر انھوں نے اپنے نظریۂ شاعری کے متعلق لکھا ہے کہ :-

" میرا نظریہ ہے کہ کسی قوم کا آرٹ اس وقت تک اس سے منسوب نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ اس میں قوم کی ذاتی و مزاجی خصوصیات نمایاں طور پر نہ پائی جائیں اگر ایک مفہوم ایک خاص مشرقی مذاق رکھنے والا شاعر ادا کرے اور اسی مفہوم کو ایک مغربی ادیب کہے تو اگرچہ بات ایک ہی ہوگی لیکن دونوں کے اندازِ بیان کے ساتھ ساتھ دونوں کی اسپرٹ بالکل مختلف ہوگی لیکن اگر یہ فرق و امتیاز باقی نہ رہے تو ظاہر ہے کہ جس قوم نے اپنی خصوصیات مزاجی کو دوسری قوم کی خصوصیات ذہنی میں جذب کر دیا ہے یا جذب ہو جانے دیا ہے وہ اپنی انفرادیت کا دعوی نہیں کر سکتی وہ اور اس کا آرٹ محض ایک عکس ہوگا دوسری قوم کی نقالی کا" [۳]

وہ نرمی و گداز کو شعر کی روحِ رواں سمجھتے تھے اور کیفیات و احساسات کے طریقۂ ادا کو بھی ایک ضروری چیز سمجھتے تھے کیونکہ ایک بات واعظ کے منہ سے بے اثر اور بے مزہ معلوم ہوتی ہے لیکن وہی بات جب شاعر کی زبان سے ادا ہوتی ہے تو سننے والا بیتاب ہو جاتا ہے وہ غزل کے متعلق لکھتے ہیں :-

" غزل کا مزاج نہایت لطیف و نازک ہوتا ہے اس کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ لطافت و نزاکتِ مزاج اور اختصار و ایجاز کے باوجود ہر موضوع اس کے زیرِ سایہ آ جاتا ہے اور اپنے تمام محاسن اور قوت کے ساتھ...... مجھے نظم کی کسی صنف سے بھی نہ اختلاف ہے اور نہ انکار، بشرطیکہ نظم ادبی حیثیت کے علاوہ علمی معیار پر بھی کامل اترتی ہو لیکن ساتھ ہی پوری دیانت کے ساتھ تمام اصنافِ سخن میں "غزل" ہی کو میں ایک شریف ترین اور پاکیزہ ترین صنف تصور کرتا ہوں اس کے یہ معنی نہ سمجھیے کہ غزل کے علاوہ اور تمام اصنافِ سخن غیر شریفہ ہوتے ہیں" [۴]

---

[۱] "تذکرہ جگر"، ص ۱۲۹ تا ۱۳۲، [۲] "فروغِ اردو" فروری و مارچ ۱۹۶۱ء ص ۵۰۸، [۳] حضرت شاکی کے دیوان پر تقریظ (جو نواب سید شمس الحسن صاحب شمس کے قول کے مطابق غیر مطبوعہ ہے راقم نے اسے "نگارشاتِ جگر" میں شائع کرا دیا ہے) [۴] "فروغِ اردو" فروری و مارچ ۱۹۶۱ء ص ۵۰۸

وہ نظم نگاری کو مستقل فن نہیں تسلیم کرتے تھے بلکہ اس قسم کی جملہ اصنافِ سخن کو مشرقی کلچر کے منافی سمجھتے تھے اور مغربی ذہنیت کی تقلیدِ محض، یا حکومت کے اثرات، استیلا و تسلط، جن سے ہماری داخلی شاعری کا رخ قطعاً خارجی شاعری کی طرف پھر گیا ہے

وہ اپنے زمانے کے شاعروں کی بہنات کو بھی ہر اعتبار سے مخربِ اخلاق اور ملک و قوم کے لیے مہلک تصور کرتے تھے

(جگر نے بعض قدیم ترین متروک الفاظ مثلاً بارے، انکھڑیاں، مت، بن، گھبرائے ہے وغیرہ پھر سے رائج کیے اور متروک ترکیبوں کے استعمال کے ساتھ ساتھ بعض نئی ترکیبوں کو ایجاد کیا مثلاً آفتاب اٹھا، بیتاب بمفہوم بے تابانہ، حسن بمعنی محبوب، پر بمعنی لیکن، غریب الغربا بمعنی مفلس، بے دست و پائیاں[1]، گل بہار چیدہ وغیرہ وغیرہ استعمال کر کے کسی کے لیے لکھ دیا کہ اگر مذاق سلیم سے کام لیا جائے تو یہ ایک اجتہاد ہوگا جسے رائج ہونا چاہیئے اور کسی کے لئے لکھا کہ میرا ذوق اسے جائز قرار دیتا ہے بعض جگہ اپنی غلطی بھی تسلیم کی ہے اور بعض جگہ اس پر اصرار بھی کیا ہے بعض الفاظ کا تذکیر کی جگہ تانیث اور تانیث کی جگہ تذکیر استعمال کیا ہے اور اسکے بعد لکھا ہے کہ میں اس لفظ کو ہمیشہ اسی طرح استعمال کرتا ہوں بعض محاورے محض ایک خاص قسم کی ندرت اور جدت پیدا کرنے کے لئے استعمال کئے ہیں بعض الفاظ مثلاً "تجزیۂ بہار" کو مشدد اور "بے دست و پا" کو مہند بھی بنا لیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ الفاظ مشدد طریقے پر بھی کہے جا سکتے ہیں اور انسے جمع بنا لینا غلط نہیں ہے۔ اس طرح انھوں نے اپنے کلام میں جدت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے)

انھوں نے اپنی تمام عمر عزیز غزل ہی کے گیسو سنوارنے میں صرف کی اسی میں اپنے تجربات و تاثرات کو بیان کئے غزل کہنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ کیونکہ اس کے دو ہی مصرعوں میں اپنے وسیع و لطیف ترین مفہوم کو بیان کر دینا ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ الفاظ کی شیرینی و نغمگی اور لب و لہجہ کی نرمی، خیالات کی لطافت اور احساسات کی شدت کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے جگر نے غزل کی نازک مزاجی، اسکی طبعی خصوصیات کو بھی پیش نظر رکھا اور ترنم و تغزل اور رمز و ایما کے ربط باہمی کی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ وہ فطری شاعر تھے اور جب شاعری کے لئے فکر کرتے تو بقول خود روح بنکر ذرے ذرے میں سما جاتے تھے ؎

شاعر فطرت ہوں میں جب فکر فرماتا ہوں میں
روح بنکر ذرّے ذرّے میں سما جاتا ہوں میں

---

[1] انکا ایک شعر ہے ؎

ہائے رے غمازیاں نگاہوں کی
اپنی بے دست و پائیاں توبہ

اس شعر میں انھوں نے "بے دست و پائیاں" کے استعمال کے متعلق شعلۂ طور مطبوعہ ۱۹۳۶ء میں ص ۹۱ پر لکھا ہے :-
"بے دست و پا" جس مفہوم میں مستعمل ہو اس اعتبار پر میں نے اسے ایک لفظ سے تعبیر کیا ہو اور اس بنا پر جمع بنا لینا غلط نہیں سمجھا"

انکے کلام میں نزاکتیں اور لطافتیں ہیں انکے یہاں ادب کثیف کی کوئی گنجائش نہیں ہے انکا کلام تکلف اور تصنع سے بھی پاک ہے کیونکہ انھوں نے جو کچھ اپنے اشعار میں بیان کیا ہے وہی ان کی زندگی تھی ؎

مرے شعر میں ہیں نزاکتیں مری نظم میں ہیں لطافتیں
مری فکر میں کہیں اے جگر ادب کثیف کی جا نہیں

تکلف سے تصنع سے بری ہے شاعری اپنی
حقیقت شعر میں جو ہے وہی ہے زندگی اپنی

جگر رہنے نہ کر آزاد جو اک کاسہ سائل
نہ ایسی شاعری اپنی نہ ایسی زندگی اپنی

ان کا ذوق و شوق عوام کی سطح سے بلند تھا اور ان کے کلام میں مشرقیت کا عنصر بھی نمایاں طور پر ملتا ہے ؎

مرا شوق بھی مرا ذوق بھی ہے بلند سطح عوام سے
ترا ہجر بھی ترا وصل بھی مگر درد دل کی دوا نہیں

صرف نقالی ہے مغرب کی جگر
شعر میں جب مشرقیت ہی نہیں

جگر کا یہ نغمہ ہے اور ساز مشرق
یہ مغرب زدوں کی کہانی نہیں ہے

ان کے اشعار متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں کیونکہ انھوں نے اپنے اشعار میں اپنے تاثرات بیان کئے ہیں اس لئے انکے اشعار از دل خیزد بر دل ریزد کے مصداق بن گئے ہیں ان کے یہاں خوش نظری اور خوش خیالی بھی ملتی ہے انکے اشعار میں ترنم ہے اور غزلوں کا ایک ایک لفظ چھلکتا ہوا پیمانہ معلوم ہوتا ہے ان کے اشعار دل میں ڈوب جانے والے اور انکا پیغام آرزو دلوں پر چھا جانے والا ہے ان کے ساز فغاں میں جرس کے ہوش کھو دینے کی کیفیت موجود ہے انھوں نے انقلابات نو بہ نو کے باوجود نہ تو کبھی اپنی طرز فکر چھوڑی اور نہ اپنی وضع خاص بدلی بلکہ انھوں نے ہمیشہ غزل ہی کہی اور اپنی اس وضع کو تا حیات نبھاتے رہے ؎

میرا کمال شعر بس اتنا ہے اے جگر
وہ مجھ پہ چھا گئے میں زمانے پہ چھا گیا

اشعار بن کے نکلیں جو سینہ جگر سے
سب حسن یار کی تھیں بے ساختہ ادائیں

خون جگر کا حاصل ایک شعر تر کی صورت
اپنا ہی عکس جس میں اپنا ہی رنگ بھرنا

لاکھ رسوا سہی جگر لیکن
خوش نظر بھی ہے خوش خیال بھی ہے

میرا تخیل جگر طائر حیرت بن کر
میرا تصور جگر بلبل عنقا نہیں

کارِ دیگر اہل شعر سے پوچھے کوئی جگر
سب کچھ تو ہے مگر یہ کمی کیوں اثر میں ہے

تیرا دیوانہ غریب جگر
فخر ہندوستان ہے پیارے

واہ کیا مست غزل تو نے پڑھی آج جگر
ایک اک لفظ چھلکتا ہوا پیمانہ ہے

بزم مشاعرہ ہے یا گلشن تخیل
بلبل چہک رہا ہے یا حضرت جگر ہیں

گلوں سے مستی چھلک رہی ہے سرا پا بلبل بہک رہی ہے
جگر کسی گوشۂ چمن میں غزل کوئی اپنی گا رہا ہے

جو دل میں ڈوب نہ جائے وہ گفتگو کیا ہے
جو چھا نہ جائے وہ پیغام آرزو کیا ہے

جرس کے بھی جو اٹھکر ہوش کھو دیں
وہ نغمے ہیں میرے سازِ فغاں میں

ہم اپنی کیوں طرزِ فکر چھوڑیں، ہم اپنی کیوں وضعِ خاص بدلیں
کہ انقلابات نو بہ نو تو ہوا کئے ہیں ہوا کریں گے

جگر کی غزلوں میں ان کے دلی تاثرات کا عکس ہے ان کے یہاں الفاظ و علامات میں ان کی زندگی کی داستان پوشیدہ ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار قلب کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں ؎

میرے پہلو میں نہیں ہے یہ دلِ خانہ خراب
میری بربادی کی جیتی جاگتی تصویر ہے

انھیں میں کھینچ کر روحِ محبت میں نے بھر دی ہے
میرے اشعار دیکھیں گے میرا دل دیکھنے والے[۱]

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جگر کا نظریۂ شاعری صرف تغزل تک محدود تھا اسی کو وہ ایک کامیاب اور شریف ترین صنف سمجھتے تھے نظم اور دوسری اصنافِ سخن کی بھی قدر کرتے تھے لیکن معتقد غزل ہی کے تھے پہلے تو وہ نظم گو کو یہاں تک کہ ڈاکٹر اقبال کو بھی شاعر تسلیم نہیں کرتے تھے لیکن جوں جوں عمر بڑھی زندگی کے تجربات حاصل ہوئے ان میں اصلاح ہوتی گئی اور نظم نگار کی بھی قدر و منزلت کرنے لگے اور کہنے لگے کہ مجھے نظم کی کسی صنف سے نہ اختلاف ہے نہ انکار بشرطیکہ نظم ادبی حیثیت کے علاوہ علمی معیار پر بھی کامل اترتی ہو۔

سادگی و پُرکاری (سادگی و پرکاری، بلاغت اور تاثر جگر کے کلام کی خصوصیات ہیں) انھوں نے ہمیشہ سادہ، سہل، آسان الفاظ اور دلنشیں ترکیبوں کا استعمال اس طرح کیا ہے کہ بعض اوقات غزل کی غزل پڑھ لینے کے بعد بھی کہیں کوئی ثقیل، نامانوس یا مشکل لفظ نہیں ملتا اور شعر کی گرمی، زورِ بیان اور بلاغت میں بھی کوئی کمی نہیں آتی۔ وہ اپنے ادب شناس ذوق کی وجہ سے الفاظ کی دروبست اور ترکیب کے توازن کے نکتہ سے بخوبی واقف تھے اور انکا استعمال ایسی خوبصورتی سے کرتے تھے کہ ان کی شاعری میں مصوری کی جھلک نظر آنے لگتی اور انکی بات دل میں اترتی چلی جاتی ..... مثلاً ؎

ایک رنگیں نقاب نے مارا
حسن بن کر حجاب نے مارا)

[۱] ماہ و تحریک ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۳ء ص ۱۱

موت کی نیند چھائی جاتی ہے — کہہ چکا میں فسانۂ غم کیا

فروغ بادہ ترے حسن کا جواب ہوا — سنبھالنا مجھے ساقی کہ بے نقاب ہوا

لہو کی ہر ایک بوند دل بن گئی ہے — خوشا لذتِ کامیابِ محبت

مندرجہ ذیل اشعار انکے بیان کی اچھی مثال ہیں ؎

ان لبوں کی جاں نوازی دیکھنا — منہ سے بول اٹھنے کو ہے جامِ شراب

جدھر کو مستیٔ دریا نے رخ کیا اپنا — تڑپ کے موج اٹھی جھوم کر حباب اٹھا

بجلیاں طورِ تصور پہ گرانے والے — پھونک دے پھونک دے ہستی کے سیہ خانے کو

مندرجہ ذیل اشعار میں انھوں نے کیسے سادہ اسہل اور آسان الفاظ کا استعمال کیا ہے ؎

دل کو کیا کیا سکون ہوتا ہے — جب کوئی آسرا نہیں ہوتا

عرش سے ہو کے جو مایوس دعائیں آئیں — میں یہ سمجھا کہ مرے گھر میں بلائیں آئیں

کسی نے پھر نہ سنا درد کے فسانے کو — مرے نہ ہونے سے راحت ہوئی زمانے کو

دل رکھ دیا ہے سامنے لاکر خلوص سے — آگے اب اسکے کام تمھاری نظر کا ہے

ان کے دلنشین روزمرہ اور محاورے کا استعمال بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

یہ کہہ کر دیا اس نے دردِ محبت — "وہ جہاں ہم رہینگے یہ ساماں ہوگا"

مل کے بھی جو کبھی نہیں ملتا — ٹوٹ کر دل اسی سے ملتا ہے

آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ فرما دیجئے — سب یہ کہتے ہیں جگر دیوانہ ہے دیوانہ ہے

کوئی یہ لوٹ تو دیکھے کہ اسنے جب چاہا — تمام ہستیٔ دل کو جگا کے لوٹ لیا

عشق جب تک نہ کر چکے رسوا — آدمی کام کا نہیں ہوتا

وہ کہنا نہ پھر کر، ہائے مجھے ہو گیا ہے کیا — لیجے بلندیٔ دعا کر رہا ہوں میں، مرا

نہ جانے! محبت ہے کیا چیز؟ لیکن — بڑی ہی محبت سے ہم دیکھتے ہیں

مندرجہ ذیل شعر کی بلاغت دیکھئے ؎

ہائے وہ عالمِ پرشوق کہ جس وقت جگر! — اسکی تصویر بھی سینے سے لگائے نہ بنے

اس شعر کی گرمی بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

حسن کامل ہے ترا اور بھی کامل ہو جائے — میری گستاخ نگاہی بھی جو شامل ہو جائے

اسی ضمن کے چند متفرق اشعار بھی ملاحظہ ہوں ؎

اللہ رے اس گلشنِ ایجاد کا عالم — جو صید کا عالم وہی صیاد کا عالم

۱۔ مسودہ "آتشِ گل" نمبر ۱۶ گوشۂ جگر۔ لائبریری جامعہ ملیہ دہلی۔

لاکھوں نگیں بیانیوں لا پہ مری | ایک سادہ جواب کا عالم
سبھی انداز حسن پیارے ہیں | ہم مگر سادگی کے مارے ہیں
اب کوئی کہ دوح کی پکار نہیں | اب کسی کا بھی انتظار نہیں
خون دل، خون تمنا خون شوق | آپ نے جو کچھ کیا اچھا کیا

ان اشعار کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جگر کے تخیل میں ان کے تجربہ کی آمیزش ہے ان کے کلام میں سادگی و پرکاری خلوص اور شدت اثر انکے خون جگر سے آئی ہے اس وجہ سے ان کے کلام میں متاثر کرنے کی قوت بدرجۂ اتم موجود ہے۔

سہل ممتنع | سہل ممتنع کی تعریف عموماً یوں کی جاتی ہے کہ "سہل ممتنع سادگی وحسن بیان کی اس صنعت کا نام ہے جسکو دیکھ کر ہر شخص بظاہر یہ سمجھے کہ یہ بات میرے دل میں بھی تھی اور ایسا کہنا ہر شاعر کے لئے آسان ہے لیکن جب کوشش کر کے ویسا لکھنا چاہے تو نہ لکھ سکے"
جگر کے کلام میں انکی صداقت کی وجہ سے سلاست و فصاحت پیدا ہو گئی ہے کیونکہ جو انکی زندگی تھی وہی انکی شاعری ہے دونوں میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ انکے یہاں خیالات کی نزاکتوں اور ادا کی دقتوں کے باوجود سلاست و روانی انتہائے کمال تک ملتی ہے انکے بعض اشعار کو نثر کرنے کے بعد بھی ان کی ترکیب میں کوئی فرق نہیں آتا انکی متعدد چھوٹی بحر کی غزلیں مندرجہ بالا سہل ممتنع کی تعریف پر پوری اترتی ہیں۔

عشق کو بے نقاب ہونا تھا | آپ اپنا جواب ہونا تھا
تیری آنکھوں کا کچھ قصور نہیں | ہاں مجھی کو خراب ہونا تھا
چھپتے ہیں اور چھپا نہیں جاتا | اس ادائے حجاب نے مارا
ہم نہ مرتے ترے تغافل سے | پرسش بے حجاب نے مارا
جذبۂ شوق کامیاب ہوا | آج مجھ سے انہیں حجاب ہوا
دل کی ہر چیز جگمگا اٹھی | آج شاید وہ بے نقاب ہوا
ستم یاد کی دہائی ہے | نگہ التفات نے مارا
چھپے جا رہے ہیں کبھی دیدہ و دل | تری آمد آمد کی تیاریاں ہیں
دل کو برباد کر کے بیٹھا ہوں | کچھ خوشی بھی ہے کچھ ملال بھی ہے
اپنے جی میں ذرا تو کر انصاف | کب سے نامہربان ہے پیارے
پھر کبھی نام نہ لوں پینے کا | اتنی بھر پور پلا دے ساقی

ہم بھی گرے سو بار مگر — انکو بھی اپنے ساتھ لئے

انکا حسن بیان ملاحظہ فرمائیے ؎

اے جگر آپ اور ایسی چپ — کچھ تو فرمائیے خدا کے لئے
یوں دل کے تڑپنے کا کچھ تو ہے سبب آخر — یا درد نے کروٹ لی، یا تم نے ادھر دیکھا

مندرجہ ذیل اشعار انکی سادگی و حسن بیان کی عمدہ مثال ہیں ؎

دل لے کے مجھ سے دیتے ہو داغ جگر مجھے — یہ بات بھولنے کی نہیں عمر بھر مجھے
کبھی یہ ملال اسکا نہ دکھے کسی طرح دل — کبھی یہ خیال، وہ بھی یوں ہی بیقرار ہو
خود دے کے کہا درد محبت یہ کسی نے — وہ اب آج سے اپنا اسے تم دل نہ سمجھنا
یہ چاہتا ہوں الٰہی کر کچھ دنوں کے لئے — خود اپنے عشق میں وہ شوخ مبتلا ہو

محبوب سے عشق کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ؎

ہم نے سینے سے لگایا دل نہ اپنا بن سکا — مسکرا کر تم نے دیکھا دل تمہارا ہو گیا

ہجر کا بیان کیسے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے ؎

یہ کہہ کہہ کے ہم دل کو بہلا رہے ہیں — وہ اب چل چکے ہیں، وہ اب آرہے ہیں

محبوب کی محبت کا بیان اس طرح کرتے ہیں ؎

چھپ کے پہروں اسے اے دیکھنے والے یہ بتا — تجھ میں کیا بات نہیں جو مری تصویر میں ہے

جگر کا کمال یہ بھی ہے کہ وہ اعلیٰ مضامین اور بلند تخیل کو بھی سادہ و سلیس پیرایہ میں بیان کرکے بات میں بات پیدا کر دیتے ہیں مثلاً ؎

موت کیا ایک لفظِ بے معنی — جسکو مارا حیات نے مارا
جو کچھ بچ رہا تھا مرا خونِ دل — وہی آسماں پر شفق ہو گیا
مرے سر پہ احسان ہے عشق کا — مرا رنگ ہی دوسرا ہو گیا
عقل باریک ہوئی جاتی ہے — روح تاریک ہوئی جاتی ہے
کٹے گی شبِ غم بڑی راحتوں سے — تری یاد ہوگی ترا دھیان ہوگا
محبت میں جگر گذرے ہیں ایسے بھی مقام اکثر — کہ خود لینا پڑا ہے اپنے دل سے انتقام اکثر
ہم نے دنیا ہی میں دنیا کی حقیقت دیکھی — یہیں دوزخ نظر آئی یہیں جنت دیکھی

اس قسم کی مثالوں سے جگر کے کلام میں سہل ممتنع کا دکھانا بھی مقصود تھا اور یہ بھی کہ ان کے یہاں سہل ممتنع کے ساتھ ساتھ عام مضامین کے علاوہ اعلیٰ مضامین اور بلند تخیل کی بھی کمی نہیں ہے۔

لطافت زبان وبیان | شاہ معین الدین ندوی کی تحریر کے مطابق "وشاعری کے اس دورِ انقلاب میں بھی شعرا کا ایک طبقہ ایسا ہے جو ابھی تک خیالات کی بلندی، جذبات کی پاکیزگی اور اسلوب بیان کی ندرت کے مقابلہ میں شاعری میں "زبان" کی چاشنی ڈھونڈھتا ہے اور جو شعر اس ٹکسالی کا ڈھلا نہیں ہوتا وہ خواہ اپنی دوسری خوبیوں کے لحاظ سے کتنا ہی بلند اور پاکیزہ کیوں نہ ہو کھوٹا شمار کیا جاتا ہے اسمیں شبہ نہیں کہ ہر کلام کی خوبی کے لئے خواہ وہ نظم ہو یا نثر، زبان کی صحت اور سلاست الگ شے ہے اور لطفِ زبان اور شے لطفِ زبان سے مراد وہ مخصوص اور ٹکسالی محاورے ہیں جو اردو کے مرکزوں کی گلیوں میں بولے جاتے ہیں میرے نزدیک زبان کی خوبی کے لئے صرف اسقدر کافی ہے کہ اس میں کوئی صرفی نحوی خامی نہ ہو، محاورے کے خلاف نہ ہو، اندازِ بیان میں فصاحت اور دلکشی ہو اگر کلام اس معیار پر ٹھیک اترتا ہے تو پھر اسکی خوبی کے لئے اور کسی عنصر کی ضرورت نہیں اس معیار کے مطابق جگر کے کلام کی خوبی میں گفتگو کا تو کوئی محل ہی نہیں ہے اسکا ہر شعر نہ صرف صحتِ زبان بلکہ فصاحت وبلاغت کا بھی نمونہ ہے لیکن شاعری میں زبان کی چاشنی ڈھونڈھنے والوں کے لطف کا بھی پورا سامان موجود ہے۔

چشم پُر نم، زلف آشفتہ، نگاہیں بیقرار
اس پشیمانی کے صدقے میں پشیماں ہو گیا

زاہد یہ میری شوخیِ رندانہ دیکھنا
رحمت کو باتوں باتوں میں بہلا کے پی گیا

لاکھوں جانیں ہوں تو میں ان پہ تصدق کر دوں
وہ یہ فرمائیں زباں سے اسے برباد کیا

فراق و وصل کے صدقے مگر مرے مالک
فراق و وصل میں کوئی تو امتیاز رہے

الٰہی بھیج دے ایسے میں اس جانِ تمنا کو
سکوتِ شب کا سناٹا ہے اور دل کی کہانی ہے

لئے پھرتا ہوں اک تصویرِ حسرت اپنے سینے میں
خدا بخشے دلِ مرحوم کی زندہ نشانی ہے

نیت شب بخیر اے ساقی
بزم جم کیا ہے ساغر جم کیا ہے[1]

جگر کے لطافت زبان وبیان کے سلسلے میں اور بھی سیکڑوں اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں لیکن طوالت سے بچنے کے لئے ہم انکے کچھ منتخب اشعار پیش کرکے اسی پر اکتفا کریں گے پہلے انکی لطافت زبان کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

گھڑی بھر میں نا آشنا ہو گیا
نہ جانے مرے دل کو کیا ہو گیا

۱۔ فروغ اردو اگست وستمبر سنہ ۱۹۶۱ء ص ۹۲-۹۳، ۹۱

اب اس میں جان مری جائے یا رہے صیاد
بہار میں تو نہ چھوڑونگا آشیانے کو

ساقیا! توبہ کئے لیتے ہیں
لے گنہگار ہوئے جاتے ہیں

مندرجہ ذیل اشعار میں خاص لکھنوی زبان کا مزہ ملتا ہے ؎

کیا طریقہ ہے یہ صیّاد کا اللہ اللہ
ایک کو قید کیا، ایک کو آزاد کیا

بد دعا تھی کہ دعا کچھ نہیں کھلتا، لیکن
چپکے چپکے لبِ نازک سے کچھ ارشاد کیا

بھلا! ہمارا مبارک مبارک
مگر شرط یہ ہے نہ یاد آیئے گا

مندرجہ ذیل شعر میں جگر کی لطافت زبان دیکھئے ؎

لطف سے پھر اس نے کہا زیر لب
میں نے جو پوچھا تو کہا "کچھ نہیں"

ان اشعار میں محاورے کا استعمال ملاحظہ فرمایئے ؎

آئے تھے دل کی پیاس بجھانے کے واسطے
اک آگ سی وہ اور لگا کر چلے گئے

یوں پرسشِ ملال وہ فرما کے رہ گئے
شکوے مری زبان تک آآ کے رہ گئے

حسن پر طنز کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

تو مرے حالِ پریشاں پہ بہت طنز نہ کر
اپنے گیسو بھی ذرا دیکھ کہاں تک پہنچے

مندرجہ ذیل شعر میں اپنے جذبات واحساسات کی کیسی عکاسی کی ہے۔

جب تم نہیں تو فائدہ آہ وفغاں سے کیا
روئیں لپٹ لپٹ کے دلِ ناتواں سے کیا

(جگر کے یہاں بیان کی بھی ایک خاص لطافت پائی جاتی ہے ان کے اشعار میں ہر قسم کے مضامین نظم ہوئے ہیں جنہیں انھوں نے اپنے اندازِ بیان کی وجہ سے ایک خاص قسم کی دلکشی پیدا کردی ہے)

محبوب کی تعریف اس طرح کرتے ہیں ؎

شباب میکش، جمال میکش، خیال میکش، نگاہ میکش
خبر وہ رکھیں گے کیا کسی کی جنھیں خود اپنی خبر نہیں ہے

محبوب سے محبت کی انتہا دیکھئے ؎

پاسِ ادب سے چھپ نہ سکا رازِ حسن و عشق
جس جا تمھارا نام سنا سر جھکا دیا

اور جب محبوب کے دل میں بھی ان کی محبت پیدا ہوگئی تو کہتے ہیں ؎

دل میں کسی کے راہ کئے جا رہا ہوں میں
کتنا حسیں گناہ کئے جا رہا ہوں میں

محبت کی کیسی منظر کشی کی ہے ؎

اداسی طبیعت پہ چھا جائے گی
انھیں جب مری یاد آ جائے گی

اپنے محبوب کے حسن کی خصوصیت اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

ہنسی پھر اڑانے لگی عشق کے فسانے کی
نقاب اٹھا دو، بدل دو فضا زمانے کی

وہ کس سادگی سے کہتے ہیں ؎

تونے سو سو رنگ سے پردہ کیا　　دیکھنے والا تجھے دیکھا کیا

قطعہ

یہ مانا کردے گرہیں رنج فرقت　　خدا وائے فرقت نہ فرمائیے گا
محبت محبت ہی رہتی ہے، لیکن　　کہاں تک طبیعت کو بہلائیے گا

عشق کی کیفیت کی کیا خوب مصوری کی ہے ؎

ہائے یہ مجبوریاں، محرومیاں، ناکامیاں　　عشق آخر عشق ہے، تم کیا کرو؟ ہم کیا کریں؟
ترے سر کی قسم، تجھ سا ہی اک محبوب ثانی ہے　　یہی نقشہ، یہی انداز ایسی ہی جوانی ہے

حسن و عشق کے باہم محبت کو اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

عشق ہی تنہا نہیں شوریدہ سر میرے لئے　　حسن بھی بیتاب ہے اور کسقدر میرے لئے

شباب کی بھی تعریف بڑے جامع الفاظ میں کی ہے ؎

شباب اور مکمل شباب ارے توبہ　　بہار اور مجسم بہار کیا کہنا

ان اشعار میں انکا انداز بیان ملاحظہ فرمائیے ؎

دل پر ہزار طرح کے اوہام چھا گئے　　یہ تم نے کیا کیا، مری دنیا میں آگئے
آئی جب انکی یاد تو آتی چلی گئی　　ہر نقش ماسوا کو مٹاتی چلی گئی
جتنا ہی کچھ سکون سا آتا چلا گیا　　اتنا ہی بیقرار بناتی چلی گئی

انھوں نے اپنے اشعار میں محبوب کے احترام و عزت کو برقرار رکھنے کے لیے اسے "تم" کے بجائے "آپ" کہہ کر مخاطب کیا ہے مثلاً ؎

میری حیرت کی قسم آپ اٹھائیں تو نقاب　　میرا ذمہ ہے کہ جلوے نہ پریشاں ہونگے
مٹا کر ہمیں آپ پچھتائیے گا　　کمی کوئی محسوس فرمائیے گا
ہمیں جب نہ ہونگے تو کیا رنگ محفل　　کسے دیکھ کر آپ شرمائیے گا
مانا کہ ہم پہ جور و جفا کیجئے گا آپ　　لیکن ہمیں نہ ہونگے تو کیا کیجئے گا آپ
ہر چند لائیے گا زباں پر نہ راز عشق　　نظریں پکار اٹھیں گی تو کیا کیجئے گا آپ

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ جگر کے یہاں زبان کا چٹخارہ دریان کی رنگینی بھی خوب ہے اور انھوں نے جو کچھ محسوس کیا ہے اسے تغزل کی مخصوص زبان میں اپنے ایک خاص انداز میں بڑی کامیابی کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

محاورے (جگر نے اپنے دور کے ٹکسالی محاورے، ضرب الامثال اور قدیم محاوروں کو بھی جو ان کے دور میں ترک کئے جا چکے تھے بڑے سلیقے سے نظم کئے ہیں انھوں نے نئے نئے محاروں

کی ایجاد کرکے ان کو اپنے اشعار میں اپنے مطلب کی وضاحت اور ان میں بے تکلفی اور تاثیر پیدا کرنے کے لئے نظم کیا ہے ان کے کلام سے اس قسم کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں پہلے ان کے دور کے ٹکسالی محاوروں کا استعمال ملاحظہ فرمائیے ؎

"بھلا ہو بیکسی کا سامنے آہی گیا ورنہ — تجھے ہم دیکھ کر جامہ سے باہر ہو گئے ہوتے
شکایت اے جگر کیوں کرتے پھرتے ہو زمانے کی — اگر بس تھا تو قسمت کے سکندر ہو گئے ہوتے!
سنانے چلے تھے انھیں حال دل — نظر ملتے ہی رنگ فق ہو گیا
صبر ٹوٹے ہوئے دلوں کا نہ لے — تو یونہی دھان پان ہے پیارے
کیا سمجھ کر یہ چلے آئے ہیں اپنے جی میں — ان سے پوچھو تو کوئی آپ ہیں کس گنتی میں
چمن تو برق حوادث سے ہو گیا محفوظ — مری بلا سے اگر میرا آشیاں نہ رہا
حسن نے جب شکست کھائی ہے — عشق کی جان پر بن آئی ہے
عقل و جنوں میں سب کی تھیں راہیں جدا جدا — ہر پھر کے لیکن ایک ہی منزل پہ آگئے
پھر میں ہوں اور عشق کی بیتا بیاں جگر — اچھا ہوا وہ نیند کی ماتی چلی گئی
بھاگ گئے سر تری دہلیز پہ جب آپ سے آپ — کچھ کسی کی نہ چلی جب ترے احکام چلے
بہلتی تھی کچھ اس سے تسکین دلِ ناشاد بھی — اب کلیجہ کھائے جاتی ہے تمھاری یاد بھی
دہائی ہے مرے اللہ کی دہائی ہے — کسی نے مجھ سے بھی مجھ کو چھپا کے لوٹ لیا
دم بخود ہیں حضرت زاہد ہمیں تک دیکھ کر — ہوش اڑ جاتے اگر شیشے سے باہر دیکھتے
اے غم دولت ترا صبر بھی بھر ٹوٹے — بے ترے نیند بھی آنکھوں میں اگر آئی ہو

انھوں نے بعض قدیم اور متروک محاورے بھی استعمال کئے ہیں اور ان کے لئے فٹ نوٹ بھی لکھدیا ہے مثلاً وہ اپنے اس شعر میں؛

عشق خود کرتا ہے اعلانِ شکست — حسن کو دیجے مبارک بادیاں

"مبارک بادیاں" کے استعمال کے لئے داغ کی سند پیش کرتے ہوئے لکھا ہے؛ "مبارکباد" صحیح ہے "مبارکبادیاں" کو غلط کہا جاتا ہے لیکن داغ مرحوم نے لکھا ہے اور یہ سند کافی ہے" ع۲ وہ اپنے ایک دوسرے شعر میں:۔

ہر چند کہ تھمتے نہیں آنسو صفتِ شمع — باہمہ تری محفل کا سماں دیکھ رہے ہیں

ع۱ "نقاد" فروری ۱۹۱۳ء صـ۴۲ (یہ غزل جگر کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے راقم کو یہ غزل بشیر ضیائی صاحب لاہور کے کتب خانہ سے دستیاب ہوئی جسے اب "یادگار جگر" میں شائع کرا دیا گیا ہے)
ع۲ "شعلۂ طور" مطبوعہ ۱۹۳۶ء صـ۷۷

"بارے" کے استعمال کے لئے لکھتے ہیں کہ:-

"یہ محاورہ اس وقت متروک نہ تھا جب شعر کہا گیا تھا اب متروک ہے"۔ ع۱

انھوں نے نئے محاورے مثلاً آفتاب اٹھا، پردہ دار، مستانہ دار وغیرہ جیسے محاورے اور ترکیبیں اپنے فٹ نوٹ کے ساتھ ایجاد کئے مثلاً:-

جدھر سے حسن کا اک گوشۂ نقاب اٹھا
تمام ذرّے پکارے وہ آفتاب اٹھا

دردنے کروٹ ہی بدلی تھی کہ دل کی آڑ سے
دفعتاً پردہ اٹھا اور پردہ دار آ ہی گیا

دل نے اک نالہ کیا آج اس طرح دیوانہ دار
بال بکھرائے کوئی مستانہ وار آ ہی گیا

ان اشعار میں انھوں نے "پردہ دار" اور "مستانہ وار" کے متعلق نوٹ لکھا ہے کہ:-

"اہلِ فارس ان معنوں میں استعمال نہیں کرتے لیکن میرا ذوق اسے جائز قرار دیتا ہے"۔ ع۲

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جگر نے جدید و قدیم دونوں قسم کے محاورے استعمال کئے ہیں اور بعض اوقات اپنے مطلب کو واضح کرنے کے لئے محاورے بھی ایجاد کر لئے ہیں جن سے انکے کلام کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

تشبیہیں و استعارے تشبیہات و استعارات کے برمحل استعمال سے الفاظ کے معنی میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور جب استعارہ اور استعارہ بالکنایہ کو معنی کی تفصیل اور وضاحت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو وہ بھی تشبیہ کے مثل ہو جاتے ہیں اس سلسلے میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے صحیح لکھا ہے کہ:-

"استعارہ معنی آفریں اور جدت ادا کا ایک زبردست وسیلہ ہے جسے تغزل میں برتنا شاعرانہ کمال پر دلالت کرتا ہے اس کے ذریعہ معمولی سی بات کو کہاں سے کہاں پہنچایا جا سکتا ہے" ع۳

جگر تشبیہات و استعارات کو بالطبع پسند نہیں کرتے تھے بلکہ ان چیزوں کی بہتات کو عجزِ طبع کی دلیل سمجھتے تھے اس کے متعلق انھوں نے لکھا ہے کہ:-

"میں تشبیہات و استعارات کو بالطبع پسند نہیں کرتا اور ان چیزوں کی بہتات کو عجزِ طبع کی دلیل سمجھتا ہوں، تاہم کہیں کہیں بے اختیارانہ اس طرح کے اشعار بھی کہہ گیا ہوں لیکن اکثر خاص قسم کی ندرت اور جدت کے ساتھ"۔ ع۴

جگر کے اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے تشبیہات و استعارات کو بالطبع ناپسند کرنے کے باوجود کہیں کہیں ایسے اشعار کہے ہیں جن میں خاص قسم کی ندرت اور جدت پیدا ہو گئی ہے

ع۱و۲ کلیات جگر، ص ۱۲ ، ۱۱۔ ع۲ "شعلۂ طور" مطبوعہ ۱۹۴۶ء ص ۲۴
ع۳ "اردو غزل" ص ۱۱۴ ع۴ شعلۂ طور مطبوعہ ۱۹۴۶ء ص ۲۶

انکو غزل کے فن اور تکنیک پر عبور حاصل تھا وہ جذبات کے اتار چڑھاؤ کو مصرعوں میں سمونا بھی جانتے تھے اور انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ کونسی بات سیدھے سادے طریقے سے کہی جائے اور کس بات میں تشبیہات و استعارات سے لطف پیدا کیا جائے ان کے تشبیہ و استعارہ میں سادگی، سریع الفہمی اور ایک خاص قسم کا سلجھاؤ ہے جسمیں انکے تجربہ کی وسعت اور مشاہدہ کی قوت کو بڑا دخل ہے کیونکہ انکی زندگی کا بیشتر حصہ غم دنیا اور غم جاناں کے تجربات میں صرف ہوا اور انھیں تجربات کو انھوں نے صداقت کے ساتھ اپنے کلام میں موثر انداز میں بیان کر دیا ایک شعر ملاحظہ ہو سے

یوں زندگی گذار رہا ہوں ترے بغیر   جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

کسی کے بغیر زندگی اس طرح گذارنا جیسے کوئی گناہ کرنا کتنی سادہ تشبیہ ہے اور جگر کے مشاہدہ سے قریب بھی۔ تشبیہ و استعارہ کی بہتات کو جگر نے عجز طبع کی دلیل بتایا ہے لیکن بادہ و ساغر کے پردہ کے بغیر شاعری میں حسن کیونکر پیدا ہو سکتا ہے جگر نے بھی تشبیہ و استعارہ کا استعمال کیا ہے اور خوب خوب کیا ہے یہ ضرور ہے کہ انھوں نے تشبیہ و استعارہ کے لیے شعر نہیں کہے جگر کے تشبیہات و استعارات کے ذیل میں مندرجہ ذیل اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں جنہیں انھوں نے ندرت اور جدت کے ساتھ ساتھ تشبیہ و استعارے کے پردے میں بڑے لطیف مضامین ادا کر دیے ہیں سے

جیسے حسن کی دیوی جھانکتی ہو چلمن سے   نیم وا سی آنکھوں میں اف وہ کیف خواب انکا

زانوئے شوق پر وہ کھلے بہر   نرگس نیم خواب کا عالم

رنگِ حیا ہے یہ ترے جوشِ شباب میں   یا چاندنی کا پھول کھلا ہے گلاب میں

چاہیئے عشق میں مجھے آپ ہی کا جمال سا   داغ ہر ایک بدر سا، زخم ہر اک ہلال سا

یوں آج مل رہا ہے جانِ جگر سے کوئی   جس طرح مل رہا ہو کوئی حسین حسین سے

آنسو تو بہت سے ہیں آنکھوں میں جگر لیکن   بندھ جائے سو موتی ہے رہ جائے سو دانہ ہے

جگر یہ مئے ارغوانی نہیں ہے   ارے یہ آگ ہے آگ پانی نہیں ہے

یہ نشہ بھی کیا نشہ ہے کہتے ہیں جسے حسن   جب دیکھئے کچھ نیند سی آنکھوں میں بھری ہے

کبھی روئے زیبا پہ غصے کی لہر میں   کہ جیسے کوئی بجلیوں کا خزانہ

ترے حضور یہ کیا واردات قلب ہے آج   کہ جیسے چاندنی پہ بدلی سی چھائی جاتی ہے

وہ چیز کہتے ہیں فردوسِ گم شدہ جس کو   کبھی کبھی تری آنکھوں میں پائی جاتی ہے

کانٹوں میں جیسے پھول جہنم میں جیسے خلد
آنکھیں ہیں یوں ندامتِ عصیاں لئے ہوئے

اک بزمِ ناز میں چل زاہد تجھے دکھا دوں
مینا بدوش آنکھیں، ساغر بکف نگاہیں

چھایا ہوا وہ، نشۂ صہبائے محبت
جس طرح کسی رندِ خرابات کا عالم

عارض سے ڈھلکتے ہوئے شبنم کے وہ قطرے
آنکھوں سے جھلکتا ہوا برسات کا عالم

وہ عارضِ پرنور، وہ کیفِ نگہِ شوق
جیسے کہ دمِ صبح مناجات کا عالم

جگرؔ نے اپنی بے دلی کو سیاہ شامِ فرقت اور اپنے غم خانۂ مصیبت کی چاندنی کو بھی سیاہ بتایا ہے اور محبوب کا تصور دل میں ہونے کو انھوں نے کچھ سحر اور کچھ شام کے وقت سے تعبیر کر کے اس وقت کو نزع کا ہنگام بتایا ہے وہ خاموش فضائیں بھی محبوب کے گنگناتے ہوئے نغمے سن کر مست ہو جاتے ہیں مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

بے دلی نے دکھا دیا آخر
شامِ فرقت سیاہ ہوتی ہے

میرے غم خانۂ مصیبت کی
چاندنی بھی سیاہ ہوتی ہے

دل میں تم ہو، نزع کا ہنگام ہے
کچھ سحر کا وقت ہے کچھ شام ہے

فضا یہ نغموں سے بھر گئی ہے کہ موج دریا ٹھہر گئی ہے
سکوتِ نغمہ بنا ہوا ہے وہ جیسے کچھ گنگنا رہے ہیں

جگرؔ کے یہاں موج کبھی میخانے کو بہالے جاتی ہے اور کبھی اسکی ایمائی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں مثلاً ؎

میکشو! مژدہ کہ باقی نہ رہی قیدِ مکاں
آج اک موج بہالے گئی میخانے کو

پی بھی جا زاہد خدا کا نام لے کر پی بھی جا
بادۂ کوثر کی بھی اک موج پیمانے میں ہے

ترے جلوؤں کو دیکھیں اور مرے دل کی طرف دیکھیں
کہاں ہیں اتصالِ موج و ساحل دیکھنے والے

ان اشعار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ جگرؔ بقول خود تشبیہ و استعارے بالطبع پسند کرتے تھے لیکن کہیں کہیں خاص قسم کی ندرت اور جدت کے ساتھ تشبیہ و استعارہ کے اشعار بھی کہے ہیں جو ان کے مجموعۂ کلام میں بڑی آب و تاب رکھتے ہیں۔

رمز و کنایے | ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے صحیح لکھا ہے کہ:-

"ہماری زبان چاہے وہ کتنی ہی منجھی ہوئی اور ترقی یافتہ کیوں نہ ہو جائے اس میں یہ صلاحیت کبھی بھی نہیں آسکتی کہ ان نغموں کو ظاہر کرے جو دل کی وادیوں میں گونجتے ہیں غزل گو شاعر رمزی علامتوں کی مدد سے اس کوتاہی کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ اپنے آپ میں ایسا ڈوبا رہتا ہے کہ اس کو یہ بھی پروا نہیں ہوتی کہ دوسرے اس کے مافی الضمیر کو سمجھتے ہیں یا نہیں وہ

جو کہتا ہے دوسروں کے لئے نہیں کہتا اپنے من کی موج کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔۔۔

رمز و ابہام کے طلسم سے غزل کے شعر میں تھوڑی بہت پیچیدگی لازمی طور پر پیدا ہو جاتی ہے جو اس صنفِ سخن کا عیب نہیں بلکہ خوبی ہے"۔[1]

جگرؔ نے اپنے ایک شعر میں رمزی کیفیت اور باطنی تخیل کا اظہار نہایت سیدھے سادے طریقے پر کیا ہے جس سے ان کے وجدانی ذوق کے ذریعے حقیقت کے راز کا انکشاف ہوتا ہے وہ شعر ہے ؎

اک لفظِ محبت کا ادنیٰ یہ فسانہ ہے ۔۔۔ سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

رمز و کنایہ کو وجدان کی زبان، اور ابہام و اجمال کو غزل کی جان بتایا جاتا ہے کیونکہ غزل میں حسن و عشق کی گہری اور پُراسرار واردات بیان کی جاتی ہے اور اس میں تفصیل کی گنجائش نہیں ہوتی ہے اس لئے رمز و کنایہ ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے جس کے متعلق ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ:۔

"قلبی واردات ہمیشہ ابہام اور اجمال کی مقتضی ہوتی ہیں شرح درد اشتیاق اور ذکر جمال جمال چاہتا ہے کنایہ چاہتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ جو بات کہی جائے مبہم طور پر کہی جائے دل کو کنایہ اور اجمال پسند ہے اور دماغ کو تشریح و وضاحت اور استعارہ اور رمز و کنایہ کی ایمائی قوت سے شاعر کے محدود مشاہدہ میں بے پایانی پیدا ہو جاتی ہے غزل کے شعر کا مطلب ایسا معنی خیز ہونا چاہیئے کہ تحریک ذہنی اس کے اندر مختلف جذباتی اور تخیلی کیفیات پوشیدہ دیکھے جن سے تحت شعور کی بہت سی بھولی بسری یادیں تازہ ہو جائیں اور تازہ ہوتی رہیں"۔[2]

جگرؔ کے یہاں رمز و کنایہ کی ایمائی قوت بدرجہ اتم موجود ہے انھوں نے اپنے اشعار میں اشاروں کنایوں کے ذریعہ سے کہیں تو زندگی کی بھولی بسری باتیں یاد دلانے کی کوشش کی ہے اور کہیں تاثیر پیدا کرنے کے لئے ایمائیت سے کام لیا ہے اور کہیں بخودی عشق کے دلکش افسانے سنائے ہیں ؎

عشق کی چوٹ دکھانے میں کہیں آتی ہے ۔۔۔ کچھ اشارے تھے کہ جو لفظ و بیاں تک پہنچے

سب رفتہ رفتہ داغِ الم دے گئے مگر ۔۔۔ محفوظ ہے وہ زخم جو پہلی نظر کا ہے

اُنہی میں رازِ محبت کسی کا پنہاں تھا ۔۔۔ جو خشک ہو گئے آنسو مژہ تک آئے ہوئے

وہ زندگی سخت مقامات سے گذری لیکن ۔۔۔ وقت پر کام مرا جامِ سفال آہی گیا[3]

اس شعر میں جگرؔ کی زندگی کی پوری داستان پوشیدہ ہے۔

ت ۱۔ "اردو غزل"، ص ۱۸-۱۹ ت ۲ "اردو غزل" ص ۲۴-۲۵ ت ۳ جگر کی بیاض نمبر ۷ - گوشۂ جگر - لائبریری جامعہ ملیہ دہلی۔ یہ شعر "یادگارِ جگر" میں شائع کرا دیا گیا ہے۔

جگر نے مندرجہ ذیل شعر میں بھی معانی کی ایمائی رمزیت خوب پیدا کی ہے ؎

مرگِ عاشق تو کچھ نہیں لیکن
اک مسیحا نفس کی بات گئی

دل میں باقی نہیں وہ جوشِ جنوں ہی ورنہ
دامنوں کی نہ کمی ہے نہ گریبانوں کی

اللہ اللہ اعتبارات نظر
اور پھر ان سب کی بے بنیادیاں

اس نگاہِ ناز ہی سے پوچھئے
اک اسیرِ شوق کی صیادیاں

انھوں نے نقلِ قول کے حسنِ استعمال سے بھی اپنے کلام میں رمزی کیفیت کو وسعت دی ہے اور شعر کی بے تکلفی اور تازگی میں اضافہ کیا ہے ؎

یہ کہہ کر دیا اس نے درِ محبت
"وہ جہاں ہم رہیں گے یہ ساماں ہوگا"

کہتی ہے یہ اب وسعتِ دیوانگیٔ شوق
"وہ منزل بھی جو آجائے تو منزل نہ سمجھنا"

اس تبسم کے تصدق اس تجاہل کے نثار
"خود مجھی سے پوچھتے ہیں وہ کون یہ دیوانہ ہے"

بزم سے با چشمِ تر اٹھ گئے کہتے ہوئے
"وہ ہم سے تری داستاں اب سنی جائے گی"

بعض اوقات انھوں نے غیر ذی روح اشیاء اور مجرد کیفیات کو ذی روح فرض کرکے ان میں تشخیص پیدا کر دیا ہے جس کی وجہ سے ان کے بعض اشعار میں رمزی اثر بڑھ گیا ہے مثلاً ؎

ترے حسنِ مغرور سے نسبتیں ہیں
کہیں ہم نہ رہ جائیں مغرور ہو کر

عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ سکت نہیں رہتی
ورنہ چیز ہی کیا ہے گوشۂ نقاب انکا

مزاجِ حسن و تکلیفِ تجلی، اے معاذ اللہ
بس اب رسوا نہ کر اے بیخودیٔ شوقِ پنہاں کو

بعض جگہ جگر نے اپنے اشعار میں رمزی اور ایہامی کیفیت اور طلسمی اثر پیدا کرنے کے لئے سا، سی، تو ابھی جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں اور ایک پوری غزل اسی انداز میں کہی ہے جسکے چند اشعار یہ ہیں ؎

جان ہے بیقرار سی جسم ہے پائمال سا
اب نہ وہ دل نہ وہ جگر صرف ہے اک خیال سا

حسن کی سحر کاریاں عشق کے دل سے پوچھئے
وصل کبھی ہے ہجر سا ہجر کبھی وصال سا

یاد ہے آج تک مجھے پہلے پہل کی رسم و راہ
کچھ انھیں اجتناب سا کچھ مجھے احتمال سا

جگر نے بعض اوقات اپنی گنہ گاری اور رحمتِ خداوندی دونوں کو دو تصوّرات بنا کر ایک دوسرے کے مقابل کر دیا ہے جس سے رمز و ایما کو ایک خاص مناسبت ہے اس قول کے ثبوت میں مندرجہ ذیل اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں ؎

مجھ سے گناہ گار پہ، یہ بارشِ کرم
منہ دیکھتا ہوں رحمتِ عاجز نواز کا

عصیاں کی بھی نہ ہو سکی تکمیل مجھ سے آہ
کیا منہ دکھاؤں رحمتِ پروردگار کو

بھڑکا رہا ہوں آتشِ عصیاں، ہر ایک سمت
پھیلا رہا ہوں رحمتِ پروردگار کو

جگر نے کہیں کہیں سیاست حاضرہ پر ایمائی انداز میں تبصرہ کیا ہے مثلاً

اسی اک جرم پر اغیار میں برپا قیامت ہے
کہ ہم بیدار ہیں اور اپنا مستقبل سمجھتے ہیں

اس جہد و طلب کی دنیا میں کیا کار نمایاں کرتے ہیں
ہم صرف شکایت کرتے ہیں و صرف پشیماں ہوتے ہیں

ہے زخم کائنات جو ہندو ہے ان دنوں
ہے داغ زندگی جو مسلماں ہے آج کل

مرا نالہ ہوش ربا ہو گیا، مرا نغمہ روح فزا ہو گیا
کہ چمن میں پھول تو ہیں وہی مگر انہیں بوئے فنا نہیں

نیا زمانہ بنانے چلے تھے دیوانے
نئی زمین نیا آسماں بنا نہ سکے

رمز و کنایہ کے ذیل میں ان کے کچھ متفرق اشعار بھی ملاحظہ فرمائیے ۔

کہاں میں وہ کہاں تازہ اشعار رنگیں
تری اک توجہ کی گلکاریاں ہیں

پوچھے یہ کوئی اس بت ظاہر فریب سے
مجھ سے نہیں تو انس، مری داستاں سے کیا

عاشقوں کے دل مجروح سے کوئی پوچھے
وہ جو اک لطف نگاہ غلط انداز میں ہے

عشق میں گم گشتگی شوق راس آئی مجھے
تھی جو میرے دل میں حسرت، اب وہ انکے دل میں ہے

دل کی چوٹیں ابھری آتی ہیں تمام
عشق کی چلنے لگیں پُروائیاں

یہ ذرّے جنکو ہم خاکِ رہ منزل سمجھتے ہیں
زبان حال رکھتے ہیں، زبانِ دل سمجھتے ہیں

قفس کا اور یکایک اسطرح جنبش میں آجانا
مگر معلوم ہوتا ہے کہ گلشن میں بہار آئی

کم نہیں ہوتیں دل اندوہ طلب کی خواہشیں
آپ دیکھیں تو سہی وہ ترکش میں کوئی تیر ہے

نیچی نظروں سے دیکھنے والے
دیکھنا زخم دل کی گہرائی

مندرجہ بالا کے مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جگر نے اپنی غزلوں میں رمز و کنایہ کا اسلوب برت کر انکی اثر آفرینی میں ابہام پیدا کیا ہے اور اشاروں اور کنایوں میں پوری پوری داستان بیان کر دی ہے

ندرت ادا: جگر نے روداد عشق کو اپنے عہد کے تمام شعرا کے مقابلے میں زیادہ لطیف انداز سے بیان کیا ہے اور جب انھوں نے اس رنگ میں کہا ہے تو اپنے ندرت بیان سے اس میں ایک خاص لطف پیدا کر دیا ہے انھوں نے ایک طرف تو اپنے اس قسم کے اشعار میں دل کی گرمی کو فراہم کیا ہے اور دوسری طرف ابتذال اور سفاہت سے دامن بھی بچائے رکھا غرض کہ انھوں نے اس پامال اور شاہ راہ عام میں بھی اپنا راستہ الگ نکالا مثلاً

مندرجہ ذیل اشعار سے ان کے ندرتِ بیان اور ندرتِ خیال کا پتا چلتا ہے

ان کی نگاہ لطف ہے اور کشف راز دلبری
میری نگاہ شوق ہے اور داستان عاشقی

نہیں معلوم وہ کس طرح کے انساں ہوں گے
جن پہ تیرے ستم خاص کے احساں ہونگے

پھونک دے اے غیرت سوز محبت پھونک دے
اب سمجھتی ہیں وہ نظریں رحم کے قابل مجھے

محبت ابتدا سے انتہا تک غیر فانی ہے
یہی اک نقشِ اوّل ہے، یہی اک نقشِ ثانی ہے

رگ رگ میں آج دوڑ گئی موجِ سرخوشی
قربان تیری لغزشِ مستانہ وار کے

میں جو مٹتا ہوں تو مٹتا ہے ترے عشق کا نام
فیصلہ بس مری تقدیر کا آساں نہ ہوا

ہاں سزا دے اے خدائے عشق اے توفیقِ غم
پھر زبانِ بے ادب پر ذکرِ یار آ ہی گیا

مہرباں ہم پہ رہی چشمِ سخن گو ان کی
جب ملی آنکھ نگاہوں نے کچھ ارشاد کیا

درد بھی ساتھ چھوڑ دے روح بھی تن سے ہو جدا
دیکھ چکا ہوں میں بھی "تو کچھ" اُنکی نگاہِ ناز میں

اور ہی کچھ کہہ رہا ہے رنگِ بیتابانہ آج
اڑ نہ جائے شمع کو لیکر کہیں پروانہ آج

میں نے جب شرم سے محشر میں جھکائی گردن
بخشوانے کو مجھے میری خطائیں آئیں

رہ رہ کے تڑپ جاتی ہے سینے میں کوئی چیز
ایسا نہ ہو بیتاب تمھاری ہی نظر ہو

محشر میں بات بھی نہ زباں سے نکل سکی
کیا جھک کے اس نگاہ نے سمجھا دیا مجھے

مجھکو وصال و ہجر سے کیا واسطہ جگر
عاشق ہوں اک تبسّمِ دیوانہ ساز کا

عصیاں کی بھی نہ ہو سکی تکمیل مجھ سے آہ
کیا منہ دکھاؤں رحمتِ پروردگار کو

محبت کا انجام اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

آغازِ محبت کا انجام بس اتنا ہے
جب دل میں تمنا تھی اب دل ہی تمنا ہے

بھلا ہوا کہ نظر حیرتوں میں ڈوب گئی
کہاں کہاں نہ ترا حسن رائیگاں ہوتا

حسن و عشق کی وسعت کے متعلق کہتے ہیں ؎

حسن بے قید سہی عشق بھی محدود نہیں
مجھکو پائیں گے جہاں تک وہ نمایاں ہوں گے

عشق ہے اعتماد کے قابل
حسن کا اعتماد کون کرے

تیرا ملنا، ترا نہیں ملنا
اور جنت ہے کیا جہنم کیا

عشق مرنے پہ بھی نہیں مٹتا
یہ تعلق ضرور رہتا ہے

محبت اصلِ حقیقت محبت اصلِ مجاز
وہ کم نظر تھے جو بیگانۂ مجاز رہے

حسن کے ہر جمال میں پنہاں
میری رعنائیِ خیال بھی ہے

وہ محبوب کے ستم کو کرم سے تشبیہ دیتے ہیں ؎
مزید ندرتِ بیان دیکھئے ؎

گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں
محبت کا زمانہ آ رہا ہے

عشق اپنی خوشی سے کون کرے
عشق اگر ناگہاں نہ ہو جائے

خوشا بیداد خونِ حسرتِ بیداد ہوتا ہے
ستم ایجاد کرتے ہو کرم ایجاد ہوتا ہے

فردِ عمل سیاہ کئے جا رہا ہوں میں
رحمت کو بے پناہ کئے جا رہا ہوں میں

وہ غم و الم کو بھی ایک طرح کی نعمت سمجھتے ہیں ؎

بے فائدہ الم نہیں بیکار غم نہیں
توفیق دے خدا تو یہ نعمت بھی کم نہیں

محبت میں اپنے دل کی کیفیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

اک کسی کے قہر سے بھی مسکرا دیتا تھا دل
یا نگاہِ لطف سے بھی آہ تڑپا تا ہوں میں

جگر نے جن کیفیات کو بیان کیا ہے وہ انسے خود گذرے ہیں اور ایک اعلیٰ سطح پر پہنچ گئے ہیں جسکی وجہ سے انکے یہاں ایک قسم کا ٹھہراؤ اور ضبط پیدا ہو گیا ہے ؎

ٹھہرا جہاں یہ جسم میں دل بن کے رہ گیا
دیکھے کوئی سکون مرے اضطراب کا

سب ان پہ ہیں تصدق وہ سامنے تو آئیں
اشکوں کی آرزوئیں آنکھوں کی التجائیں

آنکھوں سے جان جائیے فرقت کا ماجرا
اشکوں سے پوچھ لیجئے جو دل کا حال ہے

انھیں آنسو سمجھ کر یوں نہ مٹی میں ملا ظالم!
پیام دردِ دل ہے اور آنکھوں کی زبانی ہے

تمام منظرِ ہستی کو ایک جا کرتے
پھر اپنی شرحِ محبت جدا جدا کرتے

اب جسے کہتے ہیں ارمانوں کا پورا ہونا
میرے نزدیک یہی موت ہے ارمانوں کی

بحمد اللہ جنونِ عشق یہ پہنچا
بہت آگے مقامِ آگہی سے

انھوں نے بعض اوقات استفہامیہ انداز اختیار کرکے اپنے اشعار میں لطافت اور بلاغت پیدا کی ہے اس قسم کے اشعار میں متکلم نے وضاحت کے لئے مخاطب سے کچھ دریافت کیا ہے جیسے ان کے یہ اشعار بلکہ بعض پوری غزلیں استفہامیہ انداز کی ہیں ؎

محبت کیا ہے تاثیرِ محبت کس کو کہتے ہیں
ترا مجبور کر دینا، مرا مجبور ہو جانا

کہاں ہم اور کہاں اب فسانۂ غمِ عشق؟
وہ التفات نہ کرتے تو کچھ بیاں ہوتا

کیا غرض تجھ کو ترے دل پہ اثر ہے کہ نہیں
میں پرستارِ محبت ہوں خبر ہے کہ نہیں

سن تو اے دل یہ برہمی کیا ہے
آج کچھ درد میں کمی کیا ہے؟

یہ مے کشی ہے تو پھر شانِ میکشی کیا ہے
بہک نہ جائے جو پی کر وہ رندی کیا ہے؟

نگاہِ شوق جگر وقفِ جار سو کیا ہے؟
جو دل حسیں ہو تو دنیائے رنگ و بو کیا ہے؟

دل بھلا یا بُرا ہے کیا کہئے؟
آپ کا نقش پا ہے کیا کہئے؟

ان اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جگر نے کیسے کیسے مضامین کیسی کیسی ندرت کے ساتھ بیان کئے ہیں۔

نشتریت: جگر کے خیال میں مذاقِ سلیم رکھنے والا اور عشق کرنے والا ہی غزل کا حق ادا کر سکتا ہے مگر حسن و عشق کے منازل سے گذرے ہوئے غزل گو کے کلام میں نشتر زیادہ ہوتے ہیں اور اسکے کلام میں حرارت ہوتی ہے جگر کو پہلے حسن سے واسطہ پڑا اسی وجہ سے انکی ابتدائی دور کی متعدد غزلیں اس سے شدت کے ساتھ متاثر ہوئیں۔

انھوں نے اپنی غزلوں میں واردات قلبیہ کو بیان کیا ہے داخلی اور قلبی واردات کی غم انگیز عکاسی میں انکو مہارت حاصل ہے انکا غم انکی زندگی کی بنیادی حقیقت ہے اور انھوں نے اپنے اس جذبہ کو بڑے درد انگیز لہجہ میں بیان کیا ہے انکے احساس تجربہ اور تخیل نے الفاظ کا لباس پہن کر شعری صورت اختیار کر لی ہے مندرجہ ذیل اشعار ان کے قلبی واردات غم کی بہترین عکاسی کرتے ہیں ؎

بیتابیوں نے کام دیا دست ناز کا — آخر لپٹ کے سو گئے درد نہاں سے ہم
وہ اشک بھری آنکھیں، یہ درد بھرے نالے — اللہ نہ دکھلائے جو وقت سحر دیکھا
ڈوب کر دل میں وہ نظریں تیر پیکاں ہو گئیں — رہ گئیں جو دل کے باہر نشتر جاں ہو گئیں
کیا خبر تھی خلش ناز نہ جینے دے گی — یہ تری پیار کی آواز نہ جینے دے گی
آہ رو لینے سے بھی کب بوجھ دل کا کم ہوا — جب کسی کی یاد آئی پھر وہی عالم ہوا
قید قفس میں یاد بہار آتی ہے مجھے — نشتر بنے ہوئے ہیں پر و بال آجکل
کیا جانئے کب تک مجھے فرقت میں کل آئے — دل کو ابھی روکا تھا کہ آنسو نکل آئے
توڑ کر سینہ و دل یار کا پیکاں نکلا — جان نکلی مرے اللہ کہ ارماں نکلا
یہاں تو کام ہے اک نشتر توجہ سے — نگاہ قہر رہے یا نگاہ ناز رہے
تو نے ٹانکے جو دیئے تھے وہ مگر ٹوٹ گئے — آج پھر خون، ابھر اس زخم جگر دیتا ہے

مریض محبت کا حال اپنے منفردانہ انداز میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

نازک ترے مریض محبت کا حال ہے — دن کٹ گیا تو رات کا کٹنا محال ہے

واردات عشق کی کیا بہترین مصوری کی ہے

اول اول آہ وہ دل میں مرے احساس عشق — آخر آخر اُف وہ نوک نیشتر پیسر لئے
تم نے نظریں پھیر لیں تو کیا ہوا — دل میں اک نشتر اترتا ہی رہا

مندرجہ ذیل شعر سے انکے ابتدائے عشق و شاعری پر روشنی پڑتی ہے ؎

"موجزن ارماں ہیں دل میں وہ ہے ایک نشتر — جو حسرت ہے پہلو میں وہ ایک چھری" ۱؎

عشق میں مبتلا ہو جانے کے بعد کی حالت ان الفاظ میں بیان کی ہے ؎

"کیا خبر تھی کہ عشق کے ہاتھوں — ق ایسی حالت تباہ ہوتی ہے
سانس لیتا ہوں دم الجھتا ہے — بات کرتا ہوں آہ ہوتی ہے" ۲؎

۱؎ "النقاد" مارچ ۱۹۱۴ء ص ۲۳ (یہ غزل جگر کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے راقم کو یہ غزل بشر صابری صاحب ہرور کے کتب خانہ سے دستیاب ہوئی) جو اب "یادگار جگر" میں شائع کر دی گئی ہے ۲؎ یہ قطعہ جگر کی بیاض میں ہے جو گوشہ جگر جامعہ ملیہ دہلی کی لائبریری میں ہے اب "یادگار جگر" میں شائع کر دیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعہ سے جگرؔ کے کلام میں انکے واردات قلبی کا پتا چلتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ ان کے نشتریت کا پہلو کس حد تک موجود ہے۔

سوز و گداز شاہ معین الدین ندوی نے صحیح لکھا ہے کہ:۔

"سوز و گداز تغزل کی روح ہے اسی سے تغزل کے جسم میں جان پڑتی ہے گداز عشق سے خالی تغزل ایک شراب بے کیف ہے اس لئے کہ تغزل نام ہے حسن و عشق کی واردات کی مصوری کا اور سوز و گداز ہی عشق میں جلا دیتا ہے اور یہی برق خرمن سوز سے کل عاشقی ہرا ہوتا ہے گداز عشق کا بیان فانی کا خاص حصہ ہے لیکن جگرؔ نے بھی ایک درد آشنا دل پایا ہے اس لئے انکے اشعار بھی اسی قرخرمن سوز کی شرر باریوں سے خالی نہیں ہیں"[1]

اس بیان کی تصدیق کے لئے جگرؔ کے اشعار ہی سے چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے وہ کہتے ہیں ؎

بخود نہ دیکھ لو انداز میرے مٹنے کا   یہ سانحہ نہ کبھی پھر نظر سے گذرے گا
قریب سرحد حرماں جگرؔ ٹھہر جاؤ   سنا ہے قافلۂ غم ادھر سے گذریگا
بیٹھے ہی بیٹھے آگیا کیا جانے کیا خیال   پہروں لپٹ کے روئے دل ناتواں سے ہم
پوچھیں گے سرگذشت مصیبت کی ابتدا   اب کے ملے اگر دل حسرت نشاں سے ہم
نہیں جاتی نمود سوز پنہانی نہیں جاتی   بجھا جاتا ہے دل چہرے کی تابانی نہیں جاتی
وہ یوں دل سے گذرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی   وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی
سوز غم ہجر بجھ نہ جائے   دھندلا سا چراغ ہے کسی کا[2]
یہ سوز نہاں نہیں ہے دل میں   جلتا ہے چراغ بے کسی کا

جگرؔ نے مندرجہ ذیل شعر میں درد نہاں سے لپٹ کر ایک خاص قسم کا گداز پیدا کر دیا ہے ؎

فرصت کہاں کہ چھیڑ کریں آسماں سے ہم   لپٹے پڑے ہیں لذت درد نہاں سے ہم

وہ درد کی لذت سراپا درد بن جانے میں سمجھتے ہیں ؎

ایک کیف ناتمام درد کی لذت ہی کیا   درد کی لذت سراپا درد بن جانے میں ہے
اللہ اللہ تیرے غم کی وسعتیں   کوئی عالم درد سے خالی نہیں
ترے بغیر تو جینا روا نہیں لیکن   میں کیا کروں جو ترا غم ہی جاں نواز رہے
مری سمت سے اسے اے صبا یہ پیام آخر غم سنا   ابھی دیکھنا ہو تو دیکھ جا کہ خزاں ہے اپنی بہار پر[3]

۱۔ فروغ اردو، اگست و ستمبر ۱۹۶۱ء ص ۱۱   ۲۔ میرؔ نے کہا ہے ؎

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے   دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

۳۔ شاد عظیم آبادی نے کہا ہے ؎

مرغان چمن کو پھولوں نے اے شادؔ یہ کہلا بھیجا ہے   آنا ہے اگر چہ تو آجاؤ ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

عجب انقلاب زمانہ ہے مرا مختصر سا فسانہ ہے
یہی اب جو بار ہے دوش پر یہی سر تھا زانوے یار پر

ایک زمانہ میں جگر خود سراپا گداز تھے اس کیفیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

رگ رگ میں دل تھا دل میں نہاں سوز و ساز تھا
وہ دن بھی کیا تھے جب میں سراپا گداز تھا

آہ رو لینے سے بھی کب بوجھ دل کا کم ہوا
جب کسی کی یاد آئی پھر وہی عالم ہوا

وہ اپنے سینۂ سوزاں کو داغ فرقت کے دہکتے ہوئے انگاروں سے تشبیہ دیتے ہیں ؎

داغ فرقت کے دہکتے ہوئے انگارے ہیں
ہاتھ لانا نہ مرے سینۂ سوزاں کے قریب

حالت دل مایوس کی دیکھی نہیں جاتی
اللہ کرے جلد شب غم کی سحر ہو

کیا پوچھتے ہو حالت بیمار شب غم کی
کچھ اور ابھی گھڑیاں باقی ہیں مصیبت کی

محبت میں ایک وقت دل پر ایسا بھی گذرتا ہے کہ ؎

رہ گیا ہے اب تو بس اتنا ہی ربط اک شوخ سے
سامنا جو وقت ہو جاتا ہے بھر آتا ہے دل

اور جب انکا محبوب وعدۂ وصل کے بعد بھی نہیں آتا ہے تو کہتے ہیں ؎

اب انکا کیا بھروسا وہ آئیں یا نہ آئیں
آ اے غم محبت تجھکو گلے لگائیں

آ کہ بیتاب انتظار ہوں میں
درد کی آخری پکار ہوں میں

نازک ترے مریض محبت کا حال ہے
دن کٹ گیا تو رات کا کٹنا محال ہے

پھنکا جاتا ہے دل، سوز غم سے
جہنم میں یہ چنگاری کہاں ہے

جگر نے دل کے درد و غم کی کیا خوب عکاسی کی ہے ؎

میں نے گھبرا کے جو اک روز جگر ق
دی یہ آواز کہاں ہے کوئی

درد چلا کر مجھی میں ہے وہ شوخ
غم پکارا کہ یہاں ہے کوئی

انکا محبوب بھی ایک گوشت پوست کا انسان تھا اپنے جسم میں دل اور دل میں محبت رکھتا تھا انکی محبت کے متعلق فرماتے ہیں ؎

آنکھوں کی نیند، دل کی خلش کا نہیں علاج
بستر سے آہ کرکے اٹھا کیجئے گا آپ

جب کچھ نہ بن پڑے گا مداوائے دردِ ہجر
رو رو کے مغفرت کی دعا کیجئے گا آپ

نہ جانے آہ کہ ان آنسوؤں پہ کیا گذری
جو دل سے آنکھ تک آئے مژہ تک آ نہ سکے

وہ غم کو بھی ایک طرح کی دولت سمجھتے ہیں ؎

پیہم جو آہ آہ کئے جا رہا ہوں میں
دولت ہے غم، زکوٰۃ دئیے جا رہا ہوں میں

کسکا شکوہ کہاں کا حالِ تباہ
اُف وہ نازک سی زیر لب اک آہ

۱؎ تقریباً اسی مضمون کو کسی شاعر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے ؎

سننے والے رو دئیے سن کر مریض غم کا حال
دیکھنے والے ترس کھا کر دعا دینے لگے

دل پھنک رہا تھا آتش ضبطِ فراق سے — دیپک کو میگھ مار بناتی چلی گئی
برابر سے بچ کر گذر جانے والے — یہ نالے نہیں بے اثر جانے والے

محبوب کے محبت کی کیسی سچی تصویر کھینچی ہے ۔

کپکپی سارے بدن میں زرد چہرہ دل اداس — چپ کھڑے ہیں دور میری خاک تربت دیکھ کر

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعہ سے جگر کے سوز قلب اور دل میں ایک خاص قسم کے گداز کا پتہ چلتا ہے

ترنم

ریچرڈ کا قول ہے کہ موسیقی موسیقیت شعری عظمت کی نشاندہی کرتی ہے جس شاعر کے کلام میں جس حد تک تیز موسیقی ابھرتی نظر آئے گی اسی حد تک اسکی شعری صلاحیتیں بھی ابھرتی رہینگی "۱" اور شیلی نے کہا ہے

OUR SWEETEST SONGS ARE THOSE THAT TELL OF SADDEST THOUGHT

یعنی ہمارے سب سے زیادہ شیریں نغمے وہی ہیں جن سے ہمارے دلدوز خیالات کا پتہ چلتا ہے ۔

ان اقوال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاعری میں موسیقیت اور موثر موسیقیت کے لئے غمگین خیالات کا بیان ضروری ہے اور موسیقی یا ترنم الفاظ کے امتزاج سے غزل کی تخلیق ہوتی ہے اسلئے جس شاعر کے کلام میں موسیقی یا ترنم الفاظ کے امتزاج سے جس قدر اسکے غمگین خیالات کی وضاحت ہوگی وہی اتنا ہی عظیم غزل گو شاعر ہوگا ۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ اردو شاعری میں ترنم سے پڑھنے کا رواج مومن سے شروع ہوا اور اساتذہ میں سائل دہلوی بھی ترنم سے پڑھتے تھے اور مجذوب پر شعر پڑھتے وقت ایک کیفیت طاری ہوجاتی تھی اور انکی اس کیفیت سے سامعین بھی اسی قدر متاثر ہوتے تھے لیکن ترنم سے غزل خوانی کا عام رواج جگر نے چلایا انکے غزل سنانے کے انداز نے اسقدر مقبولیت حاصل کی کہ عام طور سے انکی تقلید کی جانے لگی لیکن کسی کو جگر کا سا ترنم نصیب نہ ہوسکا اسکی وجہ یہ تھی کہ جگر صاحب کو ماحول موسیقی نواز ملا تھا انکی پہلی بیوی وحیدن بیگم اور مین پوری والی دو شیرازن بیگم "جنکو جگر صاحب دو سرکار" کہا کرتے تھے ایسے ہی طبقے سے تعلق رکھتی تھیں اسی وجہ سے جگر کو بھی موسیقی میں کافی درک پیدا ہوگیا خوش گلو وہ پہلے ہی سے تھے انکے سیدھے سادے جذبات، سادہ انداز بیان، نرم اور دھیمی دھن، انفعال اور خود سپردگی کی کیفیت، الفاظ و قوافی کا موزوں استعمال اور مترنم بحروں کے انتخاب نے انکے کلام میں سحر کی سی کیفیت پیدا کردی، انکی غزلوں کی ترنم کی اساس اس والہانہ پن پر بھی ہے جسکی تعمیر عشق اور رومان کے ملے جلے جذبات، اصلیت اور واقعیت اور ہلکی روایت کے ساتھ ذاتی تجربے سے ہوئی ہے انکے پڑھنے میں بھی ایک خاص والہانہ انداز اور بے پناہ موسیقیت ہوتی تھی ۔

ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ جگر کے تغزل میں ترنم و موسیقی کا ایک خاص مقام ہے یہی وہ خصوصیت ہے جسنے کلام شاعر بزبان شاعر کی اہمیت کو واضح تر کردیا ہے اور جگر کے لئے

۱۔ "فروغ اردو" فروری و مارچ سنہ ۶ ص ۲۱۰

ہماری قلبی گہرائیوں میں جگہ بنا دی ہے جگر کی نغمہ ریزی کا وصف نوازی روحِ انسانی کا ایک عنصر لطیف بن جاتی ہے اور انکے اشعار کو تاثر اور تاثیر کا طلسم بنا دیتی ہے۔

جگر کا خیال تھا کہ ترنم کے ذریعہ شاعر سامع کی ذہنیت اس بلند سطح تک لے آتا ہے جہاں وہ اسکے اشعار سمجھنے اور ان سے لطف اندوز ہونے کا اہل ہو جاتا ہے"[۲]

انھوں نے کہیں تو الفاظ کی تکرار و تواتر سے ترنم پیدا کیا ہے مثلاً ان غزلوں میں جنکے ایک ایک مصرعے درج ذیل ہیں

۱۔ حسن وہی ہے حسن جو ظالم

۲۔ نفس نفس متوجہ اگرچہ بیگانہ

۳۔ نظر نظر متبسم اگرچہ بے پروا

۴۔ نغمہ ترا نفس نفس جلوہ ترا نظر نظر

۵۔ ہمہ شعر و نغمہ ہمہ رنگ و نکہت

اور کہیں اپنی چھوٹی بحروں کی غزلوں کو اپنے دل کی کیفیات و واردات اور جذبات کا آئینہ دار بنا دیا ہے اور انہیں الفاظ کے انتخاب سے اور لہجے سے ایک خاص قسم کی موسیقی بھی پیدا کر دی ہے اسکی چند مثالیں ملاحظہ ہوں

ہائے وہ غم کی نرم فرمائیاں — بھیگی راتیں اور وہ تنہائیاں

نگاہوں کا مرکز بنا جا رہا ہوں — محبت کے ہاتھوں لٹا جا رہا ہوں

مجھے دیں نہ غیض میں دھمکیاں، گریں لاکھ بار یہ بجلیاں
مری سلطنت یہی آشیاں، مری ملکیت انھیں چار پر

میں رہیں درد سہی مگر، مجھے اور چاہیئے کیا جگر
غم یار ہے مرا شیفتہ، میں فریفتہ غم یار پر

دل گیا رونقِ حیات گئی — غم گیا ساری کائنات گئی

ان کے بہلائے بھی نہ بہلا دل — رائیگاں سعیِ التفات گئی

مرگِ عاشق تو کچھ نہیں لیکن — اک مسیحا نفس کی بات گئی

عنایت کی جسپر نظر دیکھتے ہیں — ہم اسکا دل، اسکا جگر دیکھتے ہیں

وہی راہ چلتے ہیں عشاق ان کے — کہ جس راہ کو پُر خطر دیکھتے ہیں

چھپتے ہیں، اور چھپا نہیں جاتا — اس ادائے حجاب نے مارا

مرا جب بُرا حال سن پائے گا — خراماں، خراماں چلے آئے گا

ع۱۔ "فروغ اردو" فروری و مارچ سنہ ۶۱ء ص ۴۳۹،

ع۲۔ "تذکرۂ جگر"، ص ۱۱۹

وہ بچا بچا کر چلنے کے بجائے محبت کے چوٹ کھانے کو زیادہ بہتر سمجھتے تھے ؎

نہیں یہ کہ بچتا بچاتا چلا جا
محبت کی ہر چوٹ کھاتا چلا جا

جوانی کے عالم کی کیسی مترنم انداز میں مصوری کی ہے ؎

قدم ڈگمگائے نظر بہکی بہکی
جوانی کا عالم ہے سرشاریاں ہیں

وہ اپنے قصۂ عشق کو دائمی سمجھتے تھے کیونکہ ان کی کہانی زندہ دلوں کی کہانی تھی ؎

مرا قصۂ عشق فانی نہیں ہے
یہ مردہ دلوں کی کہانی نہیں ہے

محبوب کی ایک خاص کیفیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

اسنے شانوں پہ زلف برہم کی
خیر یارب نظام عالم کی

اس شعر میں بھی "شب" اور "طرب" سے ایک خاص قسم کا ترنم پیدا کیا ہے ؎

تیرا تصور شب ہمہ شب
خلوتِ غم بھی بزمِ طرب

دل میں کسی کے راہ کئے جا رہا ہوں میں
کتنا حسیں گناہ کئے جا رہا ہوں میں

وہ اپنی کیفیت کو خود ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ؎

وہ اشک و تبسم کا پرکیف موسم
وہ شعر و ترنم کا رنگیں زمانہ

نغموں پہ میرے اور تو وہ کچھ نہ کہہ سکے
کچھ مسکرا کے پھول سے برسا کے رہ گئے

اب جگر کی کچھ طویل مگر مترنم اور رواں بحروں کے چند اشعار بھی ملاحظہ فرمائیے۔
ان اشعار میں جگر کا الفاظ کے انتخاب سے ترنم پیدا کرنے کا ملکہ دیکھئے ؎

کدھر ہے تیرا خیال؟ اے دل! یہ برہم کیا کیا سما رہے ہیں
نظر اٹھا کر تو دیکھ ظالم! کھڑے وہ کیا مسکرا رہے ہیں

خوشا یہ پندار عشق اپنا زہے شکست غرور ان کی
وہ ہم سے نظریں ملا رہے ہیں ہم ان سے نظریں ہٹا رہے ہیں

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ

میرا جو حال ہو سو ہو برق نظر گرائے جا
میں یوں ہی نالہ کش رہوں تو یوں ہی مسکرائے جا

مجھے دے رہے ہیں تسلیاں وہ ہر ایک تازہ پیام سے
کبھی آکے منظر عام پر کبھی ہٹ کے منظر عام سے

وہ کوئے قاتل کی طرف بھی شوق شہادت میں گنگناتے رقص کرتے اور جھومتے ہوئے جاتے ہیں ؎

واہ رے شوق شہادت کوئے قاتل کی طرف
گنگناتا، رقص کرتا، جھومتا جاتا ہوں میں

عشق کے متعلق اپنے تجربہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے ؎

کیا بتائیں، عشق ظالم کیا قیامت ڈھائے ہے
یہ سمجھ لو جیسے دل سینے سے نکلا جائے ہے

شباب رنگیں، جمال رنگیں، وہ سر سے پا تک تمام رنگیں
تمام رنگیں بنے ہوئے ہیں، تمام رنگیں بنا رہے ہیں

یہ موج و دریا، یہ ریگ وصحرا، یہ غنچہ وگل، یہ ماہ و انجم
ذرا جو وہ مسکرا دیئے ہیں یہ سب کے سب مسکرا رہے ہیں

مندرجہ بالا اشعار کے پیش نظر جگرؔ کا یہ دعویٰ صحیح معلوم ہوتا ہے ؎

بزم مشاعرہ ہے یا گلشن تخیل
بلبل چہک رہا ہے یا حضرت جگرؔ ہیں

غرضکہ جگرؔ کے کلام میں ترنم کا بھی ایک خاص درجہ ہے انھوں نے اپنے کلام میں ترنم پیدا کرنے کے لئے مترنم بحروں کا انتخاب کیا اور الفاظ کے انتخاب اور ان کے تواتر و تکرار سے بھی اپنے اشعار کو مترنم بنا دیا۔

فارسی ترکیبیں نظم و نثر دونوں میں الفاظ کی سادگی اور دلنشیں ترکیبوں کے استعمال سے ایک خاص قسم کی دلکشی پیدا ہو جاتی ہے اور فارسی کے شیریں الفاظ اور دلنشیں ترکیبوں کے برمحل استعمال سے تو شاعری جگمگا اٹھتی ہے فارسی کی دلآویز ترکیبوں سے قدیم وجدید تمام شعراء نے اپنا کلام آراستہ کیا ہے جگرؔ بھی اس سے نہ بچ سکے انھوں نے حتی الامکان فارسی ترکیبوں کے استعمال سے احتراز کیا ہے لیکن بعض موقعوں پر انھوں نے فارسی ترکیبوں کو اس طرح کھپایا ہے کہ فارسی اور اردو کی مثالی آمیزش سے ایک طرح کا خوش نظر گنگا جمنی رنگ پیدا ہو گیا ہے جہاں بھی انھوں نے فارسی ترکیبوں کو اردو میں استعمال کیا ہے وہ ایسی ہیں جو اس زبان میں کھپ سکیں اور اجنبی بھی نہ معلوم ہوں ہم ذیل میں چند مثالیں ملاحظہ ہوں

ہاں نگاہِ شوق وہ اٹھی نقاب
آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

شیشہ مست و بادہ مست و حسن مست و عشق مست
آج پینے کا مزا پا کر بہک جانے میں ہے

حرم و دیر نظر آتے ہیں سب سر بسجود
جلوہ گر کون ہے شوق جبیں سازیں ہے

ذرے ذرے سے نمایاں شان قدرت دیکھکر
کھل گئیں آنکھیں، طلسم حسن فطرت دیکھکر

غضب تھا آج گلشن میں یہ حسرت خیز نظارہ
ادھر بلبل کا دم ٹوٹا ادھر فصل بہار آئی

برباد دلوں نے لوٹ کے سامان آرزو
ناکامیوں کو حاصل عرفاں بنا دیا

مندرجہ ذیل شعر میں "شیشہ بدست" اور "بادہ بجام" ترکیبوں کو کس کمال شاعرانہ سے استعمال کیا ہے ؎

مجھے چاہیئے وہی ساقیا جو برس چلے جو چھلک چلے
ترے حسن شیشہ بدست سے، تری چشم بادہ بجام سے

ہزار جان گرامی، فدائے این نسبت
کہ میری ذات سے اپنا بتا دیا تو نے

مندرجہ ذیل اشعار میں انھوں نے مختلف فارسی ترکیبوں اور بندشوں مثلاً "دل ربودہ، پیرہن دریدہ، آہستہ خرامی تا چند، سرمایۂ جاں" وغیرہ کا استعمال بڑی کامیابی کے ساتھ کیا ہے ؎

بجا ہے حسن اگر مجھ پہ اعتماد کرے
دلِ ربودہ و آہِ شکستہ پا ہوں میں

اے جانِ بہار تیری خاطر
ہر پھول ہے پیرہن دریدہ

جلوۂ دوست، یہ آہستہ خرامی تا چند
ندیاں سوکھ چلیں شوق میں طوفانوں کے

حسن جس رنگ میں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے
اہل دل کے لئے سرمایۂ جاں ہوتا ہے

اک یہی حسن یقیں تسکینِ جاں و دل سہی
مجھ سے تو غافل نہیں ہے تجھ سے میں غافل سہی

ان اشعار کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جگرؔ کو فارسی ترکیبوں کے استعمال کا بھی اچھا خاصہ سلیقہ تھا اگرچہ وہ ایسی ترکیبوں کا استعمال بذات خود پسند نہیں کرتے تھے لیکن جہاں کہیں ترکیبیں انھوں نے استعمال کی ہیں پورے شاعرانہ کمال کے ساتھ استعمال کی ہیں۔

(ب) جگرؔ کے نقاد

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جگرؔ کے نقادوں[1] کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے نقاد اور تنقید کے متعلق بعض اہل قلم (جو دنیا ئے اردو ادب میں اپنا ایک بلند مقام رکھتے ہیں) کی معقول رائیں پیش کر دی جائیں اور انھیں اصولوں کی مدد سے جگرؔ کے نقادوں کو جانچا جائے کہ وہ جگرؔ پر تنقید کرنے میں کس حد تک حق بجانب ہیں۔

نقاد کے فرائض

سب سے پہلے ہم یہ دیکھیں گے کہ نقاد کے کیا فرائض ہیں نقاد کے فرائض کے متعلق کلیم الدین احمد لکھتے ہیں :۔

"نقاد کا یہ اہم ترین فرض ہے کہ وہ ذاتی جذبات، رجحانات، تعلقات کو وقتی طور پر فراموش کر دے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

تنقید کے لئے تیز ادراک، زندہ احساس، عمیق دماغ، وسعت نظر جو دنیائے ادب کے ساتھ ساتھ دنیائے علوم و فنون پر محیط، مذاق صحیح، ان جملہ اوصاف کی ضرورت ہے" ع[2]

آل احمد سرور کا خیال ہے کہ نقاد جب تک کسی چیز کی روح تک نہیں پہنچ جائے گا وہ اسکے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ :۔

"رچرڈس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک اچھے نقاد میں تین خوبیاں ہونی چاہئیں اُس کیفیت ذہنی تک پہونچنا جو مصنف یا تصنیف کی ہے، تجربات اور تجربات میں امتیاز کرنا تاکہ ان کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے، قدروں کا نباض ہونا . . . اچھا نقاد چیزوں کو پسند کرے یا نہ کرے اُن کی اچھائی کا اعتراف تو کر سکتا ہے

ع۱ ناظرین سے عرض ہے کہ "جگر کے نقاد" میرے "مقالہ" کا صرف ایک عنوان ہے اور جگرؔ کی مخالفت اور موافقت میں اس قدر لکھا گیا ہے کہ اس کے لئے ایک الگ "باب" نہیں بلکہ الگ سے ایک "ضخیم کتاب" کی ترتیب دینے کی ضرورت ہے اگر حالات نے اجازت دی تو انشاء اللہ "جگر کے نقاد" پر الگ سے ایک کتاب ترتیب دیدوں گا اس موقع پر تفصیل کی گنجائش نہیں اس لئے جہاں تک ممکن ہو سکے گا اس عنوان کے تحت مختصراً جگرؔ کے نقادوں پر اس طرح عرض کیا جائے گا کہ مطلب بھی خبط نہ ہونے پائے اور ناظرین کے سامنے جگرؔ کے نقادوں کے متعلق ایک خاکہ بھی پیش ہو جائے۔

ع۲ "اردو تنقید پر ایک نظر" (حصہ اول ص۶۶ تا ۱۱)

نارمل تنقید بہت مشکل کام ہے اس میں نئی بات کی خاطر، یا انوکھی بات کی خاطر صحیح بات کو قربان نہیں کیا جاتا . . . . .

شاعری اور تنقید دو علیحدہ چیزیں ہیں مگر دونوں میں ایک اہم رشتہ بھی ہے کوئی شاعر اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک وہ شعر، شاعری، شعر کے متعلق شعور نہیں رکھتا نہ کوئی نقاد اس وقت تک اچھا نقاد بن سکتا ہے جب تک وہ شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی اس خیال کو دوبارہ اپنے ذہن میں پیدا نہ کرے جو شاعر کے ذہن میں تھا۔“ عا سرورؔ صاحب ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

”نقاد مبصر ہوتا ہے مبلغ یا مفتی نہیں ہوتا وہ بعض رنگوں کا مداح ہو سکتا ہے بعض کا مخالف مگر وہ محض ایک طرفہ نہیں ہو سکتا . . . . ادبی تنقید محض علمی صحیفہ نہیں ہے علم کا عطر ہے۔“ عا۔

اور سید احتشام حسین لکھتے ہیں :۔

”نقاد کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ وہ ایسا پڑھنے والا ہے جو سمجھتا بھی ہے اس لئے کم سے کم اس کے لئے تو یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ادیب کی ذہنی ساخت، افتاد مزاج اور فلسفۂ حیات سے واقف ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عام پڑھنے والے اور نقاد میں فرق یہ ہوتا ہے کہ نقاد پسندیدگی اور ناپسندگی کی تشریح بھی کر سکتا ہے اور وجہیں بھی بیان کر سکتا ہے عام مطالعہ کرنے والا نتیجہ کے لحاظ سے نقاد کا ہم نوا ہوتے ہوئے بھی صرف اپنے وجدان پر بھروسہ کرتا ہے“ عـ۳

مجنوںؔ گورکھپوری کی رائے ہے کہ :۔

”بغیر ماضی کے مطالعہ، حال کے مشاہدے اور مستقبل کے تصور کے نہ کوئی صحیح معنوں میں فنکار ہو سکتا ہے اور نہ نقاد۔ اس لئے کہ ان تینوں اجزا کے امتزاج کے بغیر ہمارے اندر تواریخی بصیرت نہیں پیدا ہو سکتی ہے اور یہ تواریخی بصیرت کے بغیر نئی تخلیق ایک اسقاطی کوشش سے زیادہ قابل قدر نہیں ہو سکتی“ عـ۴

عـ۱ ”نئے اور پرانے چراغ“ (دیباچہ) صـ ۸-۹و۱۷

عـ۲ ”ادب اور نظریہ“ صـ ۷-۸

عـ۳ ”ادب اور سماج، مطبوعہ ۱۹۴۸ء صـ ۱۷-۱۸

عـ۴ ”نکات مجنوں“ صـ ۶

سید شبیہ الحسن نونہروی کی یہ رائے بھی قابل اعتنا ہے کہ :-

" نقاد کا بنیادی کام فن کی قدر و قیمت معیّن کرنا ہے - - - - - نقاد کے فرائض کی اگر تعین کی جائے تو ایک موٹی تقسیم یوں ہی کی جا سکتی ہے کہ ادب کیا ہے ؟ کیونکر پیدا ہوتا ہے اور اس کی قدر و قیمت کیا ہے - - - - - تنقید کے سلسلے میں فنکار کی شخصی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے کسی فن پارہ کو فن کار کی شخصیت سے جدا کر کے سمجھنے کا خیال مہمل ہے فنکار کی شخصیت کو سمجھتے وقت تحلیل نفسی سے نقاد کا گریزاں رہنا عملی طور پر فن کو فنکار کی شخصیت سے جدا کر کے سمجھنے کے مرادف ہے" ع ۱

چونکہ فنکار کا فن مثلاً شاعر، اس کا کلام اس کے باطن کا آئینہ ہوتا ہے اس کے اشعار میں اس کا زاویہ نگاہ، اس کا انداز اور اس کا ظرف جھلکتا ہے اس لئے اسکے کلام پر نقد و تبصرہ کرتے وقت اس کے اخلاق و کردار کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے اور شاعر کے صحیح ذوق کو متعین کرنے کے لئے نیاز فتحپوری کی تحریر کے مطابق

" ہم کو زیادہ تر اس کے اچھے اشعار سامنے رکھنا چاہئے بشرطیکہ اس کی تعداد معقول ہو اور فنی حیثیت متعین کرنے کے لئے طب و یابس سبھی کو دیکھنا چاہئے" ع ۲

جگر مرادآبادی کے خیال میں خود شاعر سے زیادہ اسکے کلام پر کسی دوسرے کو نقد و نظر کا حق ہی نہیں وہ لکھتے ہیں کہ :

" امکان ہے کہ اکثر حضرات اپنے کلام پر اپنی ہی جنبشِ قلم کو پسند نہ فرمائیں گے لیکن اگر از راہ انصاف غور فرمائیں گے تو یقیناً مان لینا پڑے گا کہ شاعر سے زیادہ کسی دوسرے شاعر یا غیر شاعر کو اس کے کلام پر نقد و نظر کا حق نہیں بشرطیکہ احتساب نفس کے ساتھ ہو . . . ہندوستان میں ناقدین کا گروہ اس قدر پست و گمراہ کور چشم بن چکا ہے کہ اسے کھلے کھلے اور ابتدائی امور ضروری تک کی خبر نہیں کیا اس کا پہلا فرض نہیں کہ وہ ممالک کی آب و ہوا کے ماتحت مشرق و مغرب کے مزاج کا تعین کر لینے کے بعد آگے قدم اٹھائے لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے غلامانہ ذہنیت کا یہ عالم ہے کہ مشرق کی ہر چیز کی تنقید مغربی نقطۂ نگاہ سے کی جاتی ہے یہاں تک کہ اسناد و دلائل میں بھی ہمارے

ع ۱ " تنقید و تحلیل" ص ۶۱ و ۶۶

ع ۲ " نگار" جولائی ۱۹۶۱ء ص ۵

ناقدین کی تمام و کمال توجہ مغرب ہی کی جانب منعطف رہتی ہے"۔ ع ۱

اس کے علاوہ جگرؔ کا یہ بھی خیال ہے :-

" شاعر کو سمجھنے کے لئے اس کی زندگی کا جائزہ لیا جائے نقابل اچھی چیز نہیں دیکھنا یہ چاہئے کہ خود اس نے کیا کہا ہے کوئی شاعر بھی نئی بات نہیں کہتا جو کچھ کہتا ہے کسی نہ کسی شکل میں پہلے سے موجود ہے قابل غور صرف یہ بات ہے کہ جو کچھ اس نے کہا ہے اس پر اپنی مہر بھی لگائی ہے یا نہیں"۔ ع ۲

جگر صاحب کے اس بیان کے ثبوت میں کہ شاعر کے کلام پر کسی دوسرے کو نقد و تبصرہ نظر کا حق نہیں انھیں کا ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے ایک دفعہ

" بحث جگرؔ صاحب کے اس شعر پر تھی ؎

زمانہ گرم رفتار ترقی ہوتا جاتا ہے
مگر اک چشم شاعر ہے کہ پرنم ہوتی جاتی ہے

ایک صاحب نے غیر ترقی پسند ادب کے رجعت پسندانہ کردار کی مثال میں جگر صاحب کا یہی شعر پڑھا جگر صاحب نے جواب میں جو کچھ کہا اس کے الفاظ اس قسم کے تھے " کیوں جناب اس شعر سے رجعت پسندی کا اظہار کیسے آپ نے سمجھا ؟

معترض :- زمانہ کی ترقی اور اس سلسلے میں اس کی گرم رفتاری پر چشم شاعر اگر آنسو بہائے تو شاعر کی رجعت پسندانہ ذہنیت کا اظہار نہیں تو اور کیا ہے ؟"

کمال ذہانت کے ساتھ جگر صاحب نے کہا۔ " آپ اسے طنز کیوں نہیں سمجھتے جو ارتقار پر خوش ہونے کے بجائے آنسو بہانے والے شاعر پر کیا گیا ہے اس ایک اشارہ نے جگر صاحب کے مفہوم اتنا واضح کر دیا کہ ان کا یہی شعر رجعت پسند ادب سے بیزاری کا ایک بین ثبوت ہو گیا"۔ ع ۳

اس مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ واقعی شاعر کے کلام کی تشریح اس سے بہتر اور کوئی دوسرا شخص نہیں کر سکتا لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ دوسرے حضرات شعرا کے کلام پر تنقید و تبصرہ کرنا ہی چھوڑ دیں البتہ شعر کو سمجھنے اور اس پر تنقید کرتے وقت بڑی سنجیدگی و ذہانت سے غور و فکر

ع ۱ "تحریک" اکتوبر ۱۹۶۲ء ص ۳۳

ع ۲ "فروغ اردو" جنوری ۱۹۶۲ء ص ۴۷

ع ۳ "فروغ اردو" فروری و مارچ ۱۹۶۱ء ص ۲۶۷-۲۶۸

کرکے کوئی رائے پیش کریں۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ نقاد کا فرض ہے کہ وہ تنقید کے وقت ذاتی جذبات و رجحانات کو دور رکھے، کلام یا تصنیف کی روح تک پہونچنے کی کوشش کرے تجربات اور تجربات میں امتیاز کرے، نئی یا انوکھی بات کی خاطر صحیح بات کو قربان نہ کردے، یکطرفہ فیصلہ نہ کرے، ماضی حال اور مستقبل کے تصور کو ذہن نشین رکھے، فنکار کی شخصی اہمیت کو نظرانداز نہ کرے، ممالک کی آب و ہوا کے ماتحت فنکار کا مزاج کا تعین کرے مشرق کے ادب پر مغربی نقطۂ نگاہ سے تنقید نہ کرے وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک شعر و شاعری کا تعلق ہے ناقد کو چاہیئے کہ وہ شاعر کے بہترین اشعار کو شاعرانہ حیثیت سے ان کو صحیح درجہ دے اسکے کلام میں شاعری کی اصلی روح کو تلاش کرے اور اگر اس معیار پر اس کا کلام پورا اترے تو اسکے شاعرانہ کمال سے انکار نہ کرے۔

تنقید کیا ہے؟

نقاد کے فرائض کا جائزہ لینے کے بعد یہ دیکھنا چاہیئے کہ تنقید کیا ہے اس سلسلے میں بھی ہم پہلے دنیائے اردو ادب کے بلند مقام نقادوں کی رایوں کو حوالے کے ساتھ نقل کرنے کے بعد کوئی رائے قائم کرینگے۔

تنقید کے متعلق کلیم الدین احمد لکھتے ہیں کہ

"اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر عـ۱ ۔ ۔ ۔ ۔

تنقید کوئی کھیل نہیں ہے جسے ہر شخص بہ آسانی کھیل سکے یہ ایک فن۔ ایک صناعی ہے

عـ۱ یہ کلیم الدین کی انتہاپسندی ہے وہ مشرقی ادب کو مغربی عینک سے دیکھتے اور اسی معیار سے اس پر تنقید کرنے میں کلیم الدین صاحب اردو ادب کے ساتھ یہ انصاف نہیں کرتے ہیں انھیں کو جواب دینے کیلئے جگر نے کہا تھا کہ ہمارے ناقدین مغرب زدہ ہیں۔

اگر ایمانداری سے دیکھا جائے تو کلیم الدین کے اس بیان میں صداقت کا فقدان ملے گا کیونکہ اردو ادب میں بھی تنقید کا وجود رہا ہے اور اب بھی ہے یہ بات دوسری ہے کہ اس میں وہ معیار نہیں قائم کیا جا سکا ہے جو مغربی ادب میں ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی ادب اردو سے کئی سو سال زیادہ قدیم ہے اور ان میں بہت سے تجربات کئے جا چکے ہیں اس کے مقابلہ میں ابھی اردو ادب کو نہیں پیش کیا جا سکتا۔

صرف ایک فن ہی نہیں یہ ایک مشکل ترین فن ہے ہر فن کی طرح اس کے بھی اصول و ضوابط اور اغراض و مقاصد ہیں ادب و زندگی میں اس کی مخصوص و قیمتی جگہ بھی ہے اس لئے ہر شخص ایک نقاد کے فرائض انجام نہیں دے سکتا ہے نقاد شاعر و انشاپرداز کی طرح چند مخصوص اوصاف کا حامل ہوتا ہے جو اسے عوام سے ممیز کرتے ہیں اسے فنِ تنقید کے ہر پہلو سے واقفیت ہوتی ہے . . . . نقاد میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ شاعر کے دماغ میں سما کر اس کے تجربہ کے ہر عنصر کو سمجھ سکتا ہے اور خود سمجھ کر دوسروں کو سمجھا بھی سکتا ہے وہ اس تجربے کی قدر و قیمت کا اندازہ کرتا ہے اور اس سلسلہ میں اپنے ذاتی خیالات تاثرات جذو رجحانات کو وقتی طور پر فراموش کر دیتا ہے اردو نقاد عموماً ان اوصاف کے حامل نہیں ہوتے ہر شخص محض اپنی پسند و نفرت کا اظہار کرتا ہے اور بزعم خود ایک جلیل القدر نقاد بن بیٹھتا ہے،، ع۱

پروفیسر رشید احمد صدیقی فرماتے ہیں!۔

"تنقید نہ یزداں کا فن ہے نہ اہرمن کا وہ انسان کا فن ہے اور انسان کے ادبی کارناموں کے پرکھنے کا فن . پرکھنے میں دیانت، دانشمندی اور احترام سے کام لینا چاہئے نہ کہ نالۂ و نفیر سے شعر و ادب کی دنیا میں نہ ہر مرض کی دوا درود شریف ہے نہ ع۔ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند!

تنقید نگار نہ تو پولیس کے مانند روزنامچے تصنیف کرتا ہے نہ شانہ نشین فرشتوں کے مانند اعمال نامہ مرتب کرتا ہے نہ عدالتوں کی طرح قانون کا منھ تکتا ہے . . . . میں اکثر نقادوں سے بالخصوص غزل کے نقادوں سے کہوں گا،

دل بدنہی بخوب ما، طعنہ مزن بزشت ما!

- - - - - - - - - - - - -

جب تک نقاد فنکار کے برابر یا اس سے بلند نہ ہو اسے تنقید کی ذمہ داری نہ لینی چاہئے اسی طرح فنکار نقاد کے برابر یا اس سے بلند نہ ہو اس کو کسی ادبی یا شعری تخلیق کے پیش کرنے میں تامل کرنا چاہیئے اعلیٰ تنقید ہمیشہ اعلیٰ تخلیق سے برآمد ہوتی ہے اور اعلیٰ تخلیق کا مدار تمام تر اس پر ہے کہ تخلیق کرنے والا کائنات کی عظمت ادرفن وزندگی کی اعلیٰ قدروں کا حامل ہے یا نہیں شعر و ادب کا اعلیٰ مقام وہ ہے جہاں نقاد اور فنکار کو ایک دوسرے سے ممیز کرنا ناممکن ہو جاتا ہے،، ع۲

ع۱ "اردو تنقید پر ایک نظر" (حصۂ اول) ص۹۵ ع۲ "جدید غزل" (مطبوعہ ۱۹۵۵ء) ص۲۱-۲۲

آل احمد سرور لکھتے ہیں :۔

"تنقید ایک فن ہے مگر اس فن کے حاصل کرنے کے لئے شعریت، دوسرے کی بنائی ہوئی دنیا یا اس کے تجربہ تک پہنچنے کی صلاحیت اور زندگی کی اچھی قدروں کا شعور ضروری ہے رچرڈس نے غلط نہیں لکھا ہے۔

وہ جو کام ایک ڈاکٹر جسم کے لئے کرتا ہے تنقید ادب کے لئے کرتی ہے وہ ذہنی صحت کا معیار قائم کرتی ہے۔" ع۱

سرور صاحب دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

"بڑے تخلیقی کارنامے بغیر ایک اچھے تنقیدی شعور کے وجود میں نہیں آ سکتے تخلیقی جوہر بغیر تنقیدی شعور کے گمراہ ہو جاتا ہے اور تنقیدی شعور بغیر تخلیقی استعداد کے بے جان رہتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

تخلیقی ادب میں تنقیدی شعور کی کارفرمائی ہوتی ہے تنقید اس کو واضح کر دیتی ہے تنقید خلاصہ یا تنقیص نہیں ہے مگر اس کا تخلیق کے بنیادی خیال تک پہونچنا ضروری ہے ۔ ۔ ۔

بڑی تنقید تخلیقی ادب سے کسی طرح کمتر نہیں ہوتی بلکہ وہ خود تخلیق ہو جاتی ہے ۔ ۔ ۔ تنقید کے لئے ایک مقدس سنجیدگی کی ضرورت ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ہڈسن نے تو اور صاف کہا ہے کہ وہ سچی تنقید بھی چونکہ اپنا مواد اور جذبہ زندگی سے لیتی ہے اس لئے اپنے رنگ میں وہ بھی تخلیق ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اچھی تنقید کسی طرح اچھی تخلیق سے کم نہیں بلکہ بعض وجوہ سے اس پر فوقیت رکھتی ہے ۔ ۔ ۔

اچھی تنقید محض معلومات ہی فراہم نہیں کرتی بلکہ وہ سب کام کرتی ہے جو ایک مورخ ماہر نفسیات، ایک شاعر اور ایک پیغمبر کرتا ہے تنقید ذہن میں روشنی پیدا کرتی ہے اور یہ روشنی اتنی ضروری ہے کہ بعض اوقات اس کی عدم موجودگی میں تخلیقی جوہر میں کسی شے کی کمی محسوس ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ تنقید کا کام فیصلہ ہے تنقید دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیتی ہے تنقید وضاحت ہے، صراحت ہے، ترجمانی ہے، تفسیر ہے، تشریح ہے، تحلیل ہے، تجزیہ ہے، تنقید قدریں متعین کرتی ہے ادب اور زندگی کو پیمانہ دیتی ہے تنقید انصاف کرتی ہے، ادنیٰ اور اعلیٰ، جھوٹ اور سچ، پست و بلند کے معیار قائم کرتی ہے تنقید ہر دور کی ابدیت اور ابدیت کی

ع۱ " تنقید کیا ہے" (مطبوعہ ۱۹۴۷ء) ص ۳۲

عصریت کی طرف اشارہ کرتی ہے، تنقید ادب میں ایجاد کرنے اور محفوظ کرنے دونوں کا کام انجام دیتی ہے وہ بت شکنی بھی کرتی ہے اور بت گری بھی۔ تنقید کے بغیر ادب ایک ایسا جنگل ہے جس میں پیداوار کی کثرت ہے موزونیت اور قرینے کا پتہ نہیں۔۔۔ ۔۔۔۔ فاعلاتن فاعلات کی گردان اگرچہ تنقید نہیں ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ کوئی بھی اچھا نقاد عروض اور اس کے قواعد سے بے نیاز ہو سکتا ہے ادب کا اچھا نقاد زبان کا بھی اچھا نباض ہوتا ہے،، ع۱

تنقید کے سلسلے میں شبیہہ الحسن نونہروی کی یہ رائے بھی اہم ہے کہ:-

"وہ وقت ختم ہو چکا جب ادب کو سمجھنے کے لئے اصول بلاغت کی کتابیں اور لغت کام آتی تھی اب ادب کو زندگی کے نامیاتی انسائیکلوپیڈیا ہی کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے اس سلسلے میں زبان واسلوب۔ مکان و زماں، فنکار کی شخصیت اور ذاتی زندگی اسکے عقائد و توہمات معاشی اور معاشرتی روابط زمانہ کی تاریخی اور تہذیبی قوتیں اور محرکات بیرونی دنیا کے مختلف الاقسام ہنگامے اور پھر فنکار کے ذہن کے اندرونی ہنگامے سب ہی پر غور کرنا پڑتا ہے یہ تمام مراحل اور اسی قسم کے اور بہت سے مراحل اسوقت تک طے نہیں ہو سکتے جب تک کہ چند دوسرے علوم سے کام نہ لیا جائے یہ پس منظری معلومات اگرچہ فن تنقید سے کوئی براہ راست ربط نہیں رکھتے مگر ان کے بغیر ادب کو باقاعدگی کے ساتھ سمجھنا ممکن نہیں ہے،، ع۲

غزل کی تنقید میں اس بات کو بھی دھیان میں رکھنا چاہیے جس کی طرف عندلیب شادانی نے اشارہ کیا ہے انھوں نے لکھا ہے کہ:-

" درحقیقت شدت احساس اور خلوص جذبات ہی سے غزل غزل بنتی ہے اس کے بغیر وہ دماغی ورزش ہے اور بس،، ع۳

پروفیسر رشید احمد صدیقی کا کہنا ہے کہ:-

" جگر اور فانی دونوں کا شاعری کا نقطۂ نظر شخصی شاعرانہ ہے غزل گوئی میں ہوتا بھی کچھ ایسا ہی ہے، شاعری شخصی بھی ہوتی ہے آفاقی بھی۔ میں دونوں کا قائل ہوں لیکن سر اسی کے آگے جھکاتا ہوں جس کے یہاں دونوں میں تمیز کرنا دشوار ہو جائے،، ع۴

ع۱ "تنقید کیا ہے،، (مطبوعہ ۱۹۴۷ء) ص ۱۶۷ تا ۱۸۴

ع۲ " تنقید و تحلیل،، ص ۵۸-۵۹

ع۳ "دور حاضر اور غزل گوئی،، مطبوعہ ۱۹۵۱ء ص ۱۴

ع۴ "آتش گل،، مطبوعہ ۵۶ء ص ۲۵

نیاز فتحپوری لکھتے ہیں :-

"اچھی شاعری تمام تر اسلوب بیان کی خوبی پر منحصر ہے، اور اصلاحی حیثیت سے یہ بڑی وسیع المعانی چیز ہے اس میں صحت زبان، صحت الفاظ و تراکیب خیال، ندرت اظہار کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں شامل ہیں مثلاً یہ کہ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ شعر کے الفاظ سے بھی متبادر ہے یا نہیں، اس نے محض وزن پورا کرنے کے لئے کسی غیر ضروری لفظ کا اضافہ تو نہیں کیا، یا کوئی ضروری لفظ ترک تو نہیں کر دیا، دونوں مصرعوں میں ربط تسلسل پایا جاتا ہے یا نہیں، کوئی ایسا دعویٰ تو نہیں کیا گیا جس کا ثبوت پیش نہ کیا گیا ہو کوئی نحوی غلطی تو اس میں نہیں پائی جاتی صرف خطاب و مخاطب دونوں واضح ہیں یا نہیں، شعر میں کوئی ایسا ابہام تو نہیں جو ذہن سامع کو الجھن میں ڈالدے، تشبیہ، استعارہ و کنایہ قریب الفہم ہیں یا نہیں، تعبیر و تعلیل میں کوئی منطقی تضاد تو نہیں، مضمون عامیانہ و سخیف تو نہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ شعر بغیر غور و تامل کے فوراً سمجھ میں آجاتا ہے یا نہیں۔

الغرض شعر کو مفہوم و ٹکنک کے لحاظ سے سانچے کی ڈھلی ہوئی چیز ہونا چاہئے جس میں کسی تغیر و تبدل، حذف و اضافہ یا مزید ترقی کی گنجائش نہ ہو۔" ع۱

تنقید کے سلسلے میں اہل علم و ادب کی یہ جو رائیں پیش کی گئی ہیں ان سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ تنقید کرتے وقت نقاد کو تنقید کے اصول و ضوابط اور اس کے اغراض و مقاصد کو ذہن میں رکھنا چاہئے اعلیٰ تنقید کیلئے اعلیٰ تخلیقی صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے یہ انسان، اور اسکے ادبی کارناموں کے پرکھنے کا فن ہے اس سے صحیح ادبی ذہن کا معیار قائم کیا جاتا ہے تنقید سے تخلیقی ادب کو واضح کیا جاتا ہے، اس سے ذہن میں روشنی پیدا ہوتی ہے اس کا کام فیصلہ ہے عیب جوئی یا قصیدہ خوانی نہیں ہے اسکے ذریعہ ادب کی وضاحت، صراحت، ترجمانی، تفسیر، تشریح، تحلیل تجزیہ کیا جاتا ہے اور ادنیٰ و اعلیٰ جھوٹ و سچ اور پست و بلند ادب کو پرکھ کر اس کے ساتھ انصاف کیا جاتا ہے اس سے ادب میں ایجاد اور محفوظ کرنے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔

موجودہ دور میں تنقید کے لئے زبان و اسلوب، مکان و زمان، فنکار کی شخصیت اور ذاتی زندگی، اسکے عقائد و توہمات، معاشی و معاشرتی روابط زمانہ کی تاریخی اور تہذیبی قوتیں اور محرکات بیرونی، فنکار کے ذہن کے اندرونی ہنگاموں کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔

ع۱ "نگار" جولائی ۱۹۶۱ء صہ ۵

غزل پر تنقید کرتے وقت شدتِ احساس اور خلوص جذبات کے ساتھ اس کی شخصی اور آفاقی شاعری میں بھی تفریق کرنا چاہئے، اس کی زبان، الفاظ، تراکیب، مضامین وغیرہ کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے

جگر کے نقادوں پر تنقید و تبصرہ

نقاد کے فرائض اور تنقید کی اہمیت کے جائزہ لینے کے بعد اب ہمیں جگر کے نقادوں کے متعلق بھی کچھ کہنا ہے۔

جگر کے نقادوں میں ایک طرف سید سلیمان ندوی، مرزا احسان احمد، پروفیسر رشید احمد صدیقی پروفیسر آل احمد سرور جیسی سخن فہم اور سخن شناس شخصیتیں ہیں جو ائمہ فن اور اکابر شعر و ادب ہیں اور جگر سے اس قدر خلوص و عقیدت رکھتی ہیں کہ ان کی ہر چیز انھیں پسند ہے اپنی پسندیدگی کی بنا پر انھوں نے جگر کی تعریف و توصیف کی ہے ان کو جگر کی ہر بات میں یہاں تک کہ کلام میں بھی صرف خوبی ہی خوبی نظر آئی ہے ان کی خامیوں پر ان کی نظر ہی نہیں پڑتی جو انتہائے خلوص و محبت کی دلیل ہے تو دوسری طرف پروفیسر کلیم الدین احمد، عندلیب شادانی، مجنوں گورکھپوری اور علامہ نیاز فتحپوری جیسے جیّد اور مقتدر ناقد و مبصر ہیں جنھوں نے جگر کی کوتاہیوں اور نارسائیوں پر نکتہ چینی کی ہے اور وہ کسی طرح جگر کو عظیم شاعر ماننے ہی کے لئے تیار نہیں ہیں۔

مندرجہ بالا اکابرین میں سے اگر جگر کے موافقین نے کچھ غلو سے کام لیا ہے تو مخالفین نے بھی انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے پھر بھی مندرجہ بالا ہستیوں میں سے جنھوں نے جگر کی حمایت یا مخالفت کی ہے ان میں جزوی صداقت بھی پائی جاتی اس لئے ضروری ہے کہ جگر کی شاعری کو پسندیدگی اور استحسان کی نظروں سے دیکھنے والوں کو بجائے طرفداروں کے زمرے میں شامل کرنے یا ان کی سخن فہمی سے بدگمان ہونے کے ان کی پسندیدگی اور استحسان میں صداقت کی تلاش کیجائے اسی طرح جگر کی شاعری کے منکروں کے بیانات میں جن میں انھوں نے جگر کی شاعری کو سطحی بتایا ہے ان کی لغزشوں اور کوتاہیوں پر انگوٹھا اور بیدردی کے ساتھ نشتر چلایا ہے ان کو بدذوق، ہٹ دھرم اور متعصب کہنے کے بجائے ان کے بیان میں بھی سچائی کے عناصر کی تلاش کی جائے تاکہ جگر کی شاعری کے بارے میں کوئی صحیح متوازن اور منصفانہ رائے قائم کی جاسکے۔

اسقام اور اغلاط سے جگر کیا دنیا کے کسی بھی بڑے سے بڑے شاعر کا کلام پاک نہیں ہے اس لئے میرے خیال میں بہتر یہی ہوگا کہ جگر کے موافقین و مخالفین دونوں کی رایوں کا الگ الگ جائزہ لے کر دیکھا جائے کہ کس کی کونسی رائے کہاں تک صحیح اور کہاں تک غلط ہے پہلے جگر کے کلام کے متعلق ان کے نقادوں کی متوازن رائیں ملاحظہ ہوں۔

جگر کے نقادوں کی متوازن رائیں

یہاں پر صرف انھیں حضرات کی رایوں سے بحث کی جائے گی جنھوں نے اردو ادب میں

کوئی مقام حاصل کر لیا ہے بعض غیر معروف حضرات نے بھی جگرؔ پر اعتراض کرنے کے لئے قلم اٹھایا ہے لیکن ان کے اعتراضات کی کوئی خاص اہمیت نہیں زیادہ تر ان کے اعتراضات برائے اعتراض ہیں اس لئے انھیں قصداً نظر انداز کر دیا گیا ہے ان غیر معروف حضرات کا تذکرہ آگے چل کر ضمناً کر دیا جائے گا

جگرؔ مرادآبادی پر سب سے پہلا مقالہ مرزا احسان احمد صاحب (اعظم گڈھ) نے ۱۹۲۰ء کے "مخزن" میں لکھا تھا اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے احسان صاحب کی رائے کی جانچ کی جائے انھوں نے جس وقت یہ مقالہ لکھا تھا اس وقت تک جگرؔ کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا ان کے پیش نظر جگرؔ کا وہ کلام تھا جو بعد کو "داغِ جگر" کی شکل میں شائع ہوا اور اس کلام کے پیش نظر مرزا احسان احمد صاحب نے اپنی متوازن رائے دیتے ہوئے لکھا ہے:-

"ہمارا دوست نہ کوئی بڑا آدمی ہے نہ وہ فلسفہ یا پالٹکس کہتا ہے، نہ وہ تاریخی واقعات لکھتا ہے نہ وہ رہبران قوم کی مدّاحی کرتا ہے، وہ صرف شاعر ہے، عشق و محبت اس کا خمیر ہے، وہ ازل سے ایک دردمند دل لیکر آیا ہے اس کا ہر شعر ایک جذبۂ مجسّم ہوتا ہے وہ صرف اپنے دردِ دل کا اظہار کرتا ہے اس کو اس کی پرواہ نہیں کہ کوئی اس کا سننے والا بھی ہے خود اس کا دل اس کی شاعری کی داد دیتا ہے اور یہی اسکے کمال شاعری کا حقیقی ثبوت ہے" ؏۱

مرزا احسان احمد کا مندرجہ بالا بیان حقیقت پر مبنی ہے اس کے ثبوت میں جگرؔ کے اس دور کے کلام سے کچھ اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں جو احسان صاحب کے اس دعوے کی تصدیق کرینگے وہ اشعار یہ ہیں ؎

بیتابیوں نے کام دیا دستِ ناز کا
آخر لپٹ کے سو گئے دردِ نہاں سے ہم

قیدِ قفس میں یادِ بہار آئی ہے مجھے
نشتر بنے ہوئے ہیں پر و بال آجکل

کچھ کھٹکتا تو ہے پہلو میں مرے رہ رہ کر
اب خدا جانے تری یاد ہے یا دل میرا

محفوظ اک جگہ بھی نہیں جسمِ زار میں
خود بن گیا ہوں اپنا گریباں بہار میں

دستِ جنونِ عشق کی گلکاریاں نہ پوچھ
ڈوبا ہوا ہوں سر سے قدم تک بہار میں

مایوس شبِ ہجر نہ ہو اے دلِ بیتاب
اللہ دکھائے گا تو دیکھیں گے سحر بھی

ہم اور ان کے سامنے عرضِ نیازِ عشق
لیکن ہجومِ شوق سے مجبور ہو گئے

یاد ہے آجتک مجھے پہلے پہل کی رسم و راہ
کچھ انھیں اجتناب سا کچھ مجھے احتمال سا

؏۱ "شبلی کالج" میگزین (جگر نمبر ۱۹۶۰ء-۱۹۶۱ء) ص ۲

چلا یاد سے کبھی تری کچھ نہ کام
بس اتنا ہوا آنکھ تر ہو گئی

ہر قدم پر، ہر روش پر، ہر ادا پر، ہر جگہ
دیکھنا پڑتا ہے اندازِ نگاہِ یار کو

محشر میں بات بھی نہ زباں سے نکل سکی
کیا جھک کے اس نگاہ نے سمجھا دیا مجھے

احسان صاحب کے بعد علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے بھی "شعلۂ طور" کے مقدمہ میں "تعارف نو وارد شاعر" کے عنوان سے اپنی گرانقدر رائے دی ہے انھوں نے جگر کے کلام "شعلہ طور" پیش نظر ۱۹۳۳ء میں فرمایا تھا کہ :-

"جگر شاعر ہے، مگر کیسا شاعر؟ تنہا شاعر، بلکہ ہمہ شاعر، ان کا طرز ابنائے زمانہ کے طرز سے الگ لکھنؤ اور دہلی دونوں حکومتوں سے آزاد، موزوں الفاظ اور دلکش ترکیبوں کے باوجود بے ساختگی اور آمد سے معمور، ہر تکلف، تعمق اور آورد سے پاک طلسم الفاظ سے خیالات کی ایک دنیا بنا کر کھڑی کر دینے والا ......

جگر کا کمال یہ ہے کہ سادگی اور تکلف کی ہر شان سے بے نیازی کے باوجود، اس میں بیحد فطری آرائش اور خود نمائشِ حسن ہے۔ - - جگر کی شاعری کے معنوی خیالات بہت مختصر ہیں وہ انھیں الٹ پلٹ کر دہراتے رہتے ہیں، مگر وہ جب کہتے ہیں تو سننے والوں کو وہ بات نئی معلوم ہوتی ہے" ؎۱

سلیمان صاحب کے اس ارشاد کی غمازی مندرجہ ذیل اشعار کریں گے ؎

فریاد کیسی؟ کس کی شکایت؟ کہاں کا حشر؟
دنیا اُدھر ہی ٹوٹ پڑی وہ جدھر ہوا

جو کچھ بچ رہا تھا مرا خون دل
وہی آسماں پر شفق ہو گیا

مری موت سن کر کیا اس نے ضبط
مگر رنگ چہرے کا فق ہو گیا

جس کو نعمت یہ ملے کیوں وہ رہے آزردہ
سو خوشی، ایک ترے غم میں پریشاں ہونا

ان کو بلا کے اور پشیماں ہوئے جگر
یہ کیا خبر تھی ہوش میں آیا نہ جائے گا

کیا کہہ دیا کسی نے؟ کہ ملتے ہی چشم شوق
دونوں طرف سے دست تمنا دراز تھا

تم مجھ سے چھوٹ کر رہے سب کی نگاہ میں
میں تم سے چھوٹ کر کسی قابل نہیں رہا

؎۱ "فروغ اردو" اگست دسمبر ۱۹۶۱ء ص۱۱، ۱۲

اے چارہ ساز حالتِ دردِ نہاں نہ پوچھ
اک راز ہے، جو کہہ نہیں سکتے زباں سے ہم

اُداسی طبیعت پہ چھا جائے گی — انھیں جب مری یاد آجائے گی
آیا نہ راس نالۂ دل کا اثر مجھے — اب تم ملے، تو کچھ نہیں اپنی خبر مجھے

عشق کیا چیز ہے، اک حشر در آغوشِ خیال
حسن کیا؟ خواب ہے اک چشمِ تماشائی کا

مرا احساسِ غم اے کاش اتنا تیز ہو جاتا
جو چھو جاتی ہوا، دل درد سے لبریز ہو جاتا

ہر سانس ہے در پردہ نگہبانِ محبت — زنہار کبھی، حسن کو غافل نہ سمجھنا
عفو کیا؟ جلوۂ رحمت بھی نکلے گا یہیں — ذوقِ عصیاں چاہیئے عرفانِ عصیاں چاہیئے

وقت آئے تو ہمیں جان بھی کر دینگے فدا
کیا یہ ممکن ہے ترے نام کی عزت نہ کریں

ہمیں بھی نہ اب چین آئے گا جبتک — ان آنکھوں میں آنسو نہ بھر لائے گا
دردِ دل غیرت تری کیا ہو گئی — اُن لبوں پر اور ہائے دردِ دل
آ کہ بیتابِ انتظار ہوں میں — درد کی آخری پکار ہوں میں
ہائے یہ مجبوریاں ترکِ محبت کیلئے — مجھکو سمجھاتے ہیں وہ اور اُن کو سمجھاتا ہوں میں
دل کو برباد کر کے بیٹھا ہوں — کچھ خوشی بھی ہے کچھ ملال بھی ہے
یہ مے کشی ہے تو پھر شانِ مے کشی کیا ہے — بہک نہ جائے جو پی کر وہ رند ہی کیا ہے

کیا بتائیں، عشق ظالم کیا قیامت ڈھائے ہے
یہ سمجھ لو جیسے دل سینے سے نکلا جائے ہے

لطافت مانعِ نظارۂ صورت سہی لیکن
دھڑکنا دل کا کہتا ہے وہ گذرے ہیں ادھر ہو کر

درد و غم دل کی طبیعت بن چکے — اب یہاں آرام ہی آرام ہے
اپنے جی میں تو کر ذرا انصاف — کب سے نا مہرباں ہے پیارے
مری یہ فطرتِ معصوم عشق ارے توبہ — کسی نے جو بھی کہا کر لیا یقیں میں نے

دل ہے قدموں پر کسی کے سر جھکا ہو یا نہ ہو
بندگی تو اپنی فطرت ہے خدا ہو یا نہ ہو

میں اپنی اس نظر کی رعنائیوں کے صدقے   جو شکل ہے حسیں ہے دوشیزہ ہے جواں ہے

مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں اختر علی تلہری کا یہ بیان بھی صحیح معلوم ہوتا ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ :-

"جگر ایک خوش گو شاعر ہیں ان کے بیشتر اشعار دلپذیر ہوتے ہیں صاحبانِ ذوق انھیں پڑھ کر سرور و انبساط حاصل کرتے ہیں لیکن ان کی دلپذیری اور تاثیر کا راز ان کے خیالات کی بلندی یا ان کی "متصوفانہ حیثیت" میں مضمر نہیں ہے کیونکہ حقیقت میں جگر نہ تو کوئی بلند خیال شاعر ہیں اور نہ "معارف تصوّف" کے محرم راز، انھوں نے اپنی غزل گوئی کے لئے کوئی نیا راستہ بھی نہیں بنایا ہے زیادہ تر وہی فرسودہ خیالات جنھیں پرانے اور موجودہ شعرا مختلف عنوان سے ادا کر چکے ہیں وہی رندی اور سرمستی کے افسانے ہیں، وہی عشق و محبت کی داستانیں، وہی ہجر و وصال کے قصے، وہی گل و بلبل کی حکایتیں۔ البتہ جگر کے انداز تخیل میں شگفتگی اور اسلوب ادا میں رنگینی ضرور پائی جاتی ہے اور جہاں کہیں ان دونوں کا امتزاج حسن کے ساتھ ہو جاتا ہے تو نشاط انگیزی اور سرور بخشی کی کیفیت خصوصیت سے ان میں پیدا ہو جاتی ہے" ع۱

تلہری صاحب کا یہ قول شعلۂ طور کے لئے ہے اور صرف اسی حصہ کے لئے یہ صحیح بھی ہے اسی مجموعہ کے ایک شعر کے متعلق تلہری صاحب کی رائے بھی صحیح ہے کہ :۔

"برسائی آنسوؤں کی جھڑی چشم یار نے
کیا اُٹھ کے کہہ دیا مری خاک مزار نے

"جھڑی لگتی ہے برسائی نہیں جاتی" ع۲

شعلۂ طور ہی کے اشاعت کے بعد عندلیب شادانی نے بھی جگر پر اعتراضات کرنے شروع کر دیئے تھے ان کے بعض اعتراضات معقول ہیں جو درج ذیل ہیں :۔

"دل کی ہر چیز جگمگا اٹھی   آج شاید وہ بے نقاب ہوا

کوئی معمولی شاعر اگر اسی خیال کو نظم کرتا تو یوں کہتا کہ "دل کا ہر ذرہ جگمگا اٹھا"....

ع۱ "جگر مراد آبادی شعلۂ طور کے آئینہ میں" یہ اختر علی صاحب تلہری کا ایک مقالہ ہے جو راقم کو تلہری صاحب کے صاحبزادے آفتاب اختر سے دستیاب ہوا آفتاب اختر نے بتایا کہ یہ مقالہ "نگار" میں "شعلۂ طور" کی اشاعت کے بعد فوراً شائع ہوا تھا مقالہ کی اصل کاپی راقم کے پاس محفوظ ہے۔

ع۲ تلہری صاحب کا مقالہ جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے۔

بیٹھا ہوں مست و بیخود خاموش ہیں فضائیں
کانوں میں آرہی ہیں بھولی ہوئی صدائیں

مست و بیخود کو کیا خبر کہ فضا خاموش ہے یا شور سے گونج رہی ہے خیر فرض کرلیا کہ فضا خاموش تھی اور فضا جب خاموش تھی تو کانوں میں صدائیں یقیناً آرہی ہوں گی یہ بات تو سمجھ میں آگئی لیکن یہ معمہ پھر بھی حل نہ ہوا کہ جہاں آپ مست و بیخود بیٹھے ہوئے تھے وہاں کتنی فضائیں تھیں غالباً فضا تو ایک ہی ہوگی . . . .

ہیں دور ہوں تو روئے سخن مجھ سے کس لئے
تم پاس ہو تو کیوں نہیں آتے نظر مجھے

"روئے سخن" کسی کی طرف ہوتا ہے "کسی سے" نہیں ہوتا لہذا "میں دور ہوں تو روئے سخن میری طرف کس لئے" کہنا چاہیئے . . . .

چین اسیرانِ قفس کو یاد گلشن میں نہیں
دوڑتی ہیں بجلیاں سیلاب خوں تن میں نہیں

جسم میں خون کی گردش کو "سیلان" کہتے ہیں سیلاب نہیں . . . .

شمع چپ پروانے ششدر، اہل دل سب دم بخود
ہائے کیا تصویر کا عالم تری محفل میں ہے

جگرؔ صاحب کے محبوب کی محفل میں شمع چپ ہے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا شمع کبھی بولتی بھی ہے اور اگر بولتی نہیں تو یہاں چپ کہنے کا کیا حاصل؟ اور اگر یہ چپ "خاموش" کا ترجمہ ہے تو ایک نئی مشکل کا سامنا ہے کیونکہ فارسی میں شمع کا خاموش ہوجانا شمع کے بجھ جانے کو کہتے ہیں اگر چپ سے مراد "بجھی ہوئی" شمع ہے تو پھر وہاں پر سچ کے پروانوں کا کیا کام؟ . . . . .

چیخی ہے کس انداز سے کس کرب و بلا سے — دل ٹوٹ گیا نالۂ بلبل کی صدا سے

"کرب سے چیخنا" تو سمجھ میں آتا ہے لیکن "بلا سے چیخنا کیا معنی؟ . . . . . .

ے لیا کام جو لینا تھا غم ہستی نے — گرچہ ثابت نہ ہوئی میری ضرورت مجھکو

"میری ضرورت" کی جگہ "اپنی ضرورت" ہونا چاہئیے"[1]

اسی عہد کے ایک شعر یہ یگانہ کا بھی یہ اعتراض صحیح ہے ؎

"منزل عشق اے خدا کی پناہ — ہر قدم کربلائیاں تو بہ

کربلائیاں نئی جمع ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ لکھنؤ کی ہوا لگا کر پیدا ہوئی ہے اس

---

[1] "دور حاضر اور اردو غزل گوئی" مطبوعہ ۱۹۵۱ء صفحہ ۲۰۲۳

آب و ہوا میں جتنی من گڑھت جمعیں بنائی گئیں ہیں ان میں یہ جمع کچھ معنویت رکھتی ہے یعنی کربلائیاں بمعنی قربانیاں، جاں نثاریاں وغیرہ بلکہ وہ تمام مفہوم جو یہ لفظ کربلا کے ساتھ وابستہ ہے" ع۱

"شعلۂ طور" ہی کے متعلق محمد ضیاء الاسلام نے بھی صحیح لکھا تھا کہ:-

"جگر نے غزل کو اپنایا ہے اور غزل نے ان کو . . . . جگر رنگ و بو کی دنیا میں رہ پڑے ان کا دماغ ان کی خوشبو سے معطر ہو گیا انھوں نے اس رنگ و بو کی دنیا کو ہر روح پر مسلط کرنا شروع کر دیا ان کو ایک رنگین وادی میں جگہ مل گئی اگر آواز گیر و دار اٹھے بھی تو وہ اس کو اہمیت نہیں دیتے اور حسن و عشق کے نغمے الاپے جاتے ہیں ؎

سنائے تھے لب نے سے کسی نے جو نغمے ۔۔۔ لب جگر سے مکرر سنائے جاتے ہیں" ع۲

مجنوں گورکھپوری لکھتے کہ:-

"جگر کٹر غزل گو شاعر ہیں اور حسن و عشق کے احساس سے علٰحدہ ہو کر انھوں نے کبھی شعر نہیں کہا ان کے کلام میں بیشتر ربودگی پائی جاتی ہے جس کو تغزل کا اصلی جوہر کہا گیا ہے ان کی زبان اور انداز بیان میں جو بے اختیاری ہوتی ہے وہ ان کی اپنی چیز ہے اور اردو غزل میں بالکل نیا عنوان ہے عشقیہ زندگی کے واردات و معاملات کی نزاکتوں کو جدید نفسیات کا لحاظ رکھتے ہوئے بیان کرنے میں وہ اکثر قابلِ رشک حد تک کامیاب رہتے ہیں" ع۳

جگر کی اس عہد کی شاعری کے متعلق مجنوں گورکھپوری نے لکھا تھا کہ:-

"جگر کی شاعری بہت سطحی شاعری ہے . . . . . جگر کی شاعری میں جو نیاپن ہے اس کا تعلق دراصل انداز اور اسلوب سے زیادہ ہے فکر و احساس سے کم ہے اور جدید اردو غزل میں یہی اسلوب جگر کا اضافہ ہے . . . . .

جگر کی شاعری میں فکر و تامل کا کوئی میلان نہیں ہوتا وہ زندگی کے عام انسانی اور کائناتی اسرار و رموز پر کوئی سوچی سمجھی رائے نہیں رکھتے ان کی شاعری خالص جذباتی ہے اور اس جذباتی شاعری کا دائرہ بھی عشق کے موضوع تک محدود ہے" ع

ع۱ "نیرنگ خیال" لاہور، سالنامہ ۱۹۳۲ء، ص ۸، ع۲ "ادیب" اکتوبر ۱۹۳۳ء، ص ۱۴
ع۳ "شعر اور غزل" ص ۱۲۵-۱۲۶، ع۴ "آجکل" یکم ستمبر ۱۹۴۹ء، ص ۴ تا ۶

مجنوں کے اس بیان میں بھی صداقت ہے کیونکہ جگر کا یہ دوران کی سرشاری و سرمستی اور عشق و محبت کا دور تھا شراب اور وہ دونوں لازم و ملزوم تھے زندگی میں کوئی مستقل مزاجی نہیں تھی کبھی اس شہر میں ہیں تو کبھی اس شہر میں احباب کی محفل سے جب فرصت ملی تو شراب کا دور چلاتے جس کی زندگی ان حالات میں گذر رہی ہو اس کے یہاں فکر و احساس کیسے پیدا ہو سکتا ہے اور انسانی اور کائناتی اسرار و رموز پر کوئی سوچی سمجھی رائے کیسے رکھ سکتا ہے جس کو اپنی خبر نہ ہو وہ کسی اور کی خبر کیا رکھے گا یا کوئی سوچی سمجھی رائے کیا قائم کرے گا دراصل انھیں سوچنے سمجھنے کا موقع بھی تو نہیں ملا لیکن جب انھوں نے شراب ترک کر دی اور باقاعدہ متاہل زندگی گزارنے لگے تو ان کے یہاں فکر و احساس کی گہرائی بھی پیدا ہونے لگی اور انسانی اور کائناتی اسرار و رموز پر ان کی ایک سوچی سمجھی رائے کا اظہار بھی پایا جانے لگا

شعلۂ طور کے بعد جگر نے جو غزلیں یا نظمیں کہیں وہ اس زمانے کے مختلف رسائل و جرائد میں برابر شایع ہوتی رہیں اور ان پر وقتاً فوقتاً تنقید بھی ہوتی رہی "شعلۂ طور" کے بعد جگر کے کلام کا مجموعہ "آتش گل" ۱۹۵۴ء میں شایع ہوا اس کے شایع ہونے سے پہلے اور بعد کو بھی جگر کے پورے کلام یعنی "داغ جگر"، "شعلۂ طور" اور "آتش گل" پر خوب خوب تیر و نشتر چلائے گئے۔ صحیح اور غلط دونوں طرح کی تنقیدیں کی گئیں اس لیے اب دیکھنا یہ چاہیے کہ مجموعی حیثیت سے کس کس نقاد نے منصفانہ اور ایماندارانہ حد تک جگر کے کلام پر صحیح تنقید کی ہے اور کس نے غلط۔ پہلے ان حضرات کی تنقید کا جائزہ لیا جائے جنھوں نے جگر کے کلام پر خلوص دل سے تنقید کی ہے

اس سلسلے میں ہم پہلے کلیم الدین کا بیان دیکھیں گے کہ اس میں کس حد تک صداقت ہے ان کا یہ بیان صحیح ہے کہ:۔

> "جگر کے شعر داغ کی صفائی، سادگی، سلاست، روانی، رنگینی تو رکھتے ہیں لیکن داغ کی تازگی، شوخی معاملہ بندی، بیساختگی نہیں رکھتے ۔۔۔۔ جگر کے یہاں حسن اور عشق دونوں کا ایک برگزیدہ تصور ہے محبت ان کے نزدیک ایک تخلیقی اور تعمیری صلاحیت ہے جو زندگی کے جوبن کو نکھارتی اور سنوارتی ہے عشق پرستار ہوتے ہوئے بھی لائق پرستش ہے حسن اس وقت تک کامل نہیں ہے جب تک اس میں عشق کی شوخ نگاہیں شامل نہ ہو جائیں۔ محبوب کے بغیر زندگی گزارنا ایک گناہ ہے فیضان محبت عام سہی مگر عرفان محبت عام نہیں"۔ ؎۱

؎۱ "اردو شاعری پر ایک نظر" (حصہ دوم) مطبوعہ سنہ ۵۲ء ص ۱۴۴-۱۵۱

مجھے کلیم الدّین کے اس بیان کے متعلق صرف اتنا کہنا ہے کہ اگر کلیم الدّین صاحب جگر کے یہاں داغ کی تازگی و بیباختگی اور معاملہ بندی وغیرہ نہ تلاش کرتے تو بہتر تھا جہاں تک جگر کے تصورِ محبت کا تعلق ہے اس کی انھوں نے بہت جامع تعریف کی ہے اور انھیں کے اشعار کو نثر میں بیان کر دیا ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کا یہ بیان بھی صحیح ہے کہ :-

"جگر عشق کے غلبہ میں محبوب کی عفت کو کبھی نہیں فراموش کرتے ...... ہمارے عام شعراء کے محبوب سے دوستی کرنے کی خواہش ہم میں آپ میں مشکل سے پیدا ہوگی جگر کے محبوب کو ہر شخص اپنانا چاہے گا اردو شاعری کو یہ زاویہ جگر نے دیا .....

جگر کے یہاں جذبہ کی شدت ہے اسی لیے تخیل کی کمی ... جگر کی شاعری دیکھ کر مجھے اکثر محسوس ہوا کہ یہ شخص شراب ترک کیے بغیر نہ رہے گا .... جگر کی شاعری میں وہ عناصر ہیں جو اس دور کے آشوب و آزمائش میں غزل کو تب و تاب دیتے رہیں گے ،، (۱)

رشید صاحب کے اس بیان کی صداقت کے لیے "شعلۂ طور" اور "آتش گل" سے چند منتخب اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں ؎

عشق کو تھا کب سے اپنی خشک دامانی کا رنج / ناگہاں آنکھوں کو اشکوں کا سلام آ ہی گیا
اس بزم سے دل لے کر کیا آج اثر آیا / ظالم جسے سمجھے تھے مظلوم نظر آیا
ہائے وہ دردِ دل کہ جسے جگر / کچھ نہیں کھلتا جس کا سبب
میں اور یہ تمکینِ غمِ عشق ارے توبہ / تو، اور یہ احساسِ گرانبارِ محبت
وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں آتی / وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی
مری رندی بھی کیا رندی، مری مستی بھی کیا مستی / مری توبہ بھی بنجاتی ہے پیمانہ بجام اکثر
وہ مری عرضِ شوقِ بے حد پر / کچھ حیا، کچھ عتاب کا عالم
مسرت زندگی کا دوسرا نام / مسرت کی تمنّا مستقل غم
یہیں تک نہیں عشق کی سیرگاہیں / مہ و انجم و کہکشاں اور بھی ہیں
یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر / جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا ہوں میں
تنہا نہیں ہے عشق ہی رسوائے جستجو / خود حسن کو بھی گرمِ سفر دیکھتا ہوں میں
وہ از خود ہی نادم ہوئے جا رہے ہیں / خدا جانے کیا کیا خیال آ رہے ہیں
تسخیرِ مہر و ماہ مبارک تجھے، مگر / دل میں نہیں اگر تو کہیں روشنی نہیں

---

(۱) "آتش گل" مطبوعہ ۱۹۵۸ء ص۲۳-۲۴

عشقِ لامحدود جب تک رہنما ہوتا نہیں
زندگی سے زندگی کا حق ادا ہوتا نہیں

یوں بھی ہو کاش غمِ عشق کی تاثیر جگر
میں تمنّا نہ کروں اور وہ تمنّائی ہو

جگر وہ بھی زسرتاپا محبت ہی محبت ہیں
مگر ان کی محبت صاف پہچانی نہیں جاتی

لب تھرتھرا کے رہ گئے لیکن وہ اے جگر
جاتے ہوئے نگاہ ملا کر چلے گئے

یوں پرسشِ ملال وہ فرما کے رہ گئے
شکوے مری زبان تک آآ کے رہ گئے

آ پڑا کچھ وقت ایسا گردشِ ایام سے
زندگی شرما رہی ہے زندگی کے نام سے

بہت حسین سہی صحبتیں گلوں کی مگر
وہ زندگی ہے جو کانٹوں کے درمیاں گذرے

گھٹے اگر تو بس اک مشتِ خاک ہے انساں
بڑھے تو وسعتِ کونین میں سما نہ سکے

مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں آل احمد سرور کا بیان بھی صحیح معلوم ہوتا ہے جس میں انھوں نے "آتش گل" کے بارے میں لکھا ہے کہ:۔

"اس نئے مجموعہ میں، جو ایک طرح سے جگر کے عالم ہوش کا کلام ہے جگر کی عشقیہ شاعری میں گہرائی اور حقیقت نظر آتی ہے، اس کی وجہ سے ان کی رومانیت وقیع ہوگئی ہے اور ان کا ادبی مرتبہ مستحکم ...... انھوں نے عشق کیا ہے اور اس عشق کی آنچ میں جلنے اور پگھلنے سے ان کی آواز میں لے اور ان کی شخصیت میں گداز پیدا ہو گیا ہے ان کے عشق نے انھیں اس دنیا کے حسن اور حسینوں سے عشق کرنا سکھایا ہے یہ دوسری بات ہے کہ اس مجازی حسن میں انھیں گہرے ابتدائی نقوش کی وجہ سے ایک حسنِ حقیقی کی جھلک نظر آتی ہے ... جگر مزاج کے اعتبار سے جمال پرست ہیں وہ حسن کے پجاری ہیں اور حسن کے ادا شناس۔ ان کے عشق نے انھیں زندگی کے ہر قسم کے کامیاب اور ناکامیاب تجربے دیے ہیں ... جگر کے یہاں ..... چاہنے اور چاہے جانے کی لذّت ہے ......

جگر کی شاعری پڑھے لکھے عوام کی سمجھ میں آسکتی ہے ان کے جذبات کی دھڑکن اس میں موجود ہے ان کی داستانِ حیات کے نقوش اس میں بکھرے پڑے ہیں ان کی محرومیوں اور کامرانیوں، ان کے عیش و غم سے اس میں زندگی آئی ہے.......

جگر کے یہاں جو رنگِ مشاعرہ یا رنگِ محفل ہے اسے بھی میں بری چیز نہیں سمجھتا، ترقی پسندوں کے ایک بہت بڑے مشاعرے میں جو دسمبر ۱۹۴۵ء میں لکھنؤ میں ہوا تھا جگر کی ایک غزل کے سامنے دوسرے شعرا کی نظمیں بلا وجہ ماند نہیں پڑ گئیں تھیں اس غزل کا مطلع یہ ہے ؎ فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل ٭ شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

اس غزل میں جسے نظم سمجھا گیا ہے جگرؔ نے ایک زندہ احساس کا ثبوت دیا ہے عمر کی پختگی اور جذباتی طوفان کے ٹھہراؤ نے جگرؔ کو فرار نہیں سکھایا، اسے زندگی کے دکھ درد سے قریب کر دیا ان کے غم میں غمِ زمانہ آ گیا ......

.... جگرؔ کے یہاں عشق کی نفسیات بھی ملتی ہیں ...... جگرؔ کے یہاں محبت کا تصوّر ایک پاکیزہ اور لطیف تصوّر ہے مگر وہ تصوّر زندگی سے دور نہیں لے جاتا زندگی کرنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے جگرؔ کا جنون حوصلہ اور جد و جہد سکھاتا ہے جگرؔ کے شبستان میں محبوبیت کے لطف و کرم سے روشنی ہے جگرؔ نے خود بھی محبت کی ہے اور ان سے محبت بھی کی گئی ہے جگرؔ کے لطیف نشتروں سے لطف اٹھانے کے لیے اردو شاعری کی رمزیت اور اشاریت کا علم ضروری ہے جگرؔ کے رومانی تصوّر سے حقیقت رنگین ہو جاتی ہے ،، ع۱

اثرؔ لکھنوی کا یہ خیال ہے کہ :-

"جگرؔ کا والہانہ انداز فقید المثل ہے ،، ع۲

اثرؔ لکھنوی نے جگرؔ کے کلام پر بعض اعتراضات[۳] بھی کئے ہیں جن میں سے بعض صحیح بھی ہیں طوالت سے بچنے کے لیے یہاں صرف ایک شعر پر اکتفا کی جائے گی جگرؔ کے اس شعر کے متعلق اثرؔ صاحب نے صحیح لکھا ہے ؎

"ہیں شکوہ بلب تھا مجھے یہ بھی نہ رہا یاد   شاید کہ مرے بھولنے والے نے کیا یاد

اثرؔ :- آپ شکوہ بلب تھے اس حالت میں بھول گئے کہ شاید بھولنے والے نے آپ کو یاد کیا دونوں مصرعوں میں کیا ربط ہے ، میرے فہم سے بالاتر ہے پہلے ہچکیاں آنا کسی کے یاد کرنے کی علامت سمجھی جاتی تھی یہاں زبان پر شکوہ آنا یہ شبہہ پیدا کرتا ہے کہ شاید میرے بھولنے والے نے مجھے یاد کیا مگر ہنگام شکوہ یہ بھی یاد نہ رہا۔ شعر اپنی موجودہ صورت میں مہمل اور بے معنی ہے ،، ع۳

جگرؔ کے کلام گزشتہ انتخاب کی روشنی میں ڈاکٹر محمد عقیل کی یہ رائے بھی ملاحظہ ہو وہ لکھتے ہیں کہ :-

" ان کی شاعری میں رجائیت کا پرتو ہے دل گھلا دینے والے الفاظ اور جذبات غزل

ع۱ "آتشِ گل" مطبوعہ ۱۹۵۸ء صفحہ ۴۹ تا ۵۶ ، ع۲ "اثرؔ کے تنقیدی مضامین" صفحہ ۱۰۶ ، ع۳ " اثرؔ نے جگرؔ کے کلام پر جو اعتراضات کئے تھے اس کا جواب "مبصر" اور اسلم رضوی کی طرف سے " قومی آواز " مورخہ ۲۶ جنوری ۱۹۵۹ء میں اور ایک دوسری تاریخ کے قومی آواز میں (جس کی نقل راقم کے پاس موجود ہے تاریخ لکھنا بھول گیا تھا) میں دیا گیا ہے اور اسلم واحدی نے ۲ فروری ۱۹۵۹ء کے قومی آواز میں جواب الجواب دیا ہے جو حضرات تفصیل چاہتے ہوں وہ مندرجہ بالا اخبار دیکھ سکتے ہیں ،، ع۴ " قومی آواز (ضمیمہ) ۲۶ جنوری ۱۹۵۹ء ص۲

ہیں سمو کر جگر مرر ہنے کی صلاح نہیں دیتے بلکہ زندگی کی رنگا رنگ دلچسپیوں سے ہمیں وابستہ کردیتے ہیں ..... جگر کی لذت اور مزہ میں ایک وقار ہے تجسس ملی ہوئی تڑپ ہے جسے صرف وصل کی شادکامیوں میں لے جاکر ختم کردینے والا جگر کے احساسات اور فن کو نہ صرف نہیں سمجھ سکتا بلکہ ان کی توہین بھی کرتا ہے جگر جذبات کے شاعر ضرور ہیں مگر سستے جذبات کے نہیں" ۱

اس بیان کے متعلق مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ ڈاکٹر عقیل کا یہ بیان "آتش گل" کے لیے صحیح ہے اس سے پہلے کے کلام میں جگر کے یہاں بعض سستے جذباتی اشعار بھی ملتے ہیں

جگر کی شاعری اور شخصیت پر سب سے عظیم اور زبردست حملہ علامہ نیاز فتحپوری نے کیا ہے نیاز صاحب نے جگر کے کلام پر تنقید تو ۱۹۳۶ء ہی سے شروع کردی تھی اور جولائی ۱۹۶۱ء میں "نگار" کا جگر نمبر نکال کر دم لیا اس سے پہلے انھوں نے جگر کے کلام پر جو اعتراضات کیے تھے ان کو اپنی کتاب "ماله وما علیہ" میں شامل کردیا تھا لیکن ۱۹۵۲ء میں کراچی کے مشاعرے میں صدارت کی جھگڑے کی بنا پر (جسکا اعتراف انھوں نے خود "نگار" جولائی ۱۹۶۱ء میں صفحہ ۲ پر کیا ہے) ایک جگر نمبر نکالا جو ان کے ایک طویل مضمون کی حیثیت رکھتا ہے اس میں سوائے نیاز کے اس مضمون کے اور کسی کا کوئی مضمون شامل نہیں ہے اس نمبر میں نیاز نے کراچی کے مشاعرے کے عناد کو بڑی سادہ لوحی سے ابتدا ہی میں اعتراف کرلیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ یہ نمبر تنقید کے لیے نہیں بلکہ جگر سے اس عناد کا بدلا لینے کے لیے نکالا گیا ہے نیاز کے اس جگر نمبر پر بڑے سخت جوابات دیئے گئے ہیں خصوصاً ماہر القادری نے تو ان کے جواب میں یہاں تک لکھدیا کہ :-

> اگر میر انیس کے زمانے میں یا ان کے بعد کوئی ناقد یہ کہتا کہ زبانی انکا کلام سن کر، مجھ سے داد دیئے بغیر نہ رہا جاتا، مگر گھر واپس آکر سوچتا تو مجھے تعجب ہوتا کہ میں نے انیس کے کلام کو کیوں سراہا؟ تو اس قسم کے ناقد کے منہ پر ارباب ذوق تھوک دیتے" ۲

میرا خیال ہے کہ ماہر صاحب عقیدت اور جذبات کی رو میں اسقدر بہ گئے کہ ان کو یہ بھی احساس نہ رہا کہ علامہ نیاز فتحپوری ایک بہت بڑے عالم اور ادب کے پرانے خدمت گذار ہیں جن کے احسانات سے اردو ادب کو مفر نہیں اس کے علاوہ نیاز صاحب عمر میں بھی ماہر صاحب سے بڑے اور جگر کے ہم عمر ہیں ظاہر ہے کہ اپنے سے بڑے کی شان میں ایسے جملے ادا کرنا مشرقی تہذیب کے خلاف ہے اور ادب میں تھوکنے چاٹنے کی رسم کو داخل کرنا انتہائی نامناسب ۔ بہرحال گذشت آنچہ گذشت ۔ میری اس تحریر سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھ لیں کہ میں نیاز صاحب کا طرفدار یا ماہر صاحب کا مخالف ہوں ایسا ہرگز نہیں ہے دراصل نیاز نے جو تنقید "ماله وما علیہ" میں کی ہے وہ زیادہ قابل اعتماد ہے کیونکہ اس زمانے

۱؎ "فروغ اردو" فروری، مارچ ۱۹۶۱ء ص ۲۰۶، ۲؎ "فروغ اردو" دسمبر ۱۹۶۱ء ص ۱۸۰۱

یں جگر اور نیاز سے کوئی ذاتی عناد نہیں تھا اس لیے تنقید میں اسی حد تک زیادہ اہمیت ہے ساتھ ہی ساتھ ایسا بھی نہیں ہے کہ نیاز نے جولائی ۱۹۶۱ء میں جو اعتراضات کئے ہیں سب یکسر غلط ہیں اس میں بھی نیاز کے بعض اعتراضات صحیح ہیں اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نیاز کے دونوں اعتراضات پر سنجیدگی سے غور کیا جائے اور اعتراضات جس حد تک صحیح ہوں ان کا اعتراف کر لیا جائے اور اگر اعتراضات غلط ہوں تو ان کی تردید کر دی جائے

نیاز کے اعتراضات میں حقیقت کی تلاش کے لیے بھی ایک کتاب کی ضرورت ہے کیونکہ نیاز نے جو کچھ لکھا ہے اس کا جواب [1] ماہر القادری، رضا انصاری، تسکین قریشی، شہر صباحی، سرخوش عسکری اور احمر رفاعی نے اتنا طویل دیا ہے کہ ان سب کا جائزہ چند صفحات میں لینا کار دارد کا مضمون ہے اس لیے طوالت سے بچنے کے لیے ہم پہلے نیاز کی معقول راؤں کا جائزہ لیں گے

نیاز نے جگر کے بعض اشعار پر بہت ہی مناسب اعتراض کیا ہے مثلاً ان کا ایک شعر ہے ؂

آتے ہیں پھر وہ عزم دل و جاں کئے ہوئے
پلکوں کی اوٹ حشر کا ساماں کئے ہوئے

جس کے متعلق نیاز کی یہ رائے صحیح ہے کہ :-

"پہلے مصرعہ میں "عزم دل و جاں" کی ترکیب اس معنی میں جو شاعر کا مقصود ہے صحیح نہیں عزم کے معنی" ارادہ و مقصد" کے ہیں اور ارادہ کسی فعل کا ہوتا ہے جو شعر میں ظاہر نہیں کیا گیا

شاعر کا مقصود یہ کہنا ہے کہ وہ پھر "دل و جاں کو تباہ کرنے یا لوٹنے کا عزم کیے ہوئے آتے ہیں" اور یہ مفہوم محض "عزم دل و جاں" کہنے سے پورا نہیں ہوتا اگر عزم غارت دل و جاں لکھتے یا کوئی اور لفظ غارت کے ہم معنی استعمال کرتے تو یہ مفہوم پیدا ہو سکتا تھا اساتذہ فارسی واردو نے عزم کا لفظ بغیر کسی فعل کے اظہار کے کبھی نہیں کیا

دوسرے مصرعہ میں پلکوں کی اوٹ کا فقرہ بالکل بے ضرورت استعمال ہوا ہے محبوب کی ہر ادا "حشر ساماں" ہوتی ہے "پلکوں کی اوٹ" کی تخصیص کیوں ؟ اور اگر یہ تخصیص کی تھی تو پہلے مصرعہ میں چشم شرمگیں یا نگاہ حجاب آلود کی قسم کا کوئی فقرہ ہوتا تو بیشک پلکوں کی اوٹ کا ذکر مناسب تھا اگر آنے کی رعایت سے جس میں رفتار کا مفہوم پنہاں ہے دوسرا مصرعہ یوں ہوتا " ہر ہر قدم پہ حشر کا ساماں کیے ہوئے " تو یہ نقص نہ

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے "نگار" جولائی ۱۹۶۱ء "فروغ اردو" دسمبر ۱۹۶۱ء، دجنوری ۱۹۶۲ء، "قومی آواز" ۳۰ جولائی ۱۹۶۱ء، ۱۷ جون ۱۹۶۲ء، ۲۴ جون ۱۹۶۲ء، یکم جولائی ۱۹۶۲ء، ۸ جولائی ۱۹۶۲ء، "ترجمان" کانپور اکتوبر ۱۹۶۱ء اور "تحریک" اکتوبر ۱۹۶۱ء ،

مزید پیدا ہوتا ہے۔

نیاز صاحب نے جگر کے ایک دوسرے شعر ؎

جلوۂ دوست یہ آہستہ خرامی تا چند — ندیاں سوکھ چلیں شوق میں طوفانوں کے

کے لیے صحیح لکھا ہے کہ ۔

" پانچواں شعر بھی غالباً نظم ہی کا شعر ہے گو اسے غزل کا بھی کہہ سکتے ہیں لیکن دونوں صورتوں میں بے معنی ہے
١ اوّل تو جلوے کے لیے "آہستہ خرامی" کا استعمال بالکل غیر مناسب ہے بجائے اس کے انداز تغافل
بہتر ہوتا

دوسرے مصرعہ میں ندیوں سے شاعر کی کیا مراد ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور ان کا طوفانوں کے شوق میں سوکھ جانا اس سے زیادہ ناقابل فہم بات ہے اگر یہ کہا جاتا کہ سوکھی ندیاں اب تک طوفانوں کے انتظار میں ہیں تو بے شک مفہوم پیدا ہو سکتا تھا" ٢

جگر صاحب کا ایک شعر ہے ؎

رگ رگ میں ایک برق خراماں لیے ہوئے — دل ہے ہوائے منزل جاناں لیے ہوئے

جس کے متعلق نیاز نے صحیح لکھا ہے کہ ۔

" پہلے مطلع کا دوسرا مصرعہ اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہے لیکن پہلے مصرعہ سے کوئی ربط نہیں شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ دل ہوائے منزل جاناں لیے ہوئے ہے اسی لیے اس کی رگ رگ میں بجلی دوڑ رہی ہے"

جس طرح دوسرے مصرعہ میں ہے کے اظہار سے جملہ پورا کیا گیا ہے اسی طرح پہلے مصرعہ میں بھی جملہ مکمل ہونا چاہیئے تھا مثلاً یوں "رگ رگ میں ہے وہ برق خراماں لیے ہوئے"

اور اسی کے ساتھ ساتھ دوسرے مصرعہ کو پہلا اور پہلے کو دوسرا کر دیتے لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے کہ "برق خراماں" کیا چیز ہے برق کی صفت خراماں کبھی نہیں ہو سکتی ۔" ٣

جگر کا ایک اور شعر ہے ؎

ہر لحظہ اک سرور میسر لیے ہوئے ؎ خود زندگی ہے بادہ و کوثر لیے ہوئے

جس کے لیے نیاز کی رائے صحیح ہے ۔

"تیسرے مطلع میں لفظ میسر کا استعمال درست نہیں اگر یہ "لیے ہوئے" سے متعلق ہے تو میسر لینا کوئی محاورہ نہیں اور اگر سرور میسر کے معنی سرور حاصلہ کے ہوں تو لیے ہوئے کے ساتھ وہ بالکل بیکار رہے عربی میں میسر ذویسار اور غنی کے معنی میں آتا ہے لیکن اردو میں اس کا استعمال حاصل شدہ کے مفہوم میں کیا جاتا ہے ۔" ٤

١۔ نگار "اپریل ۱۹۴۳ء ص ۲ ، ٢۔ "نالہ و ماعلیہ" ص ۵۸ ، ٣۔ "نالہ و ماعلیہ" ص ۱۱۱ ، ٤۔ "نالہ و ماعلیہ" ص ۱۵۹

نیاز نے جگر کے کلام کی بعض خصوصیات کو سراہا بھی ہے اور بجا طور پر لکھا ہے کہ :۔

"مرے شعر میں ہیں نزاکتیں مری نظم میں ہیں لطافتیں
مری فکر میں کہیں اے جگر ادب کثیف کی جا نہیں

اس سے بے شک میں متفق ہوں اور یقیناً ان کا کلام "سخافت و رکاکت" سے بالکل پاک ہے اس میں نزاکتیں بھی ہیں اور لطافتیں بھی، لیکن افسوس ہے کہ لغزشوں کی کمی بھی نہیں ۔۔ اسمیں شک نہیں کہ جگر خالص دنیائے حسن و عشق کے شاعر تھے دیار حسن کے بڑے پجاری تھے اور کوچہ عشق کی راہیں بھی انھیں بخوبی معلوم تھیں لیکن ان کا مسلک عشق فتادگی و بیچارگی یا عجز سپردگی نہ تھا ۔۔۔۔

جگر کا عشق گویا ایک مطالبہ تھا استحقاق ذاتی کا اور طلب حق پر انھیں اصرار بھی تھا اس لیے ان کے تصور عشق میں ہلکی سی خسروانہ کیفیت بھی نظر آتی ہے ۔۔۔۔۔ وہ صرف مرنے کے نہیں بلکہ مار رکھنے کے بھی قائل تھے بلکہ وہ حسن سے کبھی کبھی "دو بدو" بھی ہو جاتے تھے اور صاف صاف کہہ دیتے تھے کہ

محبت میں ہم تو جیے ہیں جیئں گے ۔ ٭ ٭ ٭ ۔ وہ ہوں گے کوئی اور مر جانے والے

الغرض عشق کے باب میں جگر کی یہ خود اعتمادی کہ :۔

وہ عشق ہی نہیں ہے وہ دل ہی نہیں جگر ٭٭٭ بیتاب خود کیا نہ جسے حسن یار نے

بڑی دلچسپ چیز ہے اور اپنے ہمعصر شعراء کے مقابلہ میں ان کے یہاں زیادہ پائی جاتی ہے ہر چند یہ نیو رہم کو یاس (یگانہ) کے کلام میں بھی نظر آتے ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ یاس (یگانہ) کے یہاں اس نے ذرا خشونت کی شکل اختیار کر لی ہے اور جگر کے یہاں نرمی و لطافت زیادہ ہے "[۱]

اس تحریر کے بعد نیاز نے جگر کے اشعار پر اعتراضات شروع کئے ہیں جنمیں سے بعض اعتراضات صحیح ہیں جن کی مثالیں بشرح بجا بھی ہیں جگر کا ایک شعر درملاحظہ ہو

سورش در زالاماں گردش دہر الحذر
بہکے ہوئے سے قافلے سہمی ہوئی سی رہ گزر

اس پر نیاز نے صحیح اعتراض کیا ہے کہ :۔

"رہ گزر کو سہمی ہوئی کہنا بے معنی بات ہے سہمنے کا تعلق صرف احساس سے ہے اور رہگذر میں احساس کہاں اسکی جگہ اجڑی ہوئی لکھ دیتے تو بھی غنیمت تھا "[۲]

جگر کے ایک اور شعر پر بھی نیاز کا اعتراض صحیح ہے شعر ہے ؎

کیا قہر تھا کہ پاس ہی دل کے لگی تھی آگ
اندھیر ہے کہ دیدۂ تر دیکھتے رہے

نیاز صاحب کا اعتراض ہے ہے :۔

"دونوں مصرعے بری طرح مربوط نہیں اوّل تو پاس ہی دل کے کی جگہ "پاس ہی دل میں" کہنا چاہیئے تھا تاکہ یہ معلوم کرنے کی ضرورت نہ ہوتی کہ دل کے پاس کہاں آگ لگی تھی اور دیدۂ تر سے اس کو کیا تعلق ہے علاوہ

---

[۱] "نگار" جولائی ۱۹۶۱ء صفحہ ۶ [۲] "نگار" جولائی ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۹

اس کے "کیا قہر تھا" کہنے کے بعد "اندھیر ہے" کہنے کا موقع نہ تھا شعر یوں ہونا چاہیے :۔

کیا قہر ہے کہ پاس ہی دل میں لگی تھی آگ ؎ اور اس کو میرے دیدہ تر دیکھتے رہے "[1]

جگر کے اس شعر

ہر شے ہے تمامی ناتمامی ؎ اک میں ہی نہیں فراقِ دیدہ

پر بھی نیاز کا اعتراض صحیح ہے کہ :۔

"تمام ناتمامی بے معنی سی بات ہے اگر رنج ناتامی کہا جاتا تو فراق دیدہ" سے کچھ مناسبت بھی پیدا ہو جاتی اس مصرعہ کو یوں ہونا چاہیے :۔

ہر شے کو ہے رنج ناتمامی "[2]

آخر میں ان کی یہ رائے بھی حقیقت پر مبنی ہے کہ :۔

" جگر اسمیں شک نہیں کافی ذہین انسان تھے، بلند و پاکیزہ خیالات بھی ان کے ذہن میں آتے تھے لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں وہ بڑے لاابالی قسم کے انسان تھے اور ان کا یہی مزاج ان کی شاعری میں منتقل ہو گیا اس کے علاوہ ان کی ابتدائی تعلیم بھی معمولی تھی، مطالعہ بھی وسیع نہ تھا اور اساتذہ کی صحبت بھی انکو میسر نہیں ہوئی . . . . . ان کے یہاں جوش و سرمستی اور ایک خاص والہانہ کیفیت ضرور پائی جاتی ہے ... جگر کے یہاں سب سے بڑا عیب نقص بیان ہے اور اگر وہ اساتذہ کے کلام کا غائر مطالعہ کرتے یا انھیں ان اہل کمال کی صحبت نصیب ہوئی ہوتی جو علم بیان و معانی کے ماہر ہیں تو غالباً یہ نقص ان کے کلام میں نہ پایا جاتا "[3]

جگر کے نقادوں کی لغزشیں جگر کے نقاد و مبصرین کی جگر کے کلام پر صحیح راؤں کا جائزہ لینے کے بعد ضروری ہے کہ جگر کے سراہنے اور اعتراض کرنے والوں کی لغزش مبالغہ آمیزی اور ان کی غلط بیانی کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے

مرزا احسان احمد صاحب نے جگر پر جو مضمون ۱۹۲۰ء میں لکھا تھا اسمیں انھوں نے اپنی بڑی منصفانہ اور متوازن رائے دی ہے لیکن ان سے بھی بعض جگہ پر لغزش ہو گئی ہے مثلاً وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

"معشوق کو دیکھکر بے تاب و بے صبر ہو جانا نہایت عام خیال ہے جو ایک مدت سے بندھتا چلا آتا ہے دیکھو جگر اتنے پامال مضمون کو بھی اپنی خوبیٔ ادا سے کس قدر پر لطف بنا دیتے ہیں

رگ رگ نے صدقے کر دیا سرمایۂ شکیب ؎ اللہ کس کا خانۂ دل میں گذر ہوا "[4]

اس شعر میں سرمایۂ شکیب کی ترکیب لطف پیدا کرنے کے بجائے بے لطفی سی پیدا کرتی ہے

---

[1] نگار جولائی ۱۹۶۱ء صفحہ ۲۹۰، [2] نگار جولائی ۱۹۶۱ء صفحہ ۴، [3] نگار جولائی ۱۹۶۱ء صفحہ ۵۵-۵۶، [4] شبلی کالج میگزین جگر نمبر ۱۹۶۰ء

احسان صاحب ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

"ان کا کلام ابتذال سے پاک ہے، کمر، چوٹی وغیرہ اس قسم کے الفاظ سے ان کی شاعری بالکل خالی ہے تاہم کہیں کہیں ابتذال کی جھلک نظر آجاتی ہے لیکن بہت شاذ" ١

احسان صاحب جگر کے جس دور کے کلام کی تعریف کر رہے ہیں اس کی تردید جگر صاحب کے اس بیان سے خود ہی ہو جاتی ہے جس میں انھوں نے اقرار کیا ہے کہ :۔

"میں نے (اوّل کلام کا کچھ زمانہ چھوڑ کر) حسن کو قصائی ہندی یا ایرانی عاشق کی طرح عشق کو ذلیل و رسوا صورت میں ہرگز پیش نہیں کیا" ٢

یعنی اوّل کلام کے کچھ زمانے میں جگر نے بھی حسن و عشق کے عام خیالات کو اسی طرح پیش کیا ہے جیسا کہ ان کے پیش رو کرتے رہے ہیں

جگر کے اس بیان سے علامہ سید سلیمان ندوی کے اس بیان کی بھی تردید ہوتی ہے جس میں انھوں نے اپنے ۱۹۳۵ء کے مضمون میں "مختصر طور تعارف نو وارد شاعر" میں ان کا تعارف کراتے ہوئے لکھا تھا کہ :۔

"جگر کی شاعری میں نہ زلف و شانہ ہے نہ سرمہ و آئینہ نہ ہوس بالائے بام نہ شکایت ستم عام نہ اس کے شانۂ خیال میں چشمہائے سنبل کی آئینہ بندی ہے، نہ اس کے محبوب کے ہاتھوں میں قصاب کی چھری اور جلاد کی تلوار ہے نہ اس کے کوچہ میں شہدا کے دل و جگر کی گلکاری ہے" ٣

مرزا احسان صاحب اور سلیمان صاحب کے مندرجہ بالا بیان کی تردید جگر نے خود کر دی ہے ناظرین کی سہولت کے لیے جگر کے اس دور کے کلام سے کچھ اشعار بھی پیش کیے جاتے ہیں جنہیں جگر کا ابتذال بھی ہے اور زلف و شانہ، سرمہ و آئینہ، ہوس بالائے بام اور محبوب کے ہاتھ میں جلاد کی تلوار وغیرہ سب ہی کچھ مل جاتا ہے ؎

اس چشم غزالیں کو میخانۂ دل دیکھا
اس روئے نگاریں کو فردوس نظر دیکھا

اف یہ تیغ آزمائیاں توبہ
تیری نازک کلائیاں توبہ

صبر کے ساتھ مرا دل بھی لیے جائیں آپ
اس قدر رحم مرے حال پہ فرمائیں آپ

تاثیر جذبۂ شوق کا اللہ رے کمال
آئینہ بن گئے تری اک اک ادا کے ہم

پھر آپ نے چھیڑی دہن و گیسو کی حکایت
ہر چند کہ زیر خفقاں دیکھ رہے ہیں

نزع میں ڈھونڈ رہی ہیں آنکھیں
کاش، انھیں ایک نظر دیکھوں میں

---

١ "شبلی کالج میگزین (جگر نمبر) ۱۹۶۱ء ص ۱۲، ٢ "تحریک" اکتوبر ۱۹۶۰ء ص ۲، ٣ "فروغ اردو" اگست دسمبر ۱۹۶۱ء ص ۱۳۰

یہ نہ پوچھو دہر میں کب سے میں اسی طرح خانہ خراب ہوں
جو نہ مٹ سکا، وہ طلسم ہوں جو نہ اٹھ سکا وہ حجاب ہوں

کیا چیز تھی کیا چیز تھی ظالم کی نظر بھی
اف کر کے وہیں بیٹھ گیا دردِ جگر بھی

وہ عاشق ہوں کہ میری لاش جب زیرِ مزار آئی
محبت نوحہ گر پہنچی تمنا سوگوار آئی

مژدہ اے شوقِ شہادت! اوج پر تقدیر ہے
آج دستِ نازنیں نازک ہی اک شمشیر ہے

سفاک جتو نیں بھی ہیں قاتل نظر بھی ہے
کیا چیز ہو گئے ہو تمھیں کچھ خبر بھی ہے

ان سے تو عنایت کی نظر کی نہیں جاتی
اور دل کی یہ حالت ہے کہ دیکھی نہیں جاتی

آؤ جہاں برہم کریں، پیدا انیا عالم کریں
تم جانِ جانِ حسن ہو ہم جانِ جانِ عاشقی

سنانے چلے ہیں انھیں قصۂ غم
محبت دل کے ہاتھوں سے مجبور ہو کر

محبت کی پرپیچ راہوں نے مارا
تری آڑی ترچھی نگاہوں نے مارا

یاد ظالم کو تم اپنی روک لو
لوٹے لیتی ہے مری تنہائیاں

تم جو ایسے میں چلے آؤ تو رو لوں دم بھر
صبح کا وقت بھی ہے خاطرِ ناشاد بھی ہے

خود حسن و شباب ان کا، کیا کم تھا رقیب اپنا
جب دیکھیے، اب وہ ہیں، آئینہ ہے شانہ ہے

میرے ہجومِ شوق پر منہ سے تو کچھ نہ کہہ سکے
چہرے پہ رنگ آ گیا ہاتھ مرا دبا دیا

صدقے ان ہاتھوں کے مجھ کو بھی خبر تک نہ ہوئی
اس نزاکت سے گلے پر مرے شمشیر چلی

اک شاہدِ خیال کو لپٹا کے پی گیا
باہوں میں باہیں ڈال کے اٹھلا کے پی گیا

"اودھ پنچ" لکھنؤ میں بھی جگر کے کلام پر وقتاً فوقتاً مزاحیہ تنقید ہوئی ہے مثلاً ۱۴ / جون ۱۹۲۶ء کو "مضامین غیر" کے عنوان میں اس طرح تنقید کی گئی ہے :-

"بے کیفیوں کے کیف سے گھبرا کے پی گیا
توبہ کو توڑ تاڑ کے تھرا کے پی گیا

شاید "کیف" کاتب کی غلطی ہے اصل مصرعہ یوں تھا ؟

"بے کیفیوں کی "فیف" سے گھبرا کے پی گیا

فیف آلہ ایست کہ از و روغن سیاہ در لیمپ می ریزند تا کہ نہ ٹپکد یعنی از زمین نہ ریزد بے کیفی میں کیف کہاں یہ نفی و اثبات کا اجتماع کیا ؟ دوسرے مصرعے میں تھرّانا فضول ہے توبہ کوئی برقی بیٹری نہیں جو توڑنے والے کے جسم میں تھرتھری پیدا کر دے ہاں توبہ توڑنے والا کسی قدر ڑاضرور معلوم ہوتا ہے لہٰذا دوسرا مصرعہ یوں پڑھیں تو اچھا ہے ؎

توبہ کو توڑ تاڑ کے ڑا کے پی گیا

یہ اصلاح ناپسند ہو تو پھر پورا مطلع یوں پڑھیں ؎

بے کیفیوں کے خوف سے تھرا کے پی گیا ÷ ÷ ÷ توبہ کو توڑ تاڑ کے گھبرا کے پی گیا

بایمعنی کہ خوف سے انسان تھراتا ہے اور توڑ تاڑ سے گھراتا ہے " ١

اس شعر میں جگر نے اپنی زندگی کے اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے جب انھوں نے شراب سے توبہ کر لی تھی لیکن پھر غم واندوہ سے پریشان ہو کر شراب ہی کا سہارا لے لیا تھا توبہ کو توڑنے پر جگر کا تھرا جانا مناسب ہے لیکن تنقید میں اس کو ٹرا باد بنانا مناسب نہیں معلوم ہوتا

جگر کے دوسرے اشعار ہیں ؎

میری نگاہ دفکر پہ جب چھا گئی بہار ! رنگینیوں میں ڈوب کے لہرا کے پی گیا !

جس پر اعتراض ہے کہ :-

" صنعت ' پنڈبی ' میں اس سے بہتر شعر نکلنا مشکل ہے نگاہ و فکر کے تالاب پر بہار چھائی دو چونچیں کائی پر رسید کیں پھر غوطہ مارا اور لہرا کے پی گیا

آزردگیِ خاطرِ ساقی کو دیکھ کر ؎ مجھ کو یہ شرم آئی کہ شرما کے پی گیا

نئی دولھنوں کا قاعدہ ہے کھانے پینے میں شرماتی ہیں کہ سسرال والے ندیدہ نہ کہیں چنانچہ یہ مشہور بنڑا ڈومنیوں کی زبان پر ہے " کھانا نہ جانے پینڈی رے بنو پینا نہ جانے دودھ ۔ بنو شرماتی ہے " مگر یہاں الٹی انھی رسم ہوئی کہ مارے شرم کے گھٹ گھٹ پی گئے " ٢

مندرجہ بالا دونوں اشعار میں جگر نے اپنے توبہ توڑنے کے واقعہ کو بیان کیا ہے جس میں زبان کی خوبی یا اردو کی ترقی نہ سہی لیکن شاعر کے دلی جذبات کی عکاسی ضرور ہے اس لیے اس کے جذبات کا اس طرح مذاق اڑانا درست نہیں معلوم ہوتا

اودھ پنچ ہی میں آخر دسمبر سنہ ١٩٣٠ع کی جگر میں ایک نظم پر ظحال مرادآبادی نے اسی رنگ کی نظم میں اس طرح تنقید کی ہے :-

حضرت جگر مرادآبادی

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں
بہار رنگ و شباب ہے کیا ستارہ و ماہتاب ہے کیا
تمام ہستی جھکی ہوئی ہے جدھر وہ نظریں جھکا رہے ہیں

حضرت ظحال مرادآبادی

یہ واہمہ کی ہو کارسازی خیال کی ہو فسوں طرازی
وہ چل رہے ہیں نہ پھر رہے ہیں نہ آ رہے ہیں نہ جا رہے ہیں
حجاب ناحق وہ کر رہے ہیں فضول رخ کو چھپا رہے ہیں
ہر ایک دل میں بسے ہوئے ہیں ہر اک نظر میں سما رہے ہیں
شباب رنگ بہار جھلکے کبھی نہ ہم نے سنے نہ دیکھے
ستارہ و ماہتاب ہیں کیا کو نقطہ ہے دکھا رہے ہیں
تمام ہستی جھکی ہوئی ہے جدھر وہ نظریں جھکی ہوئی ہیں
مزا یہ دیکھو کہا گیا ہے جدھر وہ نظریں جھکا رہے ہیں
چرائے بیٹھے ہیں دل ہمارا اسی سبب سے وہ منفعل ہیں
وہ یوں ہی آنکھیں چرا رہے ہیں وہ یوں ہی نظریں جھکا رہے ہیں ٣

١ اودھ پنچ لکھنؤ ٢٢ جون ١٩٣٠ع ص ٣ ، ٢ اودھ پنچ لکھنؤ [illegible] ، ٣ [illegible]

مندرجہ بالا اشعار میں جگرؔ نے اپنے دل کی کیفیت اور محبوب کے حسن و شباب کی عکاسی کی ہے جس پر طحاںؔ صاحب نے طنز کیا ہے کہ ستارہ و ماہتاب کے لئے صیغہ جمع استعمال کرنا چاہیئے لیکن انھوں نے جگرؔ کے شعر کی اس لطافت پر غور نہیں کیا جس کی انھوں نے عکاسی کی ہے جگر صاحب نے اپنے دل کی کیفیت بیان کی ہے پہلے شعر کے اسلوب کو اختر علی تلہری نے ان الفاظ میں سراہا ہے :-

"اس شعر میں بھی" نفسیاتی واقعیت موجود ہے اگر کوئی اپنا حبیب چلا جاتا ہے تو عرصہ تک تصور کی نگاہوں کو نظر آتا ہے کہ" یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں" اسمیں کچھ شک نہیں کہ اس کرشمہ زائی کی محاکات نہایت ہی اچھے اسلوب سے کی ہے" [۱]

اسی طرح دوسرے شعر میں بھی جگرؔ نے اپنے محبوب کے حسن و شباب کی کشش کو بیان کیا ہے کہ جدھر وہ دیکھ لیتا ہے تمام ہستی اس طرف دیکھنے لگتی ہے ستارہ و ماہتاب کے لیے جگرؔ نے "ہے" کا استعمال غلط نہیں کیا ہے جس پر طحاں صاحب کو اعتراض ہے طحاںؔ صاحب کی اصلاح بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر جگرؔ نے ماہتاب ستارے کہا ہوتا تب تو جمع کا صیغہ لانا ضروری تھا لیکن انھوں نے تو خود ہی تمام اسم واحد ہی رکھے ہیں پھر صیغہ جمع کا استعمال کیونکر کیا جائے

جگرؔ کے صوفیانہ مذاق شاعری کے متعلق اختر علی تلہری صاحب کا بیان ہے کہ :-

" جگرؔ نے تصوف کے دام میں گرفتار ہو کر اپنی شاعری کو داغدار بنا لیا ہے اس مذاق کے ماتحت انھوں نے بہت سے ایسے اشعار کہہ ڈالے ہیں جنکے معنی کی چولیں اگر بعید تاویلوں کے ذریعے بٹھا بھی لی جائیں تو ان میں شعریت کا کوئی چٹخارہ نہیں ملتا آپ کا جی چاہے تو ان اشعار کو تصوف کا کارنامہ قرار دے لیجیے لیکن میں تو انھیں جگرؔ کی شاعری کے ناصیہ کا داغ سمجھتا ہوں ،، [۲]

تلہری صاحب کو جگرؔ کے صوفیانہ اشعار میں شعریت کا کوئی چٹخارہ نہیں ملا اور انھوں نے ایسے اشعار کو ناصیہ کا داغ قرار دے کر مثال میں کچھ اشعار بھی پیش کیے ہیں تلہری صاحب نے ان اشعار سے قطع نظر کیا ہے جنمیں شعریت کا چٹخارہ بھی ہے اور وہ ان کی شاعری کے ناصیہ کا داغ بھی نہیں ہیں مثلاً ؎

جب دیکھ نہ سکتے تھے، تو دریا بھی تھا قطرہ — جب آنکھ کھلی، قطرہ بھی دریا نظر آیا

ذرے ذرے میں تھی ساری ایک موجِ انقلاب — منظرِ فطرت کو میں دیکھا کیا سہما ہوا

دل کیا ہے؟ نقش، حسنِ حقیقت طراز کا — آئینہ کیا ہے؟ عکس ہے آئینہ ساز کا

پیراہنِ جنوں سے تنِ عشق ڈھک لیا — یہ اک طریقِ خاص ہے اخفائے راز کا

---

[۱] و [۲] تلہری صاحب کا ایک مضمون "جگرؔ مرادآبادی" مشمولہ طور کے آئینہ میں" جس کا ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے

کہا، اپنی حقیقت تھی منصور و انا الحق کی ... ناچیز سا اک قطرہ دریا کے مقابل تھا
خود حسن یار، جو اک جلوۂ مستور نہ ہو ... آئینہ خانۂ عالم میں کہیں نور نہ ہو
اپنی ہستی کے جو انوار سے بیگانہ ہے ... وہ فقط چند حبابات کا دیوانہ ہے
سراپا دید ہو کر غرق موج نور ہو جانا ... ترا ملنا ہے خود ہستی سے اپنی دور ہو جانا
میں عشق ہوں مکمل، میں شوق ہوں مسلسل ... گویا تمام عالم، میری ہی داستاں ہے
اگر نہیں پس پردہ کوئی حقیقت میں ... یہ کون بول رہا ہے طلسم صورت میں
مجھی میں رہے مجھ سے مستور ہو کر ... بہت پاس نکلے بہت دور ہو کر
محو تسبیح تو سب ہیں مگر ادراک کہاں ... زندگی خود ہی عبادت ہے مگر ہوش نہیں
میں خطاکار، سیہ کار، گنہ گار مگر ... کس کو بخشے تری رحمت جو گنہ گار نہ ہو
ازل سے حسن تو عاشق نواز ہے لیکن ... جو عشق ہی اسے عاشق نواز رہنے دے
پردہ جب اٹھ گیا ہے دیکھا یہی ہے اکثر ... اپنی ہی آرزو میں اپنی ہی جستجو کی
ہوگا تری محفل میں کوئی اور بھی جلوہ ... مجھ کو تو محبت ہی محبت نظر آئی
مٹائے لاکھ زمانہ، مٹا نہیں سکتا ... اگر یہ سچ ہے، کہ تیری ہی اک ادا ہوں میں
محبت ہی ناظم، محبت ہی ناشر ... محبت دکھاتی ہے کیا کیا مناظر
محبت ہی باطن، محبت ہی ظاہر ... محبت ہی اول، محبت ہی آخر
محبت ہی میں ہوں محبت ہی تو ہے

مندرجہ بالا اشعار تلہری صاحب کے بیان کی تردید کرتے ہیں انھیں سے عندلیب شادانی کے اس بیان کی بھی تردید ہوتی ہے جس میں انھوں نے جگر کی صوفیانہ شاعری کے لیے لکھا ہے کہ:

"انھوں نے اس بے مزہ راگ کو بہت زیادہ الاپا ہے اور درجنوں اشعار" فلسفہ و تصوف " کے ان مسائل پر لکھ ڈالے ہیں جن سے ہر نقال شاعر اور جاہل صوفی اچھی طرح واقف ہے"۱

جگر کے ان اشعار میں تصوف کا راگ بے مزہ قطعی نہیں ہے البتہ انھوں نے تصوف کے معاملہ میں اپنے ماقبل شعرا کی پیروی کی ہے

عندلیب شادانی نے جگر کے بعض اشعار کے معانی و مطالب بیان کرنے میں بھی بہت ناانصافی سے کام لیا ہے مثلاً جگر کا ایک شعر ہے ؎

میں ہوا جب سے غریق موج طوفان خیز عشق ... ڈوب مرنے کی تمنا سینۂ ساحل میں ہے

---

۱ "دور حاضر اور اردو غزل گوئی" مطبوعہ سنہ ء صفحہ

جس کے متعلق عندلیب لکھتے ہیں کہ :-

"ساحل کے لیے پہلے سینہ قائم کیا پھر اس میں ڈوب مرنے کی تمنا پیدا کی اور اس تمنا کے پیدا ہونے کا سبب شاعر صاحب کی بحر عشق میں غرقابی ہے ممکن ہے جگرؔ صاحب کا بیان ہو مگر وہ کاش اتنا بتلا دیتے کہ سینہ ساحل میں جو تمنا موجزن ہے اسکا علم انکو کیونکر ہوا اور یہ کیسے پتہ چلا کہ ان کی غرقابی کی وجہ سے ساحل بھی ڈوب مرنا چاہتا ہے"۔ ء۱

شعر کا مطلب صاف ہے کہ جب سے وہ (جگرؔ) طوفان خیز عشق کی موجوں میں غرق ہیں ان کی یہ تمنا ہے کہ وہ سینہ ساحل میں ڈوب کر مر جائیں ایسے صاف اور سادے شعر کو کیسے غلط معنی عندلیب شادانی نے پہنائے ہیں۔

اسی طرح جگرؔ کے ایک شعر کی اد وضاحت میں عندلیب شادانی نے سخن فہمی و سخن سنجی کی اس طرح شان دکھائی ہے جگرؔ کا شعر ہے ؎

میں نیم بسمل خیام حسب جگرؔ   حافظ خوش کلام نے مارا !!

عندلیب لکھتے ہیں :-

" یہ شعر اگرچہ کل دس لفظوں کا مجموعہ ہے لیکن قادر الکلام شاعر نے اسمیں ایک پوری داستان بیان کر دی ہے اور اس خوبصورتی کے ساتھ کہ جو باتیں اس میں مذکور نہیں وہ خود بخود سمجھ میں آجاتی ہیں اور واقعہ کی مکمل تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے

ایک بادشاہ سیر و شکار یا جنگ کے ارادے سے اپنی فوجیں لیکر نکلا ہے بحیثیت ملک الشعرائے سلطانی جگرؔ صاحب بھی لشکر کے ہمراہ ہیں چلتے چلتے لشکر ایک مقام پر ٹھہر جاتا ہے پڑاؤ ہوتا ہے خیمے لگائے جاتے ہیں ایک خیمہ جگرؔ صاحب کے لیے مخصوص ہے رات کو اپنے خیمہ پر پہرا دینے کے لیے ایک حافظ یعنی محافظ بھی آپ کو ملا ہے اس کا نام "خوش کلام" ہے یہ شخص اگرچہ سپاہی ہے مگر شاعر ہے اور اچھا شاعر ہے اسی بنا پر لوگ اسے "خوش کلام" کہتے ہیں ورنہ درحقیقت اس کا اصلی نام کچھ اور ہے جو اب کسی کو یاد نہیں خوش کلام کا یہ خیال ہے کہ وہ جگرؔ صاحب سے کہیں بہتر شعر کہتا ہے مگر بد ذوق دنیا اس کی قدر نہیں کرتی اسی بنا پر وہ جگرؔ صاحب کا جانی دشمن ہے اور رات دن ان کے دشمنوں کی ہلاکت کی فکر میں لگا رہتا ہے اس موقع کو اس نے غنیمت جانا طوفانی رات تھی، آندھی چل رہی تھی پچھلے پہر وہ ظالم جگرؔ کے خیمہ میں گھس گیا اور تلوار سے آپ کی سر بری طرح زخمی کر دیا بلکہ اپنے نزدیک آپ کو مار ہی ڈالا اپنے جرم کو چھپانے کی اس نے یہ تدبیر کی کہ جگرؔ صاحب کے خیمہ کی اور آس پاس کی دو تین خیموں کی طنابیں کاٹ دیں تاکہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ طوفانی ہوا سے خیمے گر پڑے اور لوگوں کی ہلاکت کا باعث ہوئے۔

خیموں کے گرتے ہی ایک شور مچ گیا لوگ جمع ہو گئے خیمے اٹھائے گئے اور تو سب صحیح سلامت تھے لیکن جگرؔ صاحب

ء۱ ،، دو شعر اور اردو غزل گوئی" مطبوعہ ۱۹۵۸ء، ص ۱۸۲

خون میں شرابور، بیہوش پڑے تھے لوگوں نے سمجھا کہ چوب خیمہ جو آپ کے سر پر لگی ہے تو اس سے بیہوش ہوگئے ہیں بہر حال آپ کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کی گئیں آپ نے آنکھیں کھولیں اور لوگوں کو بتایا کہ میں چوب خیمہ سے زخمی نہیں ہوا ہوں بلکہ میرے حافظ خوش کلام نے مجھے مارا ہے۔

اگر کسی شعر کا مطلب اس کے الفاظ ہی کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے تو یقیناً اس شعر کا یہی مطلب ہے جو ہم نے بیان کیا لیکن جگر کے مخالفین جو ان کی قادر الکلامی کے قائل نہیں اس مطلب کو غلط ٹھہراتے ہیں اور دور دراز کی تاویلیں کرتے ہیں مثلاً وہ کہتے ہیں کہ خیام (بر وزن صیام) سے شاعر کی مراد ایران کا مشہور شاعر عمر خیام نیشاپوری ہے اور حافظ کا مطلب محافظ نہیں بلکہ حافظ شیراز کی طرف اشارہ ہے مگر یہ مخالفین کی زبردستی ہے ورنہ خیام (بر وزن صیام) خیمہ کی جمع ہے مکتوبی مشابہت کی بنا پر ایسے ایام (بر وزن ایام) کیونکہ سمجھ سکتے ہیں اور کیوں شاعر کے سر یہ الزام لگایا جائے کہ اس نے مشدد (خیّام) کو مخفف (خیام) کر دیا ہے"۱

عندلیب کی یہ توجیہہ اور جدت طرازی محض تضحیک کی خاطر ہے ورنہ جگر صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ عمر خیام کے کلام کے بسبب نہیں بلکہ حافظ شیرازی کی خوش کلامی سے زیادہ متاثر ہیں ضرورت شعر کی خاطر جگر نے خیام بغیر تشدید کے اگر موزوں بھی کر دیا تو اس طرح مضحکہ اڑانا چاہیے تھا۔ (اس لفظ پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو "نگار" فروری ۱۹۴۹ء صفحہ ۳۷ عطاء اللہ صاحب کا مضمون)

اسی طرح انھوں نے جگر کے بعض دوسرے اشعار کے بھی مطالب بیان کیے ہیں ظاہر ہے ایسے معنی و مطالب کا حقیقت و سنجیدہ تنقید سے کوئی واسطہ نہیں ہے صرف جگر کی تضحیک مقصود ہے

جگر کی شاعری کے متعلق مجنوں گورکھپوری کی یہ رائے بھی صحیح نہیں ہے کہ:۔

"جگر کے اشعار سن کر ہم تلملا بھی اٹھتے اور جھوم بھی جاتے ہیں لیکن جب تامل کے ساتھ اس شعر کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سارا اثر بس جلد تک محدود تھا سوا ایک پھریری کے کچھ تھا ہی نہیں جگر زندگی وہ بھی عشقیہ زندگی کے عارضی لمحات کے شاعر ہیں ان کے اشعار ہمارے دل و دماغ یا ہماری روح کی اندرونی تہوں کو نہیں چھو پاتے"۲

مجنوں نے ایک دوسری جگہ جگر کی شاعری کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

"ان کی ساری شاعری ہیجان اور عصبی بے اختیاری کی شاعری ہے جس پر والہانہ کیفیت کا دھوکا ہوتا ہے جگر میں ایک زبردست صلاحیت یہ ہے کہ وہ چند سطحی تاثرات اور ظاہری خصوصیات میں ہم کو بہت کر لیتے ہیں گہرائیوں میں جانے سے باز رکھتے ہیں اسی لیے میں نے ان کو ایک خطرہ بتایا ہے لیکن جو لوگ ٹھہر کر اور اپنے کو روک کر غور کرنے کے خوگر ہیں وہ محسوس کرتے ہیں کہ جگر کی شاعری ایک ایسا ہیجان ہے جو صرف ہماری جلد میں پیدا ہوتا ہے اور بات کی بات میں ختم ہو جاتا ہے"۳

---

۱ "دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی" مطبوعہ ۱۹۵۱ء ص ۲۹۶ تا ۲۹۹ ۔ ۲ "جگر" آجکل یکم ستمبر ۱۹۶۰ء ص ۔ ۳ "شعر اور غزل" ص ۱۲۵

مجنوں کے مندرجہ بالا ابیات کے جواب میں پہلے "شعلۂ طور" اور بعد کو "آتش گل" سے کچھ اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں جو ہمارے دل و دماغ یا ہماری روح کی اندرونی تہوں کو بھی چھوتے ہیں اور ان میں وہ ہیجان بھی نہیں ہے جو صرف جلد کو چھوتا ہو ؎

قریب سرحد حرماں جگر! ٹھہر جاؤ
سنا ہے قافلۂ غم ادھر سے گذرے گا

انسان کو لازم ہے رہے دور ریا سے
یہ چیز جدا کرتی ہے بندے کو خدا سے

کیا جانے کب تک مجھے فرقت میں کل آئے
دل کو ابھی رو کا تھا کہ آنسو نکل آئے

ورنہ کیا تھا صرف ترتیب عناصر کے سوا
خاک کچھ بنیا بیوں کا نام انساں ہو گیا

آدمی نشۂ غفلت میں بھلا دیتا ہے
ورنہ جو سانس ہے تعلیم فنا دیتا ہے

مرا احساس غم اے کاش اتنا تیز ہو جاتا
جو چھو جاتی ہوا دل درد سے لبریز ہو جاتا

مڑ کے پھر میں نے نہ دیکھا میں ہوں لیسارہ نورد
دیکھتی ہی رہ گئی حسرت سے منہ منزل مرا

کسی طرف سے شب غم صدا نہیں آتی
پکارتا ہوں قضا کو، قضا نہیں آتی

وہ حال دل لب خاموش سے بھی سنتے ہیں
یہ جانتا تو نہ شرمندۂ فغاں ہوتا

رہ طلب میں نہ کر خوف لغزش پا سے
یہاں جو گر کے اٹھا، بس وہ کامیاب اٹھا

حشر تک ہو نہیں سکتی جو رسائی نہ سہی
یہی انساں کی ہے معراج کہ انساں ہو جائے

ان کے جاتے ہی یہ حیرت چھا گئی!
جس طرف دیکھا کیا، دیکھا کیا!

بیساختہ آج ان کے بھی آنسو نکل آئے
دیکھا نہ گیا حال فقیرانہ کسی کا!!

وہ ہمارے قریب ہوتے ہیں
جب ہمارا پتہ نہیں ہوتا

جسم محدود، روح لا محدود
پھر یہ اک ربط باہمی کیا ہے؟

وہ بھی ہے اک مقام عشق جہاں
ہر تمنا گناہ ہوتی ہے!

کس طرف جاؤں؟ کدھر دیکھوں؟ کسے آواز دوں
اے ہجوم نامرادی! جی بہت گھبرائے ہے

اس زمانے کا انقلاب نہ پوچھ
روح شیطاں کی، شکل آدم کی

لہو آتا نہیں کھنچ کر مژہ تک
نہ آئے گی بہار اب کی برس کیا

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

میں اور یہ تمکین غم عشق ارے توبہ
تو اور یہ احساس گران بار محبت

معرفت جمال میں، کام نہ آئے بال و پر
عقل کہیں پہ گر پڑی چھوٹ گئی کہیں نظر

اللہ کے علم و حکمت محدود اگر اکرام نہیں
آدمی کے پاس سب کچھ ہے، مگر
عشق لا محدود جب تک رہنما ہوتا نہیں
ہوتا ہے نہ جانے کیوں یہ محسوس
ہیں دو رہے دل کی وہ مجبوریاں بھی یاد
عصیاں کا بار ہٹ تو گیا سر سے اے کریم
دل غنی ہو تو ہر اک رنج بھی دلکی راحت
جھوٹی ہے ہر ایک مسرت

ہر سانس کے آنے جانے میں کیا کوئی نیا پیغام نہیں
ایک تنہا آدمیت ہی نہیں
زندگی سے زندگی کا حق ادا ہوتا نہیں
فطرت بھی ہے جیسے غم رسیدہ
آنکھیں تھیں سوگوار مگر دیکھتے رہے
لیکن ہوں ایک بوجھ سا دل پر لیے ہوئے
ذہن مفلس ہو تو ہر سود زیاں ہوتا ہے
روح اگر تسکین نہ پائے

یگانہ چنگیزی نے بھی جگر کے کلام پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

"شہرت عامہ کے طالب کے لیے ضروری ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ گاہکوں کے رجحان اور خوشنودی کا خیال رکھے آسان اور سستے لٹریچر کی کامیابی یا چند روزہ زندگی کا راز یہی ہے داغ اور جگر نے اس راز کو اچھی طرح سمجھا ہے ......

(جگر)

رہیے اور پھر جناب جگر! پی پلا کر برائیاں توبہ!

دوسرا مصرعہ نہایت برجستہ مگر جگر تو ایک ہی مصرعہ کا شاعر ہے مصرعہ پر مصرعہ لگانا تو آتا نہیں دیکھو یوں مصرعہ لگاتے ہیں ؎

کیوں جگر ہجو ہے اسی منہ سے پی پلا کر برائیاں توبہ!

اپنے معیار کے لحاظ سے جگر نے یہ غزل بڑے زوروں کی کہی ہے مگر اول سے آخر تک بوالہوسانہ نفس پرستی کے سوا شاعری میں کیا رکھا ہے زندگی کی وسعتوں اور اس کی ذمہ داریوں سے جگر کی شاعری کو کیا واسطہ؟ دیکھیے یہ جاپانی مال کے دن چلتا ہے یہ تو وہ شاعری تھی جو زیادہ سے زیادہ گاہکوں کے رجحان اور خوشنودی کے تابع ہے"، [۱]

یگانہ کی یہ تنقید سنہ ۴۴ء کی "شعلہ طور" کی ایک غزل پر ہے یگانہ کا یہ بیان کہ جگر شہرت عامہ کے طالب ہیں ان کو گاہکوں کے رجحان اور خوشنودی کا خیال ہے صحیح نہیں ہے دراصل جگر نے نہ تو کبھی کسی کی خوشنودی کے لیے شعر کہے اور نہ کبھی کسی کی خوشامد کی انھوں نے ہمیشہ اپنے دلی کیفیات و جذبات کی ترجمانی کی۔ جگر اس کو کیا کرتے کہ عوام نے ان کے اسی انداز کو پسند کیا اور اس پر سر دھننے لگے

---

[۱] "نیرنگ خیال" لاہور سالنامہ سنہ ۴۲ء ص ۷۹ و ۸۰

"یہ غزل" بھی جگر کے دلی جذبات و کیفیات کی آئینہ دار ہے جس کے پیچھے جگر کے معاشقہ کی ایک پوری داستان پوشیدہ ہے غزل میں بوالہوسی ضرور نظر آتی ہے لیکن اسے جاپانی مال یا گاہکوں کی خوشنودی کہنا کسی صورت میں جگر کے ساتھ انصاف نہیں ہے جگر کے شعر پر یگانہ کی اصلاح بھی درست نہیں ہے ان کی اصلاح سے جگر کے شعر کی شگفتگی ختم ہو گئی

جگر کی شاعری کے متعلق جوش کا یہ خیال بھی درست نہیں ہے کہ :-

"ان کی غزلوں کے بعض اشعار میں جو رندی و سرشاری کا بانکپن تھا اس کی رعنائی دل کو بہت لبھایا کرتی تھی لیکن افسوس کہ ترک مے نوشی نے جگر کی اس آگ کو گلا دیا تھا اور اب وہ تصوف کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئے تھے" [۱]

چونکہ ترک مے نوشی کے بعد جگر کا مزاج رندی ہی رہا تیس پینتیس سال تک مے نوشی کی زندگی نے ان کی فطرت کو رندانہ بنا دیا تھا اور جب انھوں نے شراب ترک کر دی تب بھی ان کی فطرت قطعی طور سے بدل نہ سکی جس کی طرف جگر نے خود بھی اشارہ کیا ہے ؎

گداز عشق نہیں کم جو میں جواں نہ رہا   وہی ہے آگ مگر آگ میں دھواں نہ رہا

یہ عمر کا تقاضا تھا کہ جوں جوں ان کو زندگی کے تجربات ہوتے گئے ان کو انھوں نے اپنی غزلوں میں نظم کرنا شروع کیا۔ جہاں تک جگر کے تصوف کا سوال ہے اس کے عناصر ترک شراب کے بعد نہیں ان کے ابتدائی دور کے کلام میں بھی پائے جاتے ہیں البتہ جب انھوں نے شراب ترک کر دی تو یہ رنگ اور زیادہ نکھر آیا

کہیں کہیں اثر لکھنوی نے جگر کے کلام پر تنقید کی ہے اور جگر کے کلام پر تنقید کرنے میں کہیں ان سے بھی لغزش ہوئی ہے مثلاً انھوں نے جگر کے اس شعر ؎

کیا جانیے کیا ہو گیا ارباب جنوں کو   نہ مرنے کی ادا یاد نہ جینے کی ادا یاد

کے متعلق لکھا ہے کہ :-

"مرنے کا سلیقہ ہوتا ہے نہ کہ ادا شعر غالباً سیاسی پہلو لیے ہوئے ہے اور ارباب جنوں سے دھن کے پکے جان پر کھیلنے والے محبان وطن مراد ہیں جن کا دور حاضر میں فقدان ہے اگر میرا خیال غلط نہیں تو شعر کا یہ رخ ہونا چاہیے

بدلے ہوئے انداز ہیں ارباب جنوں کے   مرنے کا سلیقہ ہے نہ جینے کی ادا یاد" [۲]

شاعر کو اختیار ہے کہ وہ اپنے احساسات و جذبات کو جس طرح محسوس کرے ادا کرے اور اگر بالفرض اثر صاحب کے اعتراض کو مان لیا جائے تو اثر صاحب کو مرنے کے لفظ کو سلیقہ اور جینے کو ادا

---

[۱] "جگر مرادآبادی" از شوق مرادآبادی (غیر مطبوعہ)، [۲] "قومی آواز" ۲۶ جنوری ۱۹۵۹ء ص ۲

نہیں کہنا چاہئے تھا کیونکہ جینے کا بھی سلیقہ ہی ہوتا ہے مثلاً

بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو (اقبال)

اور حالی کہتے ہیں ؎

نہ مطلب نگاری کا اُن کو سلیقہ نہ دربارداری کا ان کو سلیقہ
نہ امیدداری کا ان کو سلیقہ نہ خدمت گزاری کا ان کو سلیقہ

لفظ "ادا" عموماً اس اچھوتی دل کش جذباتی کشش کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس کی وجہ کشش کی وضاحت تشریح نہ کی جاسکے اثر صاحب کا ایک شعر ہے ؎

ادائیں نکلنے لگیں ہیں جفائیں ☆ ☆ محبت کا اب آرہا ہے زمانہ

ایک صاحب نے ستمگاری جیسے مرکب فعل کو سلیقہ کہا ہے ؎

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

جگر کا ایک قطعہ ہے :-

مدت ہوئی اک حادثۂ عشق کو لیکن اب تک ہے ترے دل کے دھڑکنے کی صدا یاد
ہاں ہاں تجھے کیا کام مری شدت غم سے ہاں ہاں نہیں مجھ کو ترے دامن کی ہوا یاد

اثر صاحب کا اعتراض ہے :-

" یہ حادثۂ عشق اتنا شدید تھا کہ قائل واقعی بیہوش ہوگیا اور اس کو ہوش میں لانے کے لیے معشوق اپنے دامن کی ہوا دے رہا تھا مگر اس عالم بے ہوشی میں یا ہوش آنے پر معشوق کے دل کی دھڑکنے کی صدا سن لینا بڑا کارنامہ ہے جس کے بعد ایسا انقلاب رونما ہوا کہ وہی معشوق کہتا ہے " میری جوتی تیرا غم کرے " اس پر اسے یاد دلایا جاتا ہے کہ تو نے تو مجھے اپنے دامن کی ہوا بھی دی تھی خیر یہ تو " افسانہ آں کہ شب یار گزشت " تھا کسی کو میں سیکھ نکالنے کا کوئی حق نہیں، مگر ضمناً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم آپ " دامن کی ہوا یاد نہیں کہیں گے یا دامن کی ہوا دینا یاد نہیں کہیں گے "[۱]

اتنی موشگافی صحیح نہیں معلوم ہوتی جگر نے اس قطعہ میں اپنی درد بھری یاد، دلگیر شکایت اور عاشقانہ خودداری کو ظاہر کیا ہے انھوں نے معشوق کے دامن کی محبت بھری ہوا دینے کی ادا ہی کو یاد کیا ہے یا معشوق پر اپنی بیہوشی کے رد عمل کی لذت کو محسوس کر کے کہا ہے اسی طرح معشوق کے دل کے دھڑکنے کی اس صدا کو بھی یاد کیا ہے جو ان کے کان میں آتی تھی جگر کا شدت غم اور دل کا دھڑکنا ان کے داخلی کیفیات کی عکاسی کرتا ہے

---

[۱] " قومی آواز " ۲۲ جنوری ۱۹۵۵ء صفحہ ۲

کلیم الدین احمد نے بھی جگر کے کلام پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"جگر ...... شروع میں صاف سیدھے، سلیس و رواں شعر موزوں کرتے ہیں پھر جدید رنگ تغزل" سے متاثر ہو کر اپنے شعروں میں شان و شوکت ظاہری ادبی رنگ کی آمیزش کرتے ہیں پھر شہرت عام کی خاطر ترقی پسندی کی طرف مائل ہوتے ہیں اسی کا نتیجہ ہے کہ جگر کی شاعری قدیم و جدید تغزل، رجعت پسندی اور ترقی پسندی کا مضحک نمونہ بن گئی ہے

تغیر کوئی بری چیز نہیں لیکن اچھے شعراء میں یہ تغیر ارتقا کا روپ دھار لیتا ہے ...... جگر کی غزلوں میں اس قسم کا ارتقا نہیں اگر کچھ ترقی ہے تو وہ "ٹکنیک" کی ترقی ہے ...... جگر کے اشعار کی مثال مصنوعی پھول کی سی ہے جو نہایت حسن و خوبی سے بنایا گیا ہے جس پر دور سے فطری پھول کا دھوکا ہوتا ہے لیکن مصنوعی پھول کسی فطری پھول کا مقابلہ نہیں کر سکتا

جگر نے شروع میں داغ کی ناکامیاب تقلید کی پھر نئے رنگ میں رنئے رنگ سے مراد ترقی پسندی نہیں بلکہ وہ رنگ ہے جس کے سیماب وغیرہ علمبردار تھے، لکھنے لگے اور جب ترقی پسندی کی ہوا بہنے لگی تو ترقی پسند قسم کے شعر کہنے لگے .....

جگر کبھی زمانہ ہاتھ سے نہ جانے پائے کے قائل ہیں ......

جگر نے کہنے کا ایک اسلوب قصداً گڑھا ہے جس سے سننے والا چونک اٹھتا ہے احساسات کی تازگی، نیاپن یا شدت کی وجہ سے نہیں ہوتا اس چونک اٹھنے کا سبب محض کہنے کا ڈھنگ ہے لفظی چابک دستی اور بازی گری ہے" ؎۱

کلیم الدین کا یہ بیان صحیح نہیں ہے جگر کی شاعری قدیم و جدید رنگ تغزل کا ایک مضحک نمونہ ہونے کے بجائے دونوں رنگوں کو ملا کر ایک دل کش نمونہ بن گیا ہے جو ہم کو اپنی طرف مائل کرتا ہے کلیم الدین نے جگر کے کلام کو مصنوعی پھولوں سے غلط تشبیہہ دی ہے کیونکہ جگر نے اپنے ہی دل کے جذبات و احساسات کی بڑی کامیاب عکاسی کی ہے جس سے سننے والے وجد میں آجاتے ہیں" جگر زمانہ ہاتھ سے نہ جانے پائے" کے بھی قائل نہیں تھے بلکہ اپنی شاعرانہ فطرت سے مجبور تھے جب انھوں نے ملک میں سیاسی کشمکش اور ابتری دیکھی تو ان کا دل اس پر کڑھا اور انھوں نے ان ہی حالات سے متاثر ہو کر غزلیہ نظمیں لکھیں ترقی پسند حلقوں سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا، رہا مقبولیت کا سوال تو اس کو وہ کیسے روکتے ان حلقوں میں مقبولیت کی وجہ ان کے کلام کی کشش اور سچائی تھی

جگر کو جن لوگوں نے مشاعروں کا شاعر، ادب فروش یا نام و نمود کا نے والا شاعر یا موقع پرست کہا ہے ان سب کی تردید جگر کی اس تحریر سے ہوتی ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ:۔

؎۱ اردو شاعری پر ایک نظر (حصہ دوم) مطبوعہ ۱۹۵۶ء ص ۴۴۴ تا ۴۵۵

"مشاعروں کو اور خصوصاً مشاعروں کی بہتات کو میں ہر اعتبار پر مخرب اخلاق اور ملک وقوم کے لیے مہلک تصور کرتا ہوں میرا نظریہ ہے کہ تمام فنون لطیفہ اپنے اپنے مدارج کے اعتبار پر لذت رکھتے ہیں نشہ رکھتے ہیں اور پرواز لذت کے بعد زیادہ حصول لذت کی طلب قدرتی امر ہے نتیجہ کے طور پر قوائے عمل کا ان لذتوں اور نشہ آور کیفیتوں میں محو و مستغرق ہو جانا لازم و ملزوم......

میں مشاعروں میں جن مجبوریوں کے ماتحت شریک ہو جاتا ہوں خدا ہی بہتر جانتا ہے اگرچہ قوائے عمل میں بیداری پیدا ہو چکی ہے لیکن ابھی تک اپنی اصلی حالت پر نہیں آسکے یہی سبب ہے کہ میں اپنی اس اخلاقی کمزوری کا حق ادا کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ بعض غیر حق و غیر مستحق امور کے متعلق بھی اپنے احباب کے اصرار کو رد نہیں کر سکتا ان کی نزاکت طبع کا احساس اس حد تک ہے کہ اس حد تک ہونا نہیں چاہیے آہستہ آہستہ ترقی کر رہا ہوں انشاء اللہ وہ دن بھی قریب ہی آنیوالا ہے جب میں مشاعروں کی شرکت اپنے اوپر حرام سمجھ لوں گا

ہندوستان کے گوشے گوشے میں شاعروں کی وبا پھیلی ہوئی ہے اور ہر مقام سے احباب کا اصرار ہوتا ہے کہ مشاعروں میں شرکت کروں میری عمر اور صحت دونوں اس قابل اب نہیں رہ گئے کہ ان اذیت آفریں ہنگاموں میں جان کھپاتا پھروں اسی لئے میں نے اپنے اوپر چند شرائط عائد کر رکھی ہیں اور ان پر سختی سے قائم ہوں استثنیٰ کی گنجائش کیونکر روا رکھی جا سکتی ہے اس لیے کہ ایک استثنا کے یہ معنی ہوئے کہ دیانت کے ساتھ مجھے دوسرے احباب کو استثنا سے محروم نہ رکھنا چاہیے اب آپ ہی انصاف فرمائیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے

ایک الزام عام طور پر مجھ پر عائد کیا جاتا ہے اور وہ "ادب فروشی" کا حالانکہ میں نے خود اپنے مجموعہ کلام سے بھی برائے نام ہی فائدہ اٹھایا ہے میں اپنے شعر و ادب کی عظمت محسوس کرتا ہوں کیا اس کی قیمت چند روپیے ہو سکتے ہیں" شرائط میں سے پچاس روپیے اور سکنڈ کلاس کا کرایہ یہ شعر و ادب کی قیمت ہو سکتے ہیں اور کیا شاعر اپنی صحت و آرام کا کوئی حق نہیں رکھتا"[۱]

جگر نے اپنے بعض نقادوں کو جنھوں نے ان کی شاعری کو ہلکی پھلکی یا بعد کی شاعری کو جدید و قدیم رنگ کی آمیزش کا مضحک نمونہ بتایا ہے ان کو ایک طرح کا ان الفاظ میں جواب دیا ہے۔

"دراصل سرور یا غموم جذبات کا تعلق خود شاعر کی استعداد مزاجی اور حالات و واقعات سے ہوا کرتا ہے نہ کہ دوسروں کے جذبات و واردات یا مصائب ملکی ملی سے، حالات کے ماتحت شاعر کا مزاج بن چکا ہے وہ اکثر و بیشتر ہر چیز کو اسی اسپرٹ کے زیر اثر قبول کرے گا مسرت و غم دونوں عطیات فطرت

---

(۱) "تحریک" اکتوبر سنہ ۶۳ء ص ۲۳-۲۴،

ہیں اور دونوں دو مختلف اسپرٹ اپنے اندر رکھتے ہیں دیکھنا یہ نہیں کہ شاعر مغموم جذبات پیش کرتا ہے یا مسرور، بلکہ دیکھنا یہ چاہیئے کہ شاعر نے جو کچھ کہا ہے محسوس کر کے کہا ہے یا نہیں . . .

شاعر کے شعر و ادب میں اس کی زندگی کا پایا جانا بھی لازمی ہے اس کے علاوہ شاعر کی ذہنیت اور اس کی استعداد کو بھی پاکیزہ اور بلند ہونا چاہیئے اس لیے کہ اگر شاعر نے اپنی انفرادیت کا حق ادا کیا ہے تو اس کے کلام میں اس کی ذہنیت و استعداد کا پرتو ہوگا اس صورت میں اگر شاعر پاکیزہ نفس وسیع النظر ہونے کے ساتھ ساتھ وسیع معلومات بھی رکھتا ہے تو اس کے کلام میں اس کے تمام مزاجی خصوصیات کی جھلک نمایاں طور پر موجود ہوگی"۔(۱)

اس اقتباس کو عندلیب شادانی، مجنوں گورکھپوری اور کلیم الدین وغیرہ کے اعتراض کے جواب میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے جگر کے کلام کی تعریف کچھ ضرورت سے زیادہ کردی ہے مثلاً ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ :-

"جگر صاحب کی شاعری میں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ اصلاً وہ دوری و مہجوری کے شاعر ہیں ان کی شاعری کی رفتار اور سمت کا مطالعہ کیا جائے تو آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ فراق کے شاعر ہیں وصال کے نہیں ان کا محبوب سے رشتہ کا انداز Companionate ہرگز نہیں ہے، یہی سبب ہے کہ جگر کی شاعری میں محبوب کی عفت میں کہیں کوئی خلا نظر نہیں آتا اور ان کا کلام اس آسودگی اور بے راہ روی سے پاک ہے جو ہماری شاعری اور سوسائٹی میں آجکل نظر آتی ہیں میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ جو شاعر ذہن و فکر کے اعتبار سے محبوب سے قریب قریب اور جسم و جان کے اعتبار سے دور سے دور ہو وہ اس شاعر سے بالعموم بہتر اور برتر ہوگا جس کی پوزیشن اس کے بالکل برعکس ہو جگر کے نقاد کو یہ نکتہ مدِ نظر رکھنا چاہیئے"۔(۲)

رشید صاحب کے اس بیان میں جزوی صداقت ضرور ہے لیکن جگر کو فراق کا شاعر کہنا صحیح نہیں ہے یہ ضرور ہے کہ ان کے کلام میں ہجر و فراق کے اشعار زیادہ پائے جاتے ہیں لیکن وہ محبوب کے قرب و لطف اور وصل کے بھی قائل تھے مندرجہ ذیل اشعار کی روشنی میں دیکھیے کہ رشید صاحب کا یہ فیصلہ کس حد تک صحیح ہے۔

میں ان کا ہو گیا انھیں مسرور کر دیا ؛ وہ میرے ہو گئے مجھے مغرور کر دیا !
تجاہل، تغافل، تبسم، تکلم ؛ ؛ یہاں تک تو پہنچے وہ مجبور ہو کر
مرے جنونِ تمنا کا کچھ خیال نہیں ؛ ؛ لجائے جاتے ہیں دامن چھڑائے جاتے ہیں

---

(۱) "فروغ اردو" فروری و مارچ ۱۹۶۱ء ص ۸۱ و ۸۲ (۲) "نگارش" امرتسر (جگر نمبر) غالباً ۱۹۶۱ء پرچہ پر سنہ نہیں لکھا ہے ص ۴۵-۴۶

دنیا تو یہ کہتی ہے کہ ممکن ہی نہیں ہے ✤ مجھ سے کوئی پوچھے ترے ملنے کی ادائیں

مگر دل ہے کہ ڈوبا جا رہا ہے! ✤ وہ خود تسکین خاطر کر رہے ہیں

ہر اک پردہ اٹھایا جا رہا ہے ✤ ملا ہے آج اذنِ بار ریابی

عشق کی بے تابیاں ہیں حسن کا آغوش ہے ✤ کیا گھڑی ہے کیا سماں ہے کس غضب کا جوش ہے

خود وہ گلے لپٹ گئے حسن کا واسطہ دیا ✤ جذبِ جنوں نے آج تو گل ہی نیا کھلا دیا

چہرے پہ رنگ آگیا، ہاتھ مرا دبا دیا ✤ میرے ہجوم شوق پر منہ سے تو کچھ نہ کہہ سکے

آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ:-

"جگر نے عشق کی انانیت اور خودداری پہ بار بار زور دیا ہے جگر کے یہاں کبھی کبھار عاشق خود محبوب بن گیا ہے یہ دراصل ذہن کا وہ جادو ہے تخیل کا وہ طلسم ہے جس میں کبھی کبھار عاشق اور شاعر اسیر ہو جاتا ہے اس قسم کے اشعار کافی ہیں مگر یہ جگر کا بہت بڑا کارنامہ نہیں ہے" ۱

سرور صاحب کا یہ بیان بھی کہ جگر کے یہاں عشق کی انانیت ہے صحیح نہیں ہے نیاز عاشقی کی عظمت البتہ پائی جاتی ہے جس میں ان کا جذبہ خودداری شامل ہے وہ حسن اور عشق دونوں کا حد درجہ احترام کرتے تھے ان کے بعض صوفیانہ قسم کے اشعار میں تخیل کی طلسم آفرینی ضرور مل جاتی ہے جیسے ؎

مری ہستی بھی کیا تیرا ہی عالم ہوتی جاتی ہے ✤ جدھر سے میں گزرتا ہوں نگاہیں اٹھتی جاتی ہیں

مجھی کو سب پکار اٹھیں گزر جاؤں جدھر ہو کر ✤ یہاں تک جذب کر لوں کاش تیرے حسنِ کامل کو

نیاز فتحپوری کا یہ قول بھی صحیح ثابت نہ ہو سکا جسمیں انھوں نے لکھا تھا کہ:-

"جگر کے شاعر اور اچھے شاعر ہونے میں شک نہیں لیکن ان کے کلام پر اظہار رائے کے لیے سید سلیمان ایسے مولانا کی ضرورت ہے جو غریب کوچہ عشق کی راہوں سے ناواقف ہونے کی بنا پر جگر کو "عشق حقیقی کا جویا" سمجھ بیٹھے ......

بہر حال اب اس سلسلہ میں کوئی ناقص و نامکمل مضمون شائع نہ کروں گا اور اگر کوئی صاحب لکھنا چاہتے ہیں تو واقعی صحیح معنوں میں حق انتقاد ادا کریں ورنہ اس وقت کا انتظار کریں جب میں خود اس موضوع پر قلم اٹھاؤں" ۲

نیاز نے سید سلیمان ندوی کی پیشین گوئی کو ۱۹۳۶ء ہی میں جھٹلانے کی کوشش کی تھی لیکن نیاز کی پیشین گوئی جھوٹی اور سلیمان ندوی کی پیشین گوئی سچی ثابت ہوئی جگر واقعی عشق حقیقی کے جویا تھے

---

۱ "آتشِ گل" مطبوعہ ۱۹۵۸ء ص ۲۵ ۲ "نگار" مارچ ۱۹۳۶ء ص ۹۴

یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ۱۹۳۹ء کے آخر میں شراب ترک کر دی نماز روزے اور صوفیانہ باتوں کی طرف راغب ہوئے اور ۱۹۵۳ء میں حج بیت اللہ کا شرف بھی حاصل کیا

نیاز نے جگر کے کلام پر دوبارہ تنقید کا سلسلہ ۱۹۴۲ء سے شروع کیا جسے انھوں نے "مالہٗ و ما علیہ" میں یکجا کر دیا ہے بہت ممکن ہے کہ نیاز ہی کی مندرجہ بالا اپیل سے متاثر ہو کر اختر علی تلہری مجنوں گورکھپوری عندلیب شادانی، اثر لکھنوی اور یگانہ چنگیزی وغیرہ نے قلم اٹھایا ہو کیونکہ ان سب حضرات نے ۱۹۴۲ء کے بعد ہی سے جگر کے کلام پر تنقید کا سلسلہ شروع کیا ہے نیاز خود اسی گروہ میں شامل ہیں اور ان کا آخری حملہ جولائی ۱۹۶۱ء میں گڑے ہوئے مردے پر اپنی پوری طاقت کے ساتھ ہوا اور انھوں نے اس مہینے کے جگر نمبر میں جگر کی شخصیت اور شاعری کو مجروح کرنے میں اپنے قلم کی پوری طاقت صرف کر دی لیکن اس مردے کی روح نے جو کام کیا ہے شاید وہ خود اپنی حیات میں اس کام کو ایسی خوبی سے انجام نہ دے پاتا اس نمبر کے نکلنے کے بعد نیاز کی اس سختی سے خبر لی گئی کہ انھیں بھی شاید اس حرکت پر دل ہی دل میں ندامت ہوئی ہو

نیاز فتحپوری اپنی کتاب "مالہٗ و ما علیہ" میں لکھتے ہیں :-

"جگر مرادآبادی کی شاعری کے متعلق ایک صاحب کی رائے ہے کہ وہ خارش قسم کی شاعری ہے کہ آپ جتنا زیادہ کھجائیں گے زیادہ لطف آئے گا لیکن ہے بہر حال وہ "خارش" ہی اس رائے سے مجھے تھوڑا سا اختلاف ہے اور وہ یہ کہ یہ "خارش" وہ نہیں جس سے زیادہ کھجانے میں زیادہ لطف آتا ہے بلکہ اسے آنچ کھجایا اور سوزش پیدا ہوئی یعنی جب تک ان کی زبان سے آپ ان کا کلام سن رہے ہیں غنیمت ہو لیکن جہاں آپ نے بزم سخن سے ہٹ کر اس پر غور کرنا شروع کیا اس کی قلعی اترنے لگی

یہ درست ہے کہ جگر کا تمام کلام بے آب و رنگ نہیں ان کے یہاں بعض اشعار ایسے بھی ہیں جن کو پڑھکر طبیعت وجد کرنے لگتی ہے لیکن اس قسم کے اشعار ان کے "دور رندی" کی پیداوار ہیں اور جب سے انھوں نے جائے تقدس اختیار کیا ہے ان کی غزلیں بھی اکثر مناجات ہو کر رہ گئی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جوانی کے ختم ہونے پر جو چیز ان کے کلام میں کیف و رنگ پیدا کر دیتی تھی وہ ترک ہو چکی ہے اور اسی لئے ان کا زمانہ حال کا کلام یکسر بے آب و رنگ ہے ،، [1]

نیاز صاحب دوسری جگہ جگر کی شخصیت اور شاعری پر اس طرح حملہ آور ہیں :-

"میری رائے اس باب میں ہمیشہ یہی رہی ہے کہ وہ شخص جو مشاعرہ میں اجرت لے کر شعر سناتا ہے اچھا شاعر تو ہو سکتا ہے لیکن بڑا شاعر کبھی نہیں ہو سکتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سنا ہے کہ جگر پانسو روپیہ لئے بغیر کسی مشاعرہ میں شرکت نہ کرتے تھے اگر یہ صحیح ہے تو بھی کیا ؟ خود ان کی نگاہ میں ان کے کلام کی قیمت

---

[1] "مالہٗ و ما علیہ" ص ۱۴۷-۱۵۸ ،

ایک رکشا سے زیادہ نہ تھا . . . .

جگر کی شہرت کا تعلق حسن کلام سے اتنا نہ تھا جتنا حسن سماعت سے۔ جتنا اچھا وہ کہتے تھے اس سے کہیں زیادہ اچھا وہ پڑھتے تھے وہ مشاعرہ کے شاعر تھے، اکھاڑے کی شاعری کرتے تھے اور ان کا سب سے بڑا "داؤ پیچ" ان کی خوش الحانی تھی لوگ مشاعرہ میں ان کی غزلیں نہیں بلکہ خود انکو سننے جاتے تھے . . . . . .

میں مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتا ہوں، لیکن جب کبھی میں کسی مشاعرہ میں شریک ہوا اور جگر کو سنا تو میں نے بھی بے اختیارانہ داد دی، لیکن جب گھر واپس آکر میں نے غور کیا تو مجھے تعجب ہوا کہ میں نے کیوں ان کے کلام کو سراہا تھا

اس سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ جگر کی مقبولیت کا تعلق ان کی شاعری سے اتنا نہ تھا جتنا ان کے ترنم سے . . . .

جگر . . . خوش فکر شاعر تو ضرور تھے لیکن خوش گو نہ تھے . . . . . جگر کو قادر اوّل کا شاعر بمشکل تسلیم کیا جا سکتا ہے وہ سوچنے کی حد تک یقیناً بڑے کامیاب شاعر ہیں، لیکن جتنا اچھا وہ سوچتے ہیں، اتنا اچھا کہہ نہیں سکتے یعنی احساس و فکر کے لحاظ سے وہ یقیناً کامیاب ہیں لیکن قوت اظہار کے لحاظ سے کوئی استادانہ حیثیت نہیں رکھتے، کاش کہ ان کی زبان و قوت بھی ان سے جذبات کا ساتھ دے سکتی . . . .

جگر فطرتاً بڑے لاابالی قسم کے انسان تھے اور ان کی زندگی کا یہی مزاج ان کی شاعری کا مزاج بنگیا تھا ان کی شاعری یقیناً فطری شاعری تھی لیکن بالکل ایسی ہی جیسے جنگل کی کوئی خودرو جھاڑی جس کی کانٹ چھانٹ نہ کی جائے۔

انھوں نے ہمیشہ شاعری کی، لیکن کبھی غور نہیں کیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں کس زبان میں کہہ رہے ہیں اور جو الفاظ و تراکیب وہ استعمال کرتے ہیں ان کا صحیح مفہوم و صرف کیا ہے . . . . .

میں سمجھتا ہوں کہ ان کا سب سے بڑا دشمن ایک تو ان کی خوش گلوئی تھی کہ مشاعروں میں داد ہمیشہ اسی کو ملی اور وہ یہ سمجھتے رہے کہ واہ واہ ان کے کلام پر ہو رہا ہے اس بات نے انھیں غلط خود اعتمادی میں مبتلا کر دیا . . . . . .

. . . اصل شعر وہ نہیں ہے جو مشاعرہ میں داد حاصل کرسکے، بلکہ وہ ہے جس کا اعتراف اہل نظر کریں

دوسرا دشمن ان کا مجمع احباب تھا جس نے ہمیشہ ان کے کلام کی تعریف ہی کی اور کبھی انکی لغزشوں پر متنبہ نہیں کیا نگار میں البتہ میں نے کئی بار جگر کو ان لغزشوں کی طرف متوجہ کیا، لیکن ان کو اپنے خوشامد کرنے والوں سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ میری بات سنتے اور اس سے فائدہ اٹھاتے

ہر چند کہ مداحین میں بہت کم لوگ ایسے تھے جو جگر کی لغزشوں کو سمجھ سکتے، لیکن ان میں سے چند ضرور ایسے تھے جو اس کی اہلیت رکھتے تھے لیکن انھوں نے کبھی کبھی یہ دردِ سر مول نہ لیا اس باب میں ان کے احباب علی گڑھ سب سے زیادہ قابلِ الزام ہیں کہ انھوں نے کبھی ان کو یہ مشورہ نہ دیا کہ "جگر صاحب کبھی کبھی اپنے کلام پر نظرِ ثانی بھی کر لیا کیجیے۔" (۱)

نیاز کے مندرجہ بالا تمام بیانات میں صداقت کا فقدان ہے اور ان الزامات کی کوئی حقیقت نہیں جگر کی شاعری کو "خارش" سے اور ایسی "خارش" سے جو سوزش پیدا کرتی ہے تشبیہہ دینا جگر کے کلام کے ساتھ ناانصافی ہے ان کے اس بیان کی تردید میں جگر کا پورا کلام پیش کیا جا سکتا ہے مختصراً اگر آپ جگر کے کلام کا انتخاب جو پچھلے صفحات میں جگہ جگہ دیا گیا ہے ملاحظہ فرمائیں سوزش والی کھجلی کہیں نہیں مل سکتی اور نہ بزمِ سخن سے ہٹ کر ان اشعار کو دیکھنے سے ان کی قلعی اترتی محسوس ہوگی یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ جب سے جگر نے جامۂ تقدس اختیار کیا ان کی غزلیں مناجات ہو کر رہ گئی ہیں پچھلے صفحات میں "آتشِ گل" کے منتخب اشعار کو مطالعہ کر کے دیکھیے مناجات کا رنگ کہیں نہیں ملے گا البتہ اس زمانے میں ان پر صوفیانہ رنگ کا اثر زیادہ رہا ہے اس لیے صوفیانہ رنگ کے اشعار بھی مل جاتے ہیں لیکن وہ تغزل کے لطف سے یکسر خالی نہیں ہیں ان کا اس زمانے کا کلام بے آب و رنگ بھی نہیں ہوا البتہ عمر کے تقاضے کی وجہ سے اس میں کچھ سنجیدگی ضرور پیدا ہو گئی ہے جہاں تک جگر کے مشاعروں کے معاوضے یا اکھاڑے کی شاعری کا تعلق ہے جگر نے خود پچھلے صفحات میں اس کی تردید کر دی ہے مشاعروں میں نیاز جیسے لوگوں کا بے اختیارانہ داد دینا جگر کی خوش ادائی و خوش گوئی پر دلالت کرتا ہے ان کی شاعری کو خودرو جھاڑی بتانا بھی نیاز کی زیادتی ہے کیونکہ جگر صاحب اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود جب بھی فرصت پاتے اپنے کلام پر نظرِ ثانی کر لیتے تھے اور جب وہ کہتے تھے تو پوری طرح غور و فکر کرتے تھے اگر آپ ان کی ان بیاضوں کا مطالعہ کریں جو گوشۂ جگر لائبریری جامعۂ ملیہ دہلی میں محفوظ ہیں تو اندازہ ہوگا کہ بعض بعض پوری بیاض صرف ایک غزل کی مشق میں صرف ہو گئی ہے یہ جگر کا غور و فکر نہیں تو اور کیا تھا وہ مشاعروں کی داد کے بھی زیادہ قائل نہ تھے نیاز صاحب نے اگر جگر کے خطوط (جو جگر کے نام ہیں) کا مطالعہ کیا ہوتا تو ان کو جگر کا دشمنِ قطعی نہ کہتے جگر صاحب تو خود اپنے احباب کو اپنی جدید ترین غزل لکھ کر بھیجتے اور ان سے مخلصانہ تنقید کی درخواست کرتے تھے اور جب کوئی ان کو معقول رائے دیتا تو وہ اسے قبول بھی کر لیتے تھے (۲) نیاز صاحب نے بھی جب "نگار" میں جگر کے کلام پر ان کی حیات میں تنقید کی تھی تو جگر نے ان کی جس رائے کو معقول سمجھا اسے قبول کر لیا تھا اسی لیے انھوں نے اپنے مجموعہ سے

---

(۱) "نگار" جولائی سنہ ۱۹۶۱ء ص ۳ تا ۱۳ و ۵۶، (۲) تفصیل کے لیے دیکھیے "مکاتیبِ جگر" مرتبہ تسکین قریشی۔ راقم نے بھی "جگر کے خطوط" کے نام سے ایک مجموعہ شایع کرا دیا ہے یہ خطوط بھی اس دعوے کے ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں

مندرجہ ذیل اشعار (جو مالہٗ وماعلیہ میں ہیں)، خارج کردیئے ؎

"اللہ اللہ یہ اتحادِ مذاق ÷ ÷ ÷ ÷ عالمِ دل بھی اب نگاہ میں ہے

چشمِ ساقی میں تصدق ترے پیمانوں کے ÷ ÷ چند گھونٹ اور بھی لیکن انھیں میخانوں سے"[۱]

اس طرح کے بیسوں اشعار جگر نے اپنے مجموعوں سے خارج کردیے ہیں ہمارے نیاز کا یہ الزام کہ جگر نے ان کی متوجہ کی ہوئی لغزشوں پر توجہ نہیں کی صحیح نہیں ہے البتہ ان کی وہی بات جگر نے تسلیم کی جو خود ان کو بھی صحیح معلوم ہوئی جگر کے احباب کو نااہل ٹھہرانا بھی نیاز صاحب کا ظلم ہے کیا ان کی نظر میں اصغر گونڈوی، مرزا احسان احمد، سید سلیمان ندوی، رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، فضل احمد کریم فضلی سید صدیق حسن، تسکین قریشی، حبیب احمد صدیقی وغیرہ نااہل ہیں جو جگر کے کلام کو نہ سمجھ سکے اور اگر ان میں جگر کے کلام کو سمجھنے اور اس پر تنقید کرنے کی صلاحیت تھی تو نیاز کا یہ اعتراض یقیناً مہمل ہے میرے خیال میں آخری ہی بات صحیح ہے کہ نیاز کے اعتراضات محض جذبہ عناد پر مبنی ہیں (جیسا کہ "نگار" جولائی ۱۹۶۱ء کے ابتدائیہ سے ظاہر ہے) اس لیے ان کے اس بیان کو کوئی تنقیدی درجہ نہیں ملنا چاہئے

نیاز نے جگر کے بعض اشعار پر بھی غلط اعتراضات کئے ہیں مثلاً جگر کا ایک شعر ہے ؎

اور بھی آج اور بھی ہر زخم گہرا ہو گیا ÷ ÷ بس کر اے چشمِ پشیماں کام اپنا ہو گیا

اس پر نیاز کا اعتراض ہے کہ۔

"دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں اور بھی وزن پورا کرنے کے لیے لایا گیا ہے اگر کہا جائے کہ بیان میں قوت و زور پیدا کرنے کے لیے مکرر لایا گیا ہے تو آج کا لفظ بے محل ہے اس کی جگہ ہاں ہونا چاہیئے علاوہ بریں اس شعر کے مفہوم میں بھی کوئی خاص بات نہیں بہت فرسودہ پامال خیال ہے"[۲]

اس شعر کے پہلے مصرع میں جگر نے "اور بھی" وزن پورا کرنے کے لیے نہیں بلکہ قوت و زور پیدا کرنے کے لیے اور "آج" کا لفظ مخصوص وقت کے لیے استعمال کیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ زخم زیادہ گہرا کب ہوا ظاہر ہے کہ یہ اسی دن کا واقعہ ہے جس دن محبوب نے ان کو چشمِ پشیمانی سے دیکھا تھا شعر صاف اور سادہ ہے نہ کوئی لفظ بے محل ہے اور نہ شعر کے وزن کو پورا کرنے کے لیے لایا گیا ہے

جگر کا دوسرا شعر ہے ؎

مستیٔ چشمِ یار کیا کہئے ÷ ÷ مے تو کیا میکدہ نگاہ میں ہے

جس کے متعلق نیاز صاحب فرماتے ہیں۔

"مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ مستیٔ چشمِ یار کا یہ عالم ہے کہ مے کیا اسے پورا میکدہ کہہ سکتے ہیں" لیکن دوسرا

۱۔ مالہٗ وماعلیہ ص۸۱ ، ۲۔ مالہٗ وماعلیہ ص۲۷-۲۸

مصرعہ اس قدر بھونڈا ہے کہ یہ مفہوم خوبی سے ظاہر نہ ہو سکا دوسرے مصرعہ میں چشم کی جگہ نگاہ کا استعمال کیا گیا ہے جو صحیح نہیں "نگاہ" میں ہونے کا مفہوم وہ نہیں جو شاعر ظاہر کرنا چاہتا تھا"(۱)

عرض یہ کرنا ہے کہ اگر مندرجہ بالا مصرعہ یا لفظ "نگاہ" سے وہ مفہوم نہیں نکلتا جو نیاز صاحب نے نکالا ہے تو پھر نیاز صاحب نے یہ مفہوم کہاں سے اور کیسے نکالا دوسرے یہ کہ شعر کا مطلب یہ ہے کہ "مستی چشم یار" کو دیکھ کر عاشق کی نگاہ میں ہی نہیں بلکہ سارا میکدہ پھر جاتا ہے

جگر سے ایک دوسرے شعر

آگ میں پھاند پڑیں موت سے ٹکرا جائیں ؛ واہ کیا کھیل ہیں ان سوختہ سامانوں کے

پر نیاز صاحب ان الفاظ میں معترض ہیں :-

"ساتواں شعر بھی نظم کا ہے اور نہایت بجھا ہوا" واہ کیا کھیل ہیں" کہہ کر اسے اور زیادہ ہلکا کر دیا گیا اس کی جگہ "حوصلے دیکھئے" بھی لکھ سکتے تھے علاوہ اس کے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ "سوختہ سامانوں" سے یہاں کون سی جماعت مراد ہے "مسلم لیگ" پر یہ فقرہ منطبق نہیں ہوتا اور کانگریس کا ذکر وہ کیوں کرنے لگے اور اگر یہ شعر جذبات تغزل کے تحت لکھا گیا ہے تو پھر ان کی جگہ ہم ہونا چاہیئے حالانکہ ان ہم کے متعلق بھی یہ کہنا ہے کہ وہ آگ میں پھاند پڑتے ہیں اور قوت سے ٹکرا جاتے ہیں رنگ تغزل کے منافی ہے ،، (۲)

جگر کا یہ شعر یقیناً سیاسی پہلو لیے ہوئے ہے اور اشارہ اس طرف ہے جب انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے ہندوستان کی پوری قوم جد وجہد کر رہی تھی نیاز صاحب نے اگر جگر کی زندگی کو پیش نظر رکھا ہوتا تو وہ اس شعر میں "مسلم لیگ یا" کانگریس کی جماعت کو ہرگز نہ لاتے کیونکہ جگر سیاسی پارٹیوں اور سیاست کی چالوں سے تمام عمر متنفر رہے اور کبھی کسی جماعت میں شامل نہ ہوئے یہ تو صرف ایک جذبۂ حب الوطنی تھا جس نے ان سے ایسا شعر کہلوا دیا ورنہ وہ سیاست کے چکر میں تو کبھی پھنسے ہی نہیں

جگر کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آزادی حاصل کرنے کا جذبہ جوانان وطن میں اس قدر شدت سے ہے کہ آگ میں پھاند پڑنا اور موت سے ٹکرا جانا ان کے لیے کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا "واہ کیا کھیل ہیں" سے شعر میں جو گہرائی پیدا ہو گئی ہے "حوصلے دیکھئے" سے اتنی گہرائی پیدا نہیں ہوتی

جگر کا ایک اور شعر ہے ؎

جس نے ظالم تری آنکھوں کی ندامت دیکھی ؛ اس گنہ گار محبت سے خدا ہی سمجھے

---

(۱) مالہٗ وما علیہ صفحہ ۵ (۲) مالہٗ وما علیہ صفحہ ۶

جس پر نیاز صاحب کا اعتراض ہے کہ :۔

"پہلے مصرعہ میں بجائے کو کے سے چاہیئے محاورہ غالباً یہ ہے :۔
اس سے خدا سمجھے"

دوسرے مصرعہ میں لفظ ظالم بالکل زائد ہے لیکن اگر کہا جائے کہ اس لفظ سے محبوب کو مخاطب کیا گیا ہے تو بھی صحیح نہیں کیونکہ جب محبوب کی آنکھوں میں ندامت ہو گی تو اسے ظالم کیونکر کہیں گے اور اگر اس کی ندامت کو بھی اس کا ظلم ہی ظاہر کرنا ہے تو پھر وہ گنہ گار محبت کیوں سمجھے "؎۱

جگر صاحب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ محبت کرنے والا گنہ گار اور ظالم ہے جو اپنے محبوب کی آنکھوں کی ندامت دیکھے مذہب عشق میں محبوب کی ندامت دیکھنا روا نہیں اسی وجہ سے اسے گناہ اور ظلم سمجھا گیا ہے ظالم وہ ہے جس نے اپنے محبوب کی آنکھوں کی ندامت دیکھی ہو جگر صاحب ایسے ہی ظالم سے مخاطب ہیں اور اسی کے لیے کہا ہے کہ "اس گنہ گار محبت کو خدا ہی سمجھے" اب نیاز صاحب کے بیان کئے ہوئے مطلب پر دوبارہ نظر کیجیے اور ان کی سخن فہمی کی داد دیجیے۔

اس طرح نیاز نے ایک اور مطلب بیان کیا ہے جگر کا شعر ہے ؎

پھولوں کو نازِ حسن اگر ہے ہوا کرے ؛ ؛ کانٹے بھی ہیں غرورِ گلستاں لیے ہوئے

نیاز صاحب لکھتے ہیں :۔

" بارھویں شعر میں کانٹوں کو غرور گلستاں لیے ہوئے کہا گیا ہے حالانکہ کانٹوں میں کوئی ایسی بات نہیں جس پر گلستاں غرور کر سکے کیونکہ ان کی حیثیت چمن میں بیگانوں کی سی ہوتی ہے اور اس وجہ سے وہ خود بھی گلستاں ہونے پر فخر نہیں کر سکتے "؎۲

کتنا سادہ اور شگفتہ شعر ہے جس کی تشریح کر کے نیاز نے اسے چوپٹ کر دیا ہے

کون نہیں جانتا کہ پھول گلستاں میں اپنے حسن پر نازاں ہوتے ہیں اور کانٹے ان کی جان کے محافظ انھیں کانٹوں کی وجہ سے ان کے حسن کی حفاظت ہوتی ہے جگر کہنا یہ چاہتے ہیں کہ پھولوں کو اگر اپنے حسن پر ناز ہے تو ہوا کرے کانٹوں کو بھی گلستاں کی حفاظت کرنے پر فخر ہے

نیاز صاحب نے "نگار" کے جولائی ۱۹۶۱ء کے جگر نمبر میں بھی جگر کے اشعار پر اعتراض کا طومار باندھ دیا ہے چند دیگر اشعار پر نیاز کے اعتراضات ملاحظہ ہوں

جگر کا ایک شعر ہے ؎

قفس سے ہے اگر بیزار بلبل ؛ ؛ ؛ تو پھر یہ شغل تزئینِ قفس کیا

؎۱ مالہٗ وماعلیہٗ صفحہ ۱۰۲—۱۰۳ ؛ ؎۲ مالہٗ وماعلیہٗ صفحہ ۱۱۴

نیاز صاحب کا اعتراض ہے کہ :۔

"تزئین کی جگہ تعمیر کہنا زیادہ مناسب تھا اور شغل کی جگہ فکر" ۱؎

جگر کہنا یہ چاہتے ہیں کہ بلبل قفس سے بیزاری کے باوجود اس کو سجانے کی فکر میں ہے نہ کہ اس کی تعمیر کی فکر میں۔ یہ شعر جگر کے اس خیال کی غمازی کرتا ہے جب ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ تھا ہندوستانی باشندے انگریزی حکومت سے بیزار ہونے کے باوجود حکومت میں عہدے قبول کر کے وطن کی اصلاح و آرائش کرتے تھے اسی طرف جگر نے اشارہ کیا ہے لیکن نیاز کی اصلاح سے شعر کا وہ مفہوم ہی خبط ہو گیا جو جگر کہنا چاہتے تھے

جگر کا ایک اور شعر ہے ؎

تیرا تصور شب ہمہ شب ؁ خلوت غم بھی بزم طرب

نیاز کا اعتراض ہے :۔

"پہلا شب بیکار ہے اگر کہا جائے کہ شب کی تکرار زور پیدا کرنے کے لیے ہے تو پہلا مصرع یوں ہونا چاہیئے :۔

تیرا تصور اور ہمہ شب !

دوسرے مصرع میں خلوت غم مبتدا ہے اور بزم طرب خبر لیکن فعل کا کہیں پتہ نہیں۔ جب تک بزم طرب کے بعد ہے نہ لایا جائے مفہوم پورا نہیں ہوتا، یوں کہنا چاہیے :۔

غم ہے اب اپنا رشک طرب ،، ۲؎

ماہر القادری نے نیاز کے اس اعتراض کا بڑا معقول جواب دیا ہے وہ لکھتے ہیں :۔

"اگر نیاز صاحب کے مصرعوں کو قبول کر لیا جائے، تو شعر بالکل سپاٹ بن کر رہ جائے گا "شب ہمہ شب" میں "شب" کی تکرار سے شعر میں جو نغمگی پائی جاتی ہے اس کو وجدان صحیح ہی محسوس کر سکتا ہے حضرت جگر کے مطلع کا مصرعہ ثانی :۔

خلوت غم بھی بزم طرب

فعل (ہے) کا محتاج نہیں ہے شعر میں اس قسم کے محذوفات تو بڑا لطف دیتے ہیں اتنے اچھے اور صاف و سادہ شعر میں ناقد کا عیب نکالنا اس کے ذوقِ شعری کو متہم کرتا ہے !،، ۳؎

جگر کا ایک شعر ہے ؎

باتوں باتوں میں آج تو سر بزم ؁ کہہ گئے وہ ہر ایک دل کی بات ۴؎

۱؎ ، ۲؎ "نگار" جولائی ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۶، ۳؎ "فروغ اردو" دسمبر ۱۹۶۱ء صفحہ ۵ ۔ ۴؎ نیاز صاحب نے غالباً غلطی سے "بات دل کی" لکھ دیا ہے

نیاز صاحب معترض ہیں کہ :۔

"ہر ایک غلط ہے۔ ہریک ہونا چاہیئے۔ ایک اردو ہے اور ہر فارسی محتاط شعرا اردو نے ہمیشہ ہریک استعمال کیا ہے غالب کا مصرع ہے :۔

ہر یک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

یہ شعر یوں ہونا چاہیئے :۔

باتوں باتوں میں آج تو سرِ بزم | کہہ گئے آج سب کے دل کی بات [1]

نیاز صاحب کے اس اعتراض میں غالب ہی کا ایک شعر پیش کیا جا سکتا ہے ؎

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے | تمھیں بتاؤ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

نیاز صاحب کی اصلاح سے شاعر نے جو مفہوم ادا کیا ہے وہ ادا نہیں ہوتا شاعر نے محبوب کے دل کی بات اس سے کہلوائی ہے اور نیاز نے دوسروں کے دل کی بات اس سے کہلوا دی شعر کا مطلب ہی کچھ اور ہو گیا

جگر کا شعر ہے ؎

گمراہیوں میں مجھکو ملی ہیں وہ لذتیں | بچ بچ کے چل رہا ہوں ہر اک رہگذر سے میں

نیاز صاحب لکھتے ہیں :۔

"رہگذر سے بچ بچ کے چلنا اور اس سے دور دور رہ کر چلنا، دو مختلف باتیں ہیں بچ بچ کے چلنے میں صرف احتیاط کا مفہوم پایا جاتا ہے اور دور دور چلنے میں قطعی احتراز کا۔ اگر بچ بچ کے بجائے دانستہ لکھتے تو یہ نقص باقی نہ رہتا اور شعر میں زیادہ زور پیدا ہو جاتا ہر اک کہنا بھی صحیح نہیں، اس جگہ میں ہر ہونا چاہیئے" [2]

نیاز کے اس اعتراض کا جواب تسکین قریشی نے خوب دیا ہے وہ لکھتے ہیں :۔

"دونوں باتیں مختلف سہی مگر اپنی اپنی جگہ اس شعر میں دونوں صحیح اور ضروری ہیں شاعر کو رہگذر پر چل کر تو کچھ حاصل نہ ہو سکا لیکن جب وہ گمراہ ہو گیا اور گمراہی میں اس کو لذتیں ملنے لگیں تو نفسیاتی طور پر اس کو ہر رہگذر سے اتنی نفرت ہو گئی کہ بچ بچ کر ہی نہیں چلتا بلکہ دور دور رہتا ہے بہر حال احتیاط ہو یا احتراز اس حالت خاص میں دونوں عین مقتضائے فطرت ہیں" [3]

جگر کا ایک شعر ہے ؎

آدمی کو آدمی سے بُعد وہ بھی کس قدر | زندگی کو زندگی کا راز داں سمجھا تھا میں

---

[1] نگار جولائی سنہ ۶۱ء صفحہ ۱ [2] نگار جولائی سنہ ۶۱ء صفحہ ۲ [3] "فروغ اردو" جنوری سنہ ۶۲ء صفحہ ۵۹

نیازؔ کا اعتراض ہے:۔

"پہلے مصرع میں کسقدرؔ کی جگہ اسقدر زیادہ مناسب تھا دوسرے مصرع میں زندگی کے ذکر کا کوئی موقع نہیں آدمی کو زندگی نہیں کہتے یوں کہنا چاہیئے تھا: وہ آدمی کو آدمی کا راز داں سمجھا تھا میں" ع۱

جگرؔ صاحب کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر زندگی ہی زندگی کی راز داں ہے تو آدمی کو آدمی سے بُعد کیوں ہے؟

جگرؔ صاحب کا ایک شعر اور ہے ؎

سراپا محبت بنے جا رہے ہیں ۔۔۔ سلامت رہیں انکو بہکانے والے

نیازؔ لکھتے ہیں:۔

"بہکانے کا مفہوم ہے فریب دینا یا کسی غلط راہ پر چلانا، اس لئے اگر محبوب سراپا محبت بنا جا رہا ہے تو یہ بہکانا ہوا یا صحیح راستے پر لانا" ع۲

اس شعر کا مطلب ہے کہ ناصحوں یا رقیبوں اور ہوس پرستوں کا محبوب کو سمجھانا یا اپنی جھوٹی محبت میں گرفتار کرنے کی کوشش کرنا (جو محبوب کو بہکانا ہوا) ہے جس کا اثر قبول کرکے اور سچی اور جھوٹی محبت میں امتیاز کرکے اس کا دل نرم ہو رہا ہے اور وہ سراپا محبت بنا جا رہا ہے اور ان کے بہکانے کا محبوب پر الٹا اثر ہو رہا ہے

جگرؔ کا ایک شعر ہے ؎

زندگی ہے نام جہد و جنگ کا ۔۔۔ موت کیا ہے بھول جانا چاہیئے

نیازؔ کا اعتراض ہے:۔

"موت کی رعایت سے پہلے مصرع میں جنگ تو موزوں ہے کہ اسمیں جان کا فقرہ ہے لیکن جہد کہنے کا کوئی موقع نہیں یہ جنگ سے فروتر بات ہے" ع۳

جگرؔ کا مطلب ہے کہ زندگی جہد و جنگ کا نام ہے اگر جہد سے کام نہ چلے تو پھر جنگ کرکے زندگی گذارنی چاہیئے اور اس میں موت کی بھی پرواہ نہ کرنا چاہیئے

جگرؔ کا ایک شعر ہے ؎

جہاں تک دل کا شیرازہ فراہم کرتا جاتا ہوں ۔۔۔ یہ محفل اور برہم اور برہم ہوتی جاتی ہے

نیازؔ لکھتے ہیں

"شیرازہ خود نام ہے فراہمی کا، اس لئے شیرازہ بکھر تو سکتا ہے فراہم نہیں ہو سکتا اس لئے پارہ ہائے دل یا اجزائے دل کا شیرازہ ہونا چاہیئے" ع۴

ع۱ "نگار" جولائی ۱۹۶۱ء ص ۳۰

ع۲ " " " ص ۳۸

ع۳ " " " ص ۳۸ ع۴ "نگار" جولائی ۱۹۶۱ء ص ۴۹

نیاز صاحب کے متضاد جملوں یعنی "شیرازہ خود نام ہے فراہمی کا" اور "شیرازہ فراہم نہیں ہو سکتا" پر غور کیجئے اور ان کی اس تنقید کی داد دیجئے نیاز کا یہ اعتراض بھی درست نہیں ہے شیرازہ کا بندھ بھی سکتا ہے اور فراہم بھی ہو سکتا ہے ناسخ کہتے ہیں ؎

کوئی مضمون اگر لکھنا میں اس حال پریشاں کا　　کبھی بندھتا نہ شیرازہ مرے اوراق دیواں کا

مندرجہ بالا نقد و نظر کے مطالعہ کے بعد سید محمد عبد اللہ کے اس بیان میں سچائی کی کچھ جھلک ضرور دکھائی پڑتی ہے جسمیں انھوں نے لکھا ہے کہ :-

"انسان کی فطرت میں اسلاف کی عظمت اور بڑائی کی جو طلسم بھری عقیدت موجود ہے اسکی وجہ سے ہمعصر مصنف کی شخصیت نظروں میں نہیں جچتی اس کے علاوہ معاصرانہ مدارات اور مراعات، دوستانہ مراسم اور تعلقات، صلہ کی تمنا اور شہرت اور ناں کی ترغیبات حقیقتاً بے لاگ اور سچی تنقید کے راستے میں سنگ گراں ثابت ہوتی ہیں اور ایک نقاد کے لئے کھرے کھوٹے کا پرکھنا دشوار ہو جاتا ہے جدید ادب کے مبصر کی سب سے بڑی بدقسمتی یہی ہے کہ بقول ولیمنر اسے ایسے گلفروشوں سے سابقہ پڑتا ہے جن کے ہاں کا ہر پھول عمدہ اعلیٰ اور بے نظیر ہوتا ہے اس لئے کہ اسی دعویٰ اور اسی اعلان پر انکی بکری موقوف ہے" عہ

خلاصۂ بحث جگر کے کلام پر انکی حیات ہی میں صحیح غلط معتدل اور غیر معتدل، عروضی اصول کے تحت اور مغربی انداز فکر پر بھی کافی تنقیدیں ہوئیں بہتوں نے انکی موافقت میں لکھا اور بہتوں نے مخالفت میں، موافقت میں لکھنے والوں میں مرزا احسان احمد، سید سلیمان ندوی، رشید احمد صدیقی اور آل احمد سرور ہیں جنکی تنقید میں معاصرانہ مدارات و مراعات، دوستانہ مراسم اور تعلقات شامل ہیں ان حضرات کی تنقید کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے انکے اور جگر کے تعلقات اور شخصیت کو بھی پیش نظر رکھنا پڑے گا مندرجہ بالا حضرات میں سے سب سے جگر کے تعلقات دوستانہ و مخلصانہ تھے اور دوستی اور خلوص کا تقاضہ تھا کہ وہ جگر کے اسی حصے کو تنقید کے لئے منتخب کریں جسمیں کوئی شاعرانہ خوبی یا کمال ہے خلوص و محبت اور عقیدت نے انکی نظر میں جگر کی معمولی کمزوریوں پر پڑنے نہ دیں جسکی وجہ سے جگر کے کلام پر ان حضرات سے کہیں کہیں لغزش بھی ہو گئی ہے جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے لیکن انکی اس معمولی سی لغزش کی بنا پر انکو جانبدار ٹھہرانا مناسب نہ ہوگا کیونکہ ان کے تنقید کا بیشتر حصہ صحیح اور حقیقت پر مبنی ہے جگر کی مخالفت میں لکھنے والوں میں اختر علی تلہری، عندلیب شادانی، مجنوں گورکھپوری، اثر لکھنوی، یگانہ چنگیزی، کلیم الدین احمد اور نیاز فتحپوری ہیں،

اختر علی تلہری نے جگر کے کلام پر تنقید کرنے میں کافی توازن رکھا ہے اور حق انتقاد ادا کیا ہے عندلیب شادانی کی

عہ اورینٹل کالج میگزین، فروری ۱۹۴۱ء ص ۷۱

نے جگر کے اشعار کی ایسی ایسی مضحک توجیہیں پیش کی ہیں جن سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ تنقید نہیں توہین د تنقیص ہی ان کے مدِ نظر ہے۔ اودھ پنچ مورخہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۳۰ء میں بھی جگر پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی گئی تھی مجنوں نے جگر کے جس زمانے کے کلام پر تنقید کی ہے وہ ایک حد تک حق بجانب ہیں لیکن انکا جگر کے کلام میں فکر کی گہرائی وغیرہ کی تلاش ایک غزل گو شاعر کے یہاں خیال عبث ہے جیسا کہ پچھلے صفحات میں جگر کا قول نقل کیا جا چکا ہے اثر لکھنوی نے اپنی زباندانی کی وجہ سے کچھ زبان کی صحیح اور کچھ غلط خامیاں دکھائی ہیں یگانہ نے انکے کلام کو جاپانی مال کہہ کر اپنے بغض و عناد کا مظاہرہ کیا ہے کلیم الدین احمد نے جگر کے کلام کو مغربی ادب کے معیار پر پرکھنے کی کوشش کی ہے جو صحیح نہیں ہے انکو بھی جگر نے خود جواب دیدیا ہے نیاز فتچپوری نے تو اپنے تنقید کی بنیاد ہی کراچی کے ایک مشاعرے کی صدارت کے جھگڑے کی وجہ سے محض عناد پر رکھی ہے انھوں نے "مالہ و ماعلیہ" میں جو کچھ لکھا ہے اس میں تو انھوں نے نقاد کے فرائض ادا کئے ہیں لیکن "نگار" جولائی ۱۹۶۱ء کا جگر نمبر محض جگر کے انتقال پر ان سے بدلا لینے کے لئے نکالا گیا ہے جسمیں اگرچہ ساری تنقید کو غلط نہیں کہا جا سکتا لیکن اس کا بیشتر حصہ غلط اور دشمنی کی بنا پر محض خانہ پری کے لئے لکھا گیا ہے جو نیاز صاحب جیسے عالم و نقاد کے لئے افسوسناک ہے۔

جگر کے کلام کو غلطیوں سے پاک ثابت کرنے کی کوشش کرنا نقاد کے فرائض سے راہ فرار ڈھونڈنے کے مرادف ہے جگر کیا دنیا کا کوئی بھی بڑے سے بڑا شاعر ایسا نہیں جسکے یہاں غلطیاں نہ ہوں یا اس کا کلام غلطیوں سے پاک ہو۔

جگر صاحب کو خود بھی اپنی غلطیوں کا اعتراف تھا اس لئے ان کے کلام کو غلطیوں سے پاک کہنا بھی دیانتداری کے خلاف ہے اور اسکو اغلاط کا مجموعہ یا جگر کو ادنیٰ درجہ کا شاعر کہنا بھی ناانصافی ہے اشفاق علی خاں (جن کو اردو ادب میں ابھی تک کوئی مقام حاصل نہیں ہو سکا ہے) نے اپنی کتاب "جگر کی غزلیہ شاعری" میں جگر کے کلام کو اغلاط کا مجموعہ ثابت کرنے کے لئے اپنا تمام زورِ قلم صرف کر دیا ہے اور انکے کلام میں عروضی، معنوی، لغوی غرضیکہ ہر قسم کی غلطیاں تلاش کر کر کے گنائی ہیں تفصیل کی گنجائش نہیں اس لئے مختصراً انکی تحریر کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس سے ناظرین خود اندازہ کر لیں کہ انکی تنقید کا معیار کیا ہے۔

جگر کا ایک شعر ہے ؎

حسن کے بھی ڈگمگاتے ہیں قدم عشق کرتا ہے جہاں دارائیاں [1]

اس شعر کو اشفاق صاحب نے یوں نقل کر کے تنقید کی ہے ؎

"حسن کے بھی ڈگمگاتے ہیں قدم عشق کرتا ہے جہاں درائیاں

اس میں "یہ درائیاں" کیا؟ خدا جانے یہ درانا کی گت بنی ہے یا یہ کوئی اور ہی گت ہے۔

---

[1] "شعلۂ طور" مطبوعہ سنہ ۱۹۶۰ء ص ۲۰۰

"درائی اور اس کی جمع درائیاں دونوں بے معنی ہیں" ع۱

اشفاق علیخاں نے بڑی دیدہ دلیری اور جسارت کے ساتھ جگرؔ کے کلام پر اصلاح بھی فرمائی ہے انھوں نے لکھا ہے کہ :۔

"درجِ ذیل ناموزوں اشعار میں کس کس کو سہو کاتب کہئے گا؟" ع۲

اس کے بعد انھوں نے اسی صفحہ ۲۸۲ سے ۲۸۴ تک جگرؔ کے ۲۰ شعر نقل کئے ہیں اور صفحہ ۲۸۴ سے ۲۸۸ تک ہر شعر پر اصلاح بھی فرمائی ہے انھوں نے جو بھی اصلاح دی ہے سب اشعار "شعلہ طور" مطبوعہ ۱۹۶۱ء میں صحیح لکھے ہوئے ہیں ناظرین کی سہولت کیلئے صفحات نوٹ کئے دیتا ہوں شعر نمبر ۱ سے لیکر ۲۰ تک (شعر نمبر ۷ و ۲۰ کو چھوڑ کر) "شعلہ طور" مطبوعہ ۱۹۶۱ء میں ترتیب وار اسطرح لکھے ہوئے ہیں ص۱۷۰، ص۱۶۸، ص۱۷۱، ص۱۷۱، ص۱۷۳، ص۱۷۶، ص۱۸۷، ص۱۹۵، ص۱۹۸، ص۲۰۵، ص۲۰۶، ص۲۴۱، ص۲۵۰، ص۲۵۶، ص۲۵۸، ص۲۵۹، ص۲۶۲، ص۲۷۳، ص۱۲۶، ص۱۳۱، ص۱۱۴، ص۱۱۱، ص۱۱۲، ص۸۵، ص۸۶، ص۸۶، ص۱۱۱، ص۶۲ اس طرح اشعار غلط نقل کر کے اشفاق علیخاں نے جگرؔ پر خواہ مخواہ کی ایک کتاب ۴۰۳ صفحات کی لکھ ڈالی ہے اور محض نام و نمود اور سستی شہرت کی خاطر جگرؔ جیسی عظیم شخصیت پر تنقید کر کے اپنے کو ادبی حلقے میں تعارف کرانے کی ناکام کوشش ع۳ کی ہے اس کتاب میں اس قدر غلطیاں ہیں کہ اسکے جواب میں اس سے دوگنی ضخامت کی کتاب تیار ہو سکتی ہے ظاہر ہے کہ اس کا یہاں کوئی محل نہیں ہے،

جگرؔ کے ایک شعر کی تشریح بھی اشفاق کی زبانی سن لیجئے جگرؔ کا ایک شعر ہے ؎

یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

جس کے لئے وہ لکھتے ہیں :۔

"کہنا یہ تھا کہ فراق میں زندگی تکلیف سے گزار رہا ہوں لیکن مثال ایسے کام یعنی گناہ کی دی جو تکلیف کے برعکس راحت یا لذت اور بدنیتی کے لئے ضرب المثل ہے اس مثال کی موجودگی میں شعر کا مطلب یہ ہوا کہ میں فراق میں زندگی اس طرح گزار رہا ہوں جسطرح کوئی ایسا کام کرے جو لذت اور بدنیتی پر کم سے کم ان دونوں میں سے کسی ایک خصوصیت پر مبنی ہو مختصر لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ میں فراق میں گناہ کر رہا ہوں یا فراق میں ناگفتہ بہ کام کر رہا ہوں ذرا غور کیجئے تو اس گناہ کے لفظ سے شعر کا کتنا مکروہ اور گھناونا مطلب پیدا ہو رہا ہے عاشقانہ شعر ہے، فراق کا ذکر ہے محبوب کا تصور یا اسکی تصویر بھی ضرور پیشِ نظر ہوگی ایسے میں شاعر

ع۱ جگرؔ کی غزلیہ شاعری ص۱۱۲ ع۲ جگرؔ کی غزلیہ شاعری ص۲۸۲ ع۳ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ایک مخصوص جماعت) جو جگرؔ کی حیات ہی میں انکی مخالفت پر کمر بستہ تھی، اور جگرؔ صاحب بھی انکو کلمۂ خیر سے نہیں یاد کرتے تھے) کے مختلف افراد نے ملکر یہ کتاب اشفاق علیخاں سے لکھا کر جگرؔ کی شاعرانہ اہمیت کو گھٹانے کی کوشش کی ہے۔ واللہ اعلم

کہہ رہا ہے۔

"کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں"

ان کڑیوں کو ملائیے تو یہ گناہ کون سا ہوا ۹۰۰۰

کتنا شدید ذم کا پہلو ہے شعر میں! "ع ۱

شعر سے گھناؤنا مطلب تو نہیں پیدا ہوتا اشفاق کی تشریح البتہ گھناؤنی ہو گئی ہے جگر نے "گناہ" کو "خطا" کے مفہوم میں استعمال کیا ہے اور انگریزی کے اس مصرع کا صحیح ترجمہ پیش کیا ہے جسمیں کہا گیا ہے ع The life is a sin without thee

مرزا صائب کہتے ہیں ؎

قضارا دست پیچ خود کند در کجروی زاہد | گناہ لغزش خود کو دانم برعصا بندد

اب ذرا اشفاق کے بیان کئے ہوئے مطلب پر ایک نظر ڈالئے اور انکی شعر فہمی کی داد دیجئے

جگر کی شاعری پر کسی قسم کا تبصرہ یا تنقید کرتے وقت انکی زندگی کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے جس کے متعلق جگر صاحب کا خود کہنا تھا "شعلۂ طور" میں انکی جوانی اور "آتش گل" میں انکا بڑھاپا ہے ظاہر ہے کہ جب شاعر خود تسلیم کرتا ہو کہ اسکے کلام میں جوانی اور اسکی کہانی اور اسکے ابتدائی دور کے کلام میں عمومیت موجود ہے تو پھر اسکے اس دور میں فکر و احساس کی گہرائی یا غالب اور اقبال کی گہرائی تلاش کرنے کا ہم آپ کو کیا حق پہنچتا ہے جب کہ وہ خود کہتا ہے کہ اس نے جو کچھ کہا ہے انہیں اسکی زندگی کی جھلک دکھائی دیتی ہے

اس میں شک نہیں کہ جگر غزل (حسن و عشق) کے شاعر تھے تمام عمر انھوں نے حسن و عشق کے نغمے الاپے جب سن رسیدہ ہوئے جوانی کا جوش و جذبہ، امنگ و ولولہ رنگینی و سرخوشی اور ہیجانی کیفیت ختم ہوئی تو انکے کلام میں بھی عمر کے ساتھ پختگی، خیالات میں تفکر اور گہرائی پیدا ہو گئی اگرچہ رنگینی وہی ہی جو انکا طرۂ امتیاز تھا انھوں نے انسان کو زندگی میں خوش رہنے اور زندہ رہنے پر اکسایا ہے انکے یہاں خلوص اور تازگی کے ساتھ ساتھ انکے دل کی پکار سنائی دیتی ہے انکے یہاں حسن و عشق ہی نفسیات کے تانے بانے ہیں اور شدید قسم کی ارضیت کے باوجود (اول زمانے کے کلام کو چھوڑ کر) لذتیت اور جذبات کا سفلہ پن نہیں ہے انکے یہاں محبت کا پاکیزہ تصور پایا جاتا ہے انکو سیاست سے کوئی لگاؤ نہیں تھا لیکن جب انھوں نے دنیا کی اتھل پتھل اور انسان کو ان کا شکار ہوتے دیکھا تو ان کے دل میں بھی ایک شدید حساس شاعر کی حیثیت سے افسردگی اور رنج و غم کی کیفیت طاری ہوئی انکی آخری دور کی نظمیں یا نظم نما غزلیں انھیں کیفیات و احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں

ع ۱ جگر کی "غزلیہ شاعری" ص ۱۵۱

جگرؔ نے نہ کبھی اپنے آپ کو فلسفی یا مفکر کہا اور نہ اسکی طرف توجہ کی ہمیشہ اپنے دلی جذبات و احساسات کی ترجمانی میں لگے رہے اور اسی میں اپنا ایک الگ راستہ نکالا اس لئے ان کے یہاں فلسفہ و حکمت کی تلاش لاحاصل ہے اور انکے یہاں فلسفہ و حکمت کے نہ ہونے سے انکی عظمت پر کوئی آنچ نہیں آتی انھوں نے جس صنف کو اپنایا اس میں وہ پوری طرح سے کامیاب ہیں انکو اپنے تصورِ زندگی سے گہرا جذباتی لگاؤ تھا اور اپنے محکم عقائد کے سہارے اپنی زندگی کے تصور کو پختہ ایمانی کے ساتھ قائم رکھا یہی انکی انفرادیت بھی

جگرؔ کے یہاں غالبؔ یا اقبالؔ کی فکری گہرائی تلاش کرنا اور اسے نہ پاکر انکو دوئم یا سوئم درجہ کا شاعر قرار دینا انصاف نہیں، اصل میں دیکھنا یہ چاہیئے کہ جگر اپنے رنگِ تغزل میں کس حد تک کامیاب ہیں جگرؔ کی غزلوں میں اردو ادب کی خوش کلامی خوش لحنی اور خوش مزاجی کی زندہ روایت ملتی ہے شبیہ الحسن نونہروی نے صحیح لکھا ہے :-

> " جنسیت اور عشق کو ملاکر وہ رندی پیدا ہوتی ہے جو غزل کی آبرو ہے عشق جنسیت سے الگ ہوکر تصوف بن جاتا ہے اور جنسیت عشق سے جدا ہوکر بوالہوسی ہو جاتی ہے اچھا غزل گو نہ صوفی بن سکتا ہے اور نہ بوالہوس وہ رند رہتا ہے اور عشق و جنسیت کی شمع فروزاں سے اپنے دل و دماغ کو روشن کرنا چاہتا ہے " [ع۱]

اگر شبیہ الحسن صاحب کی اس تحریر کو صحیح مان لیا جائے تو جگرؔ سچے غزلگو شاعر تھے کیونکہ انکے یہاں جنسیت اور عشق کے میل سے انکے دل و دماغ کو روشنی ملی ہے۔

جگرؔ کے یہاں جو کمزوری ہے وہ دراصل انکے علمی شغف کی کمی ہے جسکی وجہ سے انکے یہاں فکر و خیال کا کوئی مخصوص نظریہ نہ قائم ہو سکا اور چونکہ انھوں نے قناعت و استغنیٰ کو اپنا لیا اس لئے معاشی ذرائع اور مادی وسائل کی احتیاج کو انھوں نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی یہی وجہ ہے کہ انکے یہاں پیچیدہ تجربات و مشاہدات کی کمی ہے

اپنی کم علمی ہی کی وجہ سے انھوں نے بعض ایسی ترکیبیں اور الفاظ و محاورے استعمال کئے ہیں جنسے نقادانِ جگرؔ تیر و نشتر کا کام لیتے ہیں شعری تاثیر قائم رکھنے کے لئے انھوں نے بعض متروک یا نئے الفاظ و محاورے بھی استعمال کئے ہیں

جگرؔ کے نقادوں میں اب بھی بہت سے لوگ رہ جاتے ہیں لیکن انکی تنقید کی اسقدر اہمیت نہیں جتنی مندرجہ بالا حضرات کی تھی اس لئے طوالت سے بچنے کے لئے دوسرے نقادوں کو دانستہ نظر انداز [ع۲] کر دیا گیا ہے۔

ع۱ "تنقید و تحلیل" ص ۱۱۷ ع۲ ان سب حضرات کی تفصیل انشاء اللہ جگرؔ کے نقاد کے عنوان سے ایک کتاب میں عنقریب پیش کروں گا۔

جگر کے کلام میں بعض خامیاں اور نقائص ہیں جگرؔ نے اپنے کلام کی خامیوں کا خود بڑے منصف مزاجی سے اعتراف کر لیا ہے وہ لکھتے ہیں :-

"اغلاط سے نہ میں نے اپنے آپ کو بے بہرہ رکھا ہے اور نہ انھیں کا ہو کر رہ گیا ہوں اکثر غلطیوں کا مجھے احساس ہے بعض غلطیاں ایسی بھی ہیں جنھیں میں نے دانستہ اختیار کیا ہے بعض ایسی بھی ہیں کہ وہ اپنی جگہ محاسن ہیں

اکثر ایسی بھی ہونگی جنکا مجھے علم نہیں یا جنکو ناقدانہ نظر سے نہیں دیکھ سکتا اس لئے میں خوش ہونگا اگر مجھے میری غلطیوں پر متنبہ کر دیا جائے" ؏۱

جگرؔ کا یہ بیان "شعلہ طور" کے دیباچہ مطبوعہ غالباً ۳۴ء میں ہے یہی وہ بیان ہے جسکے بعد جگرؔ کے نقادوں مثلاً عندلیب شادانی مجنوں گورکھپوری اور اختر علی تلہری نے جگرؔ کے کلام پر جا و بیجا ہر طرح کی تنقیدیں کیں جنکا تذکرہ پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے

جگرؔ کے کلام کی خامیاں گنانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جگرؔ کی زندگی پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔

جگرؔ کا مطالعہ بہت محدود (یعنی صرف نویں تک تعلیم حاصل کر سکے) رہا اسکول تعلیم کے بعد بھی انکو مطالعہ کا موقع نہ مل سکا شباب میں قدم رکھتے ہی شراب شروع کر دی آدمی خوش اخلاق و خوشخصال اور خوش خیال و خوش گلو تھے اسلئے احباب کا دائرہ بہت جلد وسیع ہو گیا اور وہ تمام عمر شراب احباب میں گھرے رہے ان دونوں نے انکو مطالعہ کا موقع ہی نہ دیا فطرت شاعرانہ تھی جو قدرت کا عطیہ تھا اس لئے جو کچھ محسوس کرتے تھے اسے نظم تو کر لیتے تھے لیکن اس پر دوبارہ نظر ڈالنے کا کم اتفاق ہوتا تھا (یہ ابتدائی دور کے حالات ہیں) ان حالات میں وہ شاعر تو ہو گئے لیکن محدود مطالعہ کیوجہ سے اپنے کلام پر علم کی جلا نہ دے سکے رفتہ رفتہ انھوں نے شخصی اور انسانی مطالعہ کی آڑ ڈھونڈلی اور کتابی مطالعہ کو بیکار محض اور اس سے جہالت میں اضافہ کہنا شروع کر دیا (یہ آخری زمانے کے خیالات ہیں) لیکن انکا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے کتابوں کے مطالعہ سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے پڑھے لکھے شاعر کے یہاں اس کے علم ہی کی وجہ سے اس کے کلام میں خامیاں کم ہو جاتی ہیں وہ اپنے کلام کی خامیوں اور خوبیوں پر نظر ثانی کر کے خامیوں کو دور کرنے اور خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کسی حد تک وہ اپنے اس ارادے میں کامیاب رہتا ہے۔

جگرؔ کے یہاں مطالعہ کی کمی ہی کی وجہ سے الفاظ کا خزانہ نہیں ملتا جس سے وہ اپنے مطالب بیان کر دیں

؏۱ "تحریک" اکتوبر ۱۹۶۲ء صـ ۳۱

یہی وجہ ہے کہ انکو اپنے مطلب کو بیان کرنے میں غیر مناسب اور ناموزوں الفاظ و تراکیب کا اختراع کرکے اپنے کلام کو داغدار کرنا پڑا اشعار نظم کرتے وقت انکے سامنے جو لفظ آگیا اسے انھوں نے نظم کر لیا اور نوٹ بھی لکھا۔ یا کہ لفظ درست یا رائج نہیں لیکن انکا مطلب اسی لفظ سے ادا ہوتا ہے اس لئے انھوں نے اس لفظ کو رائج کر دیا اس قسم کی باتیں جگر صاحب کے عجزِ طبع پر دلالت کرتی ہیں اپنے مطالعہ ہی کی کمی کیوجہ سے انھوں نے اپنے کلام میں کبعض محاورے، الفاظ تراکیب وغیرہ غلط استعمال کرلیے ہیں بعض الفاظ ایسے بھی استعمال کئے ہیں جنسے اشعار کے مفہوم ہی غلط ہوجاتے ہیں بعض مصرعے غیر مربوط ہیں بعض ابتدائی دور کے اشعار سپت اور عامیانہ قسم کے ہیں بعض اشعار اساتذہ کی زمین میں کہنے کی ناکامیاب کوشش کی ہے وغیرہ وغیرہ

جگر نے اپنی ایک مسلسل غزل میں جو ایک واقعہ سے متعلق ہے کچھ نئے قافیئے بنائے ہیں مثلاً کربلاء سے کر "بلائیاں" "نے نوا" سے "نے نوائیاں" "بے دست و پا" سے "بے دست و پائیاں" وغیرہ

اس قسم کے قافیے بنا لینا صحیح نہیں ہے مندرجہ ذیل اشعار میں انھوں نے غلط ترکیبیں استعمال کی ہیں انکا ایک شعر ہے

منتظر کچھ رند تھے جسکے وہ جام آ ہی گیا بأشش اے گردوں کہ وقتِ انتقام آ ہی گیا

اس شعر میں انھوں نے لفظ "باش" سے نیا ولولہ، جوش اور ایک تازہ زندگی پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی ہے ایک شعر میں کہتے ہیں سہ

ہاں اس طرف بھی اک نگہِ نیشتر نواز کب سے پھڑک رہی رگِ جانِ آرزو

"نیشتر نواز" کو اپنے صحیح مفہوم میں نہیں استعمال کر سکے ہیں

ایک شعر اور ہے سہ

زاہد مسجد نشیں ہیں اور اک ٹوٹا سا ظرف میکدہ میں اہتمام جام و ساغر دیکھئے

اس شعر میں "جام و ساغر" میں سے ایک لفظ بیکار ہے جو محض وزن پورا کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے

جگر اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں سہ

پھنکا جاتا ہے دل جس سوزِ غم سے جہنم میں یہ چنگاری کہاں ہے

اسمِ موصول جو اور جس کی ضمیر وہ ہوتی ہے اور پہلے مصرعہ میں چونکہ جس آیا ہے اس لئے دوسرے مصرعہ میں "یہ" کی جگہ وہ استعمال ہونا چاہئے تھا

جگر کا ایک شعر ہے سہ

لے چلا ہوں میں بھی، نذرِ حسنِ جاناں کو جگر ساتھ دل کے ایک سازِ آرزو ٹوٹا ہوا

اس میں "سازِ آرزو" کی ترکیب غلط ہے کیونکہ "آرزو" کا کوئی ساز تو ہوتا نہیں ہے جو ٹوٹ جائے۔

بعض فارسی الفاظ جو ترکیب کے ساتھ مستعمل ہیں جگرؔ نے انکو بغیر اس لحاظ کے استعمال کیا ہے مثلاً

تو مستِ ناز وہ ہے کہ اس روزگار میں
تیرے سوائے سب ہیں ترے اختیار میں

اس میں انھوں نے "روزگار" کو بغیر ترکیب کے "زمانہ" کے مفہوم میں استعمال کیا ہے جو غلط ہے اسی طرح "سوائے" کا استعمال بھی درست نہیں ہے اسکی جگہ "سوا" لکھنا چاہیے تھا

انکے مندرجہ ذیل اشعار

دل ہوا خاک تپ غم سے مگر دل کی جگہ
ایک خلش سی مجھے معلوم ہوئی جاتی ہے

دل دھڑکنا بھی غنیمت ہے تری فرقت میں
کہ خبر تو مجھے معلوم ہوئی جاتی ہے

میں "ہوئی" کے بجائے یائے مجہول یعنی "ہوئے" کا استعمال ہونا چاہیے تھا

ایک اور شعر ؎

کسی کے سامنے مشکل سے عرض حال ہوئی
سنبھل سنبھل کے طبیعت مری نڈھال ہوئی

میں "عرضِ حال ہوئی" کے بجائے "عرضِ حال ہوا" استعمال کرنا چاہیے تھا کیونکہ یہاں عرضِ حال "اظہارِ حال" کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے

ایک جگہ مذکر کو مونث کے مفہوم میں اسطرح استعمال کیا ہے ؎

خیر اسکو نظر آئی شر اسکو نظر آیا
آئینہ میں خود عکسِ آئینہ نگر آیا

خیر یہاں مذکر ہے جگرؔ صاحب نے مونث غلط استعمال کیا ہے

انھوں نے ایک جگہ "چشم جام بہ جام" اور "شوق نام بنام" کی بھی غلط ترکیب استعمال کی ہے۔

ان کے دو شعر اور ہیں ؎

یہ نہیں دل کسی عنوان نہ جانے پائے
مگر اتنا ہے کہ آسان نہ جانے پائے

بڑی مشکل سے پیدا اک وہ آدم زاد ہوتا ہے
جو خود آزاد جسکا ہر نفس آزاد ہوتا ہے

جنمیں "آسان نہ جانا" اور "آدم زاد" کی ترکیب غیر شاعرانہ ہے

اس شعر ؎

ستم زیست آفریں کی قسم
خطرۂ التفات نے مارا

میں "خطرۂ التفات" کی ترکیب غلط ہے

انھوں نے بعض فارسی ترکیبیں بھی بھدی اور غلط استعمال کی ہیں مثلاً شاملِ پیمانہ "ہوشِ عشق" "ستارۂ اقبال" "بجسی ضعف" "غیر طرف" وغیرہ

انکے یہاں بعض اوقات نقصِ بیان کی وجہ سے شعر میں غلط مفہوم بھی پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً ؎

مجھکو سب معلوم ہے افسانۂ برق و کلیم
میرے دل کا ذرہ ذرہ وادیٔ ایمن میں تھا

ورنہ ممکن ہی نہ تھا نظارۂ برقِ جمال / ذوقِ موسیٰ بھی حارو وادیِ ایمن میں تھا

دونوں اشعار میں "وادیٔ ایمن" کی آگ کو "تجلی سرِ طور" کے مفہوم میں استعمال کیا ہے جو صحیح نہیں ہے یہ دونوں واقعہ بالکل مختلف ہیں لیکن جگر صاحب نے انکو ایک ہی واقعہ سمجھ کر نظم کیا ہے

ایک اور شعر ہے ؎

جستجو میں تری یہ حاصلِ سودا دیکھا / ایک اک ذرّے کا آغوشِ طلب وا دیکھا

جستجو میں "حاصلِ سودا" کا لانا مہمل بیان ہے

ایک شعر میں کہتے ہیں ؎

مجھے اے شورِ محشر تو نے کیوں چونکا دیا اٹھکر / بلائیں لے رہا تھا بیخودی میں اپنے قاتل کی

قتل ہو جانے کے بعد بیخود ہونا اور بیخودی میں قاتل کی بلائیں لینا بے معنی بات ہے

ایک شعر اور ہے ؎

دیکھا ہے اک جہانِ خاص میں نے کبھی کبھی جگر / حُسن سے بھی بلند تر، عشق سے بھی لطیف تر

حسن و عشق سے بلند تر اور لطیف تر کوئی مقام نہیں اس لئے جگر کا یہ کہنا کہ انھوں نے کبھی کبھی حسن سے بلند اور عشق سے لطیف تر ایک جہانِ خاص دیکھا ہے صحیح نہیں ہے

جگر کے یہاں بعض اوقات غیر مربوط مصرعے، مستعار خیالات اور عامیانہ رنگِ تغزل کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے انکے بعض اشعار میں اس قدر سادگی آجاتی ہے کہ انمیں شاعرانہ کیفیت باقی نہیں رہ جاتی اس قسم کی سادگی شاعری کے لئے موزوں نہیں مثلاً انکے یہ اشعار اسی قسم کی سادگی کی مثال ہیں ؎

میں نے دل سے جو کہا جینے بھی دے گی حسرت / آئی یہ غیب سے آواز نہ جینے دے گی
ہنسی اڑاتے ہو کیا میرے دردِ فرقت کی / جو بات بات پہ کرتے ہو بیقرار مجھے
اپنی حسرت سے آپ کہہ دیجئے / بے محل کوئی گفتگو نہ کرے
کم ہے جتنی دیجئے قیمت دل پر داغ کی / اک کتابِ آرزو ہے اور باتصویر بھی
ہم عشقِ مجسم ہیں لب تشنہ و مستسقی / دریا سے طلب کیسی دریا کو رلانا ہے

بعض اشعار میں عامیانہ رنگ بھی پایا جاتا ہے خاص طور سے ابتدائی دور کے یہ اشعار انکے عامیانہ رنگ کے مظہر ہیں ؎

پہلے کہاں یہ ناز تھے یہ عشوہ و ادا / دل کو دعائیں دو تمھیں قاتل بنا دیا
بعد میرے انکی رسوائی کا یہ عالم ہوا / جس جگہ بیٹھے وہیں برپا مرا ماتم ہوا
میرے جینے کی تمھارے ہاتھ میں تدبیر ہے / تم اگر چٹکی اٹھاؤ خاک کی اکسیر ہے
آپ کی تصویر کیا معجز نما تصویر ہے / جو کرشمہ ہے چھری ہے، جو ادا ہے تیر ہے
وہ صبحِ شامِ وصال میرا بلائیں لینا لپٹ لپٹ کر / حیا سے وہ نیچی نیچی نظریں وہ شرم سے آب آب عارض

ان اشعار کے علاوہ "گوری گوری کلائیاں توبہ" "جرأتِ شوق" "اوّل اوّل"، "ٹھٹک جانے کا انداز" وغیرہ جیسے بیانات طبعِ لطیف کے لئے گراں ہیں

برابر سے بچ کر گذر جانے والے | یہ نالے نہیں بے اثر جانے والے
وہیں اس نظر میں ہیں کھب جانے والے | جو سینوں پہ ہیں برچھیاں کھانے والے

جیسے اشعار بھی جگرؔ کے معیارِ شعری سے پست ہیں

بعض اوقات انکے اشعار غیر مربوط ہوتے ہیں اور انمیں یکساں جوش و بلندی باقی نہیں رہتی مثلاً انکے یہ اشعار ؎

سونا محال ہجر میں اب رات بھر ہوا | اک جان کا عذاب یہ دردِ جگر ہوا
فرصت کہاں کہ بات کریں آسماں سے ہم | لپٹے پڑے ہیں لذتِ دردِ نہاں سے ہم
اللہ اللہ رے تاثیر فغانِ شبِ ہجر | خیر مقدم مرے نالوں کا قیامت نے کیا
مرحبا اے جذبۂ دل، حوصلہ اے دردِ فراق | مجھ سے مل کر نگہ ہوش رُبا پھرتی ہے
لطفِ تشہیر مصوّر رہے تشہیر کے ساتھ | کھینچ دے وہ بھی میرا مری تصویر کے ساتھ

انکے یہاں بعض اشعار خیالات کے لحاظ سے مستعار معلوم ہوتے ہیں مثلاً مومنؔ کا ایک شعر ہے ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا | جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

جگرؔ کہتے ہیں ؎

وہ ہمارے قریب ہوتے ہیں | جب ہمارا پتہ نہیں ہوتا

غالبؔ کا شعر ہے ؎

انکے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق | وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

جگرؔ کہتے ہیں ؎

مریضِ عشق کے چہرے پہ آگئی رونق | ابھی وہ کہہ گئے کیا جانے کیا رگا ہوں میں

ظاہر ہے کہ جگرؔ، مومنؔ اور غالبؔ کے خیالات کی نقل کرنے میں کچھ کامیاب نہیں ہیں جو بلندی و لطافت مومنؔ اور غالبؔ کے یہاں ہے جگرؔ کے یہاں نہیں ہے

جگرؔ کے بعض اشعار ایسے بھی ہیں کہ اگر انھوں نے دوبارہ ان پر توجہ کی ہوتی تو کوئی وجہ نہیں کہ انکے جیسے شاعر کے یہاں یہ غلطیاں رہ جاتیں مثلاً انکا ایک شعر ہے ؎

ہر نگہ پر بندشیں، اک اک نفس کی پرسش | ہوشیار اے عشق وہ نازک مقام آہی گیا

اگر جگرؔ صاحب اس پر دوبارہ توجہ کرتے تو "ہر نگہ" کے بعد وہ "اک اک نفس" کے بجائے "ہر نفس" ضرور لے آتے

ایک دوسرا شعر ہے ؎

جلوۂ دوست یہ آہستہ خرامی تا چند ۔ ندیاں سوکھ چلیں شوق میں طوفانوں کے

اگر اس شعر پر انھوں نے دوبارہ غور کیا ہوتا تو وہ جلوۂ دوست کے ساتھ "آہستہ خرامی" کے بجائے "اندازِ تغافل" ضرور کر دیتے اسی طرح اگر انھوں نے مندرجہ ذیل اشعار پر دوبارہ غور و فکر کیا ہوتا تو یا تو وہ خط کشیدہ الفاظ لے آتے یا ان الفاظ کو نکال کر اپنے معیارِ شعری کے لحاظ سے کوئی دوسرے الفاظ بدل دیتے ۔

اللہ رے تیغِ عشق کی برہم مزاجیاں ۔ میرے ہی خونِ شوق میں نہلا دیا مجھے
ظالم نے میرے خون میں

حدود کوچۂ محبوب ہیں وہیں سے شروع ۔ جہاں سے پڑنے لگیں پاؤں ڈگمگائے ہوئے
ڈگمگاتے

تیرا گلشن ہی نہ بن جائے قفس اے بلبل! ۔ دیکھ محدود نہ کر وسعتِ دنیائے بہار
کہیں

چہرے پہ برہمی ہے تبسم نظر میں ہے ۔ اب کیا کمی تباہی قلب و جگر میں ہے
کسر

یارب! وفائے عذرِ محبت کی خیر ہو ۔ نازک سا اعتراف بھی آج اُس نظر میں ہے
کسی کی

محبت محبت ہی رہتی ہے ، لیکن ۔ کہاں تک طبیعت کو بہلائیے گا
آخر

جگرؔ کے کلام میں مندرجہ بالا خامیاں بجا طور پر پائی جاتی ہیں لیکن دنیا کا کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جو غلطیوں سے مبرا ہو اس لئے جگر کی زبان کی صفائی، خیالات کی پاکیزگی، طرزِ ادا کی جدت سوز و گداز، درد و تپش، جوش، سادگی و رنگینی اور رندانہ انداز جیسے محاسن پر انکی ان چند کمزوریوں اور غلطیوں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور انکی کوئی خاص اہمیت باقی نہیں رہ جاتی۔

بابِ ہفتم

جگؔر کا مرتبہ :-

غزل میں تبدیلیاں ، جگؔر کے عہد میں غزل کا رنگ ، معاصرین میں کس نے غزل کو کیا دیا ، جگؔر کی مقبولیت کے اسباب ، جگؔر کا مستقبل

ترتیب

جگر کا مرتبہ

غزل میں تبدیلیاں

اردو غزل کا سلسلہ نسب ایران ہوتا ہوا عرب سے جا ملتا ہے اور چونکہ غزل میں حالات سے مطابقت کی صلاحیت ہوتی ہے اسلئے جب بھی حالات بدلے ماحول میں تبدیلی ہوئی اور زندگی نے کوئی نیا رخ اختیار کیا تو اس نے بھی اپنے آپ کو بدل دیا۔

تغزل کی ابتدائی حالت اسلام سے قبل جاہلی دور میں تشبیب کی شکل میں ملتی ہے لیکن اموی دور میں غزل میں نکھار پیدا ہوا اور اس صنف میں عشق و محبت کے جذبات کا اظہار (عشق مجازی کی صورت میں) ہونے لگا پہلی صدی ہجری میں عمر ابن ابی ربیعہ نے غزل کی صنف کو اپنایا اسکے بعد دوسروں نے اس کی تکمیل کی۔

رفتہ رفتہ یہ صنفِ سخن عربی سے فارسی میں (ایران) پہنچی تو اسنے ایران کے قومی روایات اور بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت اختیار کر کے اپنے اندازِ بیان اور موضوعات میں تبدیلی کر لی ایران میں ابتداً مسلسل غزل گوئی کی طرف میلان رہا اور قافیوں سے احساسِ معنی پیدا ہو گیا جسکی وجہ سے اس صنف میں زندگی اور تہذیب کی کچھ جھلکیاں پیدا ہو گئیں مے و میخانہ، ساقی، رند، پیرِ مغان وغیرہ غزل کے لازمی جزو بن گئے معانی اور زبان و بیان کی بھی ایک روایت بن گئی اور ایران کی تہذیب صدیوں تک غزل کی تہذیب بنی رہی۔

ہندوستان میں اردو غزل نے ایران ہی کے زیرِ اثر جڑ پکڑی اور یہاں کی آب و ہوا اسکو بھی راس آئی کہ اسنے ہندوستان میں بھی ایک اہم مرتبہ حاصل کر لیا کیونکہ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی کے:

" ایران اور ہندوستان کا کلچر صدیوں تک غزل کا کلچر رہا ہے ان کی تہذیب غزل کی تہذیب رہی ہے انکا مذاق غزل کا مذاق رہا ہے ان کی معاشرت غزل کی معاشرت رہی ہے۔ اس کلچر تہذیب مذاق اور معاشرت کو پیدا کرنے میں خارجی ماحول بڑی حد تک اثر انداز ہوا ہے لیکن اس میں بھی کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں کہ خود غزل نے اس ماحول کو کچھ کم متاثر نہیں کیا ہے غزل ہمارے مخصوص ماحول کی پیداوار ہے اور ہمارا مخصوص ماحول غزل کی پیداوار ہے" [1]

اردو غزل کا تاریخی دور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی تحریر کے مطابق:

" امیر خسرو سے شروع ہوتا ہے انکی وفات ۷۲۵ھ (۱۳۲۵ء) میں ہوئی تاریخوں اور تذکروں میں انکی دو ریختہ غزلیں ملتی ہیں" [2]

---

[1] "غزل اور مطالعۂ غزل" ص۱۷

[2] "غزل اور متغزلین" ص۸

ریختہ کے دور کی زبان، موضوعات اور مضامین تک نصف ہندی و نصف فارسی ہیں، ہندی کی الفاظ، تلمیحات، تشبیہات اور استعارات کا استعمال کثرت سے کیا گیا ہے مرد کو عورت کا محبوب اور عورت کی زبان سے اظہار عشق ہوا ہے۔

۹۰۲ھ میں شمس العشاق شاہ میرانجی کا انتقال ہوا یہ مکہ میں پیدا ہوئے تھے لیکن ہندوستان آکر یہیں کی زبان و اصطلاحات میں بات کی صوفیانہ رنگ میں عورت کو خطاب کرکے دنیا کو اس کی سسرال اور آخرت کو اس کا میکہ بتایا ہے اور اس طرح کے اشعار کہے ہیں ؎

خوشی کیے بج کھو میرانجی بڑا ابا بو دھر — بیر کہیں میں آنکھوں بیان اس میں دھرنا سدھ
اس کے رنگوں رنگی ساڑی دوجا رنگ نہ بھاتی — اس کی باس ہم کو باسا پھول پھو کٹ کی آنی

غرضیکہ اردو غزل کا رجحان ابتدا ہی سے عاشقانہ رہا ہے اور اس میں واردات حسن و عشق بیان ہوتے رہے ہیں یعنی ہجر میں آہیں بھرنا، تڑپنا، مرنا جینا، حسن کی تعریف، اپنی ستم کوشی پر ناز اپنی قوت برداشت کا مظاہرہ اور کبھی کبھی مجاز کی راہ سے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اس ابتدائی زمانے میں مذہب اور تصوف کا غلبہ زیادہ رہا اس وجہ سے رنگ تغزل بہت نہ نکھر سکا لیکن اسکا رنگ بہر حال قائم رہا۔

رفتہ رفتہ اس میں شاہد و شراب، زلف و گیسو، مے و میخانہ اور شمع و پروانہ کی داستان نے زور پکڑا اور انکا بیان رموز و علامات میں ہونے لگا اور جوں جوں علم و حکمت کی ترقی کے ساتھ ذہن کی جلا بڑھی تو انکا اثر احساسات و تخیل پر پڑا جن کی وجہ سے غزل کے محرکات اور رموز و علامات کی توجیہہ بدلی نئے نئے خیالی اور جذباتی حقائق بیان ہونے لگے اس طرح عشقیہ شاعری نے ترقی کی منزلیں طے کرنی شروع کیں اور آج اردو غزل میں جو روایات موجود ہے اسمیں ہماری سیکڑوں سال کی زندگی کے تجربے، تہذیب اور نظریات موجود ہیں۔

قدیم اور جدید غزل میں معنوی اعتبار سے کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا صرف لہجہ اور انداز میں فرق آگیا ہے جدید غزل میں اسلوبی وسعتیں اور نئے نفسیاتی اشارے پائے جاتے ہیں ان قدیم اور جدید غزلوں کی فنی خصوصیات، روایات، نئے تجربات اور اندازِ بیان معلوم کرنے کے لئے غزل کے تاریخی اوراق پلٹنے پڑیں گے۔

اردو غزل کی مسلسل ادبی تاریخ دکن سے شروع ہوتی ہے یہ دور سلطان قلی قطب شاہ والی گولکنڈہ کے زمانے سے شروع ہوا اس کو اردو غزل کا ابتدائی دور یا دورِ اوّل کہا جا سکتا ہے جسمیں محمد قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، نصرتی، بحری اور ولی و سراج وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے جن کے کلام کی بنیاد زیادہ تر جذباتِ عاشقانہ پر ہے انھوں نے سیدھی سادی پیار و محبت کی باتیں کیں اور جو کچھ کہنا چاہا

کہہ دیا محمد قلی قطب شاہ نے فارسی و عربی عناصر کی آمیزش سے تمام شعری روایات کے احترام کیساتھ ایک متوازن نمونہ قائم کیا جسمیں مقامی رنگ پورے پس منظر کے ساتھ ملتا ہے۔ ولی اور سراج نے طرح طرح کے مضامین نظم کئے ان شعراء نے صرف مسرت کو مدِ نظر رکھا اور استفادہ کی پرواہ نہ کی انھوں نے مسلسل غزلیں بھی کہی ہیں ہندی شاعری کے اثرات بھی کہیں کہیں ہیں اظہارِ عشق عورت کی زبان سے ہوا ہے لیکن ولی کے یہاں لب و لہجہ بدل گیا ہے اور انھوں نے معشوق مرد کو قرار دیا ہے یا خدا کو واردات قلبیہ کی مصوری کی ہے اور شاعری کو زندگی سے قریب کیا ہے بھاشا کی شاعری کے الفاظ (جیسے سرتجن اور موہن وغیرہ) اور عربی و فارسی اصطلاحات کو ہندی مصطلحات میں بدل دیا ہے اور اردو غزل کو ایک نیا آہنگ، نئی لے، نیا لہجہ اور نئی آواز سے آشنا کر کے اس کو ایک نئی زندگی بخشی اور اپنی تصوف مزاجی کی وجہ سے انہیں مختلف مسائلِ حیات بیان کر کے اس کے دائرہ کو بہت وسیع کر دیا سراج نے تصوّف کو تغزل کے روپ میں پیش کیا اور ہندی الفاظ کی آمیزش اس طرح کی کہ اس سے انکے کلام میں سلاست، لطافت شیرینی اور حلاوت پیدا ہو گئی

ان فنکاروں کی جگر کاوی و عرق ریزی کی وجہ سے فارسی ترکیبیں ہندی سانچوں میں ڈھل گئیں اور فارسی محاورے بھاشا کے روپ میں بدل کر ایسے گھل مل گئے کہ انمیں شیر و شکر کا لطف پیدا ہو گیا انھوں نے چھوٹی بحروں اور دردانگیز زمینوں کو زیادہ اہمیت دی موسیقیت اور ترنم و توازن سے اردو غزل میں نئی روح پھونکی بعض بعض غزلوں میں ردیف کا التزام اور املائے جلی و خفی کا بھی کوئی لحاظ نہ رکھا عربی قواعد کے اصول کی بھی پرواہ نہیں کی اس دور میں بعض محاورات اور الفاظ ایسے استعمال ہوئے ہیں جو اب ہماری زبان میں رائج نہیں ہیں جسکی وجہ سے ان محاوروں اور الفاظ کو سمجھنے میں دقت ہوتی ہے جنکے لئے ایک فرہنگ کی ضرورت ہے۔

اس دور کی غزل کو عربی و فارسی سے حسن و عشق کے واردات یعنی حسنِ فطرت اور حسنِ بشر اور عشق مجازی و عشق حقیقی دونوں ملے اخلاقیات بھی تصوّف کی شکل میں ملا۔ داخلیت کے کرشمے شدتِ احساس کے نمونے، انسانیت کے تقاضے اور سوز و گداز کے معجزے اور تصاویرِ خیال، تصاویرِ جذبات، تصاویرِ حقیقت اور تصاویرِ مناظر سب کے سب عربی و فارسی شاعری ہی کے رہینِ منت ہیں

اردو غزل کا دوسرا دور شاہ آبرو اور حاتم کا زمانہ مانا جاتا ہے اس زمانہ میں اگرچہ زبان اور خیالات فارسی معیار کے نہیں ہیں لیکن فارسی محاوروں، تشبیہوں اور استعاروں کو اردو غزل میں کافی جگہ مل گئی ہے اور ہندی الفاظ کا استعمال نسبتاً کم ہو گیا ہے جس کی وجہ سے زبان میں شیرینی اور ترنم کی کمی محسوس ہوتی ہے قدیم شعرا کی تقلید کو برقرار رکھا گیا ہے غزلیں اس زمانے میں بھی مختصر ہوتی تھیں لیکن زیادہ تر عاشقانہ خیالات مردوں ہی کی زبانی نظم ہوئے ہیں،

آبرو مضمون اور ان کے ہم عصروں نے ایہام گوئی کا نیا طرز بیان ایجاد کیا اور صنف ایہام میں خوب خوب طبع آزمائی کی۔

اس دور میں زبان کی صفائی کی طرف رجحان رہا البتہ قواعد عروض و قوافی کی پابندی خاطر خواہ نہیں کی گئی اس خرابی کو دور کرنے کے لئے حاتم نے اصلاح زبان کے لئے اصول مرتب کئے حالانکہ وہ خود بھی اس اصول کی پابندی نہ کرسکے افعال کے استعمال کو بھی ایک حد تک درست کیا لیکن حروف و روابط و ضمائر کم و بیش ویسے ہی رہے جیسے ابتدائی دور میں استعمال کئے جاتے تھے رجائیت کا عنصر کم ہو گیا ملکی حالات بدلے تو عشق و محبت کی داستانوں میں آزادانہ اور طرح دار روش میں کمی ہوئی بعض شعراء کے یہاں قنوطیت کی جھلک ملنے لگی تصوف اخلاق اور دوسرے مضامین مستقل حیثیت قائم کرنے لگے

اردو غزل کا تیسرا دور میر اور سودا کا زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے جسے اردو غزل کا عہد زرّیں کہا جاتا ہے اس دور میں بہترین صاحب طرز شعرا پیدا ہوئے قنوطیت کی لہر اسی زمانے میں دوڑی جس کی وجہ یہ تھی کہ انقلابات سماج اور ذہنیت پر برابر چوٹ لگا رہے تھے اور فضا میں قنوطیت رس پڑی تھی غزل نے اسی فضا کی ترجمانی کی اس میں آپ بیتی میں جگ بیتی کی تصویریں دکھائی دینے لگیں میر کے یہاں قنوطیت کا عنصر سب سے زیادہ ہے جس میں انکی ذاتی پژمردگی کا عنصر بھی شامل ہے بقول ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی :

"میر کے یہاں اردو غزل آبگینہ کی نزاکت کے ساتھ جلوہ گر ہے اس میں سوز و گداز، درد و یاس حسرت و ملال کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے غم جاناں اور غم دوراں کا شاید ہی کوئی پہلو ہو جسے میر نے نظر انداز کیا ہو یہی وجہ ہے کہ انکا غم ذاتی اور انفرادی ہونے کے باوجود بڑا آفاقی نظر آتا ہے اور یہ اسی آفاقیت کا نتیجہ ہے کہ میر آج تک مقبول اور ہمارے غزل گو شعرا کا محبوب ہے اور آج تک اس کی مترو ک بولی بھی پیاری لگتی ہے اور اس کی تقلید کی جاتی ہے،، علے

میر ہی کی وجہ سے غزل اردو شاعری کی آبرو بن گئی انھوں نے فارسی تراکیب، تشبیہات و استعارات سے بڑا کام لیا ان کے یہاں عشق اور محبت ناکامی و نامرادی، اداسی، پژمردگی اور سوگواری کا نام ہے سودا کے یہاں زمانہ کی خرابی کے باوجود ایک رجائیت کا احساس ملتا ہے، انکی غزلوں میں ایک سالم آہنگ اور بلند پروازی ہے سوز گداز بھی ہے اور شوق وصال کی خواہش بھی انھوں نے غزل کے لب لہجہ پر بھی کافی توجہ کی۔

درد نے تغزل میں حقیقت و معرفت کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا، تصوف اور اسکے ہمہ گیر

علے "غزل اور متغزلین" ص ۱۲

کہہ دیا محمد قلی قطب شاہ نے فارسی و ہندی عناصر کی آمیزش سے تمام شعری روایات کے احترام کے ساتھ ایک متوازن نمونہ قائم کیا جس میں مقامی رنگ پورے پس منظر کے ساتھ ملتا ہے۔ ولی اور سراج نے طرح طرح کے مضامین نظم کئے ان شعرا نے صرف مسرت کو مدِ نظر رکھا اور استفادہ کی پرواہ نہ کی انھوں نے مسلسل غزلیں بھی کہی ہیں ہندی شاعری کے اثرات بھی کہیں کہیں ہیں اظہارِ عشق عورت کی زبان سے ہوا ہے لیکن ولی کے یہاں اب لہجہ بدل گیا ہے اور انھوں نے معشوق مرد کو قرار دیا ہے یا خدا کو واردات قلبیہ کی مصوری کی ہے اور شاعری کو زندگی سے قریب کیا ہے بھاشا کی شاعری کے الفاظ (جیسے سجن اور موہن وغیرہ) اور عربی و فارسی اصطلاحات کو ہندی مصطلحات میں بدل دیا ہے اور اردو غزل کو ایک نیا آہنگ، نئی لے، نیا لہجہ اور نئی آواز سے آشنا کرکے اس کو ایک نئی زندگی بخشی اور اپنی تصوف مزاجی کی وجہ سے انہیں مختلف مسائلِ حیات بیان کرکے اس کے دائرہ کو بہت وسیع کر دیا سراج نے تصوف کو تغزل کے روپ میں پیش کیا اور ہندی الفاظ کی آمیزش اس طرح کی کہ اس سے انکے کلام میں سلاست، لطافت شیرینی اور حلاوت پیدا ہو گئی

ان فنکاروں کی جگر کاوی و عرق ریزی کی وجہ سے فارسی ترکیبیں ہندی سانچوں میں ڈھل گئیں اور فارسی محاورے بھاشا کے روپ میں بدل کر ایسے گھل مل گئے کہ انمیں شیر و شکر کا لطف پیدا ہو گیا انھوں نے چھوٹی بحروں اور دردانگیز زمینوں کو زیادہ اہمیت دی موسیقیت اور ترنم و توازن سے اردو غزل میں نئی روح پھونکی بعض بعض غزلوں میں ردیف کا التزام اور ایطائے جلی و خفی کا بھی کوئی لحاظ نہ رکھا عربی قواعد کے اصول کی بھی پرواہ نہیں کی اس دور میں بعض محاورات اور الفاظ ایسے استعمال ہوئے ہیں جو اب ہماری زبان میں رائج نہیں ہیں جسکی وجہ سے ان محاوروں اور الفاظ کو سمجھنے میں دقت ہوتی ہے جنکے لئے ایک فرہنگ کی ضرورت ہے۔

اس دور کی غزل کو عربی و فارسی سے حسن و عشق کے دو ادوار یعنی حسنِ فطرت اور حسنِ بشر اور عشق مجازی و عشق حقیقی دونوں ملے اخلاقیات بھی تصوف کی شکل میں ملا۔ داخلیت کے کرشمے شدتِ احساس کے نمونے، انسانیت کے تقاضے اور سوز و گداز کے معجزے اور تصاویرِ خیال، تصاویرِ جذبات، تصاویرِ حقیقت اور تصاویرِ مناظر سب کے سب عربی و فارسی شاعری ہی کے رہین منت ہیں

اردو غزل کا دوسرا دور شاہ آبرو اور حاتم کا زمانہ مانا جاتا ہے اس زمانہ میں اگرچہ زبان اور خیالات فارسی معیار کے نہیں ہیں لیکن فارسی محاوروں، تشبیہوں اور استعاروں کو اردو غزل میں کافی جگہ مل گئی ہے اور ہندی الفاظ کا استعمال نسبتاً کم ہو گیا ہے جس کی وجہ سے زبان میں شیرینی اور ترنم کی کمی محسوس ہوتی ہے قدیم شعرا کی تقلید کو برقرار رکھا گیا ہے غزلیں اس زمانے میں بھی مختصر ہوتی تھیں لیکن زیادہ تر عاشقانہ خیالات مردوں ہی کی زبانی نظم ہوئے ہیں۔

میں نہ ہوتے تو اچھا تھا لیکن پھر بھی جو کچھ یہ کہہ گئے غنیمت تھا ان کے بعد غزلوں میں تنزل کے آثار نمایاں ہونے لگے"[ع۱]

اردو غزل کا چوتھا دور انشا، مصحفی جرأت اور نظیر کا زمانہ قرار دیا جاسکتا ہے اس دور میں غزل نے بوالہوسی کا راستہ اختیار کیا اس میں متانت اور بلندیٔ تخئیل کے بجائے چھیڑ چھاڑ اور شوخی زیادہ آگئی عشق و عاشقی کی پاکیزہ اور لطیف داستانوں کی جگہ معاملہ بندی اور چوماچاٹی نے لی قنوطیت تو کم ہوگئی مگر کیف و دیرپا اثرات کا فقدان ہوگیا زبان و مذاق بھی پست ہوگیا داخلیت کی جگہ خارجیت نے لے لی

انشا کے یہاں زبان، الفاظ کی تراش خراش اور بندشوں کی انوکھی ترکیبیں، ہندی الفاظ، ہندوستانی تلمیحات کے ساتھ ساتھ شوخی اور طراری بھی پائی جاتی ہے اور ان کی یہ شوخی و طراری لطیفہ سنجی سے شروع ہوکر پھکڑ تک پہنچ گئی ہے انکے یہاں ہوس پرستی آورد اور صنعت گری خاص طور پر نمایاں ہے

مصحفی کے یہاں مختلف رنگ ملتے ہیں انھوں نے شعر میں تخئیل کے ساتھ ساتھ صفائی، روانی اور اثر کو بھی برقرار رکھنے کی کوشش کی انکے یہاں موضوعات میں ستھراپن، انداز میں سادگی، نظر میں رنگینی اور لہجہ میں شیرینی پائی جاتی ہے

جرأت کی غزلیں لذت پرستی اور معاملہ بندی تک محدود ہوکر رہ گئیں انھوں نے عیش کوشی اور لذت اندوزی کے "جیتے جاگتے" واقعات صحت مندانہ انداز میں پیش کئے ہیں۔

نظیر نے اپنی شاعری میں حقیقت نگاری کی بنیاد ڈالی انکو مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کا شاعر کہا جاتا ہے کیونکہ انھوں نے اپنے اشعار میں مرد اور عورت کے جنسی تعلقات کو بڑی بیباکی سے نظم کئے ہیں جو انسانی زندگی کی ایک بنیادی حقیقت ہے انکے جنسی تعلقات کی ترجمانی میں اکثر و بیشتر انکی جذباتی ہیجان انگیزی شامل ہو گئی ہے جسنے انھیں انتہا پسندی کی حد تک پہنچا دیا انھوں نے اپنے اشعار میں موضوعات کے لحاظ سے زبان کو بدل کر بولنے والی زبان استعمال کیا اور اس میں ایک طرح کی روانی اور بے ساختگی پیدا کی انکے اشعار میں انکا تجربہ ہے جو انکی اس ذہنی کیفیت کا آئینہ دار ہے جسمیں انکی پرورش ہوئی تھی انھوں نے اپنے کلام میں خوش فکری، لطیفہ تراشی، بذلہ سنجی، فقرہ بازی اور معاملہ بندی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے انھوں نے تمسخر اور استہزا کو بھی سنجیدہ شاعری میں داخل کر دیا انکے یہاں انداز بیان بہت سیدھا سادہ اور رواں ہے انھوں نے مقامی رنگ کو استعمال کیا ہے اور ہندوستانی تہواروں مثلاً ہولی، دیوالی دسہرہ بسنت وغیرہ کو بھی نظم کیا ہے

ع۱ ؎ اردو غزل کی نشو و نما، صفحہ ۲۴۴-۲۴۵

مناظرِ فطرت کی جھلک بھی ان کے کلام میں ملتی ہے

غرضیکہ اس دور کی غزلوں میں فارسی اور عربی تلمیحات، ہندوستانی روایات کو پھر سے شامل کیا گیا دسہرہ، ہولی، دیوالی اور بسنت جیسے تیوہاروں، حسینوں کی جھگڑوں اور میلوں ٹھیلوں کا ذکر ہونے لگا یہ کوئی نئی چیز نہیں تھی البتہ بہت دنوں کے بعد اس کا اعادہ کیا گیا تھا غزلوں میں قافیہ پیمائی ہونے لگی ایہام گوئی کا استعمال کم ہوا ہندی الفاظ اور ہندی محاورے پھر سے مستعمل ہوئے فارسی الفاظ و تراکیب کا استعمال کم کر کے کلام میں سادگی و روانی قائم کی گئی

اردو غزل کا پانچواں دور ناسخ اور آتش کا زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس دور میں ناسخ نے الفاظ اور زبان کے استعمال میں کمال حاصل کیا جسمیں انکو نمایاں کامیابی ہوئی کیونکہ انھوں نے اصول کی پابندی پورے طور پر کی لیکن ان کے یہاں لطیف خیالات بہت کم ملتے ہیں وہ شاعر کم اور استاد زیادہ تھے انھوں نے شاعری میں بھی پہلوانی کی ہے، وہ الفاظ، محاوروں تشبیہ و استعارہ ترکیبوں بندشوں کی چستی، زبان میں روانی اور بہاؤ پیدا کرنے میں ملکہ رکھتے تھے لیکن جذبہ کا فقدان ہے اس لئے غزل کی روایت میں انکی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے البتہ زبان و بیان کے ایک ماہر اور فن کے ایک استاد کی حیثیت سے انکا مرتبہ مسلم ہے

آتش کے یہاں فقر کا رنگ تصوف کی جھلکیاں اور جذبات کی عکاسی کی طرف توجہ پائی جاتی ہے لکھنوی انداز قائم رکھنے میں انھوں نے بھی ایک اہم پارٹ ادا کیا انکی شاعری میں ایک لئے دیئے رہنے کا انداز ہے انکے یہاں بعض اشعار انکے وارداتِ قلبیہ اور امورِ ذہنیہ کی ترجمانی کرتے ہیں انھوں نے عوام دوستی اور قلندری کا مظاہرہ کیا اور زبان کی نرمی کیساتھ ساتھ جذبات نگاری پر توجہ کی ان کے یہاں بعض اشعار دل کو گرما دیتے ہیں۔

اس دور میں محاوروں اور الفاظ کی بندش اور استادوں کی اصلاحوں نے تخئیل پر زور نہیں دیا البتہ لفظی تصنع نے فروغ حاصل کیا جو جدت کہلائی تکلف، تصنع اور آورد نے سادگی، شیرینی اور صاف گوئی کی جگہ لے لی فارسی تراکیب و اضافتوں سے پھر اردو ادب میں فراوانی ہوئی لیکن عشق کی تاثیر جذبات کی گرمی اور دل کی تڑپ عام طور سے اردو غزل میں مفقود ہو گئی عشق و محبت کی واردات کے اظہار میں فحاشی، چوماچاٹی اور بے باکی کم ہوئی زبان کی صفائی اور الفاظ کی صحت کے دھن میں ہندی کے زبان زد الفاظ کو بھی خارج کر دیا گیا اس دور میں خارجی پہلو الفاظ کے الٹ پھیر اور سامنے کی باتوں سے زیادہ دلچسپی لی گئی، مبالغہ، رعایت لفظی سنگلاخ زمین اور قافیہ پیمائی پر زیادہ زور دیا گیا قواعد زبان کی صفائی وغیرہ پر زیادہ دھیان دیا گیا الفاظ و قوافی سے کھیلنے میں مسرت محسوس کی گئی خارجی عناصر خاص لطف کے ساتھ نظم کئے گئے روایتی تشبیہات و استعارات کو زیادہ صرف کیا گیا اس زمانے

میں غم آمیز جذبات و یاس آفرین خیالات کے بجائے مسرت کے اظہار میں رنگینیٔ بیان سے کام لیا گیا کیوں کہ اس زمانے میں لکھنؤ میں دربار کی رنگینی اور تعیش اپنے عروج پر تھا جس سے اس عہد کے شعرا کا اثر پذیر ہونا ناگزیر اور فطری تھا کیونکہ اس عہد کے بیشتر شعرا دربار سے توسل رکھتے تھے۔ اس زمانے میں غزلوں میں عورت کو معشوق ظاہر کرنے کے لئے اس کے سامانِ آرائش، لباس، زیورات اور اسکی حرکات و سکنات کو نظم کیا گیا تاکہ معشوق کے عورت یا مرد ہونے کی تفریق کی جا سکے ناسخ کی کوششوں سے اہلِ لکھنؤ کی زبان پر ثقیل اور ناہموار الفاظ آنے بند ہو گئے اصلاحِ زبان ہی ناسخ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے جو ان ہی کے ہاتھوں سرانجام پایا۔

مشکل ردیف اور قافیے میں شاہ نصیر نے پوری پوری غزلیں کہیں اور کلام کو بے مزہ کیا اس زمانے میں غزلوں میں اشعار کی تعداد زیادہ ہو گئی سہ غزلہ، چہار غزلہ اور ہفت غزلہ کہنے سے پرہیز نہیں کیا گیا۔

اردو غزل کا چھٹا دور ذوق، مومن، غالب اور ظفر کے کارناموں پر مشتمل ہے جنھوں نے اردو غزل کی روایت کو قعرِ مذلت سے جسمیں لکھنؤ کی شعرا نے اسے ڈھکیل دیا تھا باہر نکالا اس میں از سرِ نو جان ڈال کر اسے نئی راہوں اور نئی منزلوں سے آشنا کرایا

ذوق نے غزل کی تمام روایات مضامینِ تصوف، مسائلِ زندگی پاکیزہ خیالات اور اخلاق نکات لفظوں کی نشست، بندشوں کی چستی، ردیف و قافیہ، دلفریب و دیدہ زیب اسلوبِ بیان کو بڑی خوبی سے برتا لیکن احساس کی شدت میں کمی کی وجہ سے انکی غزلوں میں جذب و اثر نہیں پیدا ہوا الفاظ، اندازِ بیان اور طرزِ اظہار پر انکو قدرت حاصل تھی انھوں نے اپنی قادر الکلامی کی بدولت ہر قسم کے خیال کو جس رنگ میں چاہا کہہ دیا اور اس میں اتنا زور پیدا ہو گیا کہ اسکی تعریف میں کبھی واہ اور کبھی آہ نکلنے لگی ان کی غزلوں میں قصیدوں کا سا انداز ملتا ہے کیونکہ بنیادی طور پر وہ غزل سے زیادہ قصیدے کے شاعر تھے ان کے کلام میں صفائی، عام فہمی اور برجستگی پائی جاتی ہے زود گوئی میں انکو مہارت تھی۔

مومن کے یہاں حسن و عشق کی واردات و کرامات کی کامیاب تفصیل پائی جاتی ہے بعض اوقات انھوں نے اپنے کلام میں واسوخت کا رنگ پیدا کر دیا ہے انھوں نے اپنی نازک خیالی جو انھیں طنز و مکر شاعرانہ تک لے گئی حسنِ ادا اور نفاست سے غزل کو نکھارا اور سنوارا ہے اور بعض بعض اشعار کو بعید الفہم اور معمہ بنا دیا البتہ فارسی تراکیب، تشبیہات و استعارات سے اشعار میں ایک خاص لطف و اثر پیدا کر دیا ہے وہ عشقِ پردہ نشیں میں ہمیشہ مرتے اور رومانی شاعری کو فروغ دیتے رہے۔

غالب نے غزل کی روایات کو بڑی خوبی سے برتا اس کو بالغ نظری، تازگی، خلاقی، وسعت، گہرائی اور گیرائی بخش کر خیالات کا رنگارنگ مرقع بنادیا انکی غزلوں میں حسن وعشق، تصوف فلسفہ سماجی وتہذیبی حالات کی ترجمانی اچھوتے انداز میں پائی جاتی ہے ان کے یہاں انسانی زندگی کا گداز ہے جو غم کا پیدا کردہ ہے انھوں نے حیات وکائنات کے بنیادی مسائل کو فلسفیانہ زاویہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی، تقلید کی مذمت کی اور روایت پرستی پر ضرب لگائی، ارضیت انسان دوستی اور صحت مند تشکیل کا آغاز کیا انھوں نے زمین کے ہنگاموں کا لحاظ رکھتے ہوئے اندیشہ ہائے افلاک کی ترجمانی کی انکے مفکرانہ انداز سے اردو غزل میں وزن اور وقار پیدا ہوا بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی :-

"غالب نے اردو غزل کو ایک نیا شعور، ایک نیا نسب اور ایک نیا افق دیا غالب کے تصرف سے غزل اردو کی تاثیر اور تقدیر بن گئی انھوں نے نثر اور نظم دونوں کو دلبری بھی دی، دلبری بھی۔ غالب نے غزل کی تقدیر دریافت کی اور غزل کو ایسی فضاؤں سے آشنا کیا جہاں اردو کے تمام ممکنات شعری، شاعری کو برگ وبار لانے کے لئے سامان اور سہولتیں فراہم ہیں انھوں نے اردو شاعری کے سلسلے کو دکنی پر ختم ہوجانے کے بجائے فارسی شعرائے ملاکر رودکی تک پہنچا دیا غالب نے شاعری کیساتھ وہی کیا جو امیر خسرو نے موسیقی کے ساتھ کیا" ع۱

غالب نے اپنی طرز شاعری سے شاعری کے احیا میں ایک تحریک شروع کی جس پر فلسفہ اور دماغی کاوش کا زیادہ اثر ہے شاعری کے لئے انھوں نے زبان اتنی مشکل استعمال کی کہ انھیں اپنے زمانے میں مقبولیت حاصل نہ ہوسکی۔

بہادر شاہ ظفر بذلہ گو شاعر تھے انکی غزلوں میں حسن وعشق کی مختلف کیفیات پائی جاتی ہیں بعض جگہ تصوف اور عمرانی معاملات کو نظم کیا ہے انکی زندگی ایک المیہ تھی جس سے انکے کلام میں گداز پیدا ہوگیا تھا ان کا کلام غم دل کی حکایت کے ساتھ ساتھ تہذیب وثقافت کا نوحہ ہے لہجے کی سادگی اور زبان و بیان کی شیرینی ان کا خاص وصف ہے۔

اس دور میں اردو غزل نے ترقی کرکے انحطاط کی تلافی کی جس سے اس کو چار چاند لگ گئے اس دور کے غزل گو شعرا نے علوئے تخئیل اور معنویت کو الفاظ پر ترجیح دی کلام کی بے اثری کو دور کیا نئی نئی ترکیبیں، نئی نئی تشبیہیں، نئے نئے استعارے، نئے نئے رمز وکنائے کا استعمال کرکے صنف غزل کو فروغ دیا غزل کی تمام معنوی خصوصیات اس دور میں پائی جاتی ہیں شعرا نے اعتراف حقیقت سے گریز نہ کیا ڈاکٹر عبادت بریلوی نے صحیح لکھا ہے کہ :-

---

ع۱ "جدید غزل" مطبوعہ ۱۹۵۵ء صد ۱۲

"اردو غزل کا یہ دور جس کے علمبردار غالب، مومن، ذوق، بہادر شاہ ظفر، شیفتہ اور نسیم دہلوی ہیں، غزل کی روایت کو برتنے، اس کو استوار کرنے اور آگے بڑھانے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اس زمانے میں غزل زندگی سے زیادہ قریب ہوئی اس میں حقیقت اور رجائیت کے عناصر خصوصیت کے ساتھ رونما ہوئے جذبات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ اس میں عقل وشعور کا دور دورہ ہوا، سیاسی، معاشی اور تہذیبی معاملات کی عکاسی کی جھلک بھی اس میں نظر آنے لگی، طرز اظہار، انداز بیان اور زبان کے استعمال میں گہرے جمالیاتی شعور کا اظہار کیا گیا اور اس طرح غزل کی روایت کو آگے بڑھنے کا موقع ملا"[1]

اردو غزل کا ساتواں دور داغ امیر اور جلال کا زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس دور میں داغ دہلوی ہی استادِ سخن مانے جاتے ہیں انکی غزلوں میں انداز کا تیکھاپن اور لہجے کا بانکپن ملتا ہے انکے تغزل سے اردو کو ایک نیا رنگ و آہنگ ملا انکی غزلوں میں غزل کے صدیوں کے تمام مروجہ روایات پائے جاتے ہیں جنکے بغیر غزل نامکمل رہتی ہے انکی غزلوں میں حسن وعشق کے تصور کا عیاشانہ اور عاشقانہ رنگ ملتا ہے جسمیں سوقیت اور تصنع کے ساتھ ساتھ ایک امنگ، البیلاپن اور زندہ دلی بھی پائی جاتی ہے انکو الفاظ اور زبان وبیان پر قدرت حاصل تھی آل احمد سرور کی تحریر کے مطابق:-

"داغ کی شاعری عیاشانہ ہے مجھے داغ کی چاشنی اور چٹخارے سے انکار نہیں مگر اس میں عنفوانِ شباب کا جنسی ہیجان، سستی تمنا اور انکے آسان حصول یعنی زندگی کے معرکوں میں فتح وشکست کے بہت آسان مظاہرے ہیں"[2]

لکھنؤ میں امیر مینائی کا طوطی بول رہا تھا انکا اپنا ایک رنگ ہے لکھنؤ کی غزل کی خارجیت میں جو ابتذال پیدا ہو گیا تھا وہ امیر کی غزلوں میں ملتا ہے خصوصاً صنم خانہ عشق میں جو داغ کے تتبع میں لکھا گیا تھا لیکن مراۃ الغیب میں تصوف اور اخلاق کی جھلک ملتی ہے زبان وبیان کے جادو اور اظہار خیال کے سحر سے وہ واقف تھے اس لئے زبان وبیان کا نکھار اور ستھرا پن انکی غزلوں میں ہر جگہ مل جاتا ہے۔

جلال کے یہاں لکھنوی انداز نسبتاً کم ہے انکے یہاں لکھنؤ کی خارجیت اور ابتذال نہیں ہے لکھنوی ہونے کے باوجود انکے یہاں دہلوی انداز زیادہ ملتا ہے خارجیت کی جگہ داخلیت زیادہ ملتی ہے جو دہلی

---

[1] "غزل اور مطالعہ غزل"، مطبوعہ ۵۵ء ص ۵۳، ۵۴، ۵۵

[2] "ادب اور نظریہ"، ص ۲۵

کی خصوصیت رہی ہے معاملاتِ حسن و عشق کے بجائے جذبات و احساسات اور واردات و کیفیات کو اپنا موضوع بنا کر ان میں رنگا رنگی پیدا کی زبان و بیان پر قدرت حاصل ہونے کی وجہ سے انکی غزلیں اظہار و بیان میں ایک بلند مرتبہ کی حامل ہیں

اس دور کے متعلق ڈاکٹر اعجاز حسین کی رائے صحیح ہے کہ:-

"امیر ہی پر منحصر نہیں، اس دور کے اکثر شعرا کے یہاں ایسی ہی چیزیں ملیں گی سر را آورد و شعرا کا اثر سب ہی پر پڑتا ہے غزل میں یہ رنگ عام ہو گیا تخئیل و تاثیر کی جگہ لفاظی و مبالغہ نے لے لی، سامنے کی باتوں کو صاف اور سلیس زبان میں ادا کرنے کے ذوق نے رعایت لفظی کے چسکے کو بہت زیادہ فروغ دیا تنوع مضامین کے لئے خارجی اشیا پر طبع آزمائی کی گئی، دوپٹہ، زیورات محرم چوٹی سب کو شاعری میں جگہ مل گئی" ع۱

اردو غزل کا آٹھواں دور آزاد اور حالی کی اصلاحی تحریک کو قرار دیا جا سکتا ہے اس دور میں اردو غزل پر مغربی شاعری کے اثرات پڑنے لگے تھے اور اس میں مغربی خیالات و اسلوب کو جگہ ملنے لگی تھی مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی نے اسی زمانے میں غزل میں اصلاحی تحریک چلائی اس کو زبانی باتوں کے بجائے عملی دنیا میں لانے کی کوشش کی اور اسے تنگ دائرے سے نکال کر جامعیت و ہمہ گیری کی طرف متوجہ کیا

آزاد نے اردو غزل میں انسانی جذبات کے ساتھ ساتھ مناظرِ قدرت کو بھی شامل کرنے کی کوشش کی لیکن اسمیں مناظر کی عکاسی کے لئے تفصیل کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے انھوں نے غزل کے بجائے نظم کہنے پر زور دیا اور لاہور میں ایک بزم مناظمہ قائم کی جسمیں غزل اور نظم کا مقابلہ ہوا اور اسی وقت سے اردو غزل میں ایک نئے عہد کی ابتدا ہوئی اور نظموں کی داغ بیل اور سنگ بنیاد پڑ گئی آزاد اور حالی کو نظم کا آدم بجا طور پر کہا جا سکتا ہے

حالی نے غزل کو قعرِ مزلت سے نکال کر اسے اپنے پیروں پر کھڑا کیا نئے امکانات کے شعور پیدا کئے اور اسے نئی جولاں گاہوں سے روشناس کرایا انھوں نے غزل کے ہر پہلو پر بحث کی اور اس کے مختلف پہلوؤں کی اصلاح کی کوشش بھی کی، انھوں نے غزل میں خیال کو بنیادی حیثیت دی اور لفظ کو خیال کے تابع ہونا قرار دیا غزل کے قدیم اور رائج انداز سے بیزاری ظاہر کی اور دل کھول کر اس پر تنقید کی، غزل کے تکلف، تصنع اور مبالغہ کو اصل شاعری کے منافی قرار دیکر اصلیت، سادگی اور جوش کو غزل کے لازمی عناصر قرار دیے اور اس میں حقیقت و واقعیت کی خصوصیات پیدا کرنیکی کوشش کی

ع۱ نئے ادبی رجحانات، ص ۴۳

انھوں نے غزل میں جدّت کی ابتدا کی اسے انقلابی تبدیلی سے ہم آہنگ کیا غزل سے تقلید کو ختم کیا اور اسکی جگہ خلوص اور صداقت کے عناصر داخل کئے جس سے غزل کے حسن و عشق کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوگئی اور اس کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی میں نفسیات کو بھی پیش نظر رکھا غزل میں قومی، ملکی اخلاقی تہذیبی جیسے موضوعات کو بھی داخل کیا اور انکو غزل ہی کے انداز میں پیش کیا غرضیکہ انھوں نے غزل کو کیا بہ اعتبار موضوع اور کیا بہ اعتبار طرز ادا دونوں طرح سے وسعت دی اور یہ خصوصیات خود اپنی غزلوں میں بھی پیدا کی۔

انھوں نے اعلیٰ درجے کی عشقیہ شاعری بھی کی جس میں حسن و عشق کے لطیف واردات و کیفیات اور نازک جذبات و احساسات کو اپنی غزلوں میں بڑی کامیابی کیساتھ نظم کیا

انھوں نے غزل سے مرد کو مرد کا معشوق بنانے، لوازمات مردانہ و خصوصیاتِ زنانہ کے بیان کرنے، صنائع لفظی پر غزل کے مضامین کی بنیاد رکھنے، مضامین عشق میں رکاکت و سوقیت کو نظم کرنے ہرجائی معشوق کا تذکرہ کرنے، معشوق کے لئے سخت لہجہ اختیار کرنے، معشوق کے جسمانی اوصاف اور شعر میں جنسی محرکات نظم کرنے، فرضی عشق و محبت کے واقعات کو موضوع سخن بنانے، غزل گوئی کو قربِ سلطانی و دربارداری اور مذہبی نقطہ نظر سے قابل اعتراض مضامین کو داخلِ شعر کرنے سے منع کیا اور سنگلاخ زمینوں اور مشکل ردیفوں سے بھی پرہیز کرنے کو کہا اور غزل میں وارداتِ عشق و محبت کے جنسی تذکرے کے علاوہ ہر قسم کی محبت کی عکاسی کرنے کو کہا، اظہارِ جذبات میں صداقتِ شعری کا خیال رکھنے عشق کے علاوہ ہر ہیجانی کیفیت اور جوش میں لانے والی صورتِ حال کا تذکرہ کرنے، غزل کو زندگی کا آئینہ اور وقتی رجحانات کا مکمل ترجمان بنانے، مختلف اقوام و ممالک کے ادب سے استفادہ کرنے انگریزی اور بھاکا کے خیالات علامات، تلمیحات اور موضوعات سے فائدہ اٹھانے صرف داخلی مضامین کو غزل میں رکھنے، عشقِ مجازی کے تذکروں کے مقابلہ میں حسنِ مطلق کی تعریف اور تصوف کی روح سے کام لینے، اظہارِ تاثرات میں طبعیت فطرت اور مذاق صحیح کا پورا خیال رکھنے، عہد رفتہ اور واردات گذشتہ کے تذکرے غزل میں کرنے اور اس میں اصلاح معاشرت و درستی اخلاق کی ذمہ داریوں کا لحاظ رکھنے کو ضروری قرار دیا

غزل کی زبان استعمال کرنے میں اسکی شیرینی نرمی قریب الفہمی سلاست نزاکت فصاحت و لطافت کا خیال رکھنے، قدیم الفاظ و علامات کے ساتھ نئے الفاظ و اشارات استعمال کرنے، غزل کی روایتی اور مروجہ زبان میں آہستہ آہستہ تبدیلی کرنے غزل میں مستعمل الفاظ کو موضوع سخن سے پوری طرح مناسبت رکھنے، مخصوص صنائع و بدائع پر مضامین کی بنیاد نہ رکھنے اور پھبتی، ضلع جگت یا رعایت لفظی سے اجتناب کرنے کو کہا غرضکہ اسی طرح کی بہت سی اصلاحات تجویز کیں۔

آزاد اور حالی ہی کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ غزل کے ارتقا پر عقلیت، ارضیت اور اجتماعیت کا اثر ہونے لگا عقلیت کے رجحان نے بقول راجندر ناتھ شیدا :-

"اگر ایک طرف غزل کے عشق کو رسمی مفروضات، قتل، خونریزی، بادیہ پیمائی، طوق وسلاسل آنسوؤں کے سیلاب اور آہوں کی آتش زنی، محبوب کی ستم رانی اور بے وفائی وغیرہ سے نجات دلائی تو دوسری طرف اس نے صدیوں سے چلے آرہے بے حقیقت، مذہبی اور روحانی تصورات سے بھی پاک کرنے کی کوشش کی۔"ع۱

اس طرح اردو غزل کا ایک نیا عہد شروع ہو گیا جس کا اثر بعد کے شعرا نے بہت زیادہ قبول کیا اور رفتہ رفتہ اسے ترقی پسندی کی شکل اختیار کرلی اکبر، چکبست اور اقبال کو اسی تحریک کی پیداوار کہا جا سکتا ہے۔ نظم گوئی کی ترقی بھی اسی زمانے سے شروع ہوئی غزل بھی اس کے ساتھ چلتی رہی

جگر کے عہد میں غزل کا رنگ انیسویں صدی کے ربع آخر میں جب ملک کے کچھ نامور ادیبوں کو غزل کی خامیوں کا احساس ہوا تو انھوں نے اس کے نقائص دور کرنے کی کوشش کی انکو غزل کی ہیئت اور موضوع دونوں میں خامیاں نظر آئیں اس لئے انھوں نے غزل کے موضوعات کو بدلا اسے زندگی سے قریب کیا، اس کے اسلوب بیان کو مقبول بنانے اور اس میں نئے خیالات و محسوسات کو شامل کرکے وقت کے زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی

آزاد اور حالی کی اصلاحی تحریکیں (جنکا تذکرہ پچھلے صفحات میں آچکا ہے) غزل میں رجحانات پیدا کرنے کے لئے اسی زمانے میں شروع ہوئیں

آزاد اور حالی کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ غزل گویوں کو اپنی اہمیت کا احساس ہوا بیسویں صدی کی بدلتی ہوئی انقلابی کیفیت یعنی کانگریس کی تحریک کے اثر سے حب وطن کا جذبہ، انگریزوں کی مخالفت، آزادی کے خیال، معاشرتی اصلاح کے تصور، قدامت اور جدت کی کشمکش، رجعت اور ترقی پسندی کی آویزش، قومی اور وطنی روایت سے دلچسپی، انگریزوں کے جبر و استبداد کے شعور نے غزل میں ایک نئی زندگی پیدا کرنا شروع کردی اس میں زندگی کا شعور پیدا ہو گیا مغرب کے اثرات، سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی، علمی، قومی و ملی اور وطن کی تحریک نے اس کے دامن میں وسعت پیدا کی مبالغہ آرائی کی جگہ سادگی، اصلیت، حقیقت اور واقعیت نے لے لی، غزل میں عشقیہ خیالات کے پیش کرنے میں سماجی پس منظر کو بھی پیش نظر رکھا جانے لگا وجدانی کیفیت کے ساتھ ساتھ دنیا میں جینے کا راز بھی اسی کے ذریعہ بتایا جانے لگا اسمیں زندگی کے مسائل جنمیں صداقت ہو بیان

ع۱ "کتاب نما" جنوری ۱۹۶۴ء ص ۱۸

کیے جانے لگے انداز بیان میں دلکشی سلجھاؤ اور آفاقی کیفیت پیدا کی گئی ابتذال و عریانی سے اجتناب کرنا بھی شامل کیا گیا

حالی نے غزل کی روایت میں جدت کی جو فضا پیدا کی اس سے انکے زمانے کے غزل گو شعرا میں سے اکبر، چکبست اور اقبال نے سب سے زیادہ اثر قبول کیا اور اس روایت کو آگے بڑھانے میں ایک حد تک کامیاب ہوئے

اکبر غزل کے کوئی بڑے نامور شاعر نہیں ہیں لیکن انکی اہمیت اس لئے زیادہ ہے کہ انھوں نے غزل میں نئے موضوعات مثلاً سیاسی، سماجی، مذہبی، اخلاقی، تعلیمی، ادبی، معاشی معاشرتی و تہذیبی موضوعات شامل کئے، اس میں طنز و مزاح، اشارات و علامات، رمز و ایما اور غیر ملکی الفاظ کے برمحل استعمال سے وہ جدت اور اچھوتا پن پیدا کیا کہ انکو استاد مان لیا گیا انھیں کی کوششوں سے اردو شاعری کو اردو سے نفرت کرنے والوں میں بھی مقبولیت حاصل ہوئی۔

چکبست نے بھی غزل سے خاطر خواہ کام لیا انھوں نے اپنی نظموں کے علاوہ غزلوں میں بھی انگریزوں کی غلامی پر اظہار تاسف کیا آزادی کے جذبے کو ابھارا، ظلم و استبداد پر احتجاج اور ہندو مسلم اتحاد کی کوشش کی وطن کے لئے نئے مفہوم (جو انگریزی لفظ — PATRIOTISM کا مترادف ہے) کو اپنی غزلوں اور نظموں میں شامل کیا، قومی اور ملکی عنوانات، وطن اور حب وطن، ملت اور عشق ملت، قوم اور گرفتاری قوم سے متاثر ہو کر بیساختہ اشعار کہے اور لیلائے آزادی (ہوم رول اور Dominion سے متعلق اشعار (مغربی بحر روی سے بچتے ہوئے) کہہ کر اردو شاعری کا رخ حب وطن اور قوم پرستی کی طرف پھیر دیا

اقبال نے غزل کے موضوع اور خیال دونوں میں انقلابی تبدیلی کی اپنا زاویہ نظر قومی و ملی بہت جلد بنا لیا سیاست کو قریب سے دیکھا اور وطنیت کی تحریک کے گہرے اثرات قبول کئے مسلمانوں کا خیال اور ملت کا احساس رکھا اور اپنی صلاحیتیں اسی کے لئے وقف کردیں انھوں نے غزل میں فلسفہ، مذہب، قومیت، سیاست، سائنس وغیرہ کو داخل کیا اپنی غزلوں میں نظم اور نظموں میں غزل کی خوبی اور خوشنمائی پیدا کی انکی غزلوں کے موضوعات حسن و عشق میں غزل کی داخلیت کے ساتھ انکا پورا فلسفہ حیات سمویا ہوا ہے انکے فلسفہ کا ربط عمرانیات سے بھی ہے اس لئے انکی غزلوں کے موضوعات میں فلسفہ اور عمرانی مسائل نے وسعت اور گہرائی پیدا کردی ہے اپنی غزلوں میں انھوں نے مروجہ اور نئے اشاروں کی آمیزش سے ایک نگارخانہ تیار کرکے انمیں ایسی معنویت پیدا کردی ہے جو اس دور کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتی انھوں نے اپنے نئے انداز اور آہنگ سے اردو غزل کی روایت

میں وسعت پیدا کر دی ۔

اکبر، چکبست اور اقبال نے غزل کے دامن کو وسیع کیا اس میں گہرائی گیرائی پیدا کی حقیقت و واقعیت کو داخل کیا اور سیاسی، سماجی تہذیبی معاملات کی ترجمانی میں استقلال اور باقاعدگی برتی جس سے غزل کے مزاج میں ایک فلسفیانہ خارجیت داخل ہو گئی لیکن انھوں نے اسکی داخلیت نغمگی اور غنائی کیفیت کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا، مروجہ اشاروں اور کنایوں میں وسعت، ہمہ گیری اور معنویت پیدا کر کے غزل کے دامن کو نئی گلکاریوں سے آشنا کیا جس سے نئے نئے اشارے و کنائے پیدا ہوئے اور ان ہی اشاروں کنایوں نے غزل کو وسعت دی اسطرح غزل بالکل نئے سانچوں میں ڈھل گئی وہ زندگی کے نئے حالات سے دوچار ہوئی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اس میں خود نئے حالات پیدا ہو گئے اس دور کی غزل کے متعلق ڈاکٹر محمد عقیل کی رائے ہے کہ :-

"حالی کے مقدمے نے دم توڑتے ہوئے لکھنؤ اسکول کی غزل گوئی کے انجر پنجر اور توڑ کر رکھ دیئے اور سوا اس کے کہ چند نام لیوا کہیں کہیں باقی رہ گئے تھے مجموعی حیثیت سے اس کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی انتزاع سلطنت، نئی قوم کی آمد اور نیشنل تحریکات نے کلچر اور ذہن کا ڈھانچہ ایسا تبدیل کیا تھا کہ غزل کے پرانے میدان میں اب کوئی ہاتھ دکھانے کو باقی نہیں رہ گیا تھا اور منیر، امیر و داغ کے جانے کے بعد تو یہ میدان بالکل ہی خالی ہو گیا نظم نئی تحریکات سے متاثر ہو کر رومانی، نیم سیاسی، نیم مصلحانہ انداز سے قدم اٹھا رہی تھی جسمیں فرقہ بندی کا جذبہ زیادہ تھا غزل کے لئے اب سوا اس کے اور کوئی راستہ نہ رہ گیا تھا کہ وہ مع اپنے تمام رسم و روایات کے ان چیزوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرے جو بدلتی ہوئی نئی زندگی کے ساتھ چل سکیں کیونکہ اس کے بغیر اب مفر نہ تھا ملک کے سیاسی حالات روز بروز لوگوں کا مذاق اور معیار زندگی بدلتے جاتے تھے ایسے وقت میں قدیم خیالات اور رسموں کے ساتھ غزل کو لے کر چلنا بے وقت کی شہنائی کا مصداق ہوتا تھا حسرت کسی حد تک اقبال اور چکبست نے وقت کی اس آواز کو بہت جلد پہچان لیا اور انھوں نے واقعات اور حالات کی نبض پر ہاتھ رکھ کر غزل کو ایک نئے میدان میں لانے کا فیصلہ کیا لکھنؤ پر جب یہ بپتا تازیانہ پڑا تو شعرائے لکھنؤ نے بھی اپنا رخ بدلنا چاہا مگر اس طرح کہ مرثیہ سے پیدا ہوئے اخلاقی مسائل کچھ تصوف کا صوفیانہ پن حکومت کے مٹنے سے اور مرثیت سے مترتب ہوا، غم و الم اور تھوڑی بہت وہ لکھنویت جو قابل اعتراض نہ ہو یہ سب کچھ شامل رہے ان لوگوں میں صفی، ثاقب، فانی، عزیز اور اصغر گونڈوی خاص ہیں"[1]

---

[1] "فروغ اردو" فروری و مارچ سنہ ۱۹۶۱ء ص ۱۹۸-۱۹۹

۱۹۱۴ء سے پہلے کی نظموں اور غزلوں کے متعلق آل احمد سرور کی رائے بھی قابلِ اعتنا ہے وہ لکھتے ہیں

"۱۹۱۴ء سے پہلے تک نظموں پر حالی کا اثر تھا اور غزلوں پر داغ اور امیر کا۔ مگر بڑی بات یہ تھی کہ غزل کی دنیا میں ایک خاموش تبدیلی ہو رہی تھی غالب اور میر لکھنؤ کے دل میں گھر کرتے جا رہے تھے اور اگرچہ لکھنؤ کی اپنی ادبی روایات سب موجود تھیں مگر غالب کے خیال کو میر کی زبان میں ادا کرنے کی کوشش جاری تھی۔" ع۱

اس زمانہ میں تعلیم یافتہ طبقہ نے مغربی فکر سے متاثر ہو کر غزل اور اس کی روایتوں کے خلاف ایک محاذ قائم کیا اسی دور میں صفی، عزیز اور انکے رفقا نے غزل میں اصلاحی قدم اٹھایا انھوں نے غزل میں نئے تجربات جذبہ و فکر کا امتزاج اور پستی و ابتذال سے انحراف کیا، غزل کے لب و لہجہ کو پستی سے نکالنے کی بھی کوشش کی مگر وہ اپنی کوششوں کو ہندوستان گیر نہ بنا سکے اس لئے بہت کچھ اس عہد میں بھی غزل کا رسمی اور روایتی دور باقی رہا

۱۹۲۰ء سے لیکر ۱۹۳۰ء تک اردو نظموں میں رومانی نظمیں، وطن کے گیت اور مناظر شامل کئے گئے جنمیں پختگی تو نہ تھی لیکن ایک قسم کا مزا ضرور تھا اور بقول آل احمد سرور

"یہ رندی غزل کی رندی سے تھوڑی سی مختلف تھی، اس میں گھر گھر میخانے تھے اور ساقی، ہمارے اس دنیا سے محبت کرنے والے اور ہمارے عشق سے محبت کرنے والے ساقی تھے غزل نے اس دنیا سے بھی چند رجحانات لئے، یہ پھر میر کی طرف مائل ہوئی اور تصوف کو چھوڑ کر زندگی کا ایک نیا شعور حاصل کرنے لگی، اس نے سستے تضاد، عامیانہ خیالات، فرسودہ علامات کو بھی ذرا حقارت سے دیکھنا شروع کیا، کچھ متروکات کو دوبارہ منہ لگایا اور اس طرح نظم کے دوش بدوش چلنے لگی مگر ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ نظم نے ایک اور کروٹ لی اور گھریلو، سیدھی سادی، جذباتی، مترنم، عاشقانہ، وطنی اور نشیلی ہونے کے باوجود اس نے کہیں سے ایک تلخی، بیزاری اور نفرت محسوس کی اور اس کے منہ کا مزا کڑوا ہو گیا" ع۲

پہلی جنگ عظیم سے ۱۹۳۵ء تک اردو ادب کی تاریخ کو چہل پہل کا دور کہا جاتا ہے کیونکہ اس زمانے میں شاعری اور ادب کا رخ بدلا نئے موضوعات، نئے اسالیب، نئے پیمانوں اور نئی بحروں میں تجربے کر کے ادب کو واضح تخلیقی عمل قرار دیا گیا جس سے زندگی کو فروغ اور قومی تعمیری کاموں میں مدد ملی

اس عرصہ میں زندگی کی رفتار تیز، ذہن حساس اور نفسیاتی شعور زیادہ بڑھ گیا انقلابی تصورات

ع۱ "نئے اور پرانے چراغ" مطبوعہ ۱۹۴۶ء ص ۳۱

ع۲ " " " ص ۱۴-۱۵

زندگی کے ہر شعبے میں داخل ہوگئے سائنس کو علمی دنیا ہی میں نہیں شعر و شاعری میں بھی جگہ مل گئی اب ادب لطیف کی ذہنی عیاشی کی جگہ ترقی پسندی نے لے لی قدیم غزل کا طلسم ٹوٹنے لگا غزل کی نفاست کم ہوگئی لیکن اس میں جان زیادہ آگئی غزل نے اپنی مریض زبان اور فرسودہ روایت کو بدل کر نئی نئی صنعتیں اشارے و کنائے استعمال کر کے زبان کے ساتھ بے اعتدالیاں کیں اس زمانے میں شاعری اور خطابت کا فرق بھی نظرانداز کر دیا گیا اور شاعری ایک طرح کی منظوم خطابت ہوگئی اور بقول راجندر ناتھ شیدا :-

"غزل پر دوسری بڑی یورش اس صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں ہوئی . . . . . زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح غزل میں بھی نئے اور پرانے رجحانات میں مسلسل کشمکش رہی ہے جسنے موجودہ غزل کو انقلابی اور رجعت پسندانہ قدروں کا مجموعہ بنا دیا ہے غزل نے اپنے کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق بنانے کی کوشش کی ہے اگرچہ اس حقیقت کو بھی جھٹلایا نہیں جاسکتا کہ غزل دوسری اصناف سخن کی نسبت اپنی روایتی اقدار کی زیادہ پابند ہے" ع۱

اس دور میں غزل کو ایک مخصوص اُردو داں طبقہ نے بری نظر سے دیکھنا شروع کیا اور اسکی اس قدر مخالفت کی کہ بعض اوقات لوگوں کو یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ اب شاید نظم گوئی کا غالب رجحان غزل کو بہالے جائے لیکن ایسا نہیں ہوا اور غزل بھی میدان مقابل میں ڈٹی رہی

۱۹۳۵ء سے ترقی پسند مصنفین کی تحریک شروع ہوئی اور شاعری کو افادی نظر سے دیکھا جانے لگا اس تحریک کے زیر اثر موضوع پر زیادہ اور زبان و بیان پر کم زور دیا گیا اس کا مقصد ادب کو زندگی کا ترجمان بنانا تھا اس نے نظریہ حسن و عشق کو بھی بدل کر اسے زندگی کا ایک پہلو قرار دیدیا شاعروں نے محبت کی قدر کرتے ہوئے حب الوطنی اور آزادی کی پکار پر لبیک کہا اور ملک کی آزادی پر عشق و محبت کو ترجیح نہ مل سکی تخیلی و مثالی نظریۂ عشق کو اس کی اصلی قدروں کے ساتھ سوچا اور سمجھا جانے لگا۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کی تحریر کے مطابق :-

"۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۶ء تک دس سال کا عرصہ اردو شاعری کی تاریخ میں بغاوت اور تجربوں کا ایک طوفانی دور ہے، موضوعات میں بغاوت اور تجربوں کا سلسلہ دور تک پہنچتا ہے ہیئت میں بغاوت کا احساس اس کے بعد پیدا ہوتا ہے اور پہلے پہل چند انفرادی کوششوں تک محدود رہتا ہے لیکن ترقی پسند تحریک کے ساتھ یہ بغاوت بھیجت پڑتی ہے سانیٹ نظم غیر مقفیٰ، نظم آزاد، گیتوں، نئی بحروں اور نئے پیمانوں کے تجربے نظر آتے ہیں، راشد، فیض اختر، علی سردار جعفری، میراجی اور پھر قیوم نظر یوسف ظفر وغیرہ اور انکے ساتھی اس

ع۱ "کتاب نما" جنوری ۱۹۶۴ء صفحہ ۱۵-۱۶

طرح کے تجربوں میں پیش پیش رہتے ہیں انھیں سے بعض غزلیں بھی کہتے ہیں لیکن ان سب کا سارا زور اس نئی تحریک میں صرف ہوتا ہے جس میں غزل کو جدید شاعری کی محفل سے دیس نکالا ملتا ہے لیکن اسے غزل کی سخت جانی کہیے یا اس کا کمال کہ اس قافلہ کا امام پھر غزل کے رچاؤ کی طرف مراجعت کرتا ہے اور "دست صبا" سے جدید اردو غزل کی ایک اور منزل متعین ہوتی ہے"۔ ع۱

اس زمانے کی غزل کے متعلق پروفیسر رشید احمد صدیقی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یہ صحیح لکھا ہے کہ

"اقبال کے بعد غزل کی زبان آہنگ اور موضوع میں مزید توسیع اور تبدیلی ہوئی جس میں اشتراکی تصورات کا بھی دخل ہے ان تصورات نے ارضیت، وطن دوستی اور مادی خوشحالی کے جذبات کو ابھارا ساتھ ہی ساتھ سیاسی اور وقتی حالات وحوادث بھی آئے"۔ ع۲

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کا دن ہماری قومی تاریخی آزادی کا دن ہے جس کی وجہ سے ملک و قوم میں نئی امنگیں اور نئے ولولے پیدا ہونے چاہیئے تھے لیکن آزادی کا اعلان ہوتے ہی ملک میں وسیع پیمانہ پر قتل و غارت لوٹ مار عصمت دری اغوا اور جبریہ ہجرت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا جس کی تہ میں عزت شرافت، انسانیت اخلاق محبت رواداری سب ڈوب گئی اور اتنی بڑی قربانی کے بعد بھی عام لوگوں کو سکون و چین اور آرام واطمینان نصیب نہ ہوسکا اس دور کی اردو غزل میں انھیں واقعات وحالات سے متعلق اندوہناک گیت سنائی دیتے ہیں اور ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کے الفاظ میں:

"نئی اور پرانی آوازیں یہاں ملکر ہم آہنگ ہوجاتی ہیں، خالص غزل گو، ملے جلے غزل گو اور نظم گو اور خالص نظم گو میں یہاں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا ساز دل سے جو نغمے ابلتے ہیں وہ غزل کا روپ اختیار کرتے ہیں"۔ ع۳

۱۹۴۷ء کے بعد کا زمانہ میر کے زمانے کی طرح عام تباہی اور بربادی، ذاتی و انفرادی محسوسات کا زمانہ بن گیا جس میں غم جاناں و غم دوراں دونوں ایک ساتھ آگئے ماحول اور نئے تقاضے سامنے آئے جس سے غزل کو نئے مواد مل گئے علوم و فنون کی ترقی و تیزی، نئے ماحول اور نئے تقاضوں نے غزل کیلئے سازگار زمانہ بنا دیا اور شعرا نے نئے خیالات کو نئے انداز بیان کے ساتھ نظم کرنا شروع کیا اور غزل قدیم و موجودہ زندگی سے ہم آہنگ ہو کر نئے نظریات کی ترجمانی کرنے لگی اس دور کے شعرا کے کلام میں تازگی، تفکر، اختصار اور جامعیت پیدا ہوگئی انھوں نے جو علامتیں، استعارے تشبیہیں استعمال کیں وہ غزل ہی کی روایت کی

ع۱ "ساقی" جوبلی نمبر ۱۹۵۵ء صـ ۱۱۶ ع۲ "جدید غزل" مطبوعہ ۱۹۵۵ء صـ ۳۹ ع۳ "ساقی" جوبلی نمبر ۱۹۵۵ء صـ ۱۱۶

ہیں اب ان کی غزلوں میں سیاسی وسماجی شعور کی وضاحت، ایمائیت و رمزیت کے ساتھ زندگی کے حقائق کے بیان بھی ملنے لگے انھوں نے اس دور کے حالات و واقعات کو اپنی غزل کا موضوع بنا کر کلاسیکی ادب کی روایت کے احساس کو پختہ شعور بخشا۔

اس زمانے کی غزلوں سے فرسودگی رخصت ہو گئی اس میں حسن وعشق کی داستان بھی بدل گئی جس کے متعلق ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

"جدید غزل میں جو تصورِ عشق پیش کیا جاتا ہے اس میں قنوطیت کی جگہ رجائیت نظر آتی ہے تاریکی کے بجائے روشنی کا احساس ہوتا ہے ناکامی کے بجائے اس میں مسکراہٹیں ملتی ہیں مایوسی کے باوجود ایک ہنسنے کا سا انداز نظر آتا ہے ماحول کی ناسازگاری اس میں ایک سوز ضرور بھرتی ہے اور ایک گداز ضرور پیدا کرتی ہے لیکن یہ سوز و گداز اس پس منظر میں حقیقت بن جاتے ہیں" ع[۱]

غزل جدید علوم جدید فلسفہ اور جدید سائنس سے بھی متاثر ہوئی شعور انسانی میں انسان کی تنہائی کے ساتھ ساتھ ساقی اور بزم مے بہار و خزاں، جنوں صحرا، ہوش و عقل اور زندان وغیرہ کو دورِ حاضر کی ذہنیت اور احساسات کے مطابق ایک نئے انداز سے استعمال کر کے غزل میں نئی رنگینی و لطافت اور نئی موسیقیت کے ساتھ فطری وحقیقی شاعری کی شکل میں پھر سے زندہ کیا گیا ہے اور اب غزل فن کے ساتھ حیات کے مسائل اور اپنے ماحول سے بھی دوچار ہو گئی ہے اس میں داخلی پہلو، ہمواری یک رنگی، جذباتی اور ذہنی کیفیات کے اظہار میں سادگی، سچائی، روانی، بندش کی چستی، لطیف و پرمعنی کنایات سے کام لیا گیا ہے، فلسفۂ حیات اور حقیقت ہستی کا بیان بھی ملتا ہے اور اس میں حقیقت و واقعہ نگاری بھی ملتی ہے زبان سے زیادہ خیالات کی بلندی و پرکاری پر زور دیا گیا ہے بقول فراق گورکھپوری اب

"نئی عریانیاں اور نئی سنجیدگیاں غزل میں رونما ہونے لگیں پرانی باتیں نئے انداز اور نئی باتیں پرانے انداز میں کہی جانے لگیں پچھلے بیس سال کے اندر اردو غزل میں اس قدر کثرت سے نئی ترکیبیں وضع کی گئیں کہ ان کی مثال مومن اسکول کے علاوہ اردو غزل گوئی کے آغاز سے تین سو برس بعد تک نہیں ملتی یہ ترکیبیں محض ادبی تکلف یا تصنع نہیں، بے سروپا مضمون آفرینی نہیں جسے کسی شاعر کے یہاں دیکھ کر اگلے وقتوں کے بھولے بھالے لوگ یہ کہہ کر داد دیا کرتے تھے کہ "یہ آپکا حصہ ہے"۔ بلکہ یہ ترکیبیں احساس و وجدان کی اس داخلیت (awareness) کا پتہ دیتی ہیں جو غزل کو اظہار معانی کا بہترین آلہ بنا دیتی ہے غزل اب پنچائتی چیز نہیں رہی وہ دن بدن انفرادی ذہنیت وشخصیت کے اظہار کا پردۂ ساز بنتی جا رہی ہے" ع[۲]

ع[۱] "غزل اور مطالعہ غزل" صفحہ ۵۶۱ ع[۲] "اردو غزل گوئی" ص ۷۱

موجودہ دور میں ترقی پسند شعرا جو غزل کی سخت مخالفت کرتے تھے اور اسے بیکار اور غیر جمہوری صنف سمجھتے تھے وہ بھی اب غزل کو کام کی چیز سمجھتے ہیں اور اب وہ غزلیں اور نظمیں دونوں کہتے ہیں

اردو غزل پر کلیم الدین کا یہ اعتراض کہ:

"اردو شاعری میں انقلاب ہوا لیکن غزل اپنی جگہ پر جمی رہی آج بھی غزل کی فراوانی ہے اس بات کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ صنف بہت آسان ہے کم سے کم جان سوزی میں آپ شاعر بن سکتے ہیں دوسری وجہ یہ ہے کہ غزل پر جو اعتراضات ہوئے انکا نشانہ غزل نہیں مضامین غزل تھے کسی نے اس صنف کی خامیوں کی طرف توجہ نہ کی بلکہ کسی کو ان خامیوں کا شعوری احساس بھی نہ ہوا" ع[1]

درست نہیں معلوم ہوتا جیسا کہ اوپر دکھایا گیا غزل میں ہر دور میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ہوئی ہے اور حالی کے بعد سے تو اس کی ہیئت میں اصلاح اور موضوعات میں بہت کچھ تبدیلی ہوئی ہے اس صنف کی خامیوں کی طرف بھی توجہ کی گئی ہے اور اسے فروغ دے کر آفاقی بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

لیکن ان کی یہ بات صحیح ہے کہ:-

"اب مضامین غزل میں جو بوقلمونی ہے اور اس بوقلمونی کی ایک بڑی وجہ وہ سیاسی جدوجہد وہ پیچیدہ واقعات ہیں جو گذشتہ چند برسوں میں ہوئے ہیں تحریک آزادی، انگریزوں کا ہندستان چھوڑنا، ہندو پاکستان کی تقسیم، فرقہ وارانہ خون خرابہ، کمیونسٹوں کا زور پکڑنا غرض بہت سے ہونے والے واقعات نے ذہنی دنیا پر اثر ڈالا جذبات میں نئی الجھنیں پیدا ہوئیں ۱۲ دسمبر ۱۹۵۲ء کو لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے ایک مشاعرہ نشر ہوا اس مشاعرے میں جو غزلیں پڑھی گئیں ان سے نئی ذہنی اور جذباتی الجھنوں کا پتہ چلتا ہے— — — — — — —

اب غزل زندگی سے قریب ہوگئی ہے فرضی تجربوں کی جگہ واقعی چیزیں ہیں یہ حسن و عشق کی خیالی داستان نہیں ہونے والی کشمکشوں کا بیان ہے" ع[2]

موجودہ دور کی غزل میں لب و لہجہ کی نزاکت اور داستانِ گل و بلبل کے ساتھ ساتھ عوام کے مسائل بھی نظم کئے جاتے ہیں، بین الاقوامی ربط و ضبط کی نئی روایتیں، نئی تہذیب معاشرت کی تبدیلیوں کے اثرات بھی قبول کئے جا رہے ہیں اور اسطرح جدید غزل میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن سے ایک ایک صنفِ سخن کو کارآمد، زندہ جاوید بنایا اور تنقیدِ حیات کہا جا سکتا ہے اس میں آفاقی خصوصیات

ع[1] اردو شاعری پر ایک نظر" حصہ دوم مطبوعہ ۱۹۵۶ء صفحہ ۲۸۶

ع[2] " " " " صفحہ ۲۰۳-۲۰۵

بھی ملتی ہیں جس سے اس کے پھلنے پھولنے کی امید پائی جاتی ہے

غزل کی اس ارتقائی ترقی کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جگر کے عہد تک غزل کن کن منازل سے گذری اور اب وہ کس مقام پر ہے۔

معاصرین میں کسنے غزل کو کیا دیا جگر کے زمانہ حیات میں قدیم ہمعصر اور جدید شعرا کا شمار کیا جا سکتا ہے یعنی ایک تو وہ ہیں جو انکے ابتدائے شاعری کے زمانہ میں اپنی شاعری میں تقریباً بام عروج پر پہنچ چکے تھے مثلاً اکبر، چکبست اور اقبال وغیرہ اور انکے بعد عزیز، آرزو، صفی، محشر، ریاض، شاد، علی اختر، سیماب، یاس، یگانہ اور ثاقب وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے ان سب کا شمار انکے بزرگ یا سن رسیدہ معاصرین میں کرنا چاہیئے دوسرا دور انکے ہم عصر شعرا کا ہے جو کم و بیش انکی عمر کے تھے اور شعر و شاعری میں بیشتر ان کا ساتھ رہا ہے انمیں حسرت، فانی، اصغر، مجاز جوش، اثر، اور فراق کا نام لیا جا سکتا ہے تیسرے دور کے وہ شعرا ہیں جب کہ جگر کی پیری کا زمانہ اور ان شعرا کی جوانی کا زمانہ تھا انمیں فیض، جذبی، ساحر، حفیظ جالندھری، آنند نرائن ملا، تاثیر، عابد علی عابد صوفی تبسم حفیظ ہوشیارپوری، اختر انصاری، قاسمی، بیتاب، افسر، نقلی، مجروح، اور شکیل وغیرہ کو شامل کیا جا سکتا ہے۔

مندرجہ بالا میں سے ہر شاعر نے اردو غزل کو بنانے سنوارنے میں اپنی بساط کے مطابق ہر ممکن کوشش کی ہے لیکن انکے معاصرین میں جو مقام حسرت، فانی، اور اصغر کو حاصل ہوا وہ کسی اور کو نصیب نہ ہو سکا اس لئے یہاں حسرت، فانی، اصغر، اور جگر کا تفصیلی اور باقی شعرا کے کلام کا سرسری جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے

ان کے ہم عصر قدیم شعرا میں سے اکبر، چکبست اور اقبال کی شاعری کا تذکرہ پچھلے صفحات میں آ چکا ہے اس لئے یہاں صرف عزیز، آرزو، صفی، محشر، شاد، علی اختر، سیماب، یاس، یگانہ اور ثاقب کی شاعری کا سرسری تذکرہ کرنا باقی رہ جاتا ہے۔

مندرجہ بالا تمام ہم عصر قدیم شعرا نے غزل کے نئے رجحانات سے اثر قبول کرکے غزل میں ان رجحانات کو آگے بڑھانے کی کوشش کی کسی نے غزل میں شوخی، چلبلے پن کی کیفیت، خمریات کی روایت میں نیا رنگ نکالا تو کسی نے میر و غالب کی روایت کو از سر نو تازہ کیا کسی نے لکھنوی انداز اختیار کیا تو کسی نے غزل کی روایتی اشاروں اور کنایوں میں بڑی گہری باتیں کہیں انمیں سے بعض پر گو شاعر بھی تھے لیکن وہ فن کے استاد اور غزل کی روایت کے صحیح علمبردار یا ترجمان اور عکاس تھے ان کے یہاں تجربے کی کوشش کا بھی پتہ چلتا ہے

اس کے بعد انکے دوسرے دور کے شعرا حسرت، فانی، اصغر اور جگر خود ہیں۔

ان میں سے حسرت کے کلام میں ان ہی کے قول کے مطابق ع

ہے زبان لکھنؤ میں رنگ دہلی کی نمود

انھوں نے غزل کو سوز و گداز، شیریں گفتار اور رنگین نگاری عطا کی غزل میں نطقیت اور آپ بیتی کو جگہ دی اس میں آزادی خیالی، صفائی اور صداقت گوئی کا احساس پیدا کیا مجازی عشق (گھریلو عشق) اور اسکی مختلف کیفیات کی ترجمانی کی جسمیں سماجی پس منظر کے خیال تہذیبی ماحول کے احساس اور ایک مخصوص معاشرت کے افراد کے ذہنی اور جذباتی کیفیت کے شعور کے احساس کا اظہار کرکے اس کو حقیقت و واقعیت سے قریب کیا انھوں نے غزل میں حسن و عشق کے معاملات کا واقعی و حقیقی لطف پیدا کرکے اسمیں نشاطیہ عناصر سموئے عشقیہ کیفیات و واردات کو سیدھے سادے اور معصومانہ و بے باکانہ پر تاثیر انداز میں پیش کرکے اسکی گیرائیوں کو عالمگیر بنایا عشق مجازی کو آدابِ خودی اور آدابِ زندگی سکھائی اور اسکو زندگی کے اسرار و رموز کی دنیا سے قریب کر دیا بقول آل احمد سرور:-

"حسرت کے عشق میں جو لذت آئی ہے اس میں جسم کی آنچ اور روح کی پکار دونوں ایک ناقابل بیان ہم آہنگی کے ساتھ گھل مل گئے ہیں حسرت مجازی عشق کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں وہ اس نعمت کے منکر ہیں نہ عادی ہیں ...... حسرت کے اشعار میں عشق کی گرمی اور شیرینی دونوں موجود ہیں ..... انکے یہاں ایک سپردگی، ایک مدھم ہیجان ایک سرشاری اور ایک شادابی ملتی ہے جو بڑی خوش آہنگ، بڑی لطیف اور اسکے ساتھ بڑی صحتمند اور جاندار ہے۔ حسرت صرف حسن و عشق کے مصور ہی نہیں محرم اسرار بھی ہیں وہ عشق کے واردات اور حسن کے جذبات کو سمجھتے ہیں" عا

یہ صحیح ہے کہ حسرت کے عشق کا مرکز ایک عورت ہے اور ان کے احساسات وہی ہیں جو ایک متوسط و متوازن انسان محسوس کرتا ہے انکے عشق میں کہیں کہیں ہوسناکی بھی آگئی ہے انھوں نے بعض چھوٹی چھوٹی یا توں، جانی کیفیتوں اور پیش پا افتادہ تجربوں کو ملا کر حسن و عشق کی ایک نئی اور جاندار داستان ترتیب دے دی ہے۔

انھوں نے اپنی غزلوں میں نئے انداز کی مجاہدانہ از خود رفتگی، سرفروشانہ بے نیازی اور سیاسی شعور کو داخل کیا عاشق کو "قصۂ زمین بر سرِ زمین" دکھا، و عشق و حسن دونوں کو اسی دنیا کی چیزیں سمجھ کر اپنی غزلوں میں نظم کیا۔

عا "نگار" جنوری و فروری ۱۹۵۲ء ص ۱۰۶-۱۰۷

انھوں نے زبان، اسلوب، لب و لہجہ کی نرمی، سلاست، حلاوت، روانی، حسن بندش، اور تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال سے انھوں نے غزل میں معصومیت اور انداز خیال میں اپج کے ساتھ بانکپن پیدا کیا انکی شاعری کے متعلق خواجہ احمد فاروقی کی یہ رائے صحیح ہے کہ:۔

"حسرت کی حیثیت ماضی کو حال سے ملانے والی ایک کڑی کی ہے اور اسکی شاعری مادی اور روحانی دنیا کے درمیان ایک پل ہے" ع[1]

ان کے یہاں زبان کے ساتھ جذبات کی آنچ بھی محسوس ہوتی ہے انھوں نے غم دوراں کو غم جاناں اور اپنے درد کو بنی نوع انسان کا درد بنا کر اس میں آفاقیت پیدا کی، غزل میں خارجی و داخلی پہلوؤں کا مناسب امتزاج اور اتحاد پیدا کیا، اس کو ہوسناکی و ابتذال سے پاک کر کے اس میں خودداری پیدا کی اور غزل کو "ادب برائے زندگی" بنا دیا۔

انھوں نے غزل سے معشوق سے ناگوار شکوہ و شکایت، جذبۂ انتقام، تلخی، بیزاری، خشونت، احساس ناکامی وغیرہ جیسی برائیوں کو دور کیا اور کاروبار حسن و عشق میں بدمعاملگی کی جگہ خوش معاملگی پیدا کر دی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے حسرت کو محبوب کا شاعر لکھا ہے اور اپنی گراں قدر رائے ان الفاظ میں پیش کی ہے:۔

"حسرت کے یہاں زبان و بیان کی ایسی بیساختگی ملتی ہے کہ ان کے الفاظ و تراکیب کی غرابت یا کچا پن بھی مزہ دے جاتی ہے اکثر یہ غرابت ہی ان کا نشان دیتی ہے بچوں کے مانند وہ اس درجہ معصوم اور بے تکلف ہیں کہ انکا جا بجا کھل کھیلنا اور زیادہ بھلا معلوم ہونے لگتا ہے سیدھی سادی بات کو بغیر کسی فلسفہ یا فتنۂ رنیت کے مزے سے کہنا اور بس کہہ ڈالنا حسرت کا حصہ ہے وہ بات کہہ کر تو خوش ہوتے ہیں لیکن اس احساس سے اور زیادہ خوش ہو جاتے ہیں کہ ان باتوں سے دوسرے ایسے بھی زیادہ خوش ہوں گے" ع[2]

حسرت نے غزل کو واقعی خلوصِ عشق کی سادگی و پرکاری سے سنوارا اور سجایا ہے عشق و حسن کو اپنی شاعری کی روح رواں بنایا ہے۔

انھوں نے اردو غزل میں زندگی کی تصویر پیش کی ہے ان کے یہاں ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی تحریر کے مطابق

"انسانی زندگی محبت سے عبارت ہے ـــ انھوں نے اپنے کلام میں عشق کے مختلف مدارج کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے اور اپنے تخیل کی مدد سے جنسی جذبہ میں تغزل کی کمال بینی پیدا کر دی ہے اس کمال بینی میں جنسی جذبہ کا نفسیاتی تجزیہ بھی ہے اور ترکیبہ بھی" ع[3]

مندرجہ بالا سطور کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ حسرت نے غزل کو کیا کیا دیا اور اس کو کس طرح جذبات نے

ع[1] "نگار" جنوری و فروری سنہ ۱۹۵۲ء صـ ۷۳ ع[2] "آتش گل" مطبوعہ سنہ ۱۹۵۸ء صـ ۳۴-۳۵ ع[3] "اردو غزل" صـ ۷۶ ۔

میں کامیاب ہوئے۔

اب جگر کے ہم عصروں میں دوسرے شاعر فانیؔ ہیں جو اپنی یاسیت کی وجہ سے بہت بدنام ہیں اور انھیں یاسیت کا امام اور مرگھٹ کا شاعر کہا گیا ہے لیکن انھوں نے بھی غزل کو بنانے سنوارنے میں بڑی مدد کی ہے جدید غزل کو زندگی کی مسرتوں، اسکی رنگینیوں اور رعنائی کا احساس دلایا اور حسن عشق کی مختلف کیفیات و واردات کی ترجمانی کرتے ہوئے اس پر غور و فکر کرکے ایک طرح کی گہرائی و گیرائی پیدا کی غزل میں صداقت و حقیقت نگاری بھی انھوں نے شامل کی، تصوف کے معاملات و مسائل اور حیات و کائنات کے حالات و واقعات جذبات کی مصوری، تخیل کی بلندی واقعات و واردات کی نزاکتوں کو غزل میں یکجا کیا غزل میں غم کا ایک فلسفہ سنجیدگی اور متانت احساس کی شدت اور شعور کی گہرائی پیدا کی اور لفظ پرستی کے کھوکھلے پن کو کم کیا، علامات میں نئی صداقتیں لائے، طبیعت میں ایک خاص گداز نظر میں بصیرت اور احساس میں ایک خاص گہرائی پیدا کی

انھوں نے غزل کو میرؔ کا درد و سہل ممتنع غالبؔ و مومنؔ کے اندازِ بیان کا بانکپن اور بلندیٔ تخیل دیا اس میں سادگی و پرکاری شوخی و رنگینی، مستی و بےخبری پیدا کی

وہ شعر کی پہلی اور آخری شرط شعریت ع۱ سمجھتے تھے اور شعریت کو نازک حسیات اور لطیف کیفیات پر مشتمل جانتے تھے کیونکہ اس نازک حس و لطیف کیفیت کی وجہ سے جو بات دل سے نکلتی ہے وہ دل سے ٹکرا جاتی ہے وہ شعر کا حاصل شعر ہی کو سمجھتے تھے اور حقیقی شاعری میں افادی پہلو نہیں دیکھتے تھے انکا خیال تھا کہ حقیقی شاعری زمانہ کے ساتھ بدلنے کے بجائے کبھی کبھی زمانے کو خود بدل دیتی ہے انھوں نے اپنی غزلوں میں انھیں کیفیات و حالات کو نظم کیا ہے

انھوں نے اپنی غزلوں میں پرخلوص جذبات کو پراثر الفاظ میں بڑی بلاغت کے ساتھ نظم کرکے اس میں بےساختگی، روانی اور دلچسپی پیدا کر دی ہے پروفیسر رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں:-

"فانی کے یہاں فن اور زبان کا بڑا احترام ملتا ہے ان کے لہجے میں بڑی استواری اور ہمواری ہے کبھی کبھی انکی حزین شرافت انکی حزین شاعری سے بڑی معلوم ہونے لگتی ہے" ع۲

انکے اسلوب پر قدرت فارسی ترکیبوں اور محاورے کے برمحل استعمال سے حسن پیدا کرنا بھی خوب آتا ہے انھوں نے چھوٹی چھوٹی تراکیب سے شعر میں بہت سے مضامین داخل کرکے ان میں بےپناہ حسن پیدا کر دیا ہے انکے مقطعے برجستہ اور سانچوں میں ڈھلے ہوتے ہیں

انھوں نے غزل کو غم اور قنوطیت کا نیا مزاج ایک نیا کلچر دیا اسکو رچایا اور نکھارا، زندگی

ع۱ علی گڑھ میگزین، ۴۳-۱۹۴۲ء فانی نمبر ص۵ ع۲ "جدید غزل" مطبوعہ ۱۹۵۵ء ص۲۰

غم کو نئے آداب سے سنوارا اور غم کے اندر نئی حقیقتیں پیدا کیں جسکی وجہ انکی امنگوں کا مٹنا، آرزوؤں کا کچل جانا ہے انکی تمام زندگی ناکامی اور غم میں گذری اس لئے انکی شاعری میں موت کی تمنا اور زندگی سے بیزاری پیدا ہوگئی۔

ان کی غزلوں میں فلسفۂ زندگی اور غم پرستی دونوں ہیں انکے یہاں موت اور موت سے متعلق خیالات میں انہماک، یاسیت اور تلخی بھی مل جاتی ہے پروفیسر سید احتشام حسین کی یہ رائے صحیح ہے کہ:۔

"فانی کی موت خوفناک اور ڈراونی نہیں ہے وہی زندگی کے پیچیدہ معمہ کو حل کرتی ہے وہی سکون لاتی ہے تنہائی اور یاس جہاں زندگی کا مقصد بن جاتے ہیں فانی وہاں کھڑے ہیں اس لئے ان کے یہاں مرگ کی تکرار فلسفۂ حیات کے سمجھنے اور سلجھانے کی کوشش کے سوا اور کچھ نہیں فانی اپنے ہی دکھ درد کا راز نہیں پاتے انہیں اتنی ہی زندگی کا بھید نہیں کھلتا اس لئے کائنات انکے پیش نظر نہیں وہ زندگی جو انکے لئے دیوانے کا خواب ہے انکے پیش نظر ہے وہ اسی کو سمجھنا چاہتے ہیں"ع۱

فانی نے اپنی غزلوں میں اپنی غمناک تصویروں کو حسن کارانہ بنا دیا ہے اور جذبات و واردات انسانی کی کامیاب مصوری کی ہے زبان کی چاشنی سے خاص لطف پیدا کیا ہے اور قدیم رنگ کے برتنے میں اپنے لہجہ کو آفاقی اور کائناتی بنا دیا ہے انکی غزلوں میں گہری اور پُر تامل پاکیزہ اور دلنشین ادا پائی جاتی ہے، حزن و یاس میں مابعد الطبیعیاتی تصور ملتا ہے انھوں نے غزل کو فکر، دقتِ نظر اور فلسفیانہ تعمق اور بڑی بلیغ و پُر کیف غنودگی دی۔

انھوں نے غزل کو زندگی سے نبرد آزمائی اور مقابلہ کرنا سکھایا غم کو ایک حسین جذبہ قرار دیا اور عشق و عاشقی کا وہ ماجرائے دل بھی بیان کیا جو کسی نگاہِ ناز کا چوٹ کھایا ہوا تھا چونکہ انکو اپنے عشق میں ناکامی و نامرادی کا منہ دیکھنا پڑا تھا اس لئے انکے یہاں ہوس پرستی و ہوسناکی نہیں ہے بلکہ عشق کی پاکبازی اور حسن کی لطافت کا احساس اور نازِ حسن کے ساتھ نیازِ عاشقی کی عظمت کی ایک نئی روایت مل جاتی ہے اس طرح انکی شاعری کا نقطۂ نظر شخصی شاعرانہ ہوگیا ہے اور ان کے نغمۂ غم نے ان کے دل سے پھوٹ کر بڑے حکیمانہ انداز میں شعر کا روپ دھار لیا ہے اس سلسلے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کی یہ رائے بہت معقول ہے کہ:

"فانی کے یہاں آلام حیات کی تفسیر ہے فانی زندگی کو ایک مسلسل اور منظم الم قرار دیتے ہیں وہ الم جس نے بدھ کو نجات کا متلاشی بنایا اور جس کی نشاندہی مسیح کی صلیب کرتی ہے!

ع۱ "علی گڑھ میگزین" فانی نمبر ۴۳-۱۹۴۲ء ص ۱۹۸

فانی کا غم متحرک نہیں مجہول ہے فانی کو موت کا عرفان دوسرے راستوں سے نہ ہوا غم کے راستے سے ہوا۔ ــ ــ
ــ ــ ــ ــ ــ قید حیات و بند غم کی نوعیت غالب اور فانی کے یہاں جدا گانہ ہے
غالب کے یہاں ان کی نوعیت مسئلہ کی ہے فانی کے یہاں مفارکی "ع۱
فانی نے غزل کو غم کا نیا مزاج دیا نئے آداب سکھائے، زندگی کو غم سے ہم آہنگ کرکے اس کی ہر ادا میں نئی کیفیتیں محسوس کرائیں اور اپنی غزلوں میں غم کے ذریعہ تہذیب جذبات کا کام لیا اس سلسلے میں کلیم الدین احمد کی رائے بھی قابل قبول ہے کہ:۔

"فانی کے سینے میں دل نہیں، ایک مستقل درد ہے اور اس مستقل درد کی ترجمانی انکی شاعری ہے فانی کے احساسات ذاتی ہیں فرضی یا خیالی نہیں، ان کے خیالات ذاتی مشاہدوں اور تجربوں کا نتیجہ ہیں محض تقلیدی نہیں یعنی ان کے جذبات میں اصلیت اور خیالات میں صداقت ہے۔ اور یہی بات انکے شعروں کی تاثیر کا سبب ہے ان کی دقت نظر کی وجہ سے ان کے شعروں میں سنجیدگی متانت اور گہرائی ملتی ہے ان کی آواز بلند آہنگ اور پرجوش آہنگ ہے اس میں زور ہے ایسا زور جو اپنی طاقت سے واقف ہے جسے اپنی کامیابی کا یقین اور اپنی قدر و قیمت کا احساس ہے ع۲

خلاصہ یہ کہ فانی کی شاعری کا مرکز غم و آلام رہے ہیں اسی میں انھوں نے طرح طرح سے طبع آزمائی کی ہے اور غزل کو انھوں نے غم و آلام کے نئے روایات سے آگاہ کیا ہے
فانی کے بعد اصغر کا شمار بھی ہوتا ہے کہ عنصر دل میں ہوتا ہے وہ شاعر تصوف کہلاتے ہیں اور انھوں نے غزل کو تصوف بلکہ ماورائی تصورات سے آشنا کرایا ہے جو اس دور میں زوال اور انحطاط تھا
اصغر نے غزل میں حیات و کائنات کے مسائل بیان کئے انداز حسن اور اسکی اہمیت کا احساس دلاکر اس میں ایک والہانہ وارفتگی اور متنوع کیفیات کی ترجمانی کی اور عشق حقیقی کو داخل کیا
بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی :۔

"تصوف کے مسائل کو پیش کرتے ہوئے وہ زندگی کی فضاؤں میں اتنا اونچے اڑے ہیں کہ اپنے آپ کو کہیں کہیں نظروں سے اوجھل کر دیا ہے اسی لئے ایک قسم کی ماورائیت بھی ان کے یہاں پیدا ہوگئی لیکن ان کے اس انداز میں ایک رفعت اور بلندی کا احساس ضرور ہوتا ہے اصغر کی غزلوں میں سارا کھیل تخیل کا ہے اور تخیل کی بلند پروازی نے ایک ایسی رنگین اور پرکاری فضا ان کی غزلوں میں پیدا کی ہے جو بڑی ہی دلکش اور دل آویز ہے اسی فضا نے اصغر کی غزل کو ایک حسین نگارخانہ بنا دیا ہے روحانی

ع۱ "جدید غزل" ۱۹۵۵ء ص ۲۸-۲۹ ع۲ "اردو شاعری پر ایک نظر" (حصہ دوم) مطبعہ ۱۹۵۶ء ص ۲۳۲ و ۱۴۴

اور جدانی خیالات کے ایسے حسین مرقعے اردو شاعری میں کہیں اور نہیں مل سکتے اصغرؔ کی غزل انھیں حسین مرقعوں کا ایک مجموعہ ہے اصغرؔ کے یہاں موضوعات کا تنوع نہیں ہے صرف تصوف کی کیفیات ہیں جو کہیں کہیں فلسفے کی حدود میں داخل ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں لیکن ان کی تخیل پرستی اور روحانیت انھیں فلسفی نہیں بننے دیتی اسی لئے ان کے یہاں موضوع کی یکسانیت ضرور ہے لیکن تخیل کی رنگین کاری نے اس یکسانی کو ایسا حسین بنا دیا ہے کہ ان کی شاعری ایک چمنستان نظر آتی ہے وہ تو جذب و شوق کے شاعر ہیں اور اسی جذب و شوق نے ان کی غزلوں کو آسمانی پرواز سکھائی ہے ان کی غزلوں نے آسمانوں سے ستارے توڑے ہیں اور ان ستاروں سے غزل کی روایت کی محفل کو سجایا ہے،،ع۱

یہ سچ ہے کہ انھوں نے حسن نسوانی کو بھی حسنِ آسمانی بنا کر پیش کیا ہے اور اپنی ہلکی لطیف اور شادابانہ مستی اور ہشیاری پیدا کی ہے اپنی غزلوں میں حکیمانہ خیالات اور حقائق نگاری کے ساتھ ساتھ شاعرانہ اندازِ بیان اور دلآویزی پیدا کی، خیالات میں پاکیزگی جدت اور لطیف جذبات و احساسات کی مصوری کی ان کے تصوف و عرفان کی چاشنی و شیرینی نے غزل میں تازگی، ندرت اور تاثیر کی روح پھونک دی ہے اور اس میں رقص، کیف اور وجد کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے نازک اور نفیس الفاظ کو مدھم سروں میں استعمال کر کے نغمگی اور اثر آفرینی میں اضافہ کیا ہے ان کے یہاں تصوف میں ایک نورانی پرتو کی جھلک نظر آتی ہے اصغرؔ انسان کو رسوا ہوتے اور قدروں کو بنتے اور مٹتے دیکھ کر مادی زندگی کو قابل ترک اور بے مایہ سمجھنے لگے تھے مولوی اقبال احمد سہیل کا خیال صحیح ہے کہ:۔

"جناب اصغرؔ کی شاعری عام سطح سے بلند ہے ۔۔۔ ان کی شاعری رقص معانی کی جیتی جاگتی تصویر ہے آنسو کا ایک ناچیز قطرہ ان کے جوشِ طبیعت کے فیض سے "ستارہ سحری"، بنکر چمک اٹھتا ہے اور کبھی شوق کا بحر بے کنار بن جاتا ہے،،ع۲

انھوں نے اردو غزل میں نشاط اور شگفتگی کو داخل کیا اور انسانی زندگی پر اور ائی نظر ڈال کر اسے ایک سماجی چیز بنا دیا انکی غزلوں کو پڑھ کر واقعی تنویم کے عمل اور غشی کا احساس ہوتا ہے ان کے کلام میں کہیں رطب و یابس نہیں ملتا کیونکہ ان کے یہاں ہوا و ہوس اور سستی جذباتیت کا فقدان اور پاکیزہ کردار کی جھلک ہے ان کے یہاں وہ ذہنی ہے جسمیں انھوں نے اپنی ذات اور اندرونی تجربات کو مرکزی حیثیت دی ہے جس کی وجہ سے ان کے جذبات میں گہرائی ملتی ہے کلیم الدین احمد کا یہ قول حقیقت پر مبنی ہے کہ:۔

"اصغر کا لہجہ ہمیشہ بلند رہتا ہے وہ کبھی عامیانہ رنگ اختیار نہیں کرتے ہیں بلکہ اپنا دامن اس آلودگی

ع۱ "غزل اور مطالعہ غزل"، مطبوعہ ۱۹۵۵ء صفحہ ۳۴۲ تا ۳۴۴ ع۲ "نشاطِ روح"، صفحہ ۳۹-۴۰

سے پاک رکھتے ہیں سطح نظر کی بلندی کی وجہ سے ان کی شاعری میں رفعت پیدا ہو گئی ہے تصوف یا فلسفہ ہر صفحہ پر روشن "عا

غرض اصغر کی شاعری کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے غزل میں تصوف اور اسکے مسائل کو اپنے مخصوص مگر کامیاب انداز میں بیان کیا ہے

اصغر کے بعد اپنے ہم عصروں میں جگر پہنچتے ہیں جو بیسویں صدی کے غزل گو شعرا میں چوتھے ستون سمجھے جاتے ہیں اپنے ہم عصروں میں (یعنی حسرت، فانی اور اصغر کے بعد) وہی زندہ رہ گئے تھے

جگر نے غزل کو حسن و عشق کے معاملات کے بیان میں والہانہ از خود رفتگی کی کیفیت، سرمستی و سرخوشی جوانی کا نشہ دیا اس میں نازِ حسن کے ساتھ نیازِ عشق بھی پیدا کیا حسن و عشق کی نفسیات میں جدت پیدا کی اس میں (غزل میں) والہانہ آہنگ پیدا کیا غزل کو بے پناہ خلوص، صداقت بخشی اور عشق کو رونے بسورنے کے بجائے خودداری سکھائی اس میں واردات قلبیہ کی حقیقی عکاسی کی، ان کا عشق رومانی اور حسن زندہ و تابندہ حقیقت ہے

انکی شاعری اور زندگی میں مطابقت ہے اسی وجہ سے انکے کلام میں نازک معنی موج در موج محسوس ہوتی ہے انھوں نے جو کچھ محسوس کیا وہی اپنی شاعری میں نظم کیا انھوں نے اردو غزل کو سادگی، برجستگی، شوخی، معاملہ بندی، دلکشی، رنگینی، کیف و سرمستی، بیخودی، ترنم اور حسن کاری کے ساتھ تصوف کی چاشنی بھی دی اور اسکو تکلف اور تصنع سے پاک کیا انھوں نے غزل کی اصل روح کو اپنے اندر جذب کر کے اپنے جذبات کی پرکیف، مستانہ روش رنگین ترجمانی سے اسلوب میں تازگی اور انفرادیت پیدا کی کہیں کہیں زبان و بیان کے لطف سے تاثر پیدا کیا انھوں نے غزل کے ذریعے لطیف احساسات کو جگایا محبت کے خوابیدہ تاروں کو چھیڑ کر نیا نغمہ پیدا کیا محبت کے تاثر میں غنائیت الفاظ کے ذریعہ پیدا کی اور الفاظ کے انتخاب، بندش اور ترکیب سے ایک مخصوص نغمہ پیدا کیا، غزل میں ایک خاص قسم کا نشاط و انبساط بانکپن صحت مند عشق اور زندگی کی رنگینیاں بھی بیان کیں

جگر نے غزل میں حسن و عشق دونوں کے مقام مقرر کر کے انکا پرکیف اور دل آویز تصور پیش کیا ایک طرف عشق کی پسپائی، بربادی رسوائی نامرادی اور ناکامی کو ختم کیا اس میں خودداری، خود اعتمادی اور وقار پیدا کیا تو دوسری طرف حسن کی ستم شعاری، بے مروتی سنگدلی بیگانگی، آزردگی اور غفلت کیشی کے روایتی تصور کو بھی مٹا دیا اور اس کو عام انسانوں کی طرح ایک انسان اور اس کے پہلو میں درد بھرا دل ثابت کر دکھایا جسمیں محبت سے متاثر ہونے کی خصوصیت اور عاشق کا خیال بھی رہتا ہے حسن و عشق کا بہت

عا "اردو شاعری پر ایک نظر" حصہ دوم مطبوعہ ۱۹۵۶ء، ص ۴۵ء

ہی مستانہ طرب انگیز اور ولآویز تخیل پیش کیا حسن پرستی اور حقیقت پسندی کے عناصر کو ایک دوسرے سے مربوط کیا اور رقیب کو بھی روسیاہ بنانے کے بجائے مدِ مقابل لا کر کھڑا کر دیا اس سلسلے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی نے صحیح لکھا ہے کہ:

"شاعر (عاشق) وصالِ محبوب کی خواہش کا اظہار کرے گا تو اس کا بہت زیادہ امکان ہے کہ وہ تہذیب سے گر جائے لیکن جب وہ محبوب کے جذبات کی ترجمانی کرے گا احتیاط و احترام کے دائرہ سے قدم باہر نہ نکال سکے گا اگر اس نے ایسا کیا تو خود اپنی نظر سے گر جائے گا جگر عشق کے طلب میں محبوب کی عفت کو کبھی فراموش نہیں کرتے --- ہمارے عام شعرا کے محبوب سے دوستی کرنے کی خواہش ہم میں آپ میں مشکل سے پیدا ہوگی جگر کے محبوب کو ہر شخص اپنانا چاہے گا، اردو شاعری کو یہ زاویہ جگر نے دیا" ع۱

جگر نے زاہد اور ناصح کا بھی مقام مقرر کیا اور بعض متروکات مثلاً بارے، انکھڑیاں، مت بن وغیرہ کو پھر سے رائج کیا اور غزل کو آگے بڑھانے کی کوشش کی

انھوں نے غزل میں واقعیت و داخلیت کی تصویر اور جذبات و احساسات کی تفسیر کی انکی غزل کی بنا اور دار و مدار محبت پر ہے جسمیں انھوں نے رنگا رنگ پہلو پیدا کیے ہیں انکے کلام میں ایک چوٹ کھائے ہوئے دل کی آواز اور اس کی تاثیر کے ساتھ ساتھ خود داری و شانِ استغنا پائی جاتی ہے انکا درد پسند دل دردِ عاشقی سے لذت یاب ہو کر سراپا درد بن جاتا ہے

انھوں نے صنفِ غزل میں دل فریبی و دل آویزی پیدا کی اس کو ایک رومانی اور جمالیاتی انداز دیا اور کہیں کہیں اخلاقی سماجی اور سیاسی شعور کی بالیدگی بھی بخشی، بقول فیض الرحمن اعظمی:-

"انکی مخصوص آواز اس کی انفرادی فضا، سیدھا سادہ اگر رنگین انداز، ارضیت کا شدید احساس محبوب اور عاشق کے کردار میں قدرتی پن اور معصوم سپردگی کا جذبہ، ایک طرح کی مست شباب اور والہانہ انداز، ہم آہنگی اور ربط - ذوقِ جمال اور احساسِ نغمہ، رومان اور رومانیت کی دھوپ چھاؤں زندگی میں خوشی اور پیار کی خواہش وغیرہ یہ چیزیں جگر کے تغزل میں جوہر ہیں" ع۲

انھوں نے غزل میں انسانی تقدیر و تاریخ پر مفکرانہ تبصرے انسانی عظمت پر ایمان و ایقان کا اظہار انسان کے عروج اور انسانیت کے زوال اور علم کی نارسائی پر افسوس اور عمل کی ضرورت پر اصرار کیا اور عزمِ راسخ اور یقینِ کامل کا سبق دیا ان کی آخری دور کی غزلوں میں انسانی عظمت کا یقین، حیات شناسی، دیدہ وری اور سماجی بصیرت نظر آتی ہے۔

جگر نے قدیم و جدید رنگ کی آمیزش سے تغزل میں ایک خوشگوار اور دلکش توازن قائم کیا ہے۔

ع۱ "آتش گل" مطبوعہ ۱۹۵۶ء ص ۳۲-۳۳ ع۲ "شبلی کالج میگزین" ۱۹۶۰-۱۹۶۱ء ص ۴۸-۴۹

آل احمد سرور کا خیال صحیح ہے کہ:-

"جگر کے یہاں داغ، حسرت اور کچھ کچھ مومن کی شان پائی جاتی ہے ...... جگر کے یہاں جدید رنگ کا نہیں قدیم رنگ کا نکھار ہے انھوں نے اپنی غزلوں میں وہ جان پالی ہے جو تغزل کی جان ہے یعنی انکا آبگینہ بھی تندی صہبا سے پگھل جاتا ہے ان کے کلام میں عشق کی ساری گرمی اور شدت موجود ہے وہ سننے والے یا پڑھنے والے کو اپنی دنیا میں پہنچا دیتے ہیں .... ان کے یہاں تصوف یا تفلسف یا الفاظ کی بازی گری بھی ملتی ہے مگر یہ جگر کا رنگ نہیں انھوں نے حسن کو جس جس طرح دیکھا ہے عشق کی نفسیات کی جیسی تصویریں کھینچی ہیں ان سے ہماری شاعری اور بھی رنگین ہو گئی ہے ..... جگر کو اس دور سے کوئی واسطہ نہیں وہ جہاں کھڑے ہیں تنہا کھڑے ہیں ... جگر نے اردو غزل کو حافظ کی رنگینی و سرمستی پھر سے عطا کی حسرت کے یہاں شگفتگی و شادابی ہے جگر کے یہاں تندی و تیزی، مگر اس دور کے تمام شعرائے زیادہ سپردگی (ABONDON) اور سرمستی جگر کے یہاں ہے،، ع۲

انکے کلام میں بلا کی آمد، سیل رواں کی تیزی اور تلاطم ہے اور جذبات میں ایک طرح کا طوفان ہے انکے شاہکار احساسات جذبات اور کیفیات نے بے اختیار الفاظ کا جامہ پہن کر شعر کی شکل اختیار کرلی ہے ان کے یہاں جذبے کی فراوانی ہے اور مضامین میں تنوع، جدت، تازگی اور اثر آفرینی ہے حقیقت نگاری کی جھلک اور خلوص و صداقت کے جوہر ہیں ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے صحیح لکھا ہے کہ:-

"جگر کے ہاں بجائے جوش کے ایک سرمستی ہے انھیں فراق اور وصال سے اتنی غرض نہیں جتنی اپنی بے خودی سے، اسی گونہ بے خودی میں انھیں دونوں جہاں کی نعمتیں میسر ہیں اور اسی جذب مسلسل کے باعث انکی غزل میں ایک سرور کی کیفیت پائی جاتی ہے جو انکی پُر کیف ترنم سے دلوں کو موہ لیتی ہے،، ع۳

مختصر یہ کہ جگر حسن و محبت کے شاعر تھے اور تمام عمر حسن و محبت کے مختلف کیفیات و واردات خلوص دل سے بیان کرتے رہے

حسرت، فانی، اصغر اور جگر کے قدرے تفصیلی تذکرے کے بعد اگر انکے معاصرین میں مجاز، جوش، اثر

ع۱ جگر کو دور سرمستی میں تو واقعی اس دور سے کوئی واسطہ نہیں تھا لیکن جب سے شراب سے توبہ کرکے متاہل زندگی بسر کرنے لگے تھے تو اپنے دور کے حالات و واقعات سے بھی متاثر ہوئے تھے اور اس سے واسطہ قائم کرلیا تھا جس کے ثبوت میں انکے مجموعہ دوم "آتش گل" کو پیش کیا جا سکتا ہے ع۲ "نئے اور پرانے چراغ" صـ ۱۸۷-۱۸۸، ع۳ "کتاب نما" دسمبر ۹۳ء صـ ۸

اور فراقؔ کا تذکرہ نہ کیا جائے تو یہ انصاف نہ ہوگا اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کے کلام کے بارے میں مختصراً عرض کر دیا جائے کیونکہ ان شعرائے بھی غزل کے گیسوؤں کو ضرور سنوارا ہے۔

جہاں تک مجازؔ اور جوشؔ کا سوال ہے وہ ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھتے ہیں اور انھوں نے غزل میں ایک طرح کا جہاد کیا ہے انقلابی انداز اختیار کرکے اس میں تغیر و تبادل کیا اور عوام کو انقلابی انداز کی زندگی سے نپٹنے کا طریقہ بتایا ہے انھوں نے وطنی ملی قومی اور تعمیری کاموں کو اپنی غزلوں اور نظموں میں جگہ دی انکا رجحان زیادہ تر غزلوں کے بجائے نظموں کی طرف رہا اور اسی کو فروغ دینے میں انھوں نے اپنی تمام قوت صرف کر دی ہے انھوں نے غیر ملکی حکومت کے خلاف جد و جہد کی ترغیب دی اس کے سماجی ظلم ، ناانصافی اور ریاکاری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جس سے غزل میں بلند نظری فراخدلی ، استقلال ، ایثار ، رواداری ، وفاشعاری ، بے غرضی اور اپنے مقصد کے لئے انتھک کوشش شروع ہوئی غزل کو نئے تجربات سے ہم آہنگ کرکے اس کو نئی جولان گاہوں سے روشناس کیا انھوں نے مسلسل غزلیں کہیں اور غزل اور نظم کو ایک دوسرے سے قریب کیا ان کے یہاں غزلیہ نظمیں یا نظمیہ غزلیں کافی پائی جاتی ہیں۔

اثرؔ لکھنوی نے غزل میں سادگی و پرکاری اور معصومیت کے ساتھ رنگینی اور شگفتگی پیدا کی انکی غزلوں میں زندگی بسر کرنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے ایک صحت مندانہ فضا ملتی ہے میرؔ کے اثر سے انکے یہاں داخلی کیفیت زیادہ ملتی ہے انھوں نے اپنی غزلوں میں نرم و شیریں زبان استعمال کرکے اس میں نکتہ سنجی اور نکتہ آفرینی پیدا کی ہے

فراقؔ نے غزل میں جدید رجحان ، عشقیہ واردات و کیفیات کی حقیقی ترجمانی ، مغربی سانچوں سے واقفیت اور خیال میں گہرائی پیدا کی اسکو نکھارنے اور مترنم بنانے کے لئے نئے نئے تجربے کئے بقول ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی :-

”بظاہر غزل کو مترنم بنانے کے لئے یہی کیا جا سکتا ہے کہ الفاظ کے انتخاب میں سلیقہ دکھایا جائے یا پھر ردیف کو ترک کر دیا جائے یا غزل کو مستزاد بنایا جائے لیکن فراقؔ نے ایک جدت اور کی ہے انھوں نے محض ترنم کی خاطر ہندی زبان ، ہندی لہجہ اور ہندی عروض کو اردو میں سمونے کی بڑی خوبصورت کوشش کی ہے ،، ؎۱

انھوں نے اپنی شاعری میں قدیم اور عظیم آریائی تہذیب و تصوف کی جمال آرائی داخل کرنے کی کوشش کی ہے اور غزل کے مضامین اور اس کے اظہار بیان میں وسعت پیدا کی ہے حیات و کائنات کے مسائل

؎۱ ”کتاب نما“ دسمبر ۱۹۶۳ء ص ۹

بیان کر کے فکر سے زیادہ احساس کی شدت کا اظہار کیا ہے انکے یہاں جذبات و خیالات میں زبان پیدا ہو گئی ہے وہ زبان کے معاملے میں کوئی خارجی نظریہ نہیں رکھتے بلکہ جو زبان یا جیسی زبان نے انکے مزاج کی ترجمانی کی اسی زبان کو انھوں نے استعمال کر لیا انھوں نے عام تجربات کے نادر اور معنی خیز پہلوؤں کو اجاگر کیا اور تخیل اور احساس کو تربیت اور ذہنی تحریک کا سامان فراہم کیا

فراق نے اردو غزل کو نیا زور بیان، نیا لب و لہجہ، نیا آہنگ اور نیا ذہن دیا

فراق کے بعد جگر کے تیسرے دور کے شعرا فیض، جذبی، ساحر، حفیظ جالندھری، آنند نرائن ملا، تاثیر، عابد علی عابد، صوفی تبسم، حفیظ ہوشیار پوری، اختر انصاری، قاسمی، سیف، انسر، فضلی، مجروح اور شکیل وغیرہ ہیں جو جگر کی پیری میں جوان تھے اور آج غزل کا میدان انھیں شعرا کے ہاتھ میں ہے ان میں سے ہر شاعر اپنی لب و لہجہ کے مطابق غزل کو نیا نے اور سنوارنے میں لگا ہوا ہے اور غزل کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق بنانے کی کوشش کر رہا ہے

جگر کی مقبولیت کے اسباب جگر خالص غزل گو شاعر تھے غزل انکی جان اور تغزل انکا ایمان تھا وہ اپنے تغزل ہی کے شیریں نغموں سے عوام و خواص پر تیس سال تک سحر کرتے رہے اور عوام ہی نے پہلے انکے سر پر شہنشاہ تغزل کا تاج رکھا

غزل میں عالمگیر جذباتی احساس (حسن و محبت کی باتیں اور کھاتیں) کو زندگی کی رعنائیاں اور سرتیں بیان کی جاتی ہیں اس میں عشق کے لطیف کیف اور پاکیزہ واردات و جذبات جنمیں اصلیت اور صداقت ہوتی ہے اشاروں، کنایوں، تشبیہوں، استعاروں، تلمیح، رمز اور آفاقی تمثیل کے ذریعہ سلیس، شستہ، سادہ اور شیریں زبان میں بڑی خوبی سے بیان کئے جاتے ہیں، اس میں نئے مضامین کو قبول کر کے انھیں فنی تخلیق میں بدل دینے کی غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے، اس سے جمالیاتی حظ حاصل ہوتا ہے اور وہ انسان کے بلند ترین احساسات کو غیر متوقع معنے اور اچھوتے انداز سے جگا دیتی ہے، غزل کا ہر شعر منفرد اور ایک مختصر مضمون یا افسانے کی حیثیت رکھتا ہے اس کا انداز، دل میں اتر جانے اور حافظے پر نقش ہو جانے والا ہوتا ہے کیونکہ اس میں تاثر سمویا اور تجربہ بیان کیا جاتا ہے اسنے زندگی میں اس قدر گھر کر لیا ہے کہ اس کو عام پسندی کا درجہ حاصل ہو گیا ہے ہر شخص اس کا شیدائی نظر آتا ہے بچے، بوڑھے، جوان، جاہل عالم معمولی پڑھے لکھے یعنی عام و عوام سبھی اس کی شیرینی سے لطف اندوز ہوتے ہیں ڈاکٹر رفیق حسین نے صحیح لکھا ہے کہ:

"غزل کے اشعار ڈھکے مندے الفاظ میں نہ جانے کیا سے کیا بات پیدا کر دیتے ہیں اور زندگی کے ہر شعبے پر چھائے ہوئے ہیں اسی وجہ سے یہ ہر دلعزیز ہے باوجود آسان ہونے کے مشکل ہے، باوجود مختصر ہونے کے ہر شے کو سمیٹے ہوئے ہے، جذبات نگاری، فطرت نگاری، صداقت پسندی، مصوری، تصوف، فلسفہ، اشاریت، اخلاقیات کے خشک مسائل سب کچھ اس میں ہیں اچھے شاعروں نے اچھی غزلیں کہہ کر

اس کو عام پسند کیا ۔ ۔ ۔ جنہوں نے غزل کے اصولوں سے لاپروائی نہیں برتی وہ بے مثل شاعر ہوئے "

جگر نے غزل کے اصولوں سے لاپروائی نہیں برتی اور اسی لئے وہ بھی اپنے عہد کے بے مثل شاعر ہوئے

جگر کی مقبولیت کے بہت سے اسباب ہیں ایک تو یہ ہے کہ جگر کے ابتدائی زمانے میں غزل قوالیں کی مجالس اور رقص و سرود کی محفلوں میں گائی جانے لگی جنھوں نے جگر کی شہرت کا ڈنکا بجانا شروع کیا اور ان کی عظمت بہ حیثیت شاعر تسلیم کی جانے لگی

وہ عوام و خواص دونوں میں یکساں مقبول ہوئے انکی مقبولیت کے سلسلے میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی یہ رائے معقول ہے کہ :-

" ایک شخص جب عام طور پر اپنوں میں اور پرایوں میں محبوب و مقبول ہو اسکے متعلق کسی خاص صفت اور کمال کی نشاندہی کر کے یہ بتانا مشکل ہوتا ہے کہ اس کی محبوبیت اور ہمہ گیر شہرت کا دارومدار کس پر ہے لوگوں کا مذاق اور پسند کا معیار مختلف ہوتا ہے اس لئے اگر ایک شخص سب میں مقبول ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں ایسی جامعیت اور ہمہ گیری پائی جاتی ہے کہ ہر شخص اور ہر گروہ نے اسکو اپنے اپنے معیار پسندیدگی پر جانچا اور وہ اس پر پورا اترا - اس میں دخل جہاں اس کے فنی کمال کو ہوتا ہے اظہارِ فن کے پیرایہ کو اس کے ذاتی اخلاق و عادات کو اور اس کے بعض اور شخصی کمالات کو بھی ہوتا ہے ایک نقاد کی نگاہ میں اگرچہ ان میں سے ہر چیز ایک دوسرے سے الگ اور جدا ہوتی ہے لیکن جہاں تک مقبولیت اور شہرت کا تعلق ہے یہ سب چیزیں الگ الگ نہیں ہوتیں بلکہ ایک کو دوسرے سے مدد پہونچتی ہے جگر کا حال بھی یہی ہے انکا تغزل اس کے ساتھ ایک نہایت دلآویز ترنم ان کی لاابالیت اور استغنا، خلوص ہمدردی اور غمخواری یہ وہ اوصاف ہیں جن کے عناصر سے جگر محبوب شخصیت کا پیکر تھا " ع۲

مگر بقول آل احمد سرور :-

" قبول عام کلام کی خوبی کا ضامن نہیں سمجھا جاتا مگر غور سے دیکھا جائے تو جمہور جسکے سر پر تاج رکھ دیتے ہیں اسکی بادشاہت کی بنیاد دیرپا عناصر پر ہوتی ہے ڈاکٹر جانسن کا قول ہے کہ ادب کی خوبی کا آخری معیار عوام کے قبول کی سند ہے اس قول میں صداقت ضرور پائی جاتی ہے عوام یوں ہی کسی کو سر پر نہیں بٹھاتے وہ کبھی کبھی سطحی چیزوں سے بھی متاثر ہوتے ہیں مگر تھوڑی دیر کے لئے بہت سے لوگ بہت کافی عرصے تک اسی چیز کی تعریف کرتے ہیں جو تعریف کے قابل ہو " ع۳

" ع۱ اردو غزل کی نشو و نما " ص ۹۸ ع۲ " فروغ اردو " فردوس و مارچ ۱۹۶۱ء ص ۱۷۱-۱۷۲ ع۳ " نئے اور پرانے چراغ " ص ۶۳ ۔

جگر کو قبولیت عام کا شرف اور انکے سر پر جمہور کا تاج اس وجہ سے رکھا گیا کہ ان کے کلام نے تقریباً تیس سال تک قبول عام کی سند حاصل کی جو ادب کی خوبی کا آخری معیار قرار دیا گیا ہے جگر کا کلام تعریف ہی کے قابل تھا ورنہ سطحی کلام عوام کو اتنی مدت تک متاثر نہیں کر سکتا ہے۔

جگر کی مقبولیت کا ایک سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ ایک اچھے شاعر کے ساتھ ساتھ اچھے انسان بھی تھے بلکہ اچھے شاعر کے لئے اچھا انسان ہونا لازمی سمجھتے تھے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"میں بنیادی طور پر اس حقیقت کا قائل ہوں کہ جو شخص اچھا انسان نہ ہو وہ اچھا شاعر بن ہی نہیں سکتا" ع۱

اب ہم انکی مقبولیت کے سلسلے میں ان کے کلام کی خصوصیات کا جائزہ لیں گے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ اپنے کلام کی وجہ سے کس حد تک مقبول ہوئے

جگر کے کلام کی مقبولیت کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ انھوں نے قدیم طرز سخن کو زندہ رکھتے ہوئے اسے آگے بڑھایا غالب کی گہرائی اور میر کی سادگی و پرکاری کو اپنایا حافظ کی طرح غزل میں جوش، سرمستی، نشاط، ہمہ گیری رنگا رنگی، معرفت و اسرار تصوف و اخلاق، جذبات و واردات سیاسیات غرضیکہ ہر قسم کے بلند و عمیق اور لطیف و پاکیزہ خیالات کو بہترین اسلوب بیان سے ادا کیا اس میں آفاقی عاشقانہ جذبات ایسی سادگی و دلکش انداز سے بیان کئے کہ انکی غزلوں کے پڑھنے والے اور سننے والے دونوں کیلئے بڑی سہولت ہوئی کیونکہ ان کے شعر میں جاذبہ و احساس کی دھڑکن پڑھنے اور سننے والوں کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے اور وہ اس سے پوری طرح سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کی محبت میں ارضیت کی [illegible] کیا لذیذ تلخیاں و رنگینیاں ہیں انہیں محبت کا ہر موڑ اور ہر مرحلہ ملتا ہے انکے محبوب نے ان سے بھی محبت کی ہے اور انھوں نے اس کے جذبات و احساسات کی عکاسی ایسے انداز سے کی ہے کہ اس سے انکی شاعری میں ایک نیا رخ اور نیا موڑ پیدا ہو گیا ہے انکے یہاں غزل کی ہر روایت قدیم ہونے کے باوجود تازہ، شگفتہ اور اچھوتی رعنائیاں لئے ہوئے ہے

ان کی غزلوں میں محبت کا پیغام ہے جسکے متعلق ایک دفعہ انھوں نے سید انوار شاہ سے کہا تھا کہ:-

"میرے اشعار آپکو پسند ہیں۔ یہاں یہ آپکا پسند ہے میں تو صرف پیغام پہنچانے والا ہوں" ع۲

ان کی غزلوں میں جذبہ کی اس قدر شدت ہے کہ بعض جگہ ان سے فنی غلطیاں بھی ہو گئی ہیں لیکن انکی خلوص، سچائی اور اثر کیوجہ سے لوگوں کی نظریں انکی خامیوں پر نہیں ٹکتیں کیونکہ انھوں نے اس میں شریفانہ جذبہ داخل کیا ہے اور ابتذال سے بچتے ہوئے اپنے مزاج کی سرشاری کے حسن کو اس طرح چمکایا کہ ان کی شرافت یا شریفانہ طبیعت پر حرف نہ آیا اس سلسلے میں مجھے پروفیسر سید احتشام حسین کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ:-

"جگر نے ہمیشہ ایک غزل گو کی طرح حسن و محبت کا تصور جذبہ کے راستے سے کیا ہے بھولے بھٹکے ان

ع۱ "اذکار" کراچی اکتوبر سنہ ۱۹۵۵ء ص ع۲ "جگر مراد آبادی" از شوق مراد آبادی (غیر مطبوعہ)

کے بیان میں فکری عنصر کی آمیزش ہوتی ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ جذبہ کے غلبے نے تخیل کی راہیں ہموار کی
ہوں اور شاعری محض اعصاب کی پکار بن کر رہ گئی ہو۔ عشق اور زندگی کے ابتدائی طوفان میں یقیناً
جذبہ ہی رہنما ہوتا ہے، احتیاط، سوچ بچار، فکر سب حلقۂ بیرون در معلوم ہوتے ہیں لیکن زندگی
کی کشاکش اس طوفان کا ریلا برداشت کرنے کے سلسلے میں بہت سے اور کبھی سبق دیتی ہے اور شعور کا دائرہ
(اس میں حسن و عشق کی حقیقت کے شعور کا بھی دائرہ شامل ہے) پھیلتا ہے، کامیابی اور ناکامی کی دھوپ
چھاؤں، وصل کی خواہش اور ہجر کی مجبوری کی آنکھ مچولی کاروبار محبت کی بڑی صداقتیں ہیں ان ہی
کی رنگا رنگی سے ہزاروں تصویریں بنتی ہیں ہزاروں رنگین نقش بنتے اور مٹتے ہیں اگر ان کی مصوری محض
شاعری کے بل بوتے پر کی جائے تو یہ صرف ایک روایت کی پرستش ہوگی اور اگر انھیں خود اپنی زندگی
کے حقائق تسلیم کر کے پیش کیا جائے تو وہ جاندار شاعری وجود میں آتی ہے جو اپنے والہانہ پن خلوص
اور صداقتِ اظہار کی وجہ سے خود ایک روایت بن جاتی ہے اور کبھی مرتفع ہو کر جمالیاتی تجربہ بنتی
ہے اور ذہنی آسودگی پیدا کرتی ہے جگرؔ کے یہاں دونوں صورتیں ملتی ہیں "[۱]

جگرؔ کی مقبولیت کے اسباب ان کے کلام کی شیرینی نغمگی جذبات کی سچی پر اثر عکاسی جو حقیقت و واقعیت
سے قریب ہیں، محبوب کے جذبات کی صحیح ترجمانی، انکی سرمستی بیہوشی ہشیاری و والہانہ پن سوز و گداز وغیرہ تھے اس
کے ساتھ ساتھ ان کا غزلوں کے پڑھنے کا انداز بھی ایسا تھا جس سے وہ اپنے کلام سننے والوں کو اپنے مترنم
اور نغمے کے اثر سے اس سطح پر لے آتے تھے کہ اس کی مدد سے سامعین کو انکے کلام کے سمجھنے اور اس سے پوری طرح
لطف اندوز ہونے میں مدد ملتی تھی وہ اپنے اس طرز کو سامعین پر احسان سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ شاعر کا
سامعین پر احسان ہے کہ وہ انکو اپنے ترنم اور نغمے کے ذریعہ اس سطح پر لے آتا ہے کہ وہ اس کے کلام کو
بخوبی سمجھ سکیں کلام کے پڑھنے کا انداز واقعی لوگوں کو کلام کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے اس کے متعلق جیکوسلاواکیہ
کے مشہور شاعر ہیروتن نے اپنی بڑی گراں قدر رائے دی ہے اور کہا ہے کہ :۔

"آپکی ایسے لوگوں سے ملاقات ہوئی ہے جو پڑھنے کے بعد شعر کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھتے لیکن اگر آپ اپنی
نظم پڑھ کر سنائیں تو اسپر اثر ہوتا ہے سوال یہ ہے کہ شاعری کی طرف رخ کیا ہے اگر میں نظم سنتا ہوں تو صحیح
نظم پڑھنے والے کی آواز اور صورت کی طرف دھیان دینا ہوتا ہے اور میں ہر لفظ کو اور الفاظ کے باہمی ربط
کو غور سے سنتا ہوں اور ساتھ ہی ساتھ میں نظم کے معنی بھی سمجھتا ہوں کیونکہ جو شخص شعر سمجھ کر با آواز بلند
پڑھتا ہے وہ اس کے معنی اپنے انداز سے سمجھا دیتا ہے
سننے والا محسوس کرنے لگتا ہے کہ میں نے اپنی صلاحیتوں کا غلط اندازہ لگایا تھا نظم کو سمجھنا کوئی ایسا حیرت انگیز

---

۱ "نظام جدید" (ہفت روزہ) ملتان ۱۶ و ۲۳ ستمبر ۱۹۶۲ء ص ۲۲

واقعہ نہیں ہے

اگر میں شعر کہتا ہوں تو جو نظم میں پڑھوں گا اس کی باریکیوں سے واقف ہوں گا میں شعر فہم ہوں گا اور شعر کا مجھ پیاسا ہوں گا اور میں اس سے کچھ سیکھوں گا لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔
لیکن جو چیز ایک شاعر کی حیثیت سے مدد کرے گی وہ کچھ اور ہی ہے یعنی شاعر کی تخلیق کے ارادے کو سمجھنا جو ہمیشہ انسان دوستانہ ہوتا ہے "عا

جگر صاحب کے پڑھنے کے انداز اور بلند و شیریں، دل گداز و دلنشیں آواز میں ایسی غیر معمولی ہم آہنگی تھی کہ وہ یقیناً جادو کا اثر رکھتی تھی وہ اپنے کلام اور ترنم کی بدولت مشاعروں میں چھا جاتے تھے اور سارے مجمع کو مسحور کر دیتے تھے ان میں بڑے بوڑھے، جوان، پڑھے لکھے اور جاہل، اعلیٰ طبقہ اور ادنیٰ طبقہ، قدیم تعلیم یافتہ اور جدید، روشن خیال بھی ہوتے تھے اور سبھوں پر جگر کا جادو یکساں چلتا تھا اپنے عہد کے وہ واحد شاعر تھے جو اپنی خوش گوئی اور خوش گلوئی بلکہ نغز گوئی کی وجہ سے یکساں دلچسپی کے ساتھ پڑھے اور سنے گئے وہ اس قدر مقبول و مشہور ہو گئے تھے کہ اپنا مقام بہت بلند سمجھنے لگے تھے اور کہتے تھے کہ:۔

"مشاعرے میں کسی کو جگر کے سامنے غزل پڑھنے کا حق ہی کیا ہے ہندوستان میں صرف جگر ہی ہے جو غزل کا مزاج شناس ہے اور جس نے غزل کو ایک نیا آہنگ دیا ہے" ع۲

جگر کا یہ بیان انکی تعلی نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہے جس کا ثبوت آل احمد سرور کی اس تحریر میں ملتا ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ :۔

"تقریباً ۱۹۴۰ء کے ایک مشاعرے میں جو حیدر آباد میں منعقد ہوا تھا جس میں فانی بھی شریک تھے جگر کا مسحور کن ترنم میں کلام سن کر سامعین پر وجد کا عالم طاری ہو گیا جگر کی غزل ختم ہونے پر فانی شاعرے سے اٹھ کر جانے لگے تو لوگوں نے ان سے کہا کہ ابھی مشاعرہ جاری ہے اس پر فانی نے جواب دیا کہ مشاعرہ تو جگر کی غزل پر ختم ہو گیا" ع۳

سرور صاحب کی اس تحریر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جگر کے کلام اور ترنم ریز آواز کے انکے ہم عصر شعرا بھی کسقدر معترف تھے کہ مشاعرے میں انکے پڑھ لینے کے بعد اپنا کلام پڑھنا بیکار محض سمجھتے تھے
جگر کے مشاعروں کی شہرت کے بارے میں جلیل قدوائی نے ہمارے سامنے ایک صحیح نقشہ کھینچ دیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ جگر کی مشاعروں میں

"آمد کیا ہوتی تھی جیسے کسی بادشاہ کا جلوس آتا ہو وہ سماں مجھے اچھی طرح یاد ہے، سرشاری کے عالم میں جھومتے

ع۱ "نئی دنیا" دہلی ۱۵ نومبر ۶۲ء راقم کے پاس جو رسالہ ہے اس کے اس حصے کے صفحات پھٹے ہوئے ہیں اس لئے صفحہ کا صحیح تعین نہیں کیا جا سکا
ع۲ "نگارش" "جگر نمبر غالباً ۱۹۶۱ء (رسالے پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے) ص ۲۵۳ ع۳ "نظام جدید" ملتان ۱۶ و ۲۲ ستمبر ۶۲ء ص ۳۷

جھانتے ۔ طلبہ کے جمِ غفیر کے ساتھ ہٹو بچو کے نعروں میں کشاں کشاں لائے جا رہے ہیں اپنے فارسی مطلع

مست و سرشار و غزل خواں می رسم   از سرِ جاں موئے جاناں می روم

کی تصویر بنے اور بقول غالب ع:

چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

شرارتِ نفس سے ننھے پھول رستے ہیں ساتھ ہی ہر طرف اپنی مسکراہٹ کی بجلیاں گراتے ہیں ۔ ۔ ۔

ہر ہر شعر پر کہرام مچ جاتا تھا ــــــ ۔ ۔ جگر صاحب موسیقی کے عام اصول کے خلاف جسمیں انترہ اٹھایا جاتا ہے پہلے مصرعہ کو اپنے ترنم کی خاص طرز کے مطابق دھیمے لہجے میں ادا کرتے تھے اور دوسرے مصرعہ کو کھینچ کر اور بلند آواز سے پڑھتے تھے بلکہ دوسرے مصرعہ کی ابتدا میں آواز بلند ہونی شروع ہوتی تھی اور خاتمہ تک منتہائے کمال کو پہنچ جاتی تھی اس آخری حد تک پہنچنے سے پہلے تک مجمع پورا شعر کامل سکوت کی حالت میں اور مبہوت و ششدر ہو کر سنتا تھا مگر آواز منتہائے کمال کو پہنچی نہیں کہ پورا ہال تحسین و آفرین کے نعروں سے گونج اٹھتا تھا بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ ہال کی چھت پھٹ جائے گی شاید چھتیں اڑ جایا کرتی ہیں یا ہوتا ایسی ہی داد کو کہتے ہیں" ع۱

وہ آخری ایام میں تو اسقدر مقبول ہو گئے تھے کہ مشاعرے صرف جگر کا کلام سننے کیلئے منعقد ہوتے تھے اور بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اس وقت "مشاعرہ اور جگر مرادآبادی ایک ہی شاعر کے دو نام ہیں"

اور جب جگر صاحب علالت کے سبب اپنا کلام سنانے سے معذور ہو گئے تو سامعین صرف انکو دیکھنے کے لئے مشاعروں میں مدعو کرتے اور اگر وہ انکی خاطر کچھ سنا دیتے تو وہ بے حد خوش ہوتے اور فخر کرتے کہ انھوں نے جگر کا کلام ان کی زبان سے سن لیا

جگر کی مقبولیت میں انکی شخصیت کو بھی بڑا دخل ہے آل احمد سرور نے صحیح لکھا ہے کہ :-

"اس کی زندگی ہی میں اس کی خاصی قدر ہوئی اس قدر کی وجہ یہ تھی کہ وہ صرف اچھا شاعر ہی نہ تھا بلکہ بڑا اونچا آدمی تھا اس سے محبت کر کے اس کی عزت کر کے آدمی اپنے آپکو اخلاقی اعتبار سے بلند محسوس کرتا تھا اس کے دم سے مشرقیت کی قابلِ قدر روایات، شرافت کا معیار، خلوص اور دوستی کے آداب، انسانیت کے جوہر زندہ اور روشن تھے" ع۲

جگر صاحب میں "انسان دوستی" جو بشریت کا سب سے بڑا حسن ہے بدرجہ اتم موجود تھی اسی لئے ان کے پاس اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات، اعلیٰ عہدیدار دفتروں کے معمولی کلرک بڑے بڑے سرمایہ دار

ع۱ "العلم"، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۷ء صفحہ ۲۹-۳۰ جلیل قدوائی کا یہ اقتباس پچھلے صفحات میں تفصیلاً نقل کیا جا چکا ہے لیکن اسکو مختصراً یہاں بھی نقل کر دینا ضروری معلوم ہوا تاکہ قارئین کے سامنے جگر کے پڑھنے کا انداز پیش کیا جا سکے) ع۲ "نظام" جلد ۱۰ شمارہ ۱۶، ۲۲ ستمبر ۱۹۶۲ء صفحہ ۲۷

اور ادنیٰ درجہ کے دوکاندار غرضیکہ ہر قسم کے انسان گرویدہ ہو کر چلے آتے تھے انکو اپنے یہاں بلا تکلف بلائے جاتے تھے اور جگرؔ صاحب کسی سے گریز نہیں کرتے تھے انکو گریز تھا تو صرف بدمذاقی اور ریاکاری سے، یہ چیزیں ان کے یہاں کفر میں داخل تھیں یہی وجہ ہے کہ وہ کسی ایک فرد یا گروہ کے لئے مخصوص نہیں رہے اور وہ تمام سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی جھگڑوں سے دور، رنگ و نسل زمان و مکان، ہر قید و بند سے آزاد رہ کر صرف محبت کا پیغام سناتے رہے اسی لئے انکے اخلاق، مروّت شرافت اور انسانیت کو ہر مدرسہ فکر کے افراد متفقہ طور پر مانتے ہیں

جگرؔ صاحب مجسم خلوص و محبت تھے انکی صحبت میں بیٹھ کر لوگ انکی عزت کے ساتھ اپنی عزت کرنا بھی سیکھتے تھے نیّرؔ سلطانپوری کے الفاظ میں:۔

"زبان میں دلکشی، بیان میں سحر، کلام میں نغمگی، گفتگو میں شیرینی، مزاج میں رندی، طبیعت میں خودداری وضع میں بانکپن، اخلاق میں دلآویزی، ہشیاری میں بیخودی اور بیخودی میں ہشیاری جگرؔ کے امتیازی خصوصیات ہیں انھیں خصوصیات نے جگرؔ کو جگرؔ بنا دیا تھا"۔ ؏۱

جگرؔ صاحب کی مقبولیت میں انکے کلام، ترنم، نغمگی، والہانہ پن ان کے خلوص و محبت اور اخلاق و مروّت کے علاوہ ان کے احباب کو بھی بڑا دخل ہے اور انکو بھی کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا یہ جگرؔ کی خوش قسمتی تھی کہ انکے جیسے گدڑی کے لعل کو ابتدا ہی سے قدر شناس جوہری مل گئے بالکل ابتدائی دور میں مرادآباد میں حضور احمد صاحب مرحوم اور مولوی خورشید الحسن صاحب جیسے مخلص لوگ مل گئے جنھوں نے انکے ابتدائی دور کا کلام سمیٹ سمیٹ کر رکھا اس کے بعد اصغرؔ گونڈوی، مرزا احسان احمد سید سلیمان ندوی، نواب سید علی حسن، پروفیسر رشید احمد صدیقی وغیرہ اور انکے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین آل احمد سرور بیکش اکبرآبادی حمید صدیقی، تسکین قریشی، سید صدیق حسن، حبیب احمد صدیقی، فضل احمد کریم فضلی، مجروح سلطانپوری وغیرہ جیسے جوہری اور قدرشناس مل گئے جنھوں نے جگرؔ کے شایان شان انکی قدر و منزلت اور عزت افزائی کی جگرؔ صاحب بھی ان تمام حضرات سے بے انتہا خلوص برتتے تھے اور خطوط میں سب سے برابر کا خلوص و محبت جتاتے تھے اگر ان تمام حضرات کے نام کے ان تمام خطوط کو یکجا رکھ کر دیکھا جائے جو جگرؔ صاحب نے انکو لکھے ہیں تو کم و بیش سب کے القاب و آداب اور انکا مضمون ایک جیسا ملے گا اس سے ہر شخص یہی سمجھا کہ جگرؔ صاحب انکے سب سے زیادہ قریب ہیں؏۲۔۔۔ اس کے علاوہ جگرؔ صاحب جب بھی اپنے

؏۱ "شمع ادب" نومبر ۱۹۶۱ء صفحہ ۲ ؏۲ خطوط میں انھوں نے اپنے ہر دوست کی تعریف کی ہے اور اس کے اخلاق و عادات اور خلوص و محبت کو اس قدر سراہا ہے جس کا وہ مستحق نہیں انکا تجربہ راقم الحروف کو ذاتی طور پر ہے جگرؔ صاحب نے اپنے احباب کے خلوص و محبت اور اخلاق و عادات کو حسب معمول سراہا ہے ان میں سے بعض بالکل اس کے برعکس ملے ہیں ہو سکتا ہے کہ وہ جگرؔ صاحب سے قربت حاصل کر کے انکی شہرت سے اپنی شہرت اور نام و نمود حاصل کرنے کی خاطر ان سے بناوٹی خلوص و محبت جتاتے رہے ہوں اور جب راقم الحروف سے سابقہ ہوا تو انکی حقیقت واضح ہوئی۔

احباب سے ملتے تھے تو اس سے اس قدر خلوص و محبت برتتے اس کی اتنی خاطر و مدارات کرتے اور ایسی دل جوئی کی باتیں کرتے تھے کہ وہ خواہ مخواہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتا تھا کہ جگرؔ صاحب اسی کو سب سے زیادہ چاہتے ہیں وہ جب کسی دوست کے گھر جاتے تو اس پر اور اسکے اہل و عیال پر پیسے کافی خرچ کر دیتے تھے ان کے لئے تحفے تحائف بھی لے جاتے تھے یہ سب حالات تو ایسے ہی تھے جن سے ہر شخص یہی سمجھ بیٹھے کہ واقعی جگرؔ صاحب اس سے سب سے زیادہ قریب ہیں راقم الحروف کو بعض اوقات انکے خطوط اور لوگوں کے بیانات سے حیرت ہوتی ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ حقیقت کیا ہے یہ شش و پنج بعض اوقات شکوک و شبہات کی حد میں داخل کر دیتا ہے کہ ایک انسان ہزاروں آدمیوں سے یکساں برتاؤ کیسے کر سکتا ہے؟ لیکن آخر میں یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر شخص سے خلوص و محبت جتانا اس سے برابر کا برتاؤ کرنا جگرؔ صاحب کی فطرت میں داخل ہو گیا تھا اسی وجہ سے وہ ہر شخص سے یکساں محبت و خلوص جتاتے تھے اور سب اپنے آپ کو جگرؔ سے قریب تر سمجھتے تھے جگرؔ کا یہی خلوص و محبت تھا جس نے انکو ہندوستان و پاکستان میں اسقدر مقبول و مشہور کر دیا کہ ہر دو ممالک میں انکے ہزاروں بلکہ لاکھوں قدرداں اب بھی موجود ہیں جنمیں سے بعض تو جگرؔ صاحب کی تعریف کرنا ان کے لئے کلمۂ خیر کہنا عبادت میں داخل سمجھتے ہیں مختصر یہ کہ جگرؔ صاحب کی مقبولیت میں ان کے بعض اخلاقی اوصاف جیسے ہر شخص سے برابر کا خلوص و محبت جتانا استغنا و خودداری ہمدردی و غمخواری خلوص اور انکے فنی کمالات خصوصاً تغزل کی شیرینی، سرشاری نغمگی و دلآویز ترنم وغیرہ جیسے کمالات کو بڑا دخل ہے اور یہی وہ عناصر ہیں جن سے جگرؔ کی محبوب شخصیت کی تعمیر اور ان کی مقبولیت کی تشکیل ہوئی۔

جگرؔ کا مستقبل

جگرؔ مراد آبادی غزل کے شاعر ہیں اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے غزل اور اس کے مستقبل کے متعلق کچھ بیان کر دیا جائے اس کے بعد جگرؔ کے مستقبل پر کوئی تبصرہ کیا جائے۔

شاعری کی ابتدا بقول نیازؔ فتحپوری "دنیا میں غزل سے ہوئی ہے"۔ ع۱

اور غزل بقول کلیم الدین احمد "اردو شاعری کی جان ہے"۔ ع۲

اس میں عشقیہ شاعری کا عطر یا جوہر ملتا ہے یہ اردو زبان کا طرۂ امتیاز ہے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اسکو اردو شعر و ادب میں "ام الاسالیب ع۳" کا درجہ دیا ہے اور لکھا ہے کہ:۔

"غزل جتنی بدنام ہے اتنی ہی مجھے عزیز ہے شاعری کا نام آتے ہی میرا ذہن غزل کی طرف مائل ہوتا ہے غزل کو میں فن نہیں اپنی شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری

ع۱ "اردو غزل گوئی"، ص ۱۵ ع۲ "اردو شاعری پر ایک نظر"، حصہ اول، ص ۲۷ ع۳ جدید غزل مطبوعہ ۱۹۵۵ء، ص ۷

تہذیب میں ڈھلی ہے دونوں کی سمت ورفتار ایک دوسرے سے حاصل ہوئی ہے اس پر نہ ہنسنا چاہیئے نہ رونا اس کا احترام کرنا چاہیئے

ہندوستان میں جن دیسی بدیسی زبانوں، بولیوں یا روایات کی بڑی مان دان رہی ہے اردو ان کی غزل ہے غزل شاعری نہیں تہذیب بھی ہے وہ تہذیب جو دوسری تہذیبوں کی نفی نہیں کرتی بلکہ انکی تصدیق بھی کرتی ہے اور تنقیح بھی، کبھی کبھی تزکیہ بھی۔

ہماری شاعری میں اثر کا جادو غزل ہی میں نہیں تو غزل ہی سے جگایا گیا ہے، ع۱

ڈاکٹر اعجاز حسین کا یہ بیان صداقت پر مبنی ہے کہ:-

"دنیا بلکہ کائنات کا سب سے قیمتی موتی عشق ہے بغیر اس کے تاج انسانیت کا نمایاں ہونا دشوار ہے اس میں بھی شک نہیں کہ ہماری غزل نے اس جوہر کو نہایت خوبی کے ساتھ اہل بینش کے سامنے پیش کیا" ع۲

جس غزل میں دوربینی کے ساتھ ساتھ اپج، اچھوتا پن، جدت، طرفگی، پُرخلوص جذبہ صحیح احساس اور گہرا شعور ہوگا اس کو مستقبل میں کوئی مقام حاصل ہو سکے گا کیونکہ غزل میں بنیادی طور پر نفسیاتی حسن وعشق کو بیان کیا جاتا ہے جسمیں کائنات کا عشق اور افلاطونی عشق بھی شامل ہے اس موضوع پر ابد ہی سے شاعری ہوئی ہے اور ہوتی رہنا چاہیے

غزل میں تمام اصنافِ شاعری سے زیادہ تاثیر ہوتی ہے کیونکہ اس میں حسن وعشق کا ہمہ گیر اور پُر تاثیر جذبہ (جو انسان کی فطرت اور سرشت میں داخل ہے) کی عکاسی کی جاتی ہے

ڈاکٹر یوسف حسین کا قول بھی توجہ کا مستحق ہے جسمیں انھوں نے لکھا ہے کہ:-

"غزل کی جڑیں ہماری تہذیب اور جذباتی زندگی کی گہرائیوں میں پیوست ہیں انھیں اکھاڑ پھینکنا سہل نہیں - - - - - مجھے غزل کا مستقبل اس کے امکانوں کی وجہ سے روشن نظر آتا ہے اس لئے کہ اس صنفِ سخن سے ہمارے بعض اہم اور دور رس ادبی اور جذباتی تقاضوں کی تکمیل ہوتی ہے غزل ہمارے ادبی مزاج میں اتنی دخیل ہو چکی ہے کہ اس سے قطعی طور پر بے تعلق ہو جانا ممکن نہیں معلوم ہوتا - - - - . عشق انسانی فطرت میں ودیعت ہے یہ ایک فطری کشش ہے جو دل میں ذوق اور شورش پیدا کر دیتی ہے کوئی انسان چاہے وہ کتنا ہی بے حس کیوں نہ ہو اپنی فطرت کی اس اساسی حقیقت سے ناواقف نہیں ہو سکتا اس کے تانے بانے سے ذات اپنی قبائے صفات بناتی ہے یہ مجاز اور حقیقت دونوں پر حاوی ہے" ع۳

غزل کے مستقبل کے بارے میں مختلف لوگوں کی مختلف رائیں ہیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آئندہ

ع۱ "آتش گل" مطبوعہ ۱۹۵۸ء ص ۱۷-۱۸ ع۲ "نئے ادبی رجحانات" مطبوعہ ۱۹۵۸ء ص ۱ ع۳ "اردو غزل" ص ۱۷ تا ۱۹

شاعری کا بڑا حصہ نظم پر مشتمل ہوگا مگر کچھ لوگ غزل بھی کہتے رہیں گے اور یہ سلسلہ جاری رہے گا بعض کا خیال ہے کہ مشین کی ترقی کے ساتھ شاعری اور شاعری کے ساتھ غزل کا زوال ہوگا اور بعض حضرات کا کہنا ہے کہ قومی اور تہذیبی شعور کے ساتھ مستقبل میں غزل سے دلچسپی بڑھے گی اس سلسلے میں آل احمد سرور کا خیال ہے کہ

"مستقبل کی شاعری کا بڑا حصہ نظم پر مشتمل ہوگا مگر کچھ لوگ غزل بھی کہتے رہیں گے اور دریا کو کوزے میں بند کرنے کا یہ سلسلہ ختم نہیں ہوگا" ع۱

اور گوپی ناتھ امن کہتے ہیں کہ :-

"مشین کی ترقی کے ساتھ شاعری کا زوال ہوگا یہ لازمی ہے کہ جب انسان مشین بن جائے گا تو اس کے اندر جذباتِ لطیف نہیں رہیں گے اس کے ساتھ ساتھ شاعری کا زوال ہوگا اور شاعری کے ساتھ ساتھ غزل کا زوال ہوگا لیکن جب تک شاعری زندہ ہے جب تک ہمارے یہاں جذبات اور احساسات کی قدر ہے اس وقت تک غزل کی مقبولیت کم نہیں ہو سکتی" ع۲

ڈاکٹر عبادت بریلوی سب سے زیادہ پر امید نظر آتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ :-

"قومی ترقی کے ساتھ ساتھ اسکی تہذیب اور کلچر اور اس کی روایات کی اہمیت کا احساس ناگزیر ہے جیسے جیسے یہ قومی اور تہذیبی شعور بڑھے گا اپنی روایات کو زندہ رکھنے کا شعور عام ہوتا جائے گا غزل چونکہ ان تہذیبی روایات کی آئینہ دار ہے اس لئے مستقبل میں اس سے دلچسپی بڑھتی جائے گی اور یہ دلچسپی کی فضا اس کو خود اپنی ذات کی اہمیت کا احساس دلائے گی اور یہ احساس اس میں زیادہ سے زیادہ نکھار پیدا کرے گا وہ اپنی اصلیت اور حقیقت سے آشنا ہوگی ــــــــــــــــ

آج بدلتے ہوئے حالات نے دکھا دیا ہے کہ غزل زندگی کے ساتھ ہم آہنگ ہے چنانچہ آج اس کی طرف رجحان عام ہو رہا ہے اس سے دلچسپی بڑھ رہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور غزل کا آفتاب اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ زندگی کے افق پر جلوہ ریز نظر آتا ہے

یہ صورتِ حال غزل کے شاندار مستقبل پر دلالت کرتی ہے" ع۳

اور فراق گورکھپوری اس پر ایک شرط لگا کر اس کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

"غزل جب قدیم لفظ پرستی اور سہل پسندی سے آگے بڑھ کر ایک نئی جذباتی اور داخلی زندگی کی ترجمانی کرے گی تو اردو غزل نوا ہائے سرمدی سے حیات انسانی کو مرتعش کر دیگی جو ابھی پردۂ ساز میں ہے

ع۱ "کتاب نما" جنوری ۱۹۶۲ء ص ۲۷ ع۲ "کتاب نما" جنوری ۱۹۶۲ء ص ۲۶-۲۷ ع۳ غزل از "مطالعہ غزل" ص ۶۴۲ تا ص ۶۴۳ -

غزل کی چاہت ، اس کا اختصار ، اسکی نغمگی ، اسکی مرکزیت غزل کے روشن مستقبل کی خبر دیتے ہیں۔[ع۱]

مندرجہ بالا اقوال کی مدد سے اگر ہم غزل کے مستقبل کے بارے میں کچھ سوچنا چاہیں تو ہم کوئی مستقل رائے نہیں قائم کر سکتے کیونکہ ہر شخص کی رائے مختلف ہے جس سے مبہم سے نتائج برآمد ہوتے ہیں

یہ کچھ ضروری نہیں کہ مستقبل کی شاعری کا بڑا حصہ نظم ہی پر مشتمل رہے البتہ موجودہ دور کے شعراء کا رجحان نظم کی طرف زیادہ ہے لیکن غزل کہنے والے بھی کچھ کم نہیں ہیں یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ انسان ، انسان سے مشین بن جائے اور جذبات لطیف سے محروم ہو جائے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ قومی ترقی کے ساتھ ساتھ تہذیب اور کلچر کی روایات کا احساس رہے (مثال میں روس کو پیش کیا جا سکتا ہے جہاں موجودہ زمانے میں وہاں کے قدیم تہذیب اور کلچر کا فقدان پایا جاتا ہے) اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ اگر غزل نے قدیم لفظ پرستی چھوڑ کر اور سہل پسندی سے آگے بڑھ کر نئی جذباتی اور داخلی زندگی کی ترجمانی کی تو اس کا مستقبل روشن ہی رہے گا۔

یہ صحیح ہے کہ موجودہ دور میں شعراء کا رجحان زیادہ تر ترقی پسندانہ ہوتا جا رہا ہے اور اس تحریک سے متاثر ہو کر وہ نظم کی طرف زیادہ مائل ہو گئے ہیں لیکن غزل سے بھی لوگوں کی دلچسپی کم نہیں ہو رہی ہے البتہ یہ دور مشینی دور کہلاتا ہے اور اسمیں محبت کی بھی تجارت ہونے لگی ہے اس لئے سستی جذباتیت عام ہو رہی ہے لوگوں کا مذاق پست ہوتا جا رہا ہے (ثبوت میں فلم اور فلمی گانوں کو جنمیں سستی جذباتی قسم کی غزلیں اور غزل نما نظمیں ہوتی ہیں زیادہ مقبول ہو رہی ہیں جو ادب اور شاعری کے ذوق کو پست تر بناتی جا رہی ہیں پیش کیا جا سکتا ہے) ان حالات کے پیش نظر یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ غزل کا مستقبل بہت روشن ہے کیونکہ کچھ عجب نہیں کہ اس پست ذوق کی وجہ سے لوگ غزل سے اس طرح متنفر ہو جائیں جسطرح جرأت اور انشاء کی شاعری سے ہو گئے تھے اور نظم کو پھلنے پھولنے کا موقع مل جائے لیکن غزل میں حالات سے مطابقت پیدا کر لینے کی صلاحیت ہے اس لئے اگر کوئی دوسرا حالی پیدا ہو گیا تو غزل کے روشن مستقبل سے مایوسی نہیں ہو سکتی کیونکہ غزل میں دروں بینی اور جذبات حسن و عشق کی عکاسی کی جاتی ہے جو ازل ہی سے انسان کی سرشت میں داخل ہے

مندرجہ بالا کے مطالعہ کے بعد ہمیں نیاز فتحپوری کی یہ رائے زیادہ مستند معلوم ہوتی ہے جسمیں انھوں نے لکھا ہے کہ :-

" نظم لکھنے والوں کی یہ کوشش کہ غزل گوئی مٹ جائے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کا تعلق انسان کے جذبات سے ہے جو تمدن کے ہر دور میں پائے جائیں گے اور جس کا تعلق انسان کے اس احساس سے ہے جو نثر داشاعت کو پسند نہیں کرتا پھر اگر انسان کو اس بات پر مجبور کیا جا سکتا

ع۱؎ نگار ، مئی ۱۹۴۸ء ، ص۴۵

کہ اس کے چوٹ لگے اور محسوس نہ کرے تو بیشک آپ تغزل کو بھی دنیا سے محو کر سکتے ہیں ورنہ ایسا خیال کرنا ایک طلب محال ہے۔" ع۱

غزل کے مستقبل کا جائزہ لینے کے بعد جگر کے مستقبل کے بارے میں بھی کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا ضروری ہے اس میں شک نہیں کہ جگرؔ غزل کے شاعر ہیں انکی تمام شاعری غزلیہ شاعری ہے اور انکی غزلوں میں جو خامیاں ہیں انسے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ جگرؔ نے غزل کو جو نیا رجحان دیا اس کے نئے مطالبات پورے کئے حسن و عشق کے جذبات کی صحیح ترجمانی کی اردو غزل میں والہانہ پن اور جوش و جذبہ بدرجہ اتم داخل کیا اس کا بھی اعتراف کرنا پڑے گا

جگرؔ غزل کو بہت نازک صنف سمجھتے تھے ان کا خیال تھا کہ اس میں داخلی اثرات ظاہر ہوتے ہیں اور انسان کی عادتیں خصلتیں اور حرکتیں رفتہ رفتہ ایک کردار بنا دیتی ہیں اور پھر اس سے چھٹکارہ پانا مشکل ہو جاتا ہے وہ اس شاعر کے کلام کو بے اثر سمجھتے تھے جس کے یہاں آپ بیتی نہ ہو یہی وجہ ہے کہ جگرؔ کے کلام میں انکی آپ بیتی پائی جاتی ہے جو بات ان کے دل سے نکلتی ہے دوسرے کے دل میں جا کر بیٹھتی اور دماغ پر اثر کرتی ہے

جگرؔ کی غزلوں میں ان کے عہد کے کلچر کا عطر اور روح موجود ہے اور اس کلچر کی سب سے اچھی نمائندگی کرتی ہے انکی غزلیں انکے دور کے تہذیب کی قدروں کی علمبردار ہیں اور انکیں تغزل کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں

جگرؔ کی شاعری انکے باطنی تجربے کا روشن تخیل ہے اور انکے تجربے کا جوہر بیش قیمت ہے اس لئے ان کی شاعری بھی قیمتی ہو گئی ہے کیونکہ انھوں نے اپنے تجربات کا اظہار اپنے اشعار کے ذریعہ کر کے اپنا مقصد پورا کر دیا ہے وہ صحیح معنوں میں اپنے اشعار ہی میں جلوہ گر نظر آتے ہیں انکے اشعار میں انکا ایک خاص اسلوب، خاص اندازِ بیان اور اس کے ساتھ ساتھ انکے جذبات کی صداقت اور خلوص و محبت والہانہ پن اور ایک آب و تاب بھی پائی جاتی ہے ان کے یہاں حسن و محبت پر یقین اور اس کے احترام کا پیام ہے جو خود ایک عالمگیر اور حسین موضوع ہے ان کے یہاں تحیر، محویت، فرحت، جستجو اور عمل کا جذبہ ہے انکی شاعری میں تغزل کا ارتقا اور تفکر کی انتہا ملتی ہے، تغزل میں توازن کا احساس بھی ہے اور انکے عشق نے بلوغیت کی منزلیں طے کر کے معاشرے کے ایک فرد کے بجائے تمام معاشرے کو اپنے احاطے میں لے لیا ہے اسی لئے انکے یہاں محبوب کے حسن کے ساتھ سماج کے زخم بھی دکھائی دیتے ہیں آل احمد سرور کا قول ہے کہ :-

"جگرؔ کا عشق کا تصور اگرچہ اقبالؔ کے تصور کی گہرائی نہیں رکھتا مگر لطافت میں اقبالؔ سے کم نہیں

ع۱ "اردو غزل گوئی" صـ ۱۳

جگر نے غزل کی لطافت کو قائم رکھا ہے اور اس لطافت سے اردو شاعری کے کیف و انبساط کو بڑھایا ہے جگر کے یہاں زندگی محض روحِ نشاط نہیں ہے، خود نشاط ہے ہماری جدید شاعری زندگی کے اس نشاط کو بعض حقائق کی وجہ سے کھوتی جا رہی ہے اور اسی وجہ سے جگر کے یہاں زندگی اور اس کے حسن کے ساتھ یہ والہانہ شغف ایک صحت مند علامت ہے اور یہ ضرورت ہمیشہ رہیگی ع۱

پروفیسر سید احتشام حسین نے بھی جگر کی شاعری کے متعلق اپنی گراں قدر رائے دیتے ہوئے بجا فرمایا ہے کہ:-

"جگر کی شاعری نئی تخلیق کے مدارج طے کر کے لطیف احساسات کو جگاتی اور محبت کے خوابیدہ تاروں کو چھیڑ کر نیا نغمہ پیدا کرتی ہے محبت کے تاثر میں جو غنائیت پوشیدہ ہے وہ جگر کے یہاں الفاظ میں سرایت کر گئی ہے ان کے الفاظ کے انتخاب، تراکیب اور بندش سے نغمہ پیدا ہوتا ہے افسوس کہ اردو کا ایک نغمہ گر نہ رہا اسکی آواز کا جادو اب دیکھنے میں نہ آئے گا لیکن وہ نغمے جو اس نے اپنے اشعار کو سونپ دیئے ہیں وہ زندہ رہینگے اور محبت کرنے والوں کے دلوں کی دھڑکن بنتے رہیں گے" ع۲

جگر کے کلام اور ترنم نے مشاعروں میں کچھ ایسی لذت اور دلکشی پیدا کر دی تھی گویا اردو زبان کو دوبارہ زندگی مل گئی اس میں وہ نغمگی، شیرینی اور سریلے گیت کا لطف پیدا کیا کہ جو اس کے مٹانے کے درپے تھے وہی اس کی بقا کے حق میں ہو گئے۔

(جگر نے، غزل میں سوز و ساز، درد و گداز، آپ بیتی اور جگ بیتی، عشق کی سرمستی اور انسانیت کا جمال، محبت کی سرگوشی اور دکھے ہوئے دل کی پکار کو جگہ دے کر غزل کی لاج رکھی اور اسکی آن بان قائم رکھنے میں نمایاں حصہ لیا اور اردو ادب کا سر اونچا کیا اردو غزل جو اپنی ابتذال رکاکت کی وجہ سے بدنام تھی اسے دور کر کے حسن و عشق کا ایک اعلیٰ تصور پیش کیا غزل کی مٹتی ہوئی صنعت کو بنانے سنوارنے میں اپنی تمام عمر عزیز صرف کر دی اور اس میں اپنے دلی جذبات و احساسات کا وہ کامیاب حقیقی تصور پیش کیا جو انکے ہم عصروں میں کوئی اور اتنی کامیابی سے نہ پیش کر سکا)

جگر کی شاعری کا بغور مطالعہ کرنے اور مکمل جائزہ لینے کے بعد انکی غزل گوئی کی عظمت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اور ایک شاعر کی حیثیت سے اگر انھیں اپنے دور کا عظیم ترین شاعر نہیں تو عظیم ترین غزل گو ماننا ہی پڑے گا کیونکہ انھوں نے اردو غزل کی مٹتی ہوئی دنیا کو پھر سے سنوارا اور اس کو ایک نئی زندگی بخشی۔

یہ کہنا تو مشکل ہے کہ جگر کا مستقبل بہت روشن ہے کیونکہ موجودہ دور (جسے ترقی پسندی کا دور کہا جاتا ہے) نظموں کا دور ہے نوجوان شعرا بیشتر اسی طرف راغب ہیں لیکن غزل کہنے والوں

ع۱ "آتشِ گل"، مطبوعہ ۱۹۵۸ء، ص ۱۶ ع۲ "فروغِ اردو" فروری و مارچ ۱۹۶۱ء ص ۵۰۱-۵۰۲

کی تعداد بھی کم نہیں ہے کیونکہ اس میں انسان کے ایک فطری جذبہ کی عکاسی کیجاتی ہے جو ایک عالمگیر جذبہ ہے لیکن اگر اردو زبان زندہ رہے گی اور اسکے پڑھنے اور سمجھنے والے زندہ رہینگے تو اس میں حسن و محبت کے افسانے بھی کہے اور سنے جائیں گے اور جب تک حسن و عشق کے افسانے زندہ رہیں گے (واردات حسن و عشق کا بیان ہی غزل کی جان ہے) اس وقت تک اردو غزل بھی زندہ رہے گی اور اگر غزل زندہ رہی تو جگر بھی (جس کی تمام زندگی غزل ہی کے گیسو سنوارنے میں صرف ہوئی اور اس میں تمام عشقیہ جذبات و احساسات کے ساتھ ساتھ دور حاضر کے تقاضے پورے کر کے اسے ترقی کی راہ پر گامزن کیا) زندہ رہیں گے

شاہ عبد الغنی منگلوری نے اصغر اور جگر دونوں کے کلام سننے کے بعد ایک دفعہ کہا تھا[ع۱] کہ شعر تو اصغر بھی کہتے ہیں لیکن شاعر جگر ہی ہیں اور اگر اصغر جگر کی دیکھ بھال رکھیں تو ایک دن وہ دنیائے اردو شاعری میں ایک تاریخی حیثیت حاصل کرلیں گے شاہ صاحب کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اصغر نے جگر کی دیکھ بھال کی اور جگر نے اپنی غزل گوئی کی بدولت تاریخ ادب اردو میں ایک خاص مرتبہ حاصل کر لیا جو ان کے عہد کے دوسرے شعراء نہ حاصل کر سکے۔

عـه۱ اس کا تذکرہ مع حوالہ پچھلے صفحات میں آ چکا ہے۔

کتابیات

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف
۱	اثر کے تنقیدی مضامین	اثر لکھنوی
۲	ادب اور سماج مطبوعہ ۱۹۴۸ء	سید احتشام حسین
۳	ادب اور نظریہ	آل احمد سرور
۴	اردو تنقید پر ایک نظر حصہ اول	کلیم الدین احمد
۵	اردو شاعری پر ایک نظر مطبوعہ حصہ اول	کلیم الدین احمد
۶	اردو شاعری پر ایک نظر مطبوعہ ۱۹۶۵ء (حصہ دوم)	کلیم الدین احمد
۷	اردو غزل	ڈاکٹر یوسف حسین
۸	اردو غزل کی نشو و نما	ڈاکٹر رفیق حسین
۹	اردو غزل کے پچاس سال	ڈاکٹر عبدالخالق خلیل
۱۰	اردو غزل گوئی	فراق گورکھپوری
۱۱	اقبال اور اس کا عہد	جگن ناتھ آزاد
۱۲	انواعِ فلسفہ	ظفر حسین
۱۳	آتشِ گل مطبوعہ ۱۹۵۸ء	جگر مراد آبادی
۱۴	تذکرۂ جگر مطبوعہ اپریل ۱۹۶۱ء	محمود علی خاں جامعی
۱۵	تلاشِ ہند حصہ اول	پنڈت جواہر لال نہرو
۱۶	تنقید کیا ہے مطبوعہ ۱۹۴۷ء	آل احمد سرور
۱۷	تنقید و تحلیل	سید شبیہ الحسن
۱۸	جدید غزل مطبوعہ ۱۹۵۵ء	پروفیسر رشید احمد صدیقی
۱۹	جگر مراد آبادی مطبوعہ ۱۹۴۶ء	تبسم نظامی
۲۰	جگر مراد آبادی غیر مطبوعہ	نواب سید شمیم الحسن
۲۱	جگر کی کہانی (غیر مطبوعہ)	تبسم نظامی
۲۲	جگر کی غزلیہ شاعری	اشفاق علی خاں
۲۳	جگر کے خطوط	محمد اسلام
۲۴	حیاتِ جگر (غیر مطبوعہ)	شمس الہدیٰ فیض الآفاقی
۲۵	خصائل شریف مترجم ۱۹۲۱ء	

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف
۲۶	دورِ حاضر اور غزل گوئی	عندلیب شادانی
۲۷	شعر اور غزل	مجنوں گورکھپوری
۲۸	شعلۂ طور مطبوعہ ۱۹۳۲ء	جگر مراد آبادی
۲۹	شعلۂ طور مطبوعہ ۱۹۳۶ء	،،
۳۰	شعلۂ طور مطبوعہ ۱۹۴۸ء	،،
۳۱	شعلۂ طور مطبوعہ ۱۹۶۰ء	،،
۳۲	غزل اور متغزلین	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
۳۳	غزل اور مطالعۂ غزل مطبوعہ ۱۹۵۵ء	ڈاکٹر عبادت بریلوی
۳۴	کلیاتِ جگر (مجلد) ایڈیشن دہلی	جگر مراد آبادی
۳۵	مالہ و ماعلیہ	نیاز فتح پوری
۳۶	مسلمانوں کا روشن مستقبل مطبوعہ ۱۹۴۴ء	سید طفیل احمد
۳۷	مکاتیبِ جگر	تسکین قریشی
۳۸	میر تقی میر حیات اور شاعری	ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی
۳۹	میری کہانی (حصہ دوم)	پنڈت جواہر لال نہرو
۴۰	نشاطِ روح	اصغر گونڈوی
۴۱	نکاتِ مجنوں	مجنوں گورکھپوری
۴۲	نگارشاتِ جگر	محمد اسلام
۴۳	نئے ادبی رجحانات	ڈاکٹر اعجاز حسین
۴۴	نئے اور پرانے چراغ مطبوعہ ۱۹۴۶ء	آل احمد سرور
۴۵	ہماری آزادی	مولانا ابوالکلام آزاد
۴۶	ہندوستانی تہذیب اور اردو	شبنم سبحانی
۴۷	ہندوستانی سماجیات	جعفر حسن
۴۸	ہندوستانی قومیت اور قومی تہذیب (حصہ سوم)	ڈاکٹر سید عابد حسین
۴۹	یادِ جگر	درگا پرشاد شاد
۵۰	یادگارِ جگر (غیر مطبوعہ)	شمس الہدیٰ فیض الآفاقی

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف
۵۱	یادگار جگرؔ غیر مطبوعہ	شوقیؔ مرادآبادی
۵۲	یادگار جگرؔ	محمد اسلام

نمبر شمار	نام رسالہ	ماہ و سنہ
۱	اردو شبلی کالج میگزین	فروری سنہ ۶۱ء
۲	شبلی کالج میگزین	سنہ ۱۹۶۰-۱۹۶۱ء
۳	علی گڑھ تحریک نمبر	سنہ ۱۹۶۰ء
۴	علی گڑھ میگزین انانی نمبر	سنہ ۴۳ء
۵	اردو (سہ ماہی)	اپریل سنہ ۴۵ء
۶	〃 〃 - کراچی	جنوری تا اپریل سنہ ۵۹ء
۷	〃 〃 〃	جولائی سنہ ۵۹ء
۸	العلم (سہ ماہی) کراچی	جولائی تا ستمبر سنہ ۶۲ء
۹	〃 〃 〃	اکتوبر تا دسمبر سنہ ۶۲ء
۱۰	〃 〃 〃	جولائی تا دسمبر سنہ ۶۳ء
۱۱	〃 〃 〃	اپریل تا جون سنہ ۶۴ء
۱۲	〃 〃 〃	اکتوبر تا دسمبر سنہ ۶۴ء
۱۳	نگارش (دو ماہی) امرتسر	غالباً ستمبر سنہ ۶۱ء
۱۴	ادیب علی گڑھ	اکتوبر سنہ ۴۳ء
۱۵	افکار کراچی	اکتوبر سنہ ۵۶ء
۱۶	آجکل (ماہانہ) دہلی	یکم ستمبر سنہ ۴۹ء
۱۷	〃 〃 〃	جنوری سنہ ۶۱ء
۱۸	ترجمان کانپور	اکتوبر سنہ ۶۱ء
۱۹	تحریک دہلی	اکتوبر سنہ ۶۲ء
۲۰	〃 〃	اکتوبر سنہ ۶۴ء
۲۱	جامعہ دہلی	اکتوبر سنہ ۶۱ء
۲۲	〃 〃	اکتوبر سنہ ۶۲
۲۳	〃 〃	نومبر سنہ ۶۳ء
۲۴	جام نو - کراچی	جنوری سنہ ۶۱ء
۲۵	〃 〃	دسمبر سنہ ۶۲ء
۲۶	جگرؔ سنبھل	مئی سنہ ۵۳
۲۷	جلوۂ یار میرٹھ	مئی سنہ ۱۹۱۰ء
۲۸	ساقی (جوبلی نمبر)	سنہ ۵۵ء
۲۹	سب رس حیدرآباد	ستمبر سنہ ۶۰ء
۳۰	شعلہ و شبنم دہلی	آزادی ایڈیشن سنہ ۶۰ء
۳۱	صبح امید بمبئی	جولائی سنہ ۵۱ء
۳۲	صبح نو - پٹنہ	اپریل و مئی سنہ ۶۱ء
۳۳	فروغ اردو لکھنؤ	فروری و مارچ سنہ ۶۱ء
۳۴	〃 〃	اگست و ستمبر سنہ ۶۱ء
۳۵	〃 〃	دسمبر سنہ ۶۱ء
۳۶	〃 〃	جنوری سنہ ۶۲ء
۳۷	〃 〃	فروری سنہ ۶۳ء
۳۸	کتاب نما - دہلی	دسمبر سنہ ۶۳ء
۳۹	〃 〃	جنوری سنہ ۶۴ء
۴۰	"مجلّہ سیفیہ" بھوپال	سنہ ۱۹۶۴-۱۹۶۵ء
۴۱	مخزن - لاہور	جنوری فروری مارچ تا اپریل سنہ ۱۹۲۰ء
۴۲	مرقع - لکھنؤ	جون سنہ ۱۹۲۸ء
۴۳	نقاد	فروری سنہ ۱۹۱۴ء
۴۴	〃	مارچ سنہ ۱۹۱۴ء
۴۵	نگار - لکھنؤ	مارچ سنہ ۳۶ء
۴۶	〃 〃	مئی سنہ ۳۸ء

نمبر شمار	نام رسالہ	ماہ و سنہ	رسائل و اخبار	نمبر شمار	نام رسالہ	ماہ و سنہ
۴۷	نگار۔ لکھنؤ	اپریل سنہ ۴۲ء		۶۱	مادرِ وطن (ہفتہ وار) لکھنؤ	۱۶ دسمبر سنہ ۶۱ء
۴۸	" "	جنوری تا فروری سنہ ۵۳ء		۶۲	نظام جدید (ہفتہ وار) ملتان	۱۶ و ۲۳ ستمبر سنہ ۶۲ء
۴۹	" "	مارچ سنہ ۶۱ء		۶۳	اردو ٹائمز (خیام) بمبئی	۶ ستمبر سنہ ۶۲ء
۵۰	" "	جولائی سنہ ۶۱ء		۶۴	انجام (اخبار روزانہ) کراچی	۷ جنوری سنہ ۶۰ء
۵۱	نیا دور۔ لکھنؤ	نومبر سنہ ۶۰ء		۶۵	" "	۲ اکتوبر سنہ ۶۳ء
۵۲	نیرنگ خیال۔ لاہور	سالنامہ سنہ ۴۲ء		۶۶	" "	۱۲ اکتوبر سنہ ۶۴ء
۵۳	نئی دنیا (روزنامہ) دہلی	۱۵ نومبر سنہ ۶۳ء		۶۷	قومی آواز لکھنؤ	۲۶ جنوری سنہ ۵۹ء
۵۴	ہمایوں لاہور	مارچ سنہ ۵۱ء		۶۸	" "	۲ فروری سنہ ۵۹ء
۵۵	ہم قلم کراچی	اگست سنہ ۶۱ء		۶۹	" "	۱۹ ستمبر سنہ ۶۰ء
۵۶	" "	سالگرہ نمبر سنہ ۶۱ء		۷۰	" "	۱۷ جون سنہ ۶۱ء
۵۷	اودھ پنچ (ہفتہ وار) لکھنؤ	۲۴ جون سنہ ۲۵ء		۷۱	" "	۲۴ جون سنہ ۶۱ء
۵۸	" "	آخر دسمبر سنہ ۱۰ء		۷۲	" "	۳۰ جولائی سنہ ۶۱ء
۵۹	مادرِ وطن (ہفتہ وار) لکھنؤ	۱۲ دسمبر سنہ ۶۰ء		۷۳	" "	یکم جولائی سنہ ۶۲ء
۶۰	" "	۶ جنوری سنہ ۶۱ء		۷۴	" "	۸ جولائی سنہ ۶۲ء

<u>بیاضیں</u>

نمبر شمار	نمبر بیاض	پتہ		نمبر شمار	نمبر بیاض	پتہ
۱	۱	زائر حرم حضرت حمید صدیقی چوک لکھنؤ (یہ بیاض راقم کے پاس محفوظ ہے)		۳	سودہ آتش گل	گوشہ جگر لائبریری جامعہ ملیہ دہلی
۲	۱، ۲، ۳، ۴، ۸۷	گوشہ جگر۔ لائبریری جامعہ ملیہ دہلی			۱۶	" "

نمبر شمار	نام مکتوب نگار	نام مکتوب الیہ	تاریخ خط	<u>خطوط</u>	نمبر شمار	نام مکتوب نگار	نام مکتوب الیہ	تاریخ خط
۱	جگر مرادآبادی	نواب سید علی حسن (چھجو صاحب)	...		۳	جگر مرادآبادی	میکش اکبرآبادی	
۲	"	"	سنہ ۳۳		۴	"	نواب سید شمس الحسن	

نمبر شمار	نام مکتوب نگار	نام مکتوب الیہ	تاریخ خط	خطوط	نمبر شمار	نام مکتوب نگار	نام مکتوب الیہ	تاریخ خط
۵	جگر مرادآبادی	نواب سید شمس الحسن	—		۱۶	جگر مرادآبادی	بخشی غلام محمد	[illegible] اپریل ۵۹ء
۶	״	״	...		۱۷	مولوی خورشید الحسن	شوق مرادآبادی	۲۰ مارچ [illegible]
۷	״	انجمن صحافیہ کراچی اصطفافیہ	...		۱۸	مجرؔ ذرح سلطانپوری	مجرؔ اسلام	۵ ستمبر ۶۲ء
۸	״	״	...		۱۹	مولوی خورشید الحسن	״	[illegible] اکتوبر ۶۳ء
۹	״	محمد یقین مرادآبادی	۸ ستمبر ۶۳ء		۲۰	״	״	[illegible] اپریل ۶۲ء
۱۰	״	سیکریٹری انجمن بہار ادب			۲۱	نواب سید شمس الحسن	״	۲۹ نومبر [illegible]
۱۱	״	ڈاکٹر حکیم عظیم مرحوم	...		۲۲	پروفیسر رشید احمد صدیقی	״	۱۲ اگست ۶۲ء
۱۲	״	شاکی	۲ مارچ ۶۳ء		۲۳	فضل احمد کریم فضلی	״	۲۵ ستمبر ۶۲ء
۱۳	״	وحشی	...		۲۴	تسکین قریشی	״	۲۵ اپریل ۶۵ء
۱۴	״	کسی صنف نازک کے نام			۲۵	عبدالقوی دسنوی	״	۲۲ نومبر ۶۶ء
۱۵	״	مس تہمینہ ہاشمی	مجموعہ منظوم					

نمبر شمار	نام اشخاص	مقام ملاقات	تاریخ ملاقات	اشخاص	نمبر شمار	نام اشخاص	مقام ملاقات	تاریخ ملاقات
۱	تسکین قریشی	لکھنؤ	۹ ستمبر ۶۲ء		۶	عزیز حسن	مرادآباد	۲۵ دسمبر ۶۲ء
۲	״	میرٹھ	۱۴ اپریل ۶۲ء		۷	علی مظفر	کانپور	۲۶ مئی ۶۳ء
۳	جلیل قدوائی	کراچی	دسمبر ۶۳ء		۸	فرقت کاکوروی	لکھنؤ	جون ۶۲ء
۴	مولوی خورشید الحسن	مرادآباد	۲۷ نومبر ۶۳ء		۹	محسن علی صابقی	گونڈہ	جون ۶۲ء
۵	سراج لکھنوی	لکھنؤ	ستمبر ۶۳ء					

چند ایسی کتابیں، رسالے واخبار وغیرہ جو مقالہ ،، کی تیاری کے سلسلے میں زیر مطالعہ رہے

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف
۱	اثرستان	اثر لکھنوی	۴	اردو ادب آزادی کے بعد	اعجاز حسین
۲	ادب اور ادیب	اعجاز حسین	۵	اردو غزل ولی تک	سید ظہیر الدین مدنی
۳	ادب اور زندگی	مجنوں گورکھپوری	۶	اردو کی عشقیہ شاعری	فراق گورکھپوری

رسائل و اخبار

نمبر شمار	نام رسالہ	ماہ و سنہ	نمبر شمار	نام رسالہ	ماہ و سنہ
۱	اورینٹیل کالج میگزین	مئی سنہ ۴۱ء	۲۶	انجم بارہ بنکی	مارچ سنہ ۶۰ء
۲	بہترین ادب	سنہ ۴۹ء	۲۷	آجکل (ماہانہ) دہلی	مئی سنہ ۵۰ء
۳	〃	سنہ ۵۰ء	۲۸	〃 〃	ستمبر سنہ ۵۱ء
۴	〃	سنہ ۵۱	۲۹	〃 〃	اگست سنہ ۶۱ء
۵	علی گڑھ میگزین	جنوری و فروری سنہ ۲۵	۳۰	آزاد - لکھنؤ	اگست تا نومبر سنہ ۴۹
۶	〃	جنوری سنہ ۳۸ء	۳۱	آئینہ، بمبئی	مارچ سنہ ۶۵ء
۷	کاروانِ ادب بمبئی	سنہ ۱۹۶۳ء-۱۹۶۴ء	۳۲	برہان دہلی	اکتوبر سنہ ۶۲
۸	نیشنل ہائر سکنڈری اسکول محمد پور اعظم گڑھ میگزین	سنہ ۱۹۶۱ء	۳۳	پیام نو (ہفتہ وار) لکھنؤ	۱۷ اگست سنہ ۶۴
۹	اردو (سہ ماہی) کراچی	اکتوبر سنہ ۵۹ء	۳۴	تعمیر سرینگر	جنوری و فروری سنہ ۶۱
۱۰	〃	جنوری سنہ ۶۰ء	۳۵	تعمیر حیات (ہفتہ وار) لکھنؤ	۱۰ ستمبر سنہ ۶۴
۱۱	العلم (سہ ماہی) کراچی	اپریل تا جون سنہ ۶۲ء	۳۶	جامعہ - دہلی	ستمبر سنہ ۲۹ء
۱۲	〃 〃	جنوری تا مارچ سنہ ۶۳ء	۳۷	جامعہ دہلی	دسمبر سنہ ۳۰ء
۱۳	〃 〃	اپریل تا جون سنہ ۶۳ء	۳۸	〃 〃	جنوری سنہ ۳۳
۱۴	〃 〃	جنوری تا مارچ سنہ ۶۴	۳۹	〃 〃	اکتوبر سنہ ۳۲
۱۵	ادب لطیف	مارچ سنہ ۵۵ء	۴۰	〃 〃	جولائی سنہ ۳۳
۱۶	〃	اپریل و مئی سنہ ۵۵ء	۴۱	〃 〃	ستمبر سنہ ۳۴
۱۷	ادیب علی گڑھ	جنوری سنہ ۶۲	۴۲	〃 〃	اگست سنہ ۳۵
۱۸	〃 〃	مئی جون سنہ ۶۳	۴۳	〃 〃	فروری سنہ ۳۷
۱۹	اردو دہلی	اپریل سنہ ۴۴ء	۴۴	〃 〃	مئی سنہ ۳۷
۲۰	〃 〃	اکتوبر سنہ ۵۹ء	۴۵	〃 〃	فروری سنہ ۳۸
۲۱	اردوئے معلیٰ	جنوری تا مارچ سنہ ۲۹ء	۴۶	〃 〃	مارچ سنہ ۳۸ء
۲۲	اشارہ پٹنہ	نومبر سنہ ۶۰ء	۴۷	〃 〃	جون سنہ ۳۸ء
۲۳	افکار کراچی (شمارہ آزادی)	سنہ ۵۶ء	۴۸	〃 〃	اکتوبر سنہ ۳۸ء
۲۴	〃 〃	ستمبر سنہ ۵۹ء	۴۹	〃 〃	نومبر و دسمبر سنہ ۳۹
۲۵	〃 〃	مارچ سنہ ۶۱ء	۵۰	〃 〃	نومبر سنہ ۴۱ء

نمبر شمار	نام رسالہ	ماہ و سنہ
۵۱	جامعہ دہلی	نومبر سنہ ۶۱ء
۵۲	" "	جنوری سنہ ۶۲ء
۵۳	" "	اکتوبر سنہ ۶۳
۵۴	" "	اگست سنہ ۶۴
۵۵	خاتون مشرق۔ دہلی	اکتوبر سنہ ۶۱ء
۵۶	زمانہ کانپور	مارچ و اپریل سنہ ۲۳
۵۷	" "	جنوری سنہ ۲۸ء
۵۸	" "	ستمبر سنہ ۲۸ء
۵۹	" "	اکتوبر سنہ ۲۹ء
۶۰	" "	مارچ سنہ ۳۰ء
۶۱	" "	اپریل سنہ ۳۰
۶۲	" "	مئی سنہ ۳۸ء
۶۳	" "	جولائی سنہ ۳۸
۶۴	" "	مئی سنہ ۴۰ء
۶۵	" "	نومبر سنہ ۴۱ء
۶۶	" "	اگست سنہ ۴۳
۶۷	" "	اگست سنہ ۴۴ء
۶۸	" "	جنوری و فروری سنہ ۴۷ء
۶۹	ساقی دہلی	ستمبر سنہ ۳۷ء
۷۰	" "	اکتوبر سنہ ۳۷
۷۱	" "	نومبر سنہ ۳۷ء
۷۲	" "	جنوری سنہ ۳۸
۷۳	" "	فروری سنہ ۳۸
۷۴	" "	اپریل سنہ ۳۸ء
۷۵	" "	مئی سنہ ۳۸ء
۷۶	" "	جون سنہ ۳۸ء

رسائل اخبار	نمبر شمار	نام رسالہ	ماہ و سنہ
	۷۷	ساقی دہلی	اکتوبر سنہ ۳۸ء
	۷۸	" "	دسمبر سنہ ۳۸ء
	۷۹	" "	نومبر سنہ ۴۰ء
	۸۰	سب رس حیدرآباد دکن	مئی سنہ ۴۴ء
	۸۱	" "	مئی سنہ ۴۷ء
	۸۲	سہیل	ستمبر سنہ ۳۶
	۸۳	سہیل۔ گیا	جنوری سنہ ۶۱ء
	۸۴	شاعر۔ بمبئی شمارہ (۹)	سنہ ۶۰ء
	۸۵	شاہراہ۔ بمبئی	مئی و جون سنہ ۵۸ء
	۸۶	" "	نومبر سنہ ۵۸ء
	۸۷	شاہکار	جولائی سنہ ۳۸ء
	۸۸	صحیفہ۔ لاہور	اپریل سنہ ۶۲ء
	۸۹	فاران۔ کراچی	اپریل سنہ ۶۵ء
	۹۰	فروغ اردو لکھنؤ	اپریل سنہ ۶۱ء
	۹۱	" "	جون سنہ ۶۲
	۹۲	کتاب نما دہلی	مارچ سنہ ۶۴ء
	۹۳	ماہ نو کراچی	نومبر سنہ ۶۰ء
	۹۴	معارف اعظم گڑھ	اپریل سنہ ۳۳
	۹۵	" "	جولائی سنہ ۳۳ء
	۹۶	" "	فروری سنہ ۳۴ء
	۹۷	" "	نومبر سنہ ۳۴
	۹۸	" "	فروری سنہ ۳۶ء
	۹۹	نقوش لاہور	ستمبر سنہ ۵۳ء
	۱۰۰	" "	فروری سنہ ۶۳ء
	۱۰۱	" "	جون سنہ ۶۴ء
	۱۰۲	نگار۔ لکھنؤ	مئی سنہ ۳۰ء

نمبر شمار	نام رسالہ	ماہ و سنہ
۱۰۳	نگار لکھنؤ	جون سنہ ۳۰ء
۱۰۴	״ ״	مارچ سنہ ۳۸ء
۱۰۵	״ ״	اپریل سنہ ۳۸ء
۱۰۶	״ ״	جون سنہ ۳۸ء
۱۰۷	״ ״	فروری سنہ ۳۹ء
۱۰۸	״ ״	مارچ سنہ ۳۹ء
۱۰۹	״ ״	جنوری و فروری سنہ ۴۱ء
۱۱۰	״ ״	جنوری و فروری سنہ ۴۴ء
۱۱۱	״ ״	جون سنہ ۴۴ء
۱۱۲	״ ״	نومبر سنہ ۶۰ء
۱۱۳	نئے چراغ — لکھنؤ	ستمبر سنہ ۶۱ء
۱۱۴	״ ״	اگست سنہ ۶۲ء
۱۱۵	نیا دور — لکھنؤ	دسمبر سنہ ۵۹ء
۱۱۶	نیرنگ خیال — لاہور	اگست سنہ ۳۵ء
۱۱۷	״ ״	فروری سنہ ۴۵ء
۱۱۸	״ ״	فروری سنہ ۶۱ء
۱۱۹	״ ״	جنوری سنہ ۶۲ء
۱۲۰	ہم قلم — کراچی	ستمبر سنہ ۶۲ء
۱۲۱	نیا پیام (سہ روزہ) لاہور	۱۵ ستمبر سنہ ۶۳ء
۱۲۲	بھوپال پنچ (ہفتہ وار)	۲۹ اکتوبر سنہ ۶۱ء
۱۲۳	عبرت (ہفتہ وار) کلکتہ	۲۱ اپریل سنہ ۶۳ء
۱۲۴	عوامی دور (ہفتہ وار)	۲ جون سنہ ۶۳ء
۱۲۵	ہماری زبان، علی گڑھ	یکم فروری سنہ ۶۵ء
۱۲۶	״ ״	۲۲ دسمبر سنہ ۶۵ء
۱۲۷	مادر وطن — لکھنؤ	۱۶ جون سنہ ۶۱ء
۱۲۸	״ ״	جولائی سنہ ۶۱ء

نمبر شمار	نام رسالہ	ماہ و سنہ
۱۲۹	الجمعیۃ (اخبار) روزانہ دہلی	۲ اکتوبر سنہ ۶۰ء
۱۳۰	امروز ״ لاہور	۱۳ ستمبر سنہ ۶۰ء
۱۳۱	״ ״ ״	۱۸ ستمبر سنہ ۶۰ء
۱۳۲	انجام ״ کراچی	۹ جنوری سنہ ۶۲ء
۱۳۳	جنگ ״ ״	۹ جنوری سنہ ۶۲ء
۱۳۴	״ ״ ״	۲۳ دسمبر سنہ ۸۲ء
۱۳۵	عوام — کراچی	۲۷ فروری سنہ ۶۱ء
۱۳۶	قومی آواز لکھنؤ	۲ فروری سنہ ۵۹ء
۱۳۷	״ ״	۱۰ ستمبر سنہ ۶۰ء
۱۳۸	״ ״	۱۸ ستمبر سنہ ۶۰ء
۱۳۹	״ ״	۲۲ ستمبر سنہ ۶۰ء
۱۴۰	״ ״	۱۰ ستمبر سنہ ۶۰ء
۱۴۱	״ ״	۱۷ جون سنہ ۶۲ء
۱۴۲	״ ״	۲۰ ستمبر سنہ ۶۲ء
۱۴۳	״ ״	یکم مارچ سنہ ۶۴ء
۱۴۴	״ ״	۲ اپریل سنہ ۶۴ء
۱۴۵	״ ״	۵ ستمبر سنہ ۶۴ء
۱۴۶	ملاپ حیدرآباد	۲۲ جنوری سنہ ۶۴ء
۱۴۷	نقش کراچی	۲۶ ستمبر سنہ ۶۰ء

بیاضیں

نمبر شمار	نمبر بیاض	
۱	۲	زائر حرم حضرت حمید صدیقی، چوک لکھنؤ
۲	۲، ۵، ۶، ۹، ۷، ۱۰	گوشہ جگر لائبریری جامعہ ملیہ دہلی
۳	۱	حکیم سید ابرار احمد صاحب آگرہ